سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ

# سرگزشت

کراچی

اکتوبر 2016

نگران اعلیٰ

معراج رسول

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 26 ❖ شمارہ 09 ❖ اکتوبر 2016ء

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

| | | |
|---|---|---|
| منیجر اشتہارات | محمد شہزاد خان | 0333-2256789 |
| نمائندہ کراچی | محمد عرفان خان | 0333-2168391 |
| | ناظم حمید | 0323-2895528 |
| نمائندہ لاہور | افراز علی بارش | 0300-4214400 |

●●●

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اور اب ایک اور کہانی ”اسلم بے روزگار تھا، وہ نوکری کی تلاش میں صبح کا نکلا شام کو آتا۔ اس دن بھی لوٹ رہا تھا کہ ایک سنسان سڑک پر دو پولیس والوں نے اسے روک لیا۔ تلاشی پر کچھ نہ ملا پھر بھی اسے تھانے لے آئے۔ افسر کے سامنے پیش کیا۔ افسر نے پوچھا۔ ”پستول لے کر گھومتے ہو، رہزنی کا ارادہ تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”سر! اس سپاہی نے دو ہزار مانگے تھے، میں بے روزگار کہاں سے دیتا، اسی خناس میں یہ پستول میری جیب میں ٹھونس کر مجھے یہاں لے آئے۔“ ثبوت اس کے خلاف تھا۔ اسے جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں پہلے سے موجود استادوں نے اسے خوب اسباق پڑھائے اور جب وہ جیل سے نکلا تو ڈگری ہولڈر تھا۔ ایک دن وہ اپنی بائیک بھگائے چلا جارہا تھا کہ انہی دونوں سپاہیوں نے اسے روکا، سوال کیا۔ ”کہاں سے آرہے ہو، کہاں جانا ہے؟“ اسلم نے جواب دیا۔ ”یہ کلاشنکوف گھر رکھنے جارہا تھا۔“ کانسٹیبل نے پوچھا۔ ”لائسنس ہے؟“ اس نے جواب میں جیب سے پرس نکالا۔ ہزار کا نوٹ بڑھا کر بولا۔ ”یہ رہا۔“ نوٹ پر رہنمائے اعظم کی تصویر تھی۔ دونوں کانسٹیبل کی آنکھیں احترام میں چمک اٹھیں۔ نوٹ جیب میں رکھ کر بولے۔ ”آپ جاسکتے ہیں۔“

نہ جانے یہ کہاں کی کہانی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش میں یہی ہو رہا ہے۔ رشوت ستانی ہمارے ملک، معاشرے اور اخلاقی اقدار میں ایک لاعلاج ناسور کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔

معراج رسول

# شعلہ نوا فقیر

اس کا نام محمد اختر تھا اور اس نے مشرقی پنجاب کے شہر انبالہ میں جنم لیا تھا۔ گھرانہ انتہائی غریب تھا۔ اس لیے اسے بھی کنگھی بنانے کے لیے نہایت کم عمری میں مزدوری پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن جب وہ پڑوس کے حبیب حسن کے گھر بچوں کو پڑھتے ہوئے دیکھتا تو اس کا دل اداس ہو جاتا۔ ایک دن اس نے بھی حبیب حسن سے کہا کہ وہ بھی پڑھنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اسے بھی اپنے طلبا میں شامل کرلیا۔ اسے جو سبق دیا جاتا وہ اسے فوراً یاد کر لیتا۔ ابھی اس نے ابتدائی قاعدہ ہی ختم کیا تھا کہ حبیب حسن اپنا مکتب ختم کر کے انبالہ سے امرتسر منتقل ہو گئے۔ وہ بھی نہایت خاموشی سے انبالہ سے فرار ہو کر امرتسر پہنچ گیا اور پھر سے پڑھائی شروع کردی۔ وقت گزرتا گیا اب اس پر جوانی آنے لگی تھی۔ حبیب حسن کو شاعری کا شوق تھا۔ یہ شوق محمد اختر کو بھی لگ گیا۔ اس نے اپنا تخلص ساغر رکھ لیا۔ اب وہ مشاعروں میں بھی جانے لگا تھا۔ اس کے اشعار نیا پن لیے ہوئے تھے اس لیے خوب داد ملتی۔ اس وقت امرتسر میں فرخ امرتسری، بقتی امرتسری، شمس مینائی کی شاعری کو پسند کیا جاتا تھا لیکن جب اس نے فلسفیانہ شاعری شروع کی تو لوگ اس کی جانب کھنچ آئے۔ وہاں کی سب سے بڑی ادبی تنظیم "بزم مہ وش" میں اسے خصوصی طور پر بلایا جانے لگا تھا۔ وہ ترنم میں پڑھا کرتا تھا اور اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی اس لیے سامعین اسے دیر تک پڑھاتے۔ اس دور میں جگر مراد آبادی کے ترنم کا طوطی بولتا تھا۔ ایک مشاعرے میں دونوں شریک تھے۔ لیکن جب وہ مائیک پر پہنچا تو سامعین دم بخود رہ گئے اور جگر نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا۔ وقت گزر رہا تھا کہ 1947 کا خونی دور آ گیا۔ ہر طرف مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ وہ بھی جان بچا کر کسی نہ کسی طرح لاہور آ گیا۔ لاہور پہنچتے ہی اس کی شاعری نے دھوم مچا دی لیکن سکہ بند شاعر اس کے خلاف ہو گئے اور سازشیں ہونے لگیں۔ اسے مشاعرے میں بلانے والوں کو روکا جانے لگا۔ اسے ہوٹ کرنے کے لیے کرائے کے آدمی بھیجے جانے لگے۔ اس طرح اس کی آمدنی ختم ہو کر رہ گئی۔ بحالتِ مجبوری اس نے ہفت روزہ مصور میں نوکری کر لی لیکن جب وہاں سے کئی مہینے تک اسے تنخواہ نہ ملی تو اس نے نوکری چھوڑ دی۔ وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔ انسان جب ٹوٹتا ہے تو اسے کہیں کنارا نہیں ملتا۔ مجبوری میں وہ ٹکسالی دروازے کے باہر رحیم سائیں کے تکیہ پر اٹھ آیا۔ رحیم سائیں کا تکیہ نشہ بازوں کا اڈا تھا۔ وہ بھی نشے میں ڈوبنے لگا۔ وہیں معروف موسیقار مبارک علی کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ ان دنوں وہ انور کمال پاشا کی فلم "دو آنسو" کی موسیقی ترتیب دے رہے تھے۔ انہوں نے اس سے اس فلم کے تمام گیت لکھوانے کی فرمائش کر دی۔ پانچ سو روپے ایڈوانس میں دلوا دیئے۔ اس فلم کے گیتوں نے بس پر کامیابی کے دروازے کھول دیئے۔ "انوکھی داستان، جبر، باپ کا گناہ، غلام، انجام، سرفروش اور باغی" جیسی کامیاب فلمیں اس کے حصے میں آگئیں لیکن سفید پوشوں نے اسے اتنے زخم دیئے تھے کہ وہ ان سے نفرت کرتے ہوئے خود کو نشہ میں ڈبو رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا دنیا والوں سے نفرت بڑھتی رہی۔ اسی درمیان کچھ دوستوں نے اکسایا کہ اخبار نکالو رقم ہم دیں گے۔ اس نے ڈیکلریشن لیا لیکن رقم کا انتظام نہ ہوسکا۔ یہ اثر سیدھا دماغ پر پڑا اور وہ ہوش کی دنیا سے گم ہو گیا۔ 1958 میں وہ ہوش کی دنیا میں دوبارہ آیا مگر باتوں میں ربط نہ آسکا لیکن شاعری میں وہی گہرائی تھی۔ اسے لاہور کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ یہ مشاعرہ ایوب خان کی زرعی اصلاحات کی مداح سرائی میں تھا۔ اس نے اس مشاعرے میں وہ شعر پڑھا جو بعد میں ضرب المثل ہو گیا۔ "مجھے وطن کے غریبوں کو ڈھانپنے کے لیے... قبائے خواجہ اقلیم کی ضرورت ہے۔" یہیں اس کی ملاقات نیوز ایجنٹ بابو صادق سے ہوئی اور وہ اسے اپنے ٹھیئے پر لے گئے جہاں وہ رات گزارنے لگا۔ اس کے اشعار تو اتر سے نوائے وقت میں چھپ رہے تھے لیکن اسے چین نہ تھا۔ وہ کبھی یہاں تو کبھی وہاں گھومتا رہتا۔ جہاں جگہ مل جاتی وہاں سو رہتا۔ کمبل بچھا کر سوتا اور دن بھر کندھے پر لادے رکھتا۔ اسی بے بسی کی حالت میں اس نے فٹ پاتھ پر سینکڑوں راتیں گزار دیں اور پھر 19 جولائی 1975 کو اس نے بے چارگی میں دم توڑ دیا۔ دنیا والے اسے ساغر صدیقی کے نام سے پہچانتے ہیں جس کا ماں باپ نے نام اختر رکھا تھا۔

☆☆☆

☆عبدالجبار رومی انصاری کا پیام لاہور سے۔ ”آہ...... عمار آزاد دنیا سے بھی آزاد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، باری علیگ منٹو کو بنا گیا اور آخری ملاقات کر کے راہی ملک عدم ہوا۔ عجیب شرارتی بچہ تھا آخر تک اپنی من مانی کرتا رہا اور دنیا میں اپنا نام بنا گیا۔ فلک شیر ملک کی محنت بھی آخر رنگ لے آئی۔ بہت بہت مبارک ہو بھائی۔ یہ تو مد و جزر ہے۔ بھائی کبھی اوپر تو کبھی نیچے، بس لبوں پر مسکراہٹ سجائے رکھیے۔ رانا محمد شاہد کی رقم طرازی اچھی لگی۔ مجی رحمٰن کی جنم بھومی سے محبت لائق تحسین ہے اور آپ جیسے لوگ تو دور رہ کر بھی قریب ہوتے ہیں۔ نزاہت افشاں کا مختصر تبصرہ بھی بے حد عمدہ رہا۔ سلیم رشید کا مکتوب بھی زبردست رہا۔ سید مسرت حسین رضوی آپ اچھا تبصرہ لکھتے ہیں ہمیں تو بہت پسند ہے۔ سدرہ بانو محبتیں بھی تو ایسے ہی بڑھتی ہیں نا جب گلے شکوے بھلا کر پُرخلوص رویے رکھے جائیں اور طاہرہ آپی بھی بہت اچھی ہیں۔ ندیم اقبال کا ای میل اچھا لگا۔ ”شہر خیال“ کی محبتیں بھی سب کے ساتھ ساتھ ہیں۔ آفتاب احمد قیصر وعلیکم السلام، اللہ آپ کو خوش رکھے۔ باقی اعجاز احمد شمار، محمد انعام اور محمد یاسر اعوان بھی مختصراً ٹھیک رہے۔ عالمی برادری فلسطین کی آبلہ پا مسافت کا نکتہ تو تسلیم کرتی ہے مگر ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں، ظلم تو کبھی بھی فاتح نہیں ہو سکتا اور مظلوم فلسطینیوں کی صبح بھی جلد روشن ہوگی۔ زویا اعجاز کی تحریر عمدہ تھی۔ زعفران کی خوشبو اور کھیر کا رنگ مل جائے تو اسے جیبر کہتے ہیں اور جیبر امریکی درندوں کی بھینٹ چڑھ گئی ایسے کیسز ظلم کی عدالتوں میں کیا وقعت رکھتے ہیں؟ جب ظالم حملہ آور ہوں تو اندھیر نگری ہی ہوا کرتی ہے۔ سلمٰی اعوان کا عراقی منظر نامہ افسوس ناک رہا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ پوری دنیا میں مظلوم مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ منظر امام نے ”تاریخ عالم“ پر بڑی جانفشانی سے کام کیا اور وہ مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن آخری حصے میں سارا زور برصغیر کو سمیٹنے میں لگا دیا اگر اس میں بھی پوری دنیا سے تھوڑا تھوڑا مواد شامل کر دیا جاتا تو باقی اقساط کی طرح یہ بھی سپرہٹ ہوتا۔ بہرحال بہت اچھا منظر نامہ پیش کیا۔ تورتنو کے بیچ بسے جھونگوں میں حور پری کی مترنم آواز بھی اچھی لگی۔ سفر نامے میں بھی لفظ لفظ تجسس سے بھرپور ہے، اب دیکھتے ہیں شمشال سے تورتنو کی حیرت کی تان کیونکر ٹوٹتی ہے۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ بہت بہت اچھا جا رہا ہے۔ ویلڈن مبارک باد۔ آتش فشاں میں گر کر زندہ نکل آنا یقیناً ان لوگوں کے لیے معجزہ ہے۔ ورنہ جہنم کدہ تو انہیں نگل گیا ہوتا۔ ”ہم زندہ ہیں“ میں شرلاک ہومز، ٹارزن، عمرو عیار اور الہ دین تو بہت پسندیدہ کردار ہیں۔ باقی بھی اچھے ہیں اور کہانی یا ڈراما فلم وغیرہ میں سامنے آنے پر حقیقت کا ہی گمان ہوتا ہے۔ ”ستمبر کی شخصیات“ میں قائداعظم، ممتاز مفتی، عبدالقادر، نواب زادہ نصر اللہ...... ! تحریر بے حد عمدہ رہی۔ ”ابھی تو میں جوان ہوں“ جواں ہمت لوگ بڑھاپے میں بھی اپنا آپ منوا لیتے ہیں جیسے کہ سو سالہ بچی زہرا سہگل ”ارے میں یہاں ہوں“ بچھڑے سمندر میں ویوین کی آواز تو دب گئی مگر وہ زندہ بچ گئی۔ ”روڈیو“ انسان اور سانڈ کے درمیان خونی مقابلہ خون خشک کر دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ ”بیٹا ماموں کو سلام کرو“ شاہانہ سعید نے بہت اچھا فیصلہ کیا تھا اور اچھا جواب دیا تھا۔ ایک بے زبان کی محبت کا اظہار شیرو نے ڈاکوؤں کی درگت بنا ڈالی اور اپنے گھر والوں پر قربان ہو گیا۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر شیرو کی کہانی بہت اچھی لگی۔ دولت اور شازیہ سے شادی کے نشے میں عارف کی دیوانگی نے اسے جیل یاترا کروا دی اور خان بھی وہیں مطمئن ہوتے ہیں جہاں پُرخلوص رویے ہوں یوں شازیہ ناصر ہو گئیں اور سب جھگڑے ختم۔ اُف پرائز بانڈ کے پانچ فیصد نے پورے کراچی کے چکر لگوا دیے اور بیوی بچوں کے ہمراہ جان کے لالے الگ سے پڑے، توبہ ہے غریب آدمی بھی کوئی اونچے خواب نہ دیکھے۔ بے چارے کو الٹا جان بچانی ہی مشکل ہو گئی۔ ارسلان ”سکورا“ کی خوب صورتی نہ سمیٹ سکا اور اپنے جذبات کا خود ہی خون کر دیا اور پیاری سی گڑیا سومیکا ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔ سرگزشت کی ہر تحریر ہی سپرہٹ ہے۔ باقی تحریروں میں مدو جزر تو ہوتا ہی ہے۔ ”بیت بازی“ سے نفیس نعیم، مظفر انصاری، عنایت مسیح

اور نزابت افشاں کے شعر ٹاپ پر رہے۔"

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے رقمطراز ہیں۔ "ہمیشہ کی طرح اداریے میں معراج رسول صاحب ایک نہایت باریک نقطے کی وضاحت کررہے تھے۔ اصل میں ہماری سوچ ہی ایسی ہے کہ ہمیں کوئی تختی سے پوچھنے والا نہ ہو تو ہماری سمت صحیح ہو ہی نہیں سکتی۔ قانون تو اس وقت بھی ہوتا ہے جب کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ شاید ہماری سوچ کی ایک سطح ایسی بھی ہے۔ یک علمی سرگزشت میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے بارے میں پڑھا۔ ہمارے مشاہیر جن کی ترقی کا زینہ قرآن اور دعا تھی، ان کی ترقی اور آسودگی کی وجہ بھی قرآن سے مدد لینا ہی تھی۔ ان کی جدوجہد کی کہانی پڑھ کر حیرت ہوئی۔ محض 18 سال کی عمر میں اخبار نکالا۔ تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کی ترقی کے لیے سوچنے والے ڈاکٹر سید عبداللہ ہوں یا سرسید احمد خان ایسی شخصیت ہی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ "معبر خیال" میں مجی رحمٰن کا تبصرہ پڑھا۔ خوشی ہوئی کہ دیارِ غیر میں بھی اردو سے محبت کرنے والے اور پاکستانی رسائل پڑھنے والے موجود ہیں۔ مجی صاحبہ! ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق بھی جالندھر سے ہی ہے۔ اپنی یادوں پر مشتمل کوئی بڑی تحریر لکھیں (ہم بڑی تحریر کے منتظر ہیں)۔ سلیم رشید اور سدرہ بانو ناگوری کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ خوشی ہوئی یہ پڑھ کر کہ ندیم اقبال اپنی تحریر کے حوالے سے "معبر خیال" کے باسیوں کا شکریہ ادا کررہے تھے۔ ایک لکھاری کا حاصل اس کے قاری ہی ہوتے ہیں۔ ندیم صاحب آپ اچھا لکھ رہے ہیں۔ ویسے آپ کے سفرنامے "شمشال سے ٹورنٹو" کے اوپر جس شخصیت کا Sketch ہے وہ آپ ہی ہیں؟ (جی ہاں) آفتاب احمد قیصر! بیٹی کے حوالے سے ابتدائی باتیں اچھی لگیں۔ شاید آپ مستقل طور پر کراچی شفٹ ہو چکے ہیں؟ عبدالجبار رومی کو شادی کی مبارک باد۔ مختار آزاد کے حوالے سے لکھا ایک صفحہ سیکڑوں صفحات کا احاطہ کررہا تھا۔ ان کی رخصتی پر جس پیرائے میں آپ نے لکھا حق ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ مختار آزاد صاحب کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے اردو ادب کے بے مثال قلم کار باری علیگ کی زبردست روداد لکھی۔ ان کی تحقیق اور انداز بیاں الگ ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پی ایچ ڈی ہیں؟ (جی ہاں) کشمالہ حسن کی "ہم زندہ ہیں" مشہور و معروف کرداروں کے حوالے سے معلوماتی اور دلچسپ تحریر تھی۔ گو مضمون مختصر تھا۔ تھوڑی تفصیل ہوتی تو تشنگی نہ رہتی۔ صائمہ اقبال جو ہر مہینے کی مناسبت سے مختلف شخصیات پر مختصر مضامین تحریر کرتی ہیں۔ سب سے معلوماتی اور دلچسپ تحریر ہوتی ہے۔ اس دفعہ تین کرکٹرز کا ذکر تھا۔ جب کہ پاکستان کے مایہ ناز اوپنر (عامر سہیل اور سعید انور) پر کچھ بھی نہیں تھا جب کہ دونوں کی پیدائش بھی ستمبر کی ہے؟ (صائمہ اقبال، توجہ دیں) فرزانہ نگہت اور علیم شاہد کی مختصر تحریریں بھی دلچسپ تھیں۔"

☆ سیف اللہ نے ملک وال سے لکھا ہے۔ "ایک صفحہ کے مضمون ادبی درویش میں لائن نمبر 13 میں لفظ کچوکتا کا مفہوم تو آ گیا مگر لغت میں یہ لفظ نظر نہیں آیا (کچوکتا صحیح لفظ ہے۔ فرہنگ میں دیکھیں)۔ لیجیے "معبر خیال" میں سدرہ بانو ناگوری صاحبہ جیسی باریک بین تبصرہ نگار کا تبصرہ میں مرجس کا علم نہ ہوا، میں ان کی کم علمی تو نہیں کہہ سکتا، ہو جاتا ہے ایسے بھی کبھی، کوئی بات نہیں۔ (دراصل گلگت بلتستان میں رہنے والے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امام حسن و حسینؓ سے زیادہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اس لیے ایسے نام رکھتے ہیں)۔ مضمون داستانِ باری میں ڈاکٹر صاحب نے حسبِ روایت باری علیگ صاحب کی تگ و دو، تصانیف، تراجم، آسانیاں پریشانیاں، ساری زندگی کا جس طرح احاطہ کیا ہے یہ انہی کا کام ہے۔ حسان صاحب کی کوشش مسلسل مستقل مزاجی اور پھر اس کا انعام ساری دنیا میں نام۔ یہ سب کچھ بتایا زویا اعجاز صاحبہ نے اپنے مضمون مسیحائے دوراں میں۔ آسمان چپ رہا سلمٰی اعوان کی تحریر اتنی اچھی نہ لگی جتنی اچھی تحریر ان محترمہ کی ہوتی ہے۔ اب پتا نہیں یہ تحریر واقعی تھوڑی نرم تھی یا میں نہیں سمجھ سکا۔ منظر امام صاحب نے آخر "تاریخ عالم" کی آخری قسط تحریر کرکے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ ندیم اقبال کی تحریر "شمشال سے ٹورنٹو" میں نئے نئے کردار سامنے آرہے ہیں جو کہ مضمون کو چار چاند لگا رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ندیم اقبال کی تحریر پڑھنے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیتی ہے۔ مضمون ختم ہونے تک قاری تحریر کی گرفت میں رہتا ہے۔ سفرنامہ اور ایسا سحر آفرین جواب نہیں۔ شکیل صدیقی کا مضمون جنم کدہ انسانی کوشش اور مشکل وقت میں حوصلہ رکھنے کی اچھی مثال ہے۔ کشمالہ حسن صاحبہ کی تحریر "ہم زندہ ہیں" بہت اچھی لگی۔ "ستمبر کی شخصیات" میں صائمہ اقبال صاحبہ نے حسبِ سابق کئی اعلیٰ شخصیات کا تعارف اپنے مخصوص انداز میں کرادیا۔"

☆ نزابت افشاں کی مہورہ فتح جنگ سے شرکت۔ "یک علمی سرگزشت میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے بارے میں پڑھا بہت اچھا لگا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بابائے اردو کے بعد قومی زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ ان کا مضمون "میرا اور میں" ہمارے بی اے کے نصاب میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کسی بھی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے اس میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ تُو اور میں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ "داستانِ باری" بہت پُراثر تھی۔ باری صاحب جیسی ہستیاں اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ "معبر خیال" میں فلک بھائی، قیصر خان، اویس شاہ، انور عباس، سلیم رشید، سید مسرت حسین رضوی، اعجاز احمد اپنے خوب صورت تجزیوں کے ساتھ حاضر تھے لیکن شدت سے کمی محسوس ہوئی اپنی ایڈیٹر مسز طاہر وگزار آپی کی۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس معیاری رسالے کا قاری ہوں۔ اللہ پاک مختار آزاد کو جنت الفردوس

میں جگہ دے۔ کہانیوں میں مسیحائے دوراں، آسماں چپ رہا، شمشال سے ٹورنٹو سب ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ ''جواب'' اچھی کہانی تھی۔ شاہانہ نے ظہیر کو اچھا جواب دیا۔ ''دیوانگی'' بھی سبق آموز تھی۔ عارف بہت گھٹیا کردار کا آدمی تھا۔ شکر ہے شازیہ کی شادی ناصر سے ہوئی۔ عارف جیسے کردار والے آدمیوں ہی کی وجہ سے میری آپی طاہرہ گلزار مردوں کو اپنے نشتر چبھوتی رہتی ہیں۔ ''سراب'' اچھی جارہی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری۔ محمد عزیز مے ''کیفیت مے'' سے نکلیں اور اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ بشریٰ افضل اور طاہرہ سسٹر آپ کی غیر حاضری ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ تمام قارئین کرام کو سلام عقیدت۔''

☆ احمد خان توحیدی نے راولپنڈی سے لکھا ہے۔ ''شمارہ ستمبر راجا بازار سے ملا۔ اسٹیل مل سے ریٹائرمنٹ لے کر ہم کراچی سے مستقل راولپنڈی آگئے۔ سرگزشت، سسپنس، جاسوسی اور پاکیزہ سے ریٹائرمنٹ کا ارادہ نہیں ہے (یہ خوش آیند خبر ہے کہ محفل کی زینت بنے رہیں گے) مکان کا کام اور دیگر امور کے طویل وقفے سے محفل میں شرکت نہ کرسکا۔ سب ساتھی بھول گئے۔ یک صفحہ ادبی درویش محنت سے مقام حاصل کرنے والے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے بارے میں پہلے بھی مفصل پڑھا ہے۔ پلیز یک صفحات کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دیں۔ یہ ادبی دنیا پر ایک احسان ہوگا۔ محفل ''معمہ خیال'' میں فلک شیر کو کرسیٔ صدارت مبارک اچھا تبصرہ تھا۔ سب ساتھیوں نے بیٹی کے رحمت ہونے کا تذکرہ کیا، بیٹی واقعی اللہ کی رحمت ہوتی ہے، ماں باپ کی آنکھوں کی چاند تارا، بہن ہے تو بھیا پر واری، بیوی کے روپ میں مجازی خدا کی دلاری۔ سسٹر نجمی رحمٰن امریکا میں رہ کر بھی آپ کو ہجرت سے پہلے چار سال کی عمر میں دریا میں پاؤں ڈالنا یاد ہے۔ یعنی 70 سال کی عمر میں سرگزشت کی محفل میں شرکت، مبارک باد کی مستحق ہے۔ اللہ صحت کاملہ کے ساتھ شریک رکھیں (آمین ثم آمین)۔ بھائی محمد انعام لودھراں، لڑکیوں کے بارے میں اتنا کہوں گا بعض رقم بٹورنے کے چکر میں ماہر ہوتی ہیں۔ یہ سو فیصد درست ہے، میں خود بری طرح شکار ہوچکا ہوں۔ لاہور لیبارٹری میں کام کرتے ہوئے لڑکیوں سے جان پہچان ہوتی۔ کچی مسئلے پر خود گھر آنے کا اصرار کیا، رقم کی ضرورت تھی۔ وقتی مدد کی بعد میں انہوں نے تین شادیاں میری رقم سے کیں۔ لڑکی کا رشتہ کوئی لیتا نہ تھا۔ میں نے سیالکوٹ کی فیملی میں شادی کرادی۔ تین بار کراچی سے لاہور سیالکوٹ اپنے خرچے پر کیا اور وقت ضائع کیا۔ بے بی سسٹر طاہرہ گلزار پشاور، آپ کے ساتھ محفل میں خوب نوک جھوک رہتی ہیں۔ ماشاءاللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ مرد و عورت کی ازدواجی زندگی سنت نبویؐ ہے۔ غور فرماکر اچھا ساتھی رفیق زندگی بنالیں۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے اچھے ہیں۔ آہ مختار آزاد مرحوم از زندگی بھر آزاد منش طبیعت، زندگی سے آزاد ہوگئے۔ اللہ رحمت فرمائیں۔ طویل کہانیاں میں ڈاکٹر ساجد امجد کی ''داستانِ باری'' لاجواب اسٹوری تھی۔ زویا اعجاز کی ''مسیحائے دوراں'' اچھی تحریر تھی۔ سلمیٰ اعوان کی ''آسمان چپ رہا'' یہاں تو آئے دن بے گناہ معصوم دھماکوں کی نذر ہوتے ہیں۔ پھر بھی آسمان مکمل سکوت میں ہے۔ واہ بھئی منظر امام ''تاریخ عالم'' ملکی سیاستدانوں کے اقتدار کا خوب صورت حوالہ دیا۔ صائمہ اقبال کا ''ستمبر کی شخصیات'' اچھا سلسلہ ہے جاری رکھیں۔ سفرنامہ لاجواب سچ بیانیاں میں ''جواب'' شاہانہ کا ظہیر کو اپنے بچے کو ماموں کو سلام، سو فیصد اچھا جواب تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک...... حسین لڑکی موجود پھر بھی دوست کی بیوی جو بہن بھائی کے مقدس رشتے میں ہوتی ہے۔ ظہیر کی کم ظرفی اور کمینہ پن ہے۔ ''شیرو'' اف ہائے کاش ہم انسان بھی اللہ کی نعمتوں کا ایسے ہی شکر ادا کریں جیسے شیرو نے لازوال قربانی دی۔ ''دیوانگی'' عارف اور اس کی ماں جیسے لالچی۔ بے ضمیر لوگوں کا ایسا ہی حال ہونا چاہیے۔ شازیہ کا ناصر کے حق میں اچھا فیصلہ ہے۔ ''قائیو پرسنٹ'' میں اختر کے دوست کے بانڈ کا نمبر نوٹ کر کے نمک حرامی کی ایسے اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتانا چاہیے۔ جس بڑے صاحب نے فائیو پرسنٹ پر بانڈ لیا یقینا جاگیردار وڈیرہ سیاستدان ہوں گے، اس نے خود ہی کھٹ ڈالا ہوگا۔ یہ ملکی لیڈران کا شیوہ ہے۔ ''مسافر'' اشعر کو واپسی میں تاخیر ضرور ہوئی مگر اچھا فیصلہ تھا۔ اشرف عباسی تو دوسرا مسافر تھا۔ باقی سچ بیانیاں اور طویل کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی کراچی سے خیال آفرینی۔ ''معمہ خیال'' میں خوب صورت خط کے ساتھ فلک شیر کو اولیت مبارک۔ قیصر خان گمشدہ دوستوں کو یاد کر کے ہم میں سے بہتوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ شاہد حسین، عبدالرزاق، رضا زیدی اور محمد یاسر اعوان اپنی اپنی تحریر مسترد ہونے پر بھی اپنی مشق جاری رکھیں اگر ہو سکے تو پہلے چھوٹے بڑے مراسلے آرٹیکل واقتباسات پر مشق کریں۔ ''معمہ خیال'' میں شامل آپ کے خطوط آپ کی لکھنے کی صلاحیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تک کے ندیم اقبال کو اپنے درمیان پاکر خوشگوار حیرت ہوئی، ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ۔ مختار آزاد کی رحلت پر دلی تعزیت خدا انہیں غریق رحمت کرے، (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے برصغیر پاک و ہند کے کئی ادبی شہسوار سے ہماری ملاقات کروائی ہے۔ غلام باری علیگ بھی ان میں ایک ہیں جنہیں اقتصادی مقتل گاہ میں اپنے نظریات، انا اور خودداری کا خون دینا پڑا۔ مفلسی کا عفریت تو ہوتا ہی ضمیر کو نگلنے کے لیے ہے۔ مدافعت میں کمزوری اس کا شکار بناتی ہے۔ الحروب نے قابل ترین مصلحہ کا بین الاقوامی اعزاز جیت کر اہلِ وطن کو سرخرو کیا۔ اپنے شوہر عمر الحروب کی قربانیوں کے بغیر شاید وہ ایسا نہ کر پاتی۔ ''آسمان چپ رہا'' بھی وطن پرستی میں عزت و جان وار دینے والی ایک دوشیزہ ہی کی تھی، قابل فخر دوشیزہ جو وطن کی محبت میں عزت و جاں ہار کر بھی سرخرو ہوئی۔ عرب ریاستوں کے فرمارواؤں کی قوم پرستی کے فرار دوں سے ان کی نسلیں کیا عذاب بھگت رہی ہیں۔ مجیر خاتون جیسے

## ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L ـ 5 / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

واقعات سے ان کی تاریخ بھری جارہی ہے۔ کویت کے معاملے میں صدام حسین کی شروع کردہ خلیج جنگ سے بھی کسی حکمران نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ نتیجے میں خود عراق پھر شام، بحرین، یمن اور فلسطین میں کیا کچھ ہوا اور ہو رہا ہے یہ سب عرب حکمرانوں کی دشمنوں سے دوستی کی خواہش کی وجہ ہے۔ ''تاریخ عالم'' ادبی تاریخ میں منظر امام صاحب کو سرخرو کر کے سرخرو ہو گئی، ویلڈن۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔ ''جہنم کدہ'' بہت ہی پرتجسس تھی۔ فلمی کیمرا مین کرس ڈوڈی کے ایڈونچر نے اس کے ساتھیوں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی۔ بھلا جان بوجھ کر بھی کوئی جہنم کدے میں کودتا ہے۔ ''ہم زندہ ہیں'' کشمالہ کا بہت ہی سیر حاصل مضمون تھا۔ تمام معنوی زندہ کرداروں سے ہماری آشنائی ہے۔ ان سب کو ایک جگہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ اگر عمرو عیار معنوی کردار ہے تو اس کے بادشاہ امیر حمزہ اور اس داستان کے بھی کردار افسانوی ہی ہوئے ناں؟ (جب معنوی کردار گھڑا جاتا تھا تو مرکزی کردار کے قریب کا کردار سچا لیا جاتا تھا)۔ ''ستمبر کی شخصیات'' میں قائداعظم، ممتاز مفتی کے بعد اعتزاز احسن شاندار شخصیت تھے۔ زہرہ سہگل واقعی بچی فنکارہ تھیں۔ سو سالہ بچی کا لاحقہ واقعی ان پر بہت جچتا تھا۔ اے آر رحمان بھی کامیابی کی اوج ثریا چھو رہے ہیں، آسکر ایوارڈ کا اعزاز، ان کے حصے میں بھی آیا۔ ''بپھرا سمندر'' اور ''روڈیو'' مناسب ہیں۔ ''سراب'' کاشف زبیر کے ہم عصر لکھاری کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے، آپ جو بھی ہیں خوب ہیں۔ بہت عمدہ لکھ رہے ہیں۔ سچ بیانیوں میں صرف ''جواب'' پڑھی ہے اور شاہانہ کے آخری فیصلے پر خوش بھی ہوئے۔''

☆ غلام حسین ضیاء بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''اس شمارہ میں محترمہ زویا اعجاز اور محترمہ سلمٰی اعوان نے اقوام مسلم کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کاش کہ یہ قوم اپنے ماضی کی شاندار روایات کو دوبارہ اجاگر کر کے غیر مسلم اقوام سے بھیک نہ مانگے۔ 1947ء میں ہمیں جو آزادی ملی تھی وہ آزادی کہاں چلی گئی؟ اب تو بچوں کی تدریسی کتب سے بھی اسلام کا صحیح منظر نامہ ہٹا دیا گیا ہے۔ ہر طرف فرقہ بندی اور گروہ بندی کی سیاست ہے۔ ایک مذہب، ایک خدا اور ایک قرآن۔ پھر مسلم ایک کیوں نہیں ہوتے؟ (خود ہماری اپنی کمزوری ہے)۔ محترمہ زویا اعجاز نے ''مسیحائے دوراں'' کے عنوان سے اور محترمہ سلمٰی اعوان نے ''آسمان چپ رہا'' کے عنوان سے فلسطین اور عراق کی مقتل گاہوں سے غاصبوں کے ظلم و بربریت کا نشانہ بننے والے مظلوم مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے ان کی نشاندہی فرمائی ہے۔ محترمہ زویا اعجاز نے بڑی تفصیل سے مظالم کی منظر کشی کی ہے اور محترمہ سلمٰی اعوان نے عراق کی تباہی اور ظلم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سلمٰی صاحبہ! جہاں غیر ملکی ٹینک گولے برسا رہے ہوں، جہاں حکومتی افراد کا بھی نہ پتا ہو کہ وہ کہاں چھپ گئے وہاں عراقی خواتین کی چیخیں کون سنتا ہے۔ کسی ملک میں جب غیر ملکی فوجیں گھس جاتی ہیں تو وہاں سول قانون معطل ہو جاتا ہے۔ غیر ملکی فوجی کو کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی جس کے پاس لوڈڈ گن موجود ہو۔''

☆ اویس شیخ کی آمد ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''اداریہ کی کہانی ''ضابطۂ حیات'' کے گرد گھوم رہی تھی۔ اگر یہ لفظ معنوی اعتبار سے ہمارے اذہان و قلب راسخ ہوتا تو ہمارا یہ حال ہرگز نہیں ہوتا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ ''ادبی درویش'' کی مختصر روداد پڑھنے کے باوجود تشنگی ابھی باقی ہے۔ ''معتبر خیال'' کو جوائن کیا۔ فلک شیر کرسئ صدارت پر حاضر تھے۔ بہترین نامہ تھا۔ م انور صاحب! یہ صحت مخالف کی مخالفت نہیں بلکہ دل پر لگی چوٹ کا اثر ہے۔ روحی بھائی! شادی کی مبارک باد۔ آفتاب احمد، رانا شاہد، مسرت رضوی، سدرہ اور قیصر خان کے خطوط بہترین ہیں۔ طاہرہ گلزار اور عمران جونانی سے درخواست ہے محفل میں باقاعدگی سے شرکت کیا کریں۔ آپ سدرہ بہن کی مستقل مزاجی سے تھوڑا بہت سیکھ لیں۔ مختار آزاد بھی چلے گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ''داستان یاری'' پڑھی۔ ادب کی دنیا کا محترم نام جس کے گزرے حالات و زیست فسوں خیز تھے۔ ان کی شخصیت کا منفی پہلو کہ وہ بھی پینے کے عادی تھے۔ اشتراکیت کا مطلب اور اس کے حامی دیگر مصنفین کا ذکر معلوماتی تھا۔ ''مسیحائے دوراں'' پڑھی۔ وہ شمع روشن اپنی لگن محنت اور انتھک کوششوں سے پوری دنیا کے لیے بے مثال بن گئی۔ انسانوں کو پنجرے میں بند کیا جاسکتا ہے مگر ان کی سوچوں پر قفل نہیں لگائے جاسکتے ہیں۔ کہانی کا مدعا یہی تھا۔ ''آسماں چپ رہا'' میں عراقی خاندان کی کتھا المناک تھی۔ نامعلوم کتنے ہزاروں خاندان امریکی درندگی کی بھینٹ چڑھے اور اب مسلمانوں کی نسل کشی کے لیے دشمن قوتیں ایک ہو چکی ہیں لیکن عالم اسلام کی باہمی چپقلش اور نا اتفاقی ہنوز برقرار ہے۔ منظر امام صاحب کو ڈھیروں مبارک باد۔ ان کی کاوش علم کا خزانہ تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے مصنف قسمت کے دھنی ہیں ان کا نام بطور لکھاری سرگزشت جیسے بڑے پرچے میں رقم ہوا، بہت اعلیٰ تحریر ہے۔ ''جہنم کدہ'' میں پرخطر شوٹنگ کا تذکرہ تھا۔ ''ہم زندہ ہیں'' کرداروں کا ذکر معلومات کا اضافہ بنا۔ ''ستمبر کی شخصیات'' میں کرکٹرز کی بھرمار تھی جو بالکل پسند نہیں۔ ''بپھرے سمندر میں'' اور ''روڈیو'' جیسی مہم جوئیوں میں جانے کے لیے ایک خاص اسٹیمنا چاہیے ورنہ شوقیہ جانے کی غلطی موت کے کنوئیں میں دھکیل سکتی ہے۔ سچ بیانیوں میں ''جواب'' تبصرے کی محتاج نہیں۔ شاہانہ نے اعلیٰ ظرفی، پختہ خیالی اور وسیع نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو لفظوں کا عہد نبھا کر مشرقی بیوی ہونے کا رول ادا کیا۔ سب سے بڑی بات وہ پیکر وفا کھلونا نہیں بنی۔ اس کی یہی امتیازی خوبی تھی۔ ''شیرو'' لطیف احساس اور مدھر جذبات میں گندھی بہت ہی خوب صورت کہانی تھی، پڑھ کے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''دیوانگی'' پسند نہیں آئی۔ ''قاعدہ پر سمندر'' میں ہمارے اخلاقی انحطاط کی جھلک نظر آئی۔ کیا یہ بات ہمارے لیے باعث

شرم نہیں کہ ہم اپنے ہی دوستوں، کولیگز، رشتے داروں اور پڑوسیوں کی ترقی سے جل کر حسد اور بغض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی بگاڑ کی اصل وجہ ہے۔ ’’سکورا‘‘ پڑھی۔ دورِ حاضر کا المیہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل اب محبت کو مخصوص فعل اور مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے حالانکہ محبت میں ایک دوسرے کے احساسات کی قدر کی جاتی ہے نہ کہ دوسروں کے جذبات کو اپنی ہوس تلے روندا جائے۔ میرے ہم پیشہ ور ’’مسافر‘‘ کو ضرور فلم میکر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اسٹوری منفرد بھی تھی اور تجسس سے بھرپور بھی۔ ’’احساس برتری‘‘ دکھ بھری داستان تھی۔ صوفیہ کے فیصلے نے کہانی کو جنم دیا جو قابلِ ستائش اور دانشمندانہ تھا۔ ’’مہلت‘‘ حقیقت سے قریب ترین کہانی ہے۔ اس طرح کے تلخ و شیریں الجھاؤ بھی انسانی حیات کا حصہ ہوتے ہیں۔ جسے انسان کبھی نہیں بھولتا۔ ’’حسن کے میلے‘‘ پڑھی۔ اس کہانی میں کئی پہلو تھے۔ اولاد کی محرومی کا کرب، آشفتگی کی انتہا پر بچے کو اغوا کرنا اور جس ماں نے جنا مگر دوسری نے پرورش کی لیکن دونوں کی محبتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ معاشرتی حقائق سے آراستہ زبردست کہانی تھی۔‘‘

☆ سید مسرت حسین رضوی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ’’معراج رسول صاحب کی کہانی پر تبصرہ طویل ہو جائے گا اس لیے صرف اتنا ہی تحریر کروں گا کہ اس نئی نسل کے دور میں کسی سے کوئی اُمید باندھی نہیں جا سکتی جس نسل کو اچھے برے دوست دشمن کی سدھ بدھ نہ ہو۔ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ میں ندیم اقبال صاحب کے قلم سے کینیڈا میں جو مشکلات ہیں پڑھ کر ایک ایک بات کا علم ہوا کہ سروس جاب حاصل کرنے کے لیے کیا کیا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سفرنامہ اچھا لگا۔ سچ بیانی میں ’’جواب‘‘ شاہانہ سعید نے بہت مدلل نپا تلا جواب ظہیر کو دیا۔ سعید جیسے شوہروں کو ایسے دوست دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ ’’شیرو‘‘ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شازیہ ناصر کی سچ بیانی ’’دیوانگی‘‘ شازیہ ناصر نے پلاننگ کے تحت جو قدم اٹھایا اچھا تھا پسند آیا۔ اختر شہاب کی سچ بیانی ’’فائیو پرسنٹ‘‘ ایسے واقعات بونڈ رکھنے والوں کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں لہٰذا موجودہ دور میں یہ ضروری ہے کہ اپنے سایہ پر بھی بھروسا نہ کریں۔ ڈاکٹر شمیم احمد کی سچ بیانی جسارت کی سزا تو ملنی تھی‘‘ اس لیے بزرگ کہتے ہیں باہر جا کر جذبات قابو میں رکھے جائیں۔ اشرف عباس کی سچ بیانی دل کو لگتی ہوئی کہانی ہے، واقعی جو بچے مسافر ہوتے ہیں وہ واپس ضرور آتے ہیں وعدے کے مطابق صوفیہ کی سچ بیانی ’’احساس برتری‘‘ مردوں میں برتری کا احساس زیادہ ہوتا ہے لیکن اگر خوف خدا آ جائے تو بہترین مرد ثابت ہوتا ہے۔ صوفیہ کی ذہانت نے گھر برباد ہونے سے بچا لیا یہ صوفیہ کی زندہ دلی ہے۔ دانیہ صدیقی کی سچ بیانی ’’مہلت‘‘ خواب ہی میں علم رویہ کا الہام ہوتا ہے اور انسان ماضی سے حال میں آتا ہے۔ اظفر علی کی سچ بیانی ’’حسن کے میلے‘‘ کہانی بہت دلچسپ ہے اس کو انعام ضرور ملنا چاہیے۔ اظفر علی آپ کی کہانی پر واقعی فلم بن سکتی ہے۔ مشورہ ہے کہ فلم میکر سے بات کریں اور یہ اچھا کیا کہ اپنی پالنے والی ماں کے پاس آ گئے حقیقی رشتے ایک دفعہ گم ہو جائیں تو بعد میں سوائے نفرت کے کچھ نہیں ملتا۔ میں نے بھی ’’ایک حقیقت‘‘ کے نام سے واقعہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے (الفاظ کو سجانے کے لیے ابھی آپ اساتذہ کی کہانیاں پڑھیں)۔ عزیز ترین شامل محفل فلک شیر، قیصر خان، شاہد حسین، عبدالرزاق، رضا زیدی، م انور، رانا محمد، یحییٰ رحمن، نزاہت انشال، اویس شیخ، انور عباس شاہ، پرنس فاروق احمد، سلیم رشید، حنیف ادیب، سدرہ بانو ناگوری، ندیم اقبال، عبدالجبار رومی انصاری، فہیم احمد عباسی، سفید اللہ ملک، آفتاب احمد، نصیر اشرفی، اعجاز احمد سحار، محمد انعام، محمد یاسر صاحبان کو سلام شوق۔ مختار آزاد مرحوم ہوئے، اللہ مغفرت فرمائے۔ (آمین)۔‘‘

☆ قیصر خان بھکر سے خوشا چیں ہیں۔ ’’اداریہ ایک تلخ سچ تھا ہم کس منہ سے حاضر ہوں گے۔ قرآن کے احکامات سے دور ہوتے جا رہے ہیں جو ذلالت کا باعث بن رہا ہے۔ ’’ادبی درویش‘‘ کی محنت کا پتا چلا وہ ایک محسن قوم تھے۔ ’’معیرِ خیال‘‘ میں دوست حاضر تھے ملک شیر صاحب کو مبارک باد۔ جو غیر حاضر ہیں ان میں آپا جان ڈاکٹر صاحبہ، معظم علی بنوں، رضا بھکر، خالد صاحب ملتان وغیرہ کے تبصروں سے محروم رہے۔ اس بار پھر ہم سب کی نئے دوست سے ملاقات ہوئی بہت خوشی ہوئی۔ سب کو میری طرف سے عید مبارک۔ ڈاکٹر ساجد امجد اپنا قلم کا جادو چلا رہے ہیں اللہ انہیں سلامت رکھے۔ غلام باری علیگ جیسے ادیب گر کے حالات واقعات بہت خوب صورت الفاظ میں ہمیشہ کی طرح بیان کیے۔ زویا اعجاز صاحبہ بہت خاص مضمون کے ساتھ علم کی اہمیت اور نظام پر مضمون تھا۔ منظر امام صاحب نے ’’تاریخ عالم‘‘ کا بہت خوب صورت خاتمہ کیا سب کی سب بندہ ناچیز کو حفظ ہو گئی ہے بہت خوب صورت تاریخ بیان کی ہے آگے بھی درخواست ہے اچھوتے انداز میں اپنے مطالعہ سے ہمیں بہترین معلومات دیں اللہ آپ کو سلامت رکھے، آمین۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ پہلے محبت کے مضامین کے ساتھ تھیں اب تو آپ نے دکھی کر دیا واقعی آسمان پھٹا نہیں۔ اللہ ظالموں سے نجات دے گا۔ ہمیشہ کی طرح ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ کی یہ قسط بھی بہت خوب رہی۔ ندیم صاحب تسی گریٹ ہو ویلڈن جی۔ مزا آ رہا ہے آپ کا سفرنامہ پڑھ کر۔ کاش آپ سے ملاقات بھی ہو سکے؟ صائمہ اقبال صاحبہ نے گرویدہ بنا رکھا ہے ان کا یہ مضمون بہت پسندیدہ مضمون ہے۔ انور فرہاد جی بہت خوب صورتی سے علی سفیان انکل کا سلسلہ جوڑے ہوئے ہیں۔ جاندار مضمون لکھنا ان کا خاصہ ہے۔ پہلی سچ بیانی میں شاہانہ صاحبہ نے بہت خوب صورت جواب دیا جو کہ ہر مشرقی لڑکی کو شوہر سے وفاداری کرنا۔ ’’شیرو‘‘ بیل تو جانور تھا جنہوں نے اس کو گولیاں ماریں ان کو جانور کہنا جانور کی توہین ہوگی۔ ’’دیوانگی‘‘ نام غلط ہے لالچ یا ہوس نام ہونا چاہیے تھا۔ پتا نہیں دولت کی زیادتی سے کیا مل جاتا ہے۔ ’’سکورا‘‘ ڈاکٹر صاحب

محبت ہوتی تھی لگتی ہے۔ آپ کو ہوگئی اور پھر آپ نے شیطان سے دوستی کرکے کھودی۔ "مسافر" قسمت میں منزل نہیں تھی ورنہ آپ نے حق ادا کردیا تھا۔ "من کے میلے" یہ اخلاقیات کون سی ہیں مجھے سمجھ نہیں آئی۔ بڑی کوٹھیوں والے امیر لوگ اخلاقیات کہتے کسے ہیں؟ کسی اپنے کو نیچا دکھانا، اظفر نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ روسو کی بائیوگرافی اگر پڑھنی ہو تو کس نام سے مل جائیں گی (روسو پر ساجد امجد نے "روشن خیال" کے عنوان سے جولائی 2004ء میں لکھا تھا)۔"

☆ انور عباس شاہ کا مکتوب دریا خان بھکر سے۔ "مختار آزاد کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ خداوند کریم ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ "معتبر خیال" میں فلک شیر ملک کرسی صدارت پر تھے۔ بھکر سے قیصر خان اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ شاہد حسین اور عبدالرزاق صاحب ہمت نہ ہاریں۔ مزید کہانیاں لکھ کے بھیجیں۔ ندیم اقبال کا خط بھی متاثر کن تھا۔ اس دفعہ طاہرہ گلزار سلیم قیصر بھی غیر حاضر تھے۔ ان سے گزارش ہے کہ حاضری ضرور دیں۔ علاوہ ازیں ہمیں جناب شاہد جہانگیر شاہد کی کمی شدت سے محسوس ہوتی رہے گی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر "داستان یاری" ایک جادو اثر تحریر تھی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" نہایت ہی دلچسپ انداز میں اپنے سفر کی جانب رواں دواں ہے۔ اس قدر دلچسپ تحریر پیش کرنے پر ندیم اقبال صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ "سکورا" ایک منفرد انداز کی نرالی تحریر تھی۔ ارسلان نے سومیکا کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اسی لیے وہ بے چاری شرافت سے منہ موڑ کر چلی گئی۔ اب تو "سراب" دن بدن نکھرتی جارہی ہے اور یہ ہمیں پہلے سے زیادہ عزیز لگنے لگی ہے۔ محفل شعر و سخن کا سلسلہ بھی زبردست جارہا ہے۔ سلجھے ہوئے بہن بھائیوں کے اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔ دنیا جہاں کی معلومات سے بھرپور سلسلہ "تاریخ عالم" کا آخری حصہ بھی اپنی مثال آپ تھا اس سلسلے نے ہمیں بہت کچھ دیا اور ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ منظر امام صاحب کے ہم بہت شکر گزار ہیں۔ محمد ظفر حسین کی بھی ہر تحریر سپرہٹ ثابت ہوتی ہے۔ ان کی تحریر میں بڑے شوق سے پڑھتا رہتا ہوں ان کی بھی تعریف نہ کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔ اس دفعہ شکور پٹھان صاحب غیر حاضر تھے جو کہ ہم نے بہت محسوس کیا۔"

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی بھکر سے آمد۔ "ڈاک کی مہربانی سے پرچہ بروقت ملتا نہیں اور مجھے تاخیر سے موصول خطوط کی فہرست میں اپنا نام دیکھنا گوارہ نہیں اس لیے خطوط کی محفل سے دور دور ہوں لیکن احباب کا مسلسل پکارنا رد کرنا بے ادبی ہے۔ اس لیے انگلی کٹا کر شہداء میں شامل ہونے کے مصداق چند سطر حاضر ہیں۔ لکھنا تو بہت ہے لیکن گزشتہ شمارے پر اظہار خیال مدیر کو نا گوار گزرے اس ڈر سے نہیں لکھ رہی ہوں۔ "تاریخ عالم" زبردست ہے اور "شمشال سے ٹورنٹو" کا تو جواب نہیں۔ اس سفرنامے نے قسط وار کہانیوں جیسی دلچسپی پیدا کردی ہے۔ جملے کا خوب صورت استعمال اور کہانی جیسا تجسس بھرا انداز اس خوبی نے گرویدہ کردیا ہے۔"

☆ عبدالغفار فردوس نے ایبٹ آباد سے لکھا ہے۔ "27 جولائی بروز بدھ روڈ ایکسیڈنٹ میں سری بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی گاڑی سے حادثہ ہوا۔ وہ تو بھاگ نکلا۔ لوگ مجھے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ دو ہفتے اسپتال میں رہنے اور آپریشن کے بعد ڈسچارج ہوکر گھر آیا۔ قارئین سرگزشت سے التجا ہے کہ وہ میرے لیے دعا کریں کہ میں دوبارہ سے ٹھیک ہوکر جاب کرسکوں۔ حالت ایسے نہیں کہ کچھ لکھ سکوں پر ادب سے محبت اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کی عادت سے مجبور ہوکر لکھ رہا ہوں۔ شمارہ اگست میں ہم شامل احوال تو تھے پر بیت بازی میں ہماری انٹری غائب تھی۔ کہانیوں میں شیرو، مہلت، من کے میلے بہترین کہانیاں تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ پہلے بھی ادارہ سے ریکوئسٹ کی تھی اب پھر کررہا ہوں کہ پلیز پُراسراریت پر ہر ماہ کوئی نہ کوئی مضمون دیا کریں۔"

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل ڈیرہ اسماعیل خان سے رقمطراز ہیں۔ "تقریباً دو سال کے بعد خط لکھنے کی جسارت کررہا ہوں۔ قیصر خان آف بھکر کے پُرخلوص اصرار پر "معتبر خیال" میں شامل ہورہا ہوں۔ میں ممنون ہوں کہ اس ناچیز کو آپ نے خلوص سے یاد رکھا گیا اور میرا نام "معتبر خیال" میں چھپتا رہا۔ ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ "شمشال سے ٹورنٹو...." دلچسپ جارہا ہے۔ ویلڈن ندیم اقبال صاحب۔ آپ کے مزید دلچسپ سفرنامے پڑھنے کے خواہش مند ہیں۔ "متبرک شخصیات" پڑھی۔ بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی تحریر تھی۔ ہر ماہ زیادہ سے زیادہ شخصیات کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ سلسلہ بہت دلچسپ ہے اس کو جاری رہنا چاہیے۔"

☆ اعجاز حسین ستھار کی آمد نور پور تھل سے۔ "مختار آزاد کی موت کا افسوس ہے ہم محض ان کے نام سے واقف ہیں وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ ادبی سفر کہاں سے ابتدا کی اور ادارہ کی طرف کون لایا۔ کافی تشنگی محسوس ہوئی۔ بس ایک روایت نبھائی گئی ہے (پہلے تو صرف تین سطر میں جایا کرتی تھی اس روایت کو توڑا گیا اور کاشف زبیر محی الدین نواب سے مختار آزاد تک سب کے لیے صفحہ مختص کیا گیا)۔ ایک وقت تھا جب ورق گردانی کرتے ہوئے نظر یہ علمی الف لیلہ پر جا ٹھہرتی تھیں۔ اب اس کی کمی انور فرہاد کی اہم شخصیات پورا کررہی ہیں اور یہ سلسلہ انتہائی دلچسپ جارہا ہے۔ ہر ماہ ایک تجسس سا رہتا ہے اور مختصر پیرائے میں پسندیدہ شخصیت کا احوال پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ "ہم زندہ ہیں"

بھی قابل توجہ رہی۔ پاکستانی تاریخ کے حوالے سے ”تاریخ عالم“ نے لفظ لفظ پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ آخری حصہ دلچسپ اور معلومات لیے ہوئے ہے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ گو ایک پیشہ ور فوٹو گرافر کے پردیس میں گزرے روز و شب کا قصہ ہے لیکن انہوں نے کمال مہارت سے ترتیب دے کر سفر نامہ کی شکل دی ہے جو پڑھنے والے کے لیے واقعی رہنمائی کا ذریعہ بن گیا ہے اور پڑھنے کا الگ مزہ ہے پھر مختلف کرداروں کی عادات، مزاج اور گفتگو نے دلچسپ صورت حال پیدا کر دی ہے جس کے لیے ندیم اقبال مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ”روڈیو“ سے ہم تھرل اور ایڈونچر کی توقع کر رہے تھے۔ بھاگ دوڑ، خون اور زخمی ہونے کی فلم چلنے لگی تھی لیکن دو صفحوں میں سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔ ”سراب“ پر مصنف کی مکمل گرفت ہے۔ وہ کرداروں کی سابقہ معروفیات، عادات اور نوک جھوک کو ساتھ لے کر واقعات کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ضرورت کے مطابق نئے کردار بھی شامل کر رہے ہیں۔ مرجس اس کی ایک مثال ہے۔ اب کہانی سمیٹنے کی بجائے آہستہ روی سے چلا رہے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی بھی لوٹ آئی ہے اب کہانی خوش اسلوبی سے اپنے انجام تک پہنچے گی اب زور زبردستی والی بات نظر نہیں آتی۔ یہ اچھی روایت قائم ہو رہی ہے۔ جس کے لیے پڑھنے والوں کے صبر، حوصلہ اور پڑھنے کے شوق کو داد دینا ہو گی۔ سچ بیانیوں میں ”جواب“ شاہانہ نے ظہیر کو صاف انکار کر کے اپنا دامن بدنامی، بدعہدی اور بے وفائی سے بچا لیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں وہ غلط سمت چل رہی تھی۔ اس نے جس طرح ظہیر کا ساتھ دیا، تحفے وصول کیے اور ہوٹلوں میں مہنگے کھانوں کا مزہ لیا ایک ذمہ دار شریف بیوی کو بھلا یہ کب زیب دیتا ہے۔ ”شیرو“ بڑی دلچسپ کہانی ہے لیکن آخر میں دکھی کر گئی۔ شیرو بہادروں اور وفاداروں کی طرح مالکوں پر جان قربان کر کے امر ہو گیا پھر ظفر حسین صاحب نے جانور کے قد و قامت، رنگ، نقش و نگار، عادات اور اٹھنے بیٹھنے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ کمال کی ہے۔ میں اس منظر نگاری پر انہیں بلا شرکت غیرے پورا داد دیتا ہوں۔ ”دیوانگی“ کے عارف اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھے ورنہ زور زبردستی سے کسی کا دل جیتا جا سکتا ہے نہ رشتے داری بچتی ہے۔ جو طریقہ اس نے اپنایا تھا شازیہ زندگی بھر کیسے اس کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ اخلاق کے ساتھ کردار کی پختگی سے ہی دل جیتے جا سکتے ہیں۔ دھونس دھاندلی سے وقتی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ”فائیو پرسنٹ“ میں عاقل کے ساتھ جو گزری، سو گزری لیکن واقعات کی ترتیب ایسی تھی کہ دلچسپی اور سسپنس عروج حاصل کر گئے اور پڑھتے ہوئے آنکھیں ایک لفظ سے بھی نہ ہٹ سکیں۔ سچی بات ہے غریب کو مفت میں ملی خوشیاں بھی لوگ چھیننے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ”سکورا“ میں کوئی چیز چونکا دینے والی نہیں ہے البتہ سومیکا کا کردار اور خیالات جان کر حیرت ضرور ہوئی بس ارسلان کو ماحول سے پیدا ہونے والے جذبات شکست دے گئے ورنہ آج اس کے سرخ و سفید گلگوتھنے بچے آس پاس خرگوشوں کی طرح پھدک رہے ہوتے لیکن ہر انسان کو مقدر کا لکھا ہی ملتا ہے۔ ”مسافر“ کے واقعات پُراسرار بیان کرنے کا انداز ہلکا پھلکا ہے لیکن مطالعہ کے لحاظ سے انتہائی دلچسپ اور ڈرامائی ثابت ہوئی۔ مجھے بی بی جی کی محرومی اور رانا کے زخمی ہونے کا دکھ تھا۔ چاہے بہار کا جھونکا بن کر جو بھی آیا ہے لیکن ان کی زندگی میں تبدیلی اور خوشیاں آنے کی وجہ سے دل مکمل مطمئن ہو گیا ہے۔ کہانی پچویشن کے لحاظ سے دل کے نازک تاروں کو چھو گئی جب کسی کو من چاہی خوشی ملتی ہے تو دل سکون اور طمانیت سے بھر جاتا ہے۔“

☆ سلمٰی مہر کا خط حیدرآباد سے۔ ”اگست 16ء کے شمارے میں صفحہ 271 پر ایک تراشہ نظر آیا جس میں حنیف ادیب، لاہور نے طارق سبزواری کا شعر ”وہ اشک بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے۔ عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے“ کسی اور کے نام سے لگا دیا ہے۔ برائے کرم صحیح کر دیں (یہ متنازع شعر ہے۔ اس شعر کے کئی شاعر دعوے دار ہیں اور یہ بحث بہت پرانی ہے۔ اس پر بہت سارے رسالے ادبی جرائد میں لکھے جا چکے ہیں لیکن معتبر اساتذہ کے نزدیک یہ شعر پاکستانی شاعر وکیل صابری کا ہے کیونکہ ان کے مجموعے ”پانی کا گھر“ جو 1998ء میں آیا تھا اس میں یہ شعر ”وہ عکس بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے...... عجب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے“ شامل ہے۔ اس غزل کا مقطع ہے۔ ”نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں بسمل...... ہر ایک سانس سراب سفر میں رہتا ہے“ (حنیف ادیب سے غلطی ہوئی ہے)۔

☆ خالد کبیر کا اظہار یہ لاہور سے۔ ”سرگزشت میں اس سال کوئی حاضری نہیں لگوا سکا چند ماہ قبل ایک خط روانہ کیا باعث تاخیر یا ڈاک کے محکمے کی وجہ سے آپ تک وہ خط نہ پہنچ سکا۔ اداریہ خوب تھا قانون اور ضابطہ اخلاق موجود ہوتے ہیں ان کی خلاف ورزیاں بھی خوب سر عام ہو رہی ہوتی ہیں۔ ادارے، حکومت اور قانون نافذ کرنے والے سب خاموش ہیں۔ یک صفحی سرگزشت ڈاکٹر سید عبداللہ کے بارے میں پڑھا۔ ”معبر خیال“ میں داخل ہوئے تو کئی نام نئے نظر آئے۔ یہ اچھی بات لگی کہ نئے آنے والوں کو بھی اس میں شامل ہونے کا پورا حق ہے مگر شرط یہی ہے تبصرہ خوب ہو اور بروقت ارسال کر دیا جائے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب میں بھی ”معبر خیال“ میں داخل ہو جایا کرتا تھا۔ سرگزشت سے پرانا رابطہ ہے اور رہے گا۔ پرانے قارئین میں رانا محمد شاہد، قیصر خان، سدرہ بانو ناگوری، آفتاب احمد، اعجاز احمد سخار بھی شامل ہوئے۔ مختار آزاد کے متعلق پڑھا بہت افسوس ہوا کہ ہم ایک عمدہ لکھاری سے محروم ہو گئے۔ باری علی علیگ کی داستان خوب لکھی ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے۔ منظر امام صاحب نے ”تاریخ عالم“ کی آخری قسط بھی لکھ ڈالی۔ بہت ہی اچھی کاوش تھی۔ ”ہم زندہ ہیں“ کے عنوان میں فرضی کرداروں کے بارے میں مختصر تعارف ہوا۔ مسٹر لاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن جس طرح سے بیان ہوئے وہ حقیقت سے بہت قریب تھے لہٰذا قارئین ان کو زندہ کردار سمجھتے رہے یہی قلم کار کی کامیابی کا راز ہوتا ہے۔ الف لیلوی کردار ابھی تک زندہ ہیں

لیکن ان قلمتی کرداروں پر تاریخ خاموش ہے۔ عمرو عیار، الہ دین، سند باد جہازی وغیرہ آج بھی زبان زد عام و خاص ہیں اور سائنس کی ایجادات میں ان کے نشان موجود ہیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب کراچی سے۔ "داستان باری" میں ڈاکٹر ساجد امجد نے غلام باری کا ذکر خیر کیا جہد مسلسل کی ایک طویل داستان ہے۔ راہ سفر کٹھن بھی ہے اور دشوار بھی مگر عزم و ہمت کے پیکر غلام باری نے تمام مشکلات کا مقابلہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ایک باری سب پہ بھاری۔ اس دفعہ سلمیٰ اعوان آئیں اور ہمیں افسردہ کر گئیں۔ جلتے عراق کی سسکتی آہوں نے لرزا دیا۔ معصوم جمیر پر کیے گئے ستم نے امریکیوں کی فرعونیت پر دل کو خون کے آنسو رلا دیا۔ ویری سیڈ۔ "روڈیو" خطروں سے بھرپور رہا۔ "تاریخ عالم" کا بھی اختتام ہوا۔ معلومات کا وسیع خزانہ تھا۔ ندیم اقبال نے ہمیں یاد رکھا اچھا لگا۔ بھئی شکریہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ کی تحریر ہی اتنی شاندار ہوتی ہے کہ پڑھنے والے بے اختیار ہی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ الفاظ کا خوب صورت چناؤ، شوخ جملے اور زندگی سے بھرپور قہقہے ہمیں یہ سبق سکھا گئے ہیں کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ اگلی قسط کے شدت سے منتظر ہیں کہ کمپیوٹر کی چمکتی اسکرین پر ایسا کیا تھا کہ جس نے آپ کے دھڑکتے دل کی دھڑکنوں کو مزید بڑھا دیا۔ "سو سال کی بچی" نے عمر کے آخری حصے میں خوب داد سمیٹی اے آر رحمٰن کے اللہ ہو کے واقعے نے سرشار کر دیا۔ بے شک ہدایت دینے والی ذات تو خدا کی ہے جسے چاہے جب چاہے ہدایت دے دے ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ "ہم زندہ ہیں" کشمالہ حسن نے سہانے بچپن کی یادیں تازہ کر دیں۔ عمرو عیار، ٹارزن، ہیری پوٹر اور الہ دین کے چراغ کی کہانیاں بہت پڑھیں ان کے کرداروں میں ایک کشش سی ہوا کرتی تھی جن کے سحر سے ہم اب تک نکل نہیں پائے ہیں "جواب" پڑھ کر شاہانہ کے شوہر پر حیرت ہوئی کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے سامنے شوپیس بنا دیا۔ سعید میں اگر ذرا بھی غیرت ہوتی تو وہ یوں اپنی بیوی کا تماشا نہ بناتا۔ "شیرو" کے ساتھ ظالموں نے بڑا ظلم کیا انسان تو انسان ان وحشیوں نے قربانی کے جانور پر بھی رحم نہ کیا جانے اللہ جانے ان بھٹکے ہوئے ظالموں کا کیا انجام ہوگا۔ "مسافر" میں اشرف عباس کے اس جملے کو قدرت نے سچ کر دکھایا کہ کچھ مسافر لوٹ کر بھی آ جاتے ہیں۔ "قانیہ پر ستف" میں لالچی لوگوں کی ہوس کھل کر سامنے آئی۔ دولت اچھے اچھوں کو راہ سے بھٹکا دیتی ہے۔ عاقل صاحب کے درست فیصلے نے انہیں بروقت بچا لیا۔ "سکورا" پڑھی ارسلان احمد اپنی بے جا خواہشات کو لگام دے لیتے تو یوں تنہائیوں میں آنسو نہ بہانے پڑتے۔ "معبر خیال" میں سب دوستوں نے خوب تبصرے کیے۔ رانا شاہد 14 ستمبر کو آپ کی بیٹی کی سالگرہ تھی ہماری طرف سے مبارک باد اور ڈھیر ساری دعائیں آپ کی بیٹی کے لیے طاہرہ آپا کی کمی محسوس ہوئی بقول شاعر اک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق۔"

☆ شوکت رحمٰن خٹک پشاور نے فلمی الف لیلہ کے بعد خط لکھنا ہی چھوڑ دیا تھا کافی عرصے بعد یہ خط موصول ہوا ہے۔ "یکم جولائی 2016ء کو میرے دوست وزیر اعوان صاحب نے جب یہ منحوس خبر سنائی کہ شاہد جہانگیر انتقال کر گئے تو میری آنکھوں پر اندھیرا چھا گیا۔ ساتھ گزرے ہوئے زندگی کے لمحات میرے ذہن کے پردۂ اسکرین پر نظر آنے لگے۔ قرآن پاک میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو۔ شاہد جہانگیر صاحب بھی اس بات پر پورے اترتے ہیں۔ 1995ء کا زمانہ تھا پشاور کے مہمند آباد کالونی میں ایک درویش صفت انسان اللہ داد خان رہتے تھے۔ وہ میونسپل کمیٹی پشاور کے سپرنٹنڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔ انہیں بچپن سے موسیقی سے لگاؤ تھا اور گراموفون ریکارڈ جمع کرنے کے شوقین تھے۔ ان کی لائبریری میں تین ہزار سے زائد ریکارڈ موجود تھے اور مختلف دور کے عجیب و غریب گراموفون بھی لائبریری کی زینت تھے۔ اللہ داد خان کے ہاں موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے شائقین موسیقی آیا کرتے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اللہ داد خان کا یہ سلسلہ کب سے جاری تھا لیکن 1995ء میں ایک دوست کی معرفت اس محفل کا ممبر بنا۔ مجھ سے چند ماہ بعد شاہد جہانگیر بھی محفل کے ممبر بن گئے۔ نو سال تک اس محفل سے ہماری وابستگی رہی۔ اللہ داد خان 17 اپریل 2004ء کو وفات پا گئے جس سے محفل درہم برہم ہو گئی مگر میری شاہد جہانگیر سے دوستی برقرار رہی۔ میں جن دنوں اسپتال میں بیمار پڑا تھا تو شاہد جہانگیر باقاعدہ تیمارداری کے لیے آتے مگر خالی ہاتھ نہ آتے کولڈ ڈرنکس، فروٹ لانا لازمی تھا۔ بدقسمتی سے میں تقریباً دو سال سے مختلف اسپتالوں میں شوگر کی وجہ سے ناتواں پڑا تھا اور اس عرصے میں میرے دونوں پاؤں کاٹ دیے جس سے میں معذور ہو گیا۔ شاہد جہانگیر میرے گھر باقاعدگی سے میرا احوال پوچھنے آیا کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 28 جنوری 1999ء کو جب ان کی بیٹی کی شادی ہوئی تو اللہ داد خان مرحوم کی محفل کے تمام ممبران اس شادی میں مدعو تھے اور میری خوش قسمتی یہ کہ میں بھی اس شادی میں شریک تھا۔ شاہد جہانگیر نہایت منکسار، نیک اور دوست پرست انسان تھے۔ ان کو یاد کرتے ہوئے اس موقع پر پشتو کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ "تمہاری چاہت کے پھول بہت زیادہ ہیں۔ مگر میرا دامن بہت تنگ ہے، میں کس کس کو سمیٹوں" اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں، آمین۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: اظہر علی زیدی، کراچی۔ سیما قادری، حیدر آباد۔ تجمل حسین، لاہور۔ محمد نعیم، کراچی۔ ثمرین ارشد، سیالکوٹ۔ علی اشرف، گلگت بلتستان۔ یعقوب غزنوی، پشاور۔

# فیض رساں

ڈاکٹر ساجد امجد

زندگی کی علامت حرکت ہے اور حرکت ہی زندگی ہے۔ اسی نکتے پر انہوں نے زندگی مرکوز کردی۔ تخلیقی قوت، مذاقِ سلیم، ذوق و شوق اور قدرتِ اظہار کا سہارا لے کر فکر و فلسفہ کو وزن و وقار عطا کرتے ہوئے زندگی و حقائق زندگی کے نظریہ کو آسان پیرائے میں عوام تک پہچانے کے لیے دن رات محنت کرتے رہے تاکہ عام افراد بھی اسلامی احکام کی روح تک پہنچ سکیں، اسلام کو سمجھ سکیں۔ کتابوں پر کتابیں لکھیں۔ عملی جدوجہد کی اور عالم باعمل بن کر دکھایا کہ مبلغ دین کیسے ہوتے ہیں۔

جدوجہد آزادی کے بے تیغ سپاہی، ایک عالم باعمل کا زندگی نامہ

چھوٹے سے قصبے کے چند بڑے لوگ حافظ کریم اللہ کے گھر میں جمع تھے۔ ان سب کے چہروں پر پریشانی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ بات ہی ایسی تھی کہ سب کا فکرمند ہونا لازمی تھا۔ قصبے کے ہندوؤں نے ایسا سر اٹھایا تھا کہ مسلمانوں کا جینا حرام کردیا تھا۔ خدشہ اس کا تھا کہ کسی بھی وقت کوئی بڑا حادثہ رونما ہوسکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہوجائے کوئی تدبیر کرنی لازمی تھی۔ اس وقت بھی موضوع گفتگو یہی حادثات تھے جو روزانہ رونما ہورہے تھے۔

"صاحبو! یہ عجیب لطیفہ ہے کہ ہندوستان پر مغلوں کی حکومت ہے یعنی مسلمان حکومت کررہے ہیں لیکن ہندو شیر بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ہماری دادرسی کرنے والا نہیں۔ مسلمان اس قصبے میں بہت تھوڑے ہیں اس لیے نقصان ہمارا ہی ہوگا۔"

مغلوں کی حکومت برائے نام ہے۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ ایک بادشاہ صبح بیٹھتا ہے شام کو اتر جاتا ہے۔ انگریزوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ مسلسل سازشوں نے بادشاہوں کو کمزور کردیا ہے۔ ان میں اتنی طاقت ہی نہیں رہی کہ اپنی رعایا کی حفاظت کرسکیں۔ مرہٹے اور ہندو من مانی پر تلے ہوئے ہیں۔ مسلمان ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

"اب ہوگا کیا؟ کیا ہم اپنے اپنے گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔"

"ایسے کیسے چلے جائیں۔ ہم میں سے ہر ایک دس ہندوؤں کو مار کر مرے گا۔"

"یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ میرے بھائیو، کوئی ایسی تدبیر نکالو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"کیا تدبیر نکالیں۔ کیا دہلی میں لال قلعے کے سامنے جاکر دہائی دیں یا کلکتہ جاکر انگریزوں کو اپنی بپتا سنائیں۔ اب تو جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔"

حافظ کریم اللہ سب کی باتیں غور سے سن رہے تھے لیکن اب ان کے بولنے کا وقت آگیا۔ ایک ایسی راہ سوجھ گئی تھی جس سے سب کو آشنا کرنا ضروری تھا۔

"مغلوں سے تو خیر کوئی امید نہیں لیکن دہلی جانے

کے خیال سے میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ ہمیں نجیب آباد جاکر نجیب الدولہ سے فریاد کرنی چاہیے۔ وہ مسلمان دوست نواب ہے۔ وہ ہماری ضرور امداد کرے گا۔"

"حافظ صاحب! یہ نام آپ کے ذہن میں خوب آیا۔ نجیب الدولہ مرہٹوں کا بھی دشمن ہے اور اسے کمزور مغلوں کے بھی خلاف ہی سمجھو۔ خدا ترس بھی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کرے گا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کرے گا کون۔ نجیب اللہ کے پاس جائے گا کون۔ جانا بھی رازداری ہے۔ ہندوؤں کو ہوا تک نہ لگے۔"

"اس کام کے لیے حافظ صاحب سے زیادہ موزوں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔" سب نے بہ یک وقت بہ یک آواز کہا۔

حافظ صاحب کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ تجویز بھی انہی کی تھی۔ انہوں نے اپنے بھائی بندوں سے وعدہ کرلیا کہ وہ جلد ہی اس کارِ خیر کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔

یہ قصبہ جہاں یہ باتیں ہورہی تھیں۔ قصبہ جوراسی تھا جو قصبہ منگلور کے نزدیک دیوبند سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔

حافظ کریم اللہ نجیب آباد پہنچے اور پتھر کے بنے ہوئے مضبوط پٹھانی طرز کے قلعے میں پہلا قدم رکھا تو انہیں شدت سے احساس ہوا کہ اگر مغل بادشاہ اس پٹھان حریت پسند نواب کی روش اختیار کریں تو کیا مجال کہ انگریز طالع آزما ہندوستان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھیں۔

وہ اس وقت نجیب الدولہ کے سامنے تھے اور قصبہ جوراسی کے حالات سے آگاہ کررہے تھے۔ نجیب الدولہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جارہا تھا۔

"افسوس کہ مغل حکمراں اتنے کمزور ہوگئے ہیں کہ چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں میں اپنی فوج کا ایک دستہ قصبہ جوراسی بھیجوں گا جس سے ہندوؤں کو یہ تاثر ملے گا کہ قصبے کے مسلمان تنہا نہیں ہیں میں جانتا ہوں یہ مستقل علاج نہیں لیکن کچھ دنوں کے لیے سکون ہوجائے گا۔"

حافظ کریم اللہ اپنی اس کامیابی پر نازاں قصبے کی طرف لوٹ آئے۔ کچھ دنوں بعد ریاست نجیب آباد کی طرف سے ایک کمک پہنچ گئی۔ قصبہ جوراسی کے ہندوؤں نے نجیب الدولہ کے سپاہیوں کو دیکھا تو ان کا خون خشک ہوگیا۔ ان میں سے بعض نے مسلمانوں سے رابطہ بھی کیا اور عہد کیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بھائی چارے کے ساتھ رہیں گے۔ کچھ دنوں کے لیے امن قائم بھی ہوگیا لیکن حافظ صاحب کے کانوں میں نجیب الدولہ کے الفاظ گونجتے رہتے تھے۔ "میں جانتا ہوں یہ مستقل علاج نہیں لیکن کچھ دنوں کے لیے سکون ہوجائے گا۔"

وہ جس دن سے نجیب الدولہ سے ملاقات کرکے لوٹے تھے۔ اسی دن سے کہیں اور منتقل ہونے کا ارادہ کررہے تھے۔ بس یوں کہیے کہ قصبہ جوراسی سے ان کا دل اٹھ گیا تھا۔ بس اب سوال یہ تھا کہ کہاں جائیں۔ کئی مرتبہ اردگرد کے علاقوں کا جاکر جائزہ بھی لے آئے تھے۔ اسی دیکھ بھال میں ان کے قدم سہارن پور کے ایک قصبے دیوبند میں جاکر رک گئے۔ اس وقت یہ قصبہ چند گھرانوں پر مشتمل تھا جس کو نہ جغرافیائی اور عمرانی حیثیت حاصل تھی کوئی خاص شہرت حاصل نہ تھی۔ اسے جو شہرت ملنے والی تھی وہ ابھی پردۂ غیب میں تھی۔

ان کے صاحب زادے میاں جی امام صاحب کے نام سے مشہور ہوئے اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ قصبات و دیہات میں پھیلے ہوئے مدرسوں میں پڑھانے والے ایسے اساتذہ جو دینی تعلیم کے ساتھ عملی تقدس کے حامل ہوتے تھے۔ "میاں جی" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ حافظ کریم جیسے فرشتہ خصلت باپ کا بیٹا بھی نیکی و پاکیزگی کا مظہر تھا۔ اس نے جب تدریس کا پیشہ اختیار کیا تو اس کے عملی تقدس کی شہرت نے میاں جی کے لقب سے مشہور کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ قصبہ دیوبند کا شاید ہی کوئی گھرانا ہو جو ان کا شاگرد نہ ہو۔

میاں جی کو اللہ تعالیٰ نے دیوبند میں اچھی زمینداری عطا کی تھی لیکن جب ان کے بیٹے اپنی اپنی عمروں کو پہنچے اور میاں جی کا انتقال ہوا تو یہ سب زمین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

ہر صاحب زادے کے حصے میں زمین کا اتنا کم حصہ آیا کہ گزر اوقات مشکل تھی لہٰذا اکثر نے سرکاری ملازمت کرلی۔ پانچ صاحب زادوں میں ایک صاحب زادے خلیفہ تحسین علی آنکھوں سے معذور تھے لہٰذا زمین کا جو حصہ میراث میں ان کو ملا تھا اس پر تنگی کے ساتھ متوکلانہ گزر کرتے رہے۔ بعد میں وقتی ضرورتوں سے مجبور ہوکر کچھ

زمین بھی فروخت کرنا پڑی تو تنگ دستی اور بڑھ گئی۔

وقت بہت آگے نکل آیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف کئی تحریکیں چل چکی تھیں۔ اس چھوٹے سے قصبے نے 1857ء کی قتل و غارت گری بھی دیکھ لی تھی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے سہارن پور میں رہ کر ہی انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی اور حاجی امداد اللہ بغاوت کی ناکامی کے بعد یہاں سے نکلے تھے اور گرفتاری سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر روپوش ہو گئے تھے۔ حاجی امداد اللہ تو مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں رہ کر تحریک آزادی ہند کے لیے کام کرتے رہے۔ رشید احمد گنگوہی اور قاسم نانوتوی کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر سہارن پور اور دیو بند چلے آئے۔

حاجی امداد اللہ کی تحریک پر ان کے مریدوں حضرت مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد یعقوب، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رفیع الدین اور مولانا محمد عابد حسین نے دین اسلام کی تعلیمات کے لیے ایک مکتب قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ باہمی مشوروں کے بعد چندے کی تحریک شروع کی اور مکتب قائم ہو گیا۔

دارالعلوم کے پرشوکت اور ایک عظیم الشان درسگاہ سے ان حضرات کا ذہن بالکل خالی تھا لیکن مولانا قاسم نانوتوی کا تخیل اس معمولی مکتب کو ایک عظیم انقلابی درس گاہ بنانے کا تھا۔ جامع مسجد کی سہ دریاں موجودہ مدرسے کے لیے کافی تھیں لیکن مولانا قاسم کے ذہن میں دنیائے اسلام کے ایک مرکز علوم کا نقشہ تھا جس کے دریائے علم سے مختلف علمی نہریں بھی نکلیں اور طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد اس سے فیض یاب ہو۔ انہی کی کوششوں سے یہ مدرسہ جامع مسجد کی سہ دریوں سے نکل کر وسیع و عریض زمین پر پھیلا اور ایک اسلامی یونیورسٹی میں تبدیل ہوا۔

خلیفہ تحسین علی اپنی آنکھوں کی معذوری کے سبب اس زمین کی آمدنی پر گزارہ کر رہے تھے جو انہیں میراث کے طور پر ملی تھی۔ ان تبدیلیوں سے بھی بے خبر تھے جو دیو بند کی سرزمین پر وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ ہاں سن ضرور رہے تھے کہ یہاں ایک دارالعلوم کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔

یہ بھی خوب اتفاق ہے کہ جس سال خلیفہ تحسین علی کے گھر فرزند کی ولادت ہوئی اور اس کا نام انہوں نے محمد یاسین رکھا اس کے اگلے سال دارالعلوم دیو بند کا قیام عمل میں آیا۔ ہر آنے والا بچہ اپنا رزق ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ محمد یاسین اپنے رزق میں مرکز علم لے کر پیدا ہوا۔

محمد یاسین اور دارالعلوم دیو بند ایک ساتھ بڑے ہوتے گئے۔

خلیفہ تحسین کو اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا چنانچہ ان کے فرزند محمد یاسین نے جیسے ہی ہوش سنبھالا انہوں نے اسے ایک گھریلو مکتب میں قرآن مجید حفظ کرانے بٹھا دیا۔ پھر اسی مکتب میں اردو، فارسی، حساب، ریاضی وغیرہ کی مروجہ تعلیم دلائی۔ محمد یاسین بھی ایسے ذہین اور علم کے رسیا ثابت ہوئے کہ انہیں جو پڑھایا گیا اس کی تکمیل کی۔ اب وہ اس قابل تھے کہ معذور باپ کا ہاتھ بٹا سکیں۔ انہوں نے اس پر اصرار بھی کیا۔

''ابا جان! آپ کب تک محنت کر کے مجھے پڑھاتے رہیں گے۔ اب میں نے اتنی تعلیم ضرور حاصل کر لی ہے کہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری حاصل کر کے آپ کو روزگار کی طرف سے بے فکر کر دوں۔''

''بیٹا! میں تو چاہتا ہوں تم عالم دین بنو۔ میں عربی کی تعلیم کے لیے تمہیں دارالعلوم دیو بند میں داخل کرانے کا خواہش مند ہوں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ دریا ہمارے قریب بہہ رہا ہے اور ہم کنارے بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں۔ ہندوستان بھر سے طلبہ آ کر مستفید ہو رہے ہیں اور ہم اس قصبے میں رہتے ہوئے اس سے دور رہیں۔ ارے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر کوئی پکار رہا ہے اور ہم اسے نہ سنیں جب کہ وہ ہمارے ہی فائدے کے لیے پکار رہا ہے۔''

''ابا جان! مجھے تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں لیکن تعلیم میں مشغول ہو جانے کے بعد میرے پاس اتنا وقت نہیں بچے گا کہ میں آپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔ گھر کی ضروریات کا کیا ہو گا۔''

''دنیاوی ضروریات پوری کرنے کے لیے میں تمہیں دینی تعلیم نہ دلاؤں یہ کیسے ممکن ہے۔ روز حشر اپنے پالنے والے کو کیا جواب دوں گا۔'' جب محمد یاسین بالکل مجبور ہو گئے اور سمجھ لیا کہ والد صاحب کسی طرح نہ مانیں گے اور ہرگز نوکری نہ کرنے دیں گے تو دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لے لیا۔

محمد یاسین کو دارالعلوم کا قرنِ اوّل نصیب ہوا۔ اس وقت دارالعلوم کو بہترین اساتذہ میسر تھے۔ طلبہ کو مجدد بنانے کا جوش عمل ان اساتذہ کا فریضہ اوّلین تھا۔ صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک، مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی

تھے۔ سب کے سب صاحب نسبت بزرگ تھے۔ یہ درس گاہ دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتی تھی۔ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی روح پرور آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

محمد یاسین نہایت ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ گھر میں بھوک اور افلاس کا راج تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ فاقے کو عذر بنا کر کسی دن مدرسے کی چھٹی کر لیتے۔ اکثر ہوتا کہ گرمی کی دوپہریں دارالعلوم کے اسباق سے تھک تھکا کر گھر پہنچتے تو گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔ ظہر کے بعد پھر قدم دارالعلوم کی طرف اٹھ جاتے۔

یہ فاقے آخر کب تک دراز ہوتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ معذور والد مجبور ہو گئے کہ اپنے ہونہار بیٹے کو ملازمت پر لگوا دیں تاکہ گھر کی ضروریات پوری ہوں۔ یہ پھر بھی گوارا نہیں تھا کہ تعلیم بالکل ہی ختم کر دی جائے اس لیے جزوقتی ملازمت کا بندوبست کیا گیا تاکہ تعلیم بھی چلتی رہے اور ملازمت بھی۔

اس ملازمت کی وجہ سے اسباق کی حاضری میں کمی آنے لگی۔ ایک ایسا طالب علم جو باقاعدگی سے حاضر ہو رہا تھا۔ آندھی اور برسات کی پروا نہ کرتا تھا۔ یوں غیر حاضر ہونے لگا تو اساتذہ کی نظروں میں فوراً آ گیا۔ ان کی شکایت دارالعلوم کے مہتمم مولانا رفیع الدین تک پہنچی۔ کسی سرزنش سے پہلے سبب جاننا ضروری تھا لہٰذا انہوں نے محمد یاسین کو اپنے دفتر میں بلایا۔

"آج کل آپ اسباق کی طرف سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔"

"آپ میری غیر حاضری کو عدم دلچسپی سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ جب موقع ملتا ہے میں پوری توجہ سے سبق سنتا اور یاد کرتا ہوں۔"

"جب بھی موقع ملتا ہے سے کیا مراد ہے آپ تو بڑی باقاعدگی سے دارالعلوم آیا کرتے تھے اب کیا ہو گیا۔"

"بات یہ ہے......" محمد یاسین کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"کہو بیٹا، رک کیوں گئے۔"

"میں نے ایک جگہ ملازمت کر لی ہے۔"

"ملازمت کر لی ہے؟ مگر کیوں؟"

"میرے والد آنکھوں سے معذور ہیں۔ ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے جزوقتی ملازمت کرنی پڑی۔ گھر میں بہت تنگی ہے اس ملازمت کے سوا چارہ نہیں تھا۔"

"اگر ہم تمہارا کچھ وظیفہ مقرر کر دیں؟"

"پھر مجھے ملازمت کی کیا ضرورت رہے گی۔ میں اپنا تمام وقت تعلیم کے لیے دے سکوں گا۔"

"یہ وظیفہ زیادہ نہیں ہوگا۔ اپنے والد سے پوچھ کر بتانا۔ اگر وہ اس پر قناعت کر سکیں تو تمہاری تعلیم پوری ہو سکتی ہے۔ تعلیم پوری ہونے کے بعد ہو سکتا ہے اسی دارالعلوم میں تمہارے لیے کوئی جگہ نکل آئے۔ تم ایک ذہین طالب علم ہو اس لیے ضروری ہے کہ تم تعلیم جاری رکھو۔"

لائق بیٹے نے گھر جا کر یہ پیغام دیا تو علم دین کے عاشق باپ نے اس قلیل وظیفے کو ترجیح دی اور بیٹے کی ملازمت چھڑوا دی۔

خدا ایسے اسباب مہیا کر رہا تھا کہ جس فصل کو تیار ہونا ہے وہ تیار ہو جائے۔

محمد یاسین نے پہلے سے بھی زیادہ ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ مدرس بھی ایسے ملے کہ جو پڑھا ذہن سے دل تک اتر گیا۔

فارسی ادب کی اعلیٰ تعلیم مولانا منفعت علی سے حاصل کی جو غالب کے شاگرد تھے۔ عربی درس نظامی کی تعلیم مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا سید احمد دہلوی، ملا محمود صاحب دیوبندی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے حاصل کی۔

مولانا محمد یاسین کو زمانہ طالب علمی ہی سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے خاص محبت وعقیدت تھی لہٰذا تعلیم سے فراغت ملتے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور بیعت ہو کر سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔

مہتمم دارالعلوم نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مولانا محمد یاسین کو دارالعلوم کے شعبہ فارسی میں مدرسی مل گئی اور ترقی کرتے ہوئے صدر مدرس تک پہنچے۔

وقت اور آگے بڑھا۔ نعمتوں کے نزول نے ایک شکل یہ اختیار کی کہ مولانا محمد یاسین کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا عنایت کیا۔ اس پاکیزہ گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے ممتاز ومنفرد بنانا تھا۔ اس لڑکے سے کئی اہم کام لینے تھے جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

دادا خلیفہ تحسین علی ابھی حیات تھے۔ پوتے کو ان کی گود میں دیا گیا۔ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن ان کی روحانیت محسوس کر سکتے تھے کہ ان کی گود میں دیا جانے والا لڑکا معمولی بچہ نہیں۔ انہوں نے اس کا نام محمد مبین رکھا۔

کیا مبارک ساعت تھی کہ ابھی ولی کامل حضرت گنگوہی حیات تھے اور مولانا محمد یاسین ان سے بیعت ہو چکے تھے۔ شیخ سے خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ انہیں خط لکھا اور بیٹے کی ولادت کی نوید سنائی۔ شیخ حضرت گنگوہی کا جواب آیا۔

”تولد فرزند سے مسرت ہوئی، نام اس کا محمد شفیع رکھنا۔“

پیر طریقت کا حکم تھا لہٰذا بچے کو محمد شفیع کے نام سے پکارا جانے لگا۔

وطن کہنے کو دیوبند تھا لیکن اس گھرانے کا سب کچھ اس کا ایک گوشہ دارالعلوم تھا۔ اسی گوشۂ خاص میں محمد شفیع کا بچپن کھیلتا رہا۔ اکابر علما کی بابرکت مجلسوں کو دیکھ دیکھ کر بڑے ہوتے گئے اور پڑھنے کی عمر کو پہنچ گئے۔

عمر مبارک پانچ سال کی ہوئی تو قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں حافظ محمد عظیم کے پاس بٹھا دیا گیا جنہوں نے نہایت شفقت سے قرآن کریم پڑھانا شروع کر دیا۔

آپ کی ننھیال قاضی پور ضلع مظفر نگر میں تھی۔ والدہ کے ہمراہ وہاں جاتے ہی رہتے تھے لیکن اب مشکل یہ تھی کہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ والدہ کو جانا تھا اور کچھ زیادہ دنوں کے لیے جانا تھا۔ چھوڑ کر جا نہیں سکتی تھیں۔ ساتھ لے کر جاتیں تو تعلیم کا ہرج ہوتا۔ پھر یہ طے ہوا کہ قاضی پور کے کسی مکتب میں عارضی طور پر بٹھا دیا جائے گا تاکہ سلسلہ نہ ٹوٹے۔ بچے ایسے مواقع پر خوب خوش ہوتے ہیں، آپ بھی خوشی خوشی بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔

قاضی پور پہنچتے ہی انہیں ایک مکتب میں بٹھا دیا گیا تاکہ کھیل کود میں مصروف ہونے سے پہلے ہی سبق یاد کرنے میں لگ جائیں۔ وہ خوشی خوشی گاؤں کے اس مکتب میں گئے کہ نیا مکتب ہوگا نئے اساتذہ، خوب مزہ آئے گا لیکن چند ہی روز میں دل اکتانے لگا۔ دیہاتی مکتب کا ماحول اور اسی مزاج کے استاد کا انداز تعلیم اجنبی بھی تھا اور صبر آزما بھی۔ بچوں کو سخت سزائیں دینا روزمرہ کے معمول میں تھا۔ گھر آ کر کچھ نہیں بتاتے تھے کہ والدہ اسے بہانہ سمجھیں گی اور سمجھیں گی کہ پڑھائی سے جی چرا رہا ہے۔ طبیعت میں لطافت اتنی تھی کہ یہ ماحول سوہان روح بنا ہوا تھا۔ یہ دھڑکا ہمیشہ لگا رہتا تھا کہ سبق یاد نہ کرنے پر کسی روز ان کی بھی اسی طرح پٹائی ہو سکتی ہے۔

ایک روز تو حد ہی ہو گئی۔ استاد نے ایک بچے کو رسی سے باندھا اور ڈنڈے برسانا شروع کر دیے۔ یہ منظر ایسا دلخراش تھا کہ مکتب ہی میں انہیں تیز بخار چڑھ گیا۔ گھر پہنچے تو بدن انگارہ بن گیا۔ والدہ نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو گھبرا گئیں۔ شام تک جب ذرا بخار میں کمی آئی تو انہوں نے مکتب میں گزرنے والا واقعہ والدہ کے گوش گزار کیا۔

”تم کل سے مکتب نہیں جاؤ گے۔“

”میں اگر نہیں گیا تو مولوی صاحب بڑے لڑکوں کو بھیج دیں گے جو مجھے یہاں سے زبردستی لے جائیں گے۔ جو بچے مکتب سے غیر حاضر ہوتے ہیں ان بچوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔“

”میں کسی کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

”پھر میری پڑھائی کا کیا ہوگا؟“

”میں تمہاری تعلیم کا ہرج نہیں ہونے دوں گی۔ ہم ایک دو روز میں دیوبند چلے جائیں گے۔“

ان کی والدہ کو قاضی پور میں ابھی مزید ٹھہرنا تھا لیکن محمد شفیع کی تعلیم کا ہرج نہ ہو اس خیال سے وہ دوسرے ہی روز دیوبند آ گئیں۔

محمد شفیع قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند جانے لگے۔

آپ کے والد چاہتے تو یہ تھے کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کرائیں، کچھ پارے حفظ بھی کر لیے تھے لیکن جسمانی طور پر کمزور تھے، حفظ کی محنت برداشت نہ ہو سکی۔

قرآن کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں خط و املا کی مشق اور فارسی کی تمام مروجہ کتابوں کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ حساب اور فنون ریاضی وغیرہ اپنے چچا منشی منظور احمد مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھے۔

جب آپ کی عمر سولہ سال تھی اصول فقہ اور ادب وغیرہ کی متوسط کتابیں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخل ہو کر شروع کیں۔

طلب علم میں انہماک ایسا تھا کہ دارالعلوم ہی گویا آپ کا گھر بن گیا۔ صبح کو دارالعلوم جا کر رات ہی کو واپسی ہوتی اور اکثر تو رات کو بھی وہیں کسی درخت کے نیچے کھلے فرش پر سو جاتے۔ واپسی ہوتی بھی تو رات کا ایک بج رہا ہوتا۔ والدہ انتظار میں جاگ رہی ہوتیں کہ محمد شفیع آئے تو اسے کھانا گرم کر کے دیں۔ والدہ کے اس طرح رات گئے تک جاگنے پر انہیں اذیت ہوتی تھی۔

سردیوں کی راتیں تھیں۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔
وہ گھر پہنچے تو والدہ کو حسبِ معمول جاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسی سردی میں گرم بستر سے اٹھیں اور ان کے لیے کھانا گرم کرنے لگیں۔

"اماں جان! آپ اس سخت سردی میں میرے لیے کھانا گرم کرنے کے لیے اٹھی ہیں۔ یہ مجھے قطعی اچھا نہیں لگا۔"

"میرے بچے تم دینی تعلیم کے حصول کے لیے راتوں کو جاگ رہے ہو۔ میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتی کہ اٹھ کر کھانا گرم کردوں۔"

"سردیوں کے دن ہیں آپ کو سردی لگ جائے گی۔"

"تو تو کیا تم اتنی مشقت کے بعد گھر آؤ گے تو کیا بھوکے ہی سو جاؤ گے۔"

"بھوکا کیوں سو جاؤں گا آپ میرا کھانا اٹھا کر رکھ دیا کریں میں جس وقت بھی آیا کھا لیا کروں گا۔"

"اس وقت تک تو کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"آپ تکلیف سے تو بچ جائیں گی۔ ہمت ہوئی تو گرم بھی کرلوں گا۔ بس آپ آرام سے سویا کریں۔"

"تم رات میں جلدی نہیں آسکتے؟"

"اسباق سے فارغ ہو کر جو کچھ پڑھا ہوتا ہے اپنے ہم سبقوں کے سامنے اسے دہراتا ہوں۔ اسے تکرار کہتے ہیں۔ یہ اعادہ عموماً رات کو ہوتا ہے اس لیے دیر ہو جاتی ہے۔"

"پھر بھی میرا دل نہیں مانتا کہ تم ٹھنڈا کھانا کھاؤ۔"

وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھیں لیکن منت سماجت کے بعد انہوں نے والدہ کو آمادہ کرلیا کہ وہ ان کا کھانا نکال کر ایک جگہ رکھ دیا کریں گی۔ وہ جگہ بھی انہیں بتا دی۔

اس رات بھی تکرار کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ وہ گھر پہنچے اور مقررہ جگہ سے کھانا اٹھایا۔ سردی کی وجہ سے شوربا اوپر سے بالکل جم گیا تھا۔ نیچے صرف پانی رہ گیا تھا۔ نیند آنکھوں میں جگہ بنا رہی تھی۔ گرم کرنے میں اور دیر لگ جاتی۔ انہوں نے وہی ٹھنڈا سالن روٹی میں بھگو کر کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ پیٹ بھرنا ہی تو تھا سو بھر لیا۔ روح کی غذا تو وہ علم تھا جو وہ حاصل کرکے آئے تھے۔

طلب علم میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ جیسے کتابوں کے علاوہ دنیا میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنا تو بڑی بات عزیز و اقارب کے گھر تک جانے کی فرصت نہیں تھی۔ دیوبند چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن یہاں کے راستوں تک کا علم نہیں تھا۔ بس یوں تھا کہ ہر راستہ گھر سے دارالعلوم تک جاتا تھا۔ اس کے سوا کوئی راہ معلوم ہی نہیں تھی۔ یہ راستہ بھی سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم گزرتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت نانوتوی کے مخصوص شاگرد و مرید اور مدرسہ عبدالرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبدالعلی دارالعلوم تشریف لائے۔ معزز مہمان اور دوسرے اساتذہ مہتمم دارالعلوم کے ہمراہ کھڑے تھے۔ اسی وقت محمد شفیع کتابیں بغل میں دبائے قریب سے گزرے۔ مہتمم صاحب کی نظر ان پر پڑی تو انہوں نے قریب بلایا اور معزز مہمان سے ان کا تعارف کرایا۔

"یہ دارالعلوم کا ایسا طالب علم ہے کہ اسے اپنی کتابوں کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں۔ اسے نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہے نہ جان کی۔ کتاب کا کوئی سوال پوچھو تو محققانہ جواب دے گا۔"

یہ تھی اس طالب علم کی شان کہ اساتذہ خود اس کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔

ایک مرتبہ امتحان کے دوران آپ نے شرح جامی کا سوال حل کیا۔ آپ کی کاپی علامہ شبیر احمد عثمانی کے پاس گئی۔ وہ اس کاپی کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایسی محققانہ تحریر دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے۔ کیا کوئی طالب علم ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا نکتہ رس جواب تحریر کرے۔ پرچہ لے کر فوراً مہتمم کے پاس تشریف لائے۔

"یہ کون طالب علم ہے اس نے تو اس کتاب کی شرح تصنیف کردی ہے۔"

مہتمم نے تحریر سے پہچانا اور فرمایا۔ "یہ مولانا یاسین کے فرزند محمد شفیع کا خط ہے۔ ان صاحبزادے سے ایسے ہی جواب کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

"ذرا ان صاحبزادے کو بلائیے تو۔"

"وہ اس وقت امتحان گاہ میں کوئی اور پرچہ دینے میں مشغول ہوگا۔"

"چلیے وہیں چلتے ہیں ہم سے ضبط نہیں ہوتا۔ شاباش دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی اسی وقت امتحان گاہ تشریف لے گئے اور تمام طلبہ کے سامنے آپ کے سر پر ہاتھ رکھا اور غیر معمولی جواب دینے پر شاباشی سے نوازا۔

اب آپ تعلیم حاصل کرتے ہوئے اس مقام پر آ گئے تھے جب یونانی فلسفہ کی کتاب "میبذی" پڑھنی تھی۔ اس موقع پر انہیں اپنے والد کا ایک قول یاد آ گیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ دوران گفتگو کہا تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی کی رائے مدارس عربیہ میں یونانی فلسفہ کی تعلیم کے خلاف تھی۔ یہ بات یاد آئی تو آپ کو میبذی پڑھنے میں تردد ہوا۔ سوچ میں پڑ گئے یہ فن پڑھوں یا نہیں؟ والد محترم سے ذکر کیا۔ انہیں بھی حضرت گنگوہی کا قول یاد آ گیا لیکن اس بات کو عرصہ گزر گیا تھا۔ جدید حالات میں اس رائے پر عمل کیا جائے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب کون دے، حضرت گنگوہی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب اس رائے پر کس سے رجوع کیا جائے۔ فوراً ایک نام ذہن میں آیا۔

"حضرت گنگوہی تو اس وقت دنیا میں نہیں، ان کے بعد میں مولانا اشرف علی تھانوی کو آپ کا قائم مقام سمجھتا ہوں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ تمہارے بارے میں ان سے مشورہ کر کے عمل کیا جائے۔ محمد شفیع وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے کیونکہ ان کی سخت گیری اور حاضری کے قواعد و ضوابط کی پابندی سے ڈرتے تھے لیکن چونکہ مولانا اشرف علی تھانوی ان کے والد کے ہم سبق رہ چکے تھے اور ان سے خط کتابت رہتی تھی اس لیے تیار ہو گئے۔

والدِ محترم انہیں لے کر تھانہ بھون چلے گئے اور مولانا سے ملاقات کی۔ یہ بے تکلفی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی دونوں دوست نہایت تپاک سے ملے۔

"اس وقت میرے آنے کا سبب یہ لڑکا ہے۔" والد محترم نے فرمایا اور پھر یہ بھی کہا۔ "یہ یہاں آتا ہوا اس لیے ڈرتا تھا کہ یہاں بہت قواعد و ضوابط ہیں ان کی پابندی کیسے ہو گی۔"

"بھائی مجھے تو خوامخواہ لوگوں نے بدنام کیا ہے۔ میں از خود کوئی قاعدہ ضابطہ نہیں بناتا۔ لوگوں کی غلط روش نے مجھے مجبور کر دیا کہ آنے والے کو کسی اور قاعدہ کا پابند کراؤں۔ ورنہ یہ تو مجھے کسی وقت ایک دفعہ اللہ کا نام بھی نہ لینے دیں۔ دوسرے کام اور آرام کا تو ذکر کیا۔" حضرت مولانا نے فرمایا اور پھر محمد شفیع کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "تم میری اولاد کی جگہ ہو تمہیں کیا فکر جس وقت چاہے آیا کرو۔"

اتنے میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا۔ اس کے بعد عام مجلس تھی۔ حضرت مولانا نے شام کے وقت ان سے خصوصی ملاقات فرمائی اور آنے کا سبب پوچھا۔ والد صاحب نے سبب بتا دیا کہ موجودہ زمانے میں یونانی فلسفہ پڑھا جائے یا نہیں کیونکہ حضرت گنگوہی تو اس کے خلاف تھے۔

حضرت مولانا نے فرمایا۔ "مجھے معلوم ہے اس معاملے میں حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی میں اختلاف تھا۔ حضرت نانوتوی یونانی فلسفہ پڑھانے کے حق میں تھے جب کہ حضرت گنگوہی مخالف تھے لیکن تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ضرور اس فن کو پڑھو اور محنت سے پڑھو۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ اس وقت تمام مدارسِ اسلامیہ میں اس فن کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اگر تم نے یہ فن نہ پڑھا تو فلسفہ جاننے والے علماء کے سامنے تم پر مرعوبیت طاری رہے گی اور اگر سمجھ کر پڑھ لیا تو اس کے نقصان سے محفوظ رہو گے اور دوسرے علماء کے سامنے مرعوب نہیں ہو گے۔"

محمد شفیع کو یہ رائے بڑی صائب معلوم ہوئی۔ والد کو بھی تشفی ہو گئی۔ واپس آ کر میبذی کا سبق شروع کر دیا۔ اس کے بعد فلسفے کی جتنی درسی کتابیں تھیں سب ایک ایک کر کے پڑھ ڈالیں۔

شعر و سخن کا آبائی ذوق وراثت میں ملا تھا۔ فارسی ادب کی پنج سالہ تعلیم و تربیت نے اس فطری ذوق کو مزید پروان چڑھایا۔ عربی ادب بھی خصوصی توجہ سے پڑھا تھا لہٰذا شعر گوئی کا ذوق ہو جانا لازمی تھا۔

اس زمانے میں طلبہ اردو زبان کے مشاعرے جمعہ کی فرصت کے دوران منعقد کیا کرتے تھے۔ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی نے طلاب کو کہا اگر شعر کہنا ہو تو عربی میں کہو۔ اس مقصد کے لیے استاد محترم نے ایک ادبی مجلس "نادیۃ الادب" قائم کی اور اس کے تحت ہفتہ وار مشاعرے عربی زبان میں ہونے لگے۔ محمد شفیع نے ان مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

آپ نے شعر گوئی کی ابتدا عربی سے کی اور پھر فارسی میں بھی کہنے لگے اور اس کے بعد اردو میں اشعار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ اندر کی آواز تھی جو اشعار میں ظاہر ہو رہی تھی ورنہ شاعری شعار نہیں تھا۔ آپ کی دلچسپیوں کا محور علمی و دینی مشاغل تھے۔ اتنی فرصت نہیں تھی کہ سارا وقت شاعری کی نوک پلک سنوارنے میں گزار دیتے لیکن اس کے باوجود تینوں زبانوں میں جو کلام موزوں کیا وہ قابلِ دید ہے۔

☆......☆

حضرت گنگوہی کے بعد لوگوں کی عقیدت و محبت کے مرکز تین بزرگ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا شاہ

عبدالرحیم اور مولانا اشرف علی تھانوی۔

مولانا محمود الحسن دیوبند کے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے اس لیے طلبہ میں خاص طور پر مقبول تھے۔اپنے والد کی وجہ سے محمد شفیع کی ان سے خاص مراسم ہو گئے تھے۔ والد کے ساتھ ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔اس مسلسل حاضری نے ان کی طرف سے محبت وعقیدت کے جذبات فزوں تر کر دیے تھے۔ حضرت مولانا کو بھی ان سے بہت محبت ہو گئی تھی اور بے حد شفقت سے پیش آتے تھے۔اس عقیدت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ مولانا کی خدمت میں "بیعت" کے لیے حاضر ہو گئے۔ مولانا کا اصول تھا کہ کسی طالب علم کو بیعت نہ فرماتے تھے تاکہ طالب علمی کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت ہے اس میں خلل نہ آئے۔ انہوں نے محمد شفیع کو بھی یہی جواب دیا۔"طالب علمی سے فارغ ہو جاؤ پھر کریں گے۔"

طالب علم محمد شفیع پوری جانفشانی سے طلب علم میں منہمک ہو گیا تاکہ جلد سے جلد تعلیمی سرگرمیوں سے فارغ ہو کر حضرت کے ہاتھوں پر بیعت کر لے۔کوشش کر کے مشکوۃ وجلالین وغیرہ کے وہ اسباق پورے کر لیے جن کے بعد دورہ حدیث کا نمبر آتا ہے۔تمنا یہ تھی کہ اگلے سال حضرت شیخ الہند سے صحیح بخاری پڑھنے کا موقع مل جائے مگر اسی سال یہ خبریں سنی جانے لگیں کہ حضرت کا ارادہ سفر حج کا ہے۔

پورے ہندوستان میں ترکی خلافت پر اہل یورپ کی یورش کے قصے ہر وقت زبانوں پر تھے۔ مولانا محمود الحسن کی مجلس کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔اب ان کی پوری توجہ تعلیم سے زیادہ ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرا کے اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے جہاد پر لگی ہوئی تھی۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشہ عمل تیار کر چکے تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں انہوں نے اس وقت شروع کر دی تھیں جب ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں برائے نام تھیں۔انہوں نے اپنی تحریک کی ابتداء درس وتدریس سے کی دوران درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی تربیت بھی کرتے جاتے۔ ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف و جوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لیے تیار ہو گئی تو جمعیت الانصار کی داغ بیل ڈالی اور اس طرح ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد جمع کرلی اور پھر اس کے ذریعے تحریک کا جال پورے ملک میں پھیلا دیا۔

برطانوی حکومت نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک اعصابی جنگ شروع کر دی تھی۔ اس بنا پر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت جوش تھا کیونکہ وہ خلافت عثمانیہ کو اسلام کا پشت پناہ سمجھتے تھے۔

شیخ الہند نے ایک مستقل مکان اپنے گھر کے قریب کرائے پر لے رکھا تھا جس میں ان کے ہم خیال غیر مسلم حضرات اور رفقائے انقلاب بہت رازدارانہ طور پر ٹھہرائے جاتے تھے۔شیخ الہند اکثر تنہائی کے اوقات میں یارات کو ان سے ملاقات کرتے، ان لوگوں کا تعلق پنجاب اور بنگال سے تھا۔ یہ ملاقاتیں نہایت رازداری سے کی جاتی تھیں۔ قریبی لوگوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

شیخ الہند نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بیرونی ممالک میں اپنے خفیہ مشن بھیجنے کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ان کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان سے لے کر ہندوستان تک انگریز کے خلاف ایک جال بچھا دیا جائے اور کسی مناسب موقع پر برطانوی ہند پر افغانستان پر حملہ آور ہو۔ دوسری طرف ملک میں جنگ آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس کا انگریز مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ یہ زمین ہموار کرنے کے بعد دولت عثمانیہ سے تعلق قائم کرنے کے لیے جو انقلابی پروگرام کی تکمیل کے لیے ازبس ضروری تھا خود حج کا سفر اختیار کیا۔ان کے سفر حج کے بارے میں مختلف افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا ہجرت کر کے جا رہے ہیں، کسی کا خیال تھا کہ ترکی حکومت کی امداد کے لیے سفر ہے۔

محمد شفیع نے اس سال اپنا دورۂ حدیث اس اُمید پر ملتوی کر دیا کہ حضرت شیخ حج سے واپس آئیں گے تو ان کے سامنے ہوگا۔

شیخ الہند کو انگریزوں نے گرفتار کر کے مالٹا جیل بھیج دیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے دورۂ حدیث حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے سامنے کیا۔

درس نظامی کی مکمل تعلیم سے نہایت ممتاز حیثیت میں فارغ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف بائیس سال تھی۔ اس سال آپ کی شادی کر دی گئی۔

تعلیمی ریکارڈ اتنا شاندار تھا کہ اسی سال آپ کو کچھ اسباق پڑھانے کے لیے سپرد فرما دیے گئے۔ انہوں نے

زمانہ طالب علمی ہی میں سوچ لیا تھا کہ خدمت دین فی سبیل اللہ کریں گے اور معاش کے لیے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کریں گے۔ اس لیے دوران طالب علمی ہی انہوں نے کئی دوسرے فنون سیکھ لیے تھے۔ خطاطی اور کتابت سیکھ لی تھی۔ خط نسخ اور نستعلیق میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ ماہرین فن آپ کے زور قلم کی تحسین کرتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت جلد سازی میں بھی مہارت حاصل کرلی تھی۔

علمی خدمات کے معاوضے سے مستغنی رہنے کے لیے دارالعلوم میں آپ نے طب یونانی کے نصاب کی بھی تکمیل فرمائی تھی۔

جب دارالعلوم میں مدرسی حاصل ہوئی تو ایسی لذت سے سرشار ہوئے کہ وہ تمام مشاغل ترک کردیے جو ذریعہ معاش کے لیے اختیار کیے تھے اور یکسوئی کے ساتھ تدریس و افتاد تصنیف و تالیف اور تبلیغی خدمات میں ہمہ تن مشغول ہو گئے حالانکہ دارالعلوم میں مالی وسائل کی قلت تھی۔ صرف پانچ روپے ماہوار پر آپ کا تقرر ہوا تھا۔ اس مشاہرے میں اضافہ ضرور ہوتا رہا لیکن اتنا کہ جب دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو اس وقت بھی مشاہرہ 60 روپے تھا۔ قناعت کا عالم یہ تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سات سو روپے مشاہرہ کی پیشکش بار بار ہوئی مگر آپ نے دیوبند چھوڑنا پسند نہ کیا۔

تعلیم سے فراغت اور ملازمت کا بندوبست ہوجانے کے بعد سلوک وتصوف اور اصلاح باطن کی فکر ہوئی آپ کا کہنا تھا کہ کسی بزرگ کی صحبت میں رہ کر تزکیہ باطن اور ذکر اللہ کے بغیر کتابی علوم بے روح رہتے ہیں۔ شیخ الہند مالٹا جیل میں تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ علمی فراغت کے بعد وہ انہیں بیعت کریں گے لیکن اب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انہیں رہائی کب نصیب ہو۔ اس وقت کے تمام بزرگوں پر نظر ڈالی اس سلسلے میں آپ نے والد گرامی سے بھی مشورہ کیا۔ والد ماجد کی رائے میں ترجیح اس کو ہوئی کہ حضرت تھانوی کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سابقہ حاضری اور تعلیم سے ایک مناسبت قائم ہوچکی تھی۔

آپ نے والد کو ساتھ لیا اور تھانہ بھون پہنچ گئے۔ طبیعت میں راست بازی ایسی تھی کہ یہ نہیں کہا کہ حضرت کی عقیدت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا ہوں بلکہ یہ فرمایا۔

”مجھے حق تعالیٰ نے کچھ عرصہ حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضری کی توفیق بخشی ہے۔ دل کی خواہش یہ تھی کہ ان سے بیعت ہوں مگر حضرت اس وقت اسیر ہیں اور معلوم نہیں کب رہائی ہو۔ اب میں حضرت ہی سے مشورے کا طالب ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

اتنا نیک، صالح اور عالم مرید میسر آرہا تھا کوئی اور ہوتا تو کہتا ہاتھ بڑھاؤ اور بیعت ہوجاؤ لیکن انہوں نے وہ کہا جو وہی کہہ سکتے تھے۔

”اس میں کیا اشکال ہے۔ تصوف وسلوک اعمال باطنہ کی اصلاح کا نام ہے جو ایسی ہی فرض ہے جیسے اعمال ظاہرہ کی اصلاح۔ اس کو مؤخر کرنا تو میرے نزدیک درست نہیں لیکن اس کے لیے بیعت ہونا کوئی شرط نہیں۔ بیعت کے لیے شیخ الہند کا انتظار کریں۔ حضرت کے واپس تشریف لانے تک میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ میرے مشورے کے مطابق اصلاح کا کام شروع کردیں۔“ پھر فرمایا۔ ”آپ کے ذمہ دو کام ہوں گے۔ ایک اپنے حالات کی اطلاع دوسرے اس پر جو میں مشورہ دوں اس کا اتباع۔“

حضرت مولانا نے کچھ تسبیحات اور معمولات تلقین فرمائے اور ضروری نصیحتوں کے بعد رخصت فرمایا۔

سیاسی حالات روز بہ روز خراب سے خراب تر ہوتے جارہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اہل یورپ کی سازشوں نے ترکی خلافت کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مالٹا جیل میں نظر بند تھے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے کی کوششیں تیز ہوگئی تھیں۔ خلافت کمیٹی قائم ہوگئی تھی شیخ الہند کو جیل سے رہا کرانے کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔

ان تحریکوں کے نتیجے میں 1920ء میں شیخ الہند کو مالٹا جیل سے رہا کردیا گیا۔ پانچ سال بعد آپ دارالعلوم تشریف لائے تو زیارت و ملاقات کے لیے انسانوں کا سیلاب امڈ آیا۔

شوق ملاقات کی آگ میں تو سب ہی جل رہے تھے۔ پروانہ خاص محمد شفیع کو یہ جلدی تھی کہ جلد از جلد بیعت ہوجائے۔ سیاسی حالات ایسے نہیں تھے کہ انتظار کیا جاتا لیکن پروانوں کی بھیڑ تھی کہ چھٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ خلوت میسر ہی نہیں آرہی تھی کہ دل کا حال کہا جاتا۔ ایک دن موقع مل ہی گیا۔

”حضرت نے فرمایا تھا کہ تعلیم سے فراغت کے بعد

بیعت فرمائیں گے۔"

"میں حاضر ہوں۔ مجھے وعدہ یاد ہے۔"

خوش قسمتی نے صدا لگائی۔ اضطراب نے بڑھاوا دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دو ہاتھ آگے بڑھے اور محمد شفیع کو بیعت طریقت نصیب ہوگئی۔

شیخ الہند نے چند تسبیحات کی تلقین فرمائی۔ اس سے زیادہ استفادہ کا موقع نہیں تھا۔

مالٹا سے رہائی کے بعد شیخ الہند تقریباً ڈیڑھ سال حیات رہے۔ دنیا کو ان کے اٹھ جانے کا غم تھا لیکن محمد شفیع کو یہ دکھ تھا کہ وہ استفادے سے محروم رہا۔ سلوک و تصوف کا جو سفر شروع ہوا تھا راستے میں ہی رک گیا طبیعت پر ایسی افسردگی طاری ہوئی کہ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ کئی سال اسی عالم میں گزر گئے۔ ایک روز اسی حالت بے تابانہ میں تھانہ بھون تشریف لے گئے۔

گھریلو مصروفیات نے اتنا وقت بھی نہیں دیا تھا کہ مولانا اشرف علی تھانوی سے خط و کتابت کرتے۔ اب جو حاضر ہوئے تو شرمندگی دامن گیر تھی۔

"حضرت میں شرمندہ ہوں کہ حاضری تو کیا دیتا مراسلے کو بھی مکالمہ نہ بنا سکا۔"

"انسان کے ساتھ دنیا بھی تو لگی ہوئی ہے۔ اب تمہاری شادی بھی ہوگئی ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ نہیں ملی ہوگی فرصت۔ اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔"

حضرت میری تمنا تو بہت ہے کہ تصوف و سلوک کے مراحل طے کروں مگر سنتا ہوں کہ بڑے مجاہدوں اور محنت و فرصت کا کام ہے۔ میں بچپن سے ضعیف ہوں۔ زیادہ محنت نہیں ہوتی اور فرصت بھی کم ہے۔ تمام وقت درس و تدریس اور مطالعہ میں گزرتا ہے۔ کیا ان حالات میں بھی مجھے کوئی حصہ نصیب ہوسکتا ہے۔

"آپ نے یہ کیا کہا۔ کیا اللہ کا راستہ صرف قوی لوگوں کے لیے ہے؟ کم فرصت لوگوں کے لیے نہیں۔ یہ راستہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ ہاں ہر ایک کے لیے عمل کا راستہ مختلف ہے۔ ہم آپ کو ایسا طریقہ بتائیں گے جس میں نہ قوت کی ضرورت ہے نہ فرصت کی۔" پھر فرمایا۔ "فرائض و واجبات اور سنن وغیرہ جو سب مسلمان ادا کرتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں۔ آپ تین چیزوں کی پابندی اور کرلیں۔ انشاء اللہ سارا سلوک اسی سے طے ہو جائے گا۔ اول یہ کہ تقویٰ اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ فضول کام، کلام و مجلس اور ملاقات سے پرہیز کریں یعنی ایسے کاموں سے بچیں جس میں دین کا فائدہ ہو نہ دنیا کا اور تیسرے بقدر ہمت و فرصت کچھ تلاوت قرآن روزانہ کرلیا کریں۔"

اس نصیحت و تلقین کے بعد آپ نے چند روز تھانہ بھون میں قیام کیا۔ اس دوران تعلیم و شفقت کے پھول برستے رہے۔ یہ نورانی بارش اس شدت سے ہوئی کہ محمد شفیع کے قلب کا ہر گوشہ حضرت تھانوی کی محبت سے بھر گیا۔

اب کسی کروٹ چین نہ آتا تھا مسلسل خط کتابت اور آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب بھی دارالعلوم کے مشاغل سے فرصت ملتی تھانہ بھون حاضر ہو جاتے۔ ایسا بھی ہوا کہ کئی کئی مہینے قیام رہا۔ دارالعلوم کی سالانہ تعطیلات میں رمضان کا پورا مہینا مع اہل و عیال تھانہ بھون میں ہی گزرتا۔

وہ حضرت تھانوی کے مرید نہیں ہوئے تھے لیکن احترام پیر و مرشد ہی کی طرح تھا۔ پیر و مرشد سے ملاقات کے بعد حضرت محمد شفیع کی زندگی یکسر تبدیل ہوکر رہ گئی۔ اب تک وہ محض مدرس و معلم تھے لیکن اب سلوک کی منزلیں طے کررہے تھے۔ خط کتابت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس طرف سے جو ارشاد ہوتا اس طرف اس پر عمل ہوتا جن کیفیات کا سامنا ہوتا، خط میں لکھ بھیجتے۔ دنیاوی معاملات تک لکھ بھیجتے اور مشورے کی روشنی میں اس پر عمل ہوتا۔ جتنے بچے ہوئے ان کے نام بھی حضرت تھانوی کے بتائے ہوئے رکھے۔

☆......☆

گہری سردیوں کی تاریک رات میں ریل نے تھانہ بھون اسٹیشن کو سلامی دی اور لڑکھڑاتی ہوئی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ مولانا محمد شفیع حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے اسی ریل سے سفر کررہے تھے کوئی سامان ساتھ نہیں تھا۔ اسٹیشن آتے ہی پلیٹ فارم پر کود گئے۔ اسی وقت ایک آواز آئی۔ "قلی، قلی" کوئی مسافر تھا جو مع اہل و عیال اس اسٹیشن پر اترا تھا۔ سامان بھی ساتھ تھا۔ رات کا وقت، چھوٹا سا اسٹیشن، سردی بلا کی۔ اس وقت قلی کا ملنا محال تھا۔ اسٹیشن پر روشنی کا بندوبست بھی نہیں تھا۔ آواز پھر آئی قلی، قلی۔ مولانا محمد شفیع کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی چیختا رہے اور وہ اسٹیشن سے باہر نکل جائیں۔ انہوں نے اپنا رومال سر پر لپیٹا اور اوپر سے چادر لپیٹ لی۔ اب کوئی دیکھتا تو مزدور ہی کہتا۔ دوڑتے ہوئے اس مسافر کے پاس پہنچے۔ "جلدی کرو سامان میرے سر پر رکھواؤ۔"

ان صاحب نے اوپر تلے دو صندوق ان کے سر پر رکھوا دیے۔ وہ کوئی پیشہ ور مزدور تو تھے نہیں۔ اتنا وزن اٹھانے پر پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ ایک چھوٹا بکس انہوں نے ہاتھوں میں دینا چاہا۔

''حضور، میں کمزور آدمی ہوں زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ تیسرا بکس آپ خود اٹھالیں۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ صاحب یقیناً جھگڑا کرتے کہ جب تمہیں پیسے دیں گے تو سامان ہم کیوں اٹھائیں لیکن رات گئے یہ کمزور قلی مل گیا تھا یہی بہت تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے لیکن وہ ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتے رہے اس وقت کوئی سواری نہیں تھی لہٰذا آبادی تک پیدل ہی جانا تھا۔ جیسے تیسے ان کی قیام گاہ آگئی۔ انہوں نے سامان اتارا۔ وہ صاحب یہ کہہ کر اندر گئے کہ ابھی آکر پیسے دیتے ہیں۔ بس یہ موقع اچھا تھا۔ مولانا وہاں سے غائب ہو گئے۔ دوسرے دن وہ صاحب خانقاہ میں ملے۔ نہایت تعظیم سے پیش آئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ وہی رات والا قلی ہے، بلکہ وہ تو کسی صاحب کو رات کا قصہ سنا رہے تھے اور اس قلی پر تعجب کر رہے تھے جو مزدوری لیے بغیر ہی غائب ہو گیا تھا۔

حضرت مولانا محمد شفیع تعلیمات پر اس خوبی سے عمل کر رہے تھے اور اس راہ پر اس شان سے چل رہے تھے کہ صرف چار سال کے عرصے میں ''رہبر'' کو خود یہ اندازہ ہو گیا کہ جس مسافر طریقت نے ان کی انگلی پکڑ کر سفر کا آغاز کیا تھا راستے کے نشیب و فراز سے نہ صرف واقف ہو چکا ہے بلکہ ایسا باخبر ہو گیا ہے کہ ناواقفوں کی رہبری بھی کر سکتا ہے۔

قربان جایئے۔ رہبر نے خود آواز دی

مشفق مولوی محمد شفیع صاحب

مدرس دارالعلوم دیوبند سلمہ اللہ

السلام علیکم

بے ساختہ قلب پر وارد ہوا کہ آپ کو مع دوسرے احباب بیعت و تلقین کی اجازت ہو۔ پس توکل علی اللہ اس وارد پر عمل کرنے کے لیے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر کوئی طالب حق آپ سے اس کی درخواست کرے تو قبول کرلیں۔ اس سے متعلم کے ساتھ معلم کو بھی نفع ہوتا ہے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں اور اپنے خاص معین پر اس کو ظاہر بھی کر دیجیے۔

بہ نظر احتیاط بیرنگ لفافہ بھیجتا ہوں۔

والسلام

بندہ اشرف علی از تھانہ بھون

ربیع الثانی 1349ھ

انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نوبت یہ آئے گی۔ عمریں گزر جاتی ہیں اور یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ یہاں خدمت میں حاضری کو صرف چار سال گزرے تھے اور حکیم الامت اپنی خلافت سے سرفراز فرما رہے تھے۔

اپنی حیرت کو لفظوں میں ڈھالنے کے لیے حضرت تھانوی کے مکتوب کا جواب لکھنے بیٹھ گئے۔

والا نامہ گرامی صادر ہوا۔ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا'' کہ ناکارہ و آوارہ شفیع اور بیعت و تلقین کی اجازت!

میں تو واللہ کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتا۔ سلوک کے ابتدائی مراحل سے بھی آشنا نہیں کسی دوسرے کو کیا تلقین کروں گا اور پھر ایسا کون بے وقوف ہو گا جو مجھ سے درخواست بیعت کرے گا۔

بار بار نامہ کو دیکھتا ہوں اور اپنی بے کاری پر نظر کرتا ہوں تو حیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ جیسے غفلت شعار بے کار کو اتنے بڑے منصب سے نوازنا کیا اس منصب کی بدنامی کا سبب نہ ہو۔ اس خیال سے یوں جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت نہ ہو تو اچھا ہے۔

جواب آیا۔

''آپ کو اجازت اسی لیے دی گئی ہے کہ آپ خود کو ایسا سمجھتے ہیں۔''

پھر آپ پر کچھ کیفیات طاری ہونے لگیں جس سے آپ نے بذریعہ خط حضرت تھانوی کو مطلع کیا۔

''اس کا الحمدللہ اتنا فائدہ بھی ہوا کہ گناہوں سے بچنے کی کچھ ہمت بڑھ گئی اور نماز میں کچھ من جانب اللہ تعالیٰ حضور کی ایک کیفیت پیدا ہونے لگی جو پہلے نہیں تھی بلکہ پہلے یہ کیفیت گاہ گاہ ہوتی تھی اور اب اکثر رہنے لگی ہے۔''

جواب آیا۔ ''مجھ کو یہی امید تھی۔''

ان کیفیات میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ سب حضرت تھانوی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔

☆......☆

حضرت مولانا محمد شفیع نے تدریس کا سلسلہ ابتدائی کتابوں سے شروع کیا تھا بالآخر بزرگوں کی خواہش و ایما پر آپ کو دورہ حدیث کے اساتذہ میں شامل کرلیا گیا۔

دارالعلوم کی طرف سے سب سے پہلے امام مالک کا درس آپ کے سپرد ہوا اس کے بعد دورہ حدیث کی دوسری

کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی۔

آپ کے استاد سید میاں اصغر حسین "سنن ابو داؤد" پڑھاتے تھے۔ وہ کچھ دنوں کی چھٹی پر گئے تو یہ درس آپ کے سپرد کر کے تشریف لے گئے۔ پھر استاد موصوف کی خواہش پر مستقل طور سے یہ درس آپ ہی کی طرف منتقل ہو گیا اور سال ہا سال جاری رہا۔

مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تو دارالعلوم کے ذمہ داران کے لیے ان کا نعم البدل تلاش کرنا مشکل ہو گیا۔ ایک ایسی جامع شخصیت کی ضرورت تھی جو دارالعلوم دیوبند کے تحقیقی معیار کے مطابق اس خلا کو پُر کر سکے۔ بالآخر اساتذہ اور ذمہ داران دارالعلوم کی نگاہِ انتخاب مولوی محمد شفیع پر جا رکی اس وقت آپ کی عمر 35 سال تھی کہ مفتی محمد شفیع کے نام سے مانے جانے لگے۔

اس عہدے کو قبول کرنے سے پہلے مولانا اشرف علی تھانوی سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ انہوں نے بذریعہ خط ان سے رابطہ کیا۔

"ایک ضروری عرض اس وقت یہ ہے کہ مدرسہ میں موجودہ مفتی صاحب کے متعلق ارباب حل و عقد کو عام شکایت ہے اس لیے وہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے بھی اس سلسلے میں ایک مرتبہ میرا نام لیا گیا تھا مگر بات نامکمل رہ گئی تھی۔ اس مرتبہ پھر یہ سلسلہ اٹھا ہے اور یہاں اکثر حضرات مجھے اس کام کے لیے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔

کام فی نفسہ سخت ہے اور پھر مجھ جیسے ناکارہ و نااہل کے لیے جس کو اس کام کی الف بے تک کچھ زیادہ نوبت بھی نہیں آئی البتہ یہ نفع بھی اس میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کام قابو میں آ گیا تو دینی نفع بھی بڑا ہے اور درس و تدریس میں جو دماغی تکلیف میری وسعت سے زیادہ ہو رہی تھی اس میں تخفیف ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا حل حضرت ہی کی زبان فیض ترجمان سے چاہتا ہوں۔"

حضرت تھانوی کا مختصر جواب آیا۔ "قبول کر لینا چاہیے۔" اس کے ساتھ ہی آپ کی تشفی کے لیے ایک حدیث مبارکہ بھی لکھ کر بھیجی جس کا ترجمہ یہ تھا۔

"اگر تمہیں کسی منصب کے لیے مجبور کیا جائے تو قبول کر لینا چاہیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی۔"

اس مشورے کے بعد آپ نے اس عہدے کو قبول کر لیا۔ درجات میں ایک درجے کا اضافہ اور ہو گیا۔ اب آپ مفتی محمد شفیع کے نام سے سرفراز ہوئے۔

آپ نے فتویٰ کا کام اس جانفشانی کے ساتھ جاری رکھا کہ دارالعلوم کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹے کی پابندی تھی مگر آپ روزانہ دس بارہ گھنٹے اس میں لگاتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس موقع پر مفتی محمد شفیع نے ایک نہایت اہم انقلابی اور نافع قدم اٹھایا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ دارالعلوم دیوبند سے جو فتاویٰ جاری ہوتے ہیں ان کی اشاعت کا کوئی بندوبست نہیں۔ اس کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ ان فتاویٰ سے وہی شخص مستفید ہوتا ہے جس نے فتویٰ طلب کیا ہے اور پھر یہ فتویٰ رجسٹر میں بند ہو جاتا ہے۔ اگر ان کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے تو عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک بڑی دینی خدمت ہو گی۔ ان دنوں آپ کی مصروفیات عروج پر تھیں۔ مدرس بھی تھے، مفتی بھی، تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا۔ ان مصروفیات کے باوجود آپ نے ایک علمی ماہ نامہ "المفتی" کے نام سے جاری فرمایا اور اس بے بضاعتی کے عالم میں کہ اس کے مالک و مدیر بھی خود تھے، ناظم و ناشر بلکہ محرر و چپراسی بھی خود ہی تھے۔ کتابت کا فن جو کبھی سیکھ لیا تھا اب کام آ رہا تھا۔

اس رسالے کا مقصد یہ تھا کہ اس میں دارالعلوم کی جانب سے جاری ہونے والے فتاویٰ کو ترتیب وار شائع کیا جائے۔ اس میں آٹھ صفحے ان فتاویٰ کے لیے رکھے گئے جو مفتی اعظم ہند حضرت مولانا عزیز الرحمٰن نے اپنے دور میں تحریر فرمائے تھے اور آٹھ صفحے ان فتاویٰ کے لیے رکھے گئے جو ان کے قلم سے ادا ہوئے تھے۔ باقی صفحات میں آپ کے دیگر علمی، ادبی، تاریخی و اصلاحی مضامین کا بھی نہایت گرانقدر سرمایہ شائع ہوتا رہا۔ کہیں نظم کی صورت میں کہیں نثر کی شکل میں۔ آپ کی شعری تخلیقات بھی اسی رسالے میں شائع ہوئیں۔ یہ تمام تخلیقات بعد میں کشکول کے نام سے شائع ہوئیں۔

مصروفیات کے ہجوم میں "المفتی" کا اضافہ اور ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ والد گرامی پر بیماری کا غلبہ ہوا۔ آپ کو اپنے والد سے بڑی محبت تھی۔ صبح شام والد کی خدمت میں حاضری دینا معمول تھا۔ عصر سے مغرب تک کا تو پورا وقت ہی والد کی خدمت میں گزرتا تھا۔

والد کی بیماری و مرض وفات میں شدت پیدا ہو گئی تو تمام معروفیات ترک کر کے والد کی تیمارداری میں مشغول ہو گئے۔ تمام معروفیات ثانوی حیثیت میں داخل ہو گئیں۔ عرصہ تک تھانہ بھون کی حاضری سے بھی محروم ہو گئے۔ پھر وہ وقت آ ہی گیا جو ہر ذی نفس کے لیے مقرر ہے۔ والد گرامی کا انتقال ہو گیا۔

والد کے اٹھتے ہی مرشد کی یاد آئی۔ اس دن خط لکھا۔

یہ دن شدنی تھا۔ ہو گیا۔ والد کی جو شفقت اولاد پر ہوتی ہے وہ معلوم مگر والد مرحوم کی میرے ساتھ کچھ ایسی خصوصیت تھی کہ ان کی شفقت مجھ پر والدہ کی طرح تھی۔ ہر وقت ان کی خدمت میں رہنے کا عادی تھا۔ طبیعت بے چین ہے۔ بے چینی یہ ہے کہ دیکھیے ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔

جواب آیا۔

"یہ بے چینی تو ان کے اور آپ کے حق میں رحمت ہے ورنہ دعائے مغفرت و ایصال ثواب کا اہتمام کیسے ہوتا۔ جب اہتمام نہ ہوتا تو اس اہتمام کا ثواب کیسے ملتا۔"

☆......☆

چھاؤں نے ذرا رخ بدلا تو دھوپ نے قدم نکالا۔ والد کا سایہ سر سے اٹھتے ہی اچانک احساس ہوا کہ کتنی بڑی ذمہ داری سر پر آن پڑی ہے۔ کل اٹھارہ افراد کی مکمل کفالت آپ کو تنہا کرنی تھی۔ کوئی اور تھا نہیں جو آپ کا ہاتھ بٹاتا کوئی بھائی تھا نہیں اور اپنے بچے ابھی چھوٹے تھے۔ علمی مشاغل کا حال وہی تھا۔ مفتی کی ذمہ داریاں الگ تھیں۔ ایک تجارتی کتب خانہ "دارالاشاعت" قائم کر رکھا تھا اس کی دیکھ بھال بھی ضروری تھی۔

اس بوجھ نے آپ کو بہت جلد تھکا کر رکھ دیا۔ سخت بیمار پڑ گئے۔ بیماری اتنی بڑھی کہ رخصت لے کر گھر بیٹھنا پڑا۔ گزارہ تنخواہ ہی میں مشکل تھا۔ وضع تنخواہ کے ساتھ کیسے گزرتی۔ گھر بیٹھے تو مالی مشکلات نے بھی گھر دیکھ لیا لیکن پورے گھرانے ہی کو صبر وشکر کے ساتھ گزارہ کرنے کی عادت تھی۔ یہ مشکل دن بھی گزر گئے۔ رفتہ رفتہ طبیعت بھی ٹھکانے پر آنے لگی۔ پوری طرح صحت مند نہ ہوئے تھے کہ ملازمت کی چھٹی ایک مرتبہ پھر سنبھال لی۔

اب کاروان ملت اس منزل پر آ گیا تھا۔ جب منزل بہ منزل سفر طے کرتے ہوئے قیام پاکستان کی منزل قریب آنے لگی تھی۔ ایک نئے وطن کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا تھا اس لیے علماء کا اس میں دلچسپی لینا ضروری ہو گیا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے زعمائے مسلم لیگ کو تبلیغی خطوط اور وفود بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ انہیں صحیح سمت کے تعین میں مدد دیں۔

مفتی محمد شفیع طبعاً سیاست سے دور تھے لیکن اب معاملہ مسلمانوں اور ان کے لیے علیحدہ وطن کا تھا اس لیے وہ بھی حضرت تھانوی کے ہم خیال ہو گئے اور تحریک پاکستان میں اپنا حصہ ڈالنے لگے۔

قائداعظم کی بعض تقاریر پڑھ کر حضرت تھانوی کو یہ احساس ہوا تھا کہ قائداعظم سیاست کو دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ آپ نے اس نظریہ کی اصلاح کے لیے ایک وفد دہلی بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ اس وفد میں مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شبیر علی صاحب کے ساتھ مفتی محمد شفیع کا نام بھی شامل کیا۔ حضرت مفتی صاحب کے لیے یہ خوشی کا پیام تھا کہ اس طرح انہیں قائداعظم سے پہلی مرتبہ ملنے کا شرف مل رہا ہے۔ قائداعظم اس لیے انہیں عزیز تھے کہ وہ مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ معروف معنوں میں مذہبی رہنما نہیں لیکن مسلمانوں کے رہنما ہیں اور ان کے لیے الگ وطن کے حصول کی کوششوں میں مشغول ہیں۔ تین علماء پر مشتمل یہ وفد دہلی پہنچا اور قائداعظم سے ملاقات کی۔

وفد کے ارکان نے اپنا مطمح نظر بیان کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان کسی تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس تحریک کو شریعت کے مطابق نہ چلائیں۔ اس تحریک کے چلانے والے خود کو احکام اسلام کا نمونہ نہ بنائیں اور ان کے پیرو شعائر اسلام کی پابندی نہ کریں۔

قائداعظم کا اب بھی اصرار تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیے۔

وفد کے ارکان نے دلیل دی، مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدان کے جرنیل بھی۔

ان علماء کو امید ہو گئی کہ تحریک پاکستان، شریعت کے مطابق چلے گی اور نئے وطن میں اسلام کا بول بالا ہو گا لیکن جیسے جیسے تحریک پاکستان آگے بڑھتی گئی اکابر علماء اپنی رائے کے مطابق دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ جمعیت علمائے ہند کے سرکردہ زعماء کا تھا جو متحدہ قومیت کا حامی اور تقسیم ہند کے خلاف تھا۔ دوسرا گروہ علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل تھا جو مولانا اشرف

علی تھانوی کی رائے کے مطابق مسلمانانِ ہند کو کافروں کی غلامی اور استبداد سے نجات دلانے کے لیے قیام پاکستان کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتا تھا۔

شروع میں یہ اختلاف دارالعلوم کی چہار دیواری تک محدود رہا لیکن پھر اس میں تیزی آگئی۔ مخالف علماء کی جانب سے یہ پروپیگنڈہ کیا جانے لگا کہ مسلم لیگ بے دین امراء کی نمائندہ ہے۔ یہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں عوام مسلم لیگ کی طرف سے بدظن نہ ہو جائیں اور پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ جو علماء پاکستان کے حق میں تھے ان کی یہ ذمہ داری بن گئی کہ عوام کو اصل حقائق سے باخبر کیا جائے اور اس کا اظہار کھل کر کیا جائے کہ پاکستان کا مطالبہ سیاسی و شرعی حیثیت سے بالکل جائز ہے۔ یہ آواز پوری قوت سے ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچائی جائے۔

علماء کا جواب علماء ہی دے سکتے تھے لیکن اس اختلاف کا مسلسل اظہار نظم دارالعلوم کے لیے مناسب نہیں تھا لہٰذا مفتی محمد شفیع نے یہ تحریک چلائی کہ جو علماء پاکستان کے حق میں ہیں وہ دارالعلوم کی ملازمت سے الگ ہو جائیں اور آزادانہ طور پر تحریک پاکستان کے لیے سرفروشانہ کام کریں۔ انہوں نے پیر و مرشد حضرت مولانا تھانوی سے مشورہ کیا اور دارالعلوم سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ بچپن، جوانی اور کہولت کے شب و روز اسی چہار دیواری میں گزرے تھے۔ ان کے لیے یہ صرف درس گاہ نہیں تھی بلکہ دنیا و آخرت کی امیدوں کا مرکز تھی۔ آغوشِ مادر تھی۔ اس سے منہ موڑنا آسان نہیں تھا لیکن پاکستان کے لیے سب کچھ قربان تھا۔ سوال مسلمانوں اور ان کی بقا کا تھا۔ بالآخر مولانا شبیر احمد عثمانی کی معیت میں مفتی محمد شفیع اور چند دوسرے علماء دارالعلوم کی خدمات سے مستعفی ہو گئے۔

استعفیٰ دینے کے بعد آپ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ حضرت تھانوی نے عربی کا ایک مصرعہ معمولی تصرف کے ساتھ پڑھا۔

(لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھ سے کھو دیا اور وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے۔ ترجمہ)۔

اب آپ کے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں تھی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت تھانوی رحلت فرما گئے۔ یہ صدمہ ایسا تھا کہ سنبھلنے میں برسوں لگ جاتے لیکن قیام پاکستان کی منزل سامنے تھی۔ اس کے لیے جدوجہد کے مراحل درپیش تھے۔

کچھ دن تھانہ بھون میں گزار کر دیوبند واپس آگئے اور جدوجہد پاکستان میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے ایک مستقل رسالہ ”کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ“ تصنیف فرمایا جس میں اس مسئلے کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے واضح فرمایا گیا تھا۔ اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں ثابت کیا کہ موجودہ حالات میں کانگریس کی حمایت سے دراصل کفر کی حمایت لازم آئے گی اور اس میں حصہ لینا قرآن و سنت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں۔

یہ رسالہ بڑی تعداد میں شائع ہوا۔

1945ء میں انتخابات ہوئے یہ انتخابات تحریک پاکستان کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ سہارن پور کے حلقہ انتخاب سے نوابزادہ لیاقت علی خان کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی جانب سے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں مسلم لیگ کی کامیابی سب ہی کو مشکل نظر آرہی تھی۔ حامیانِ مسلم لیگ سخت تردد میں تھے سب کا ایک ہی خیال تھا کہ یہ سہارن پور ہے۔ یہاں مفتی محمد شفیع کے فتوے کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ وہ اگر لیاقت علی خاں کے حق میں فتویٰ دے دیں تو ان کا جیتنا یقینی ہوگا۔ پولنگ ہونے میں ایک دو روز ہی رہ گئے تھے۔ ایک صاحب کو فوراً دیوبند بھیجا گیا۔ وہ مفتی محمد شفیع کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حالات سے آگاہ کیا۔ مفتی صاحب نے فتویٰ لکھوا دیا۔

”کانگریس کی حمایت کفر کی حمایت ہے۔“

یہ فتویٰ پوسٹروں کی شکل میں راتوں رات تمام حلقہ انتخاب میں تمام دیواروں پر چسپاں کر دیا گیا۔ صبح لوگ سو کر اٹھے اور دیواروں پر لگے پوسٹروں پر نظر پڑی تو اچھل پڑے۔ مفتی محمد شفیع کا نام دیکھتے ہی ان کی رائے بدل گئی۔ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں میں ان کی اتنی عقیدت تھی کہ فتویٰ پڑھتے ہی لیاقت علی کے حق میں نعرے لگنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فضا یکسر تبدیل ہو گئی۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں کو شاندار کامیابی ملی۔

انہی دنوں جمعیت علمائے اسلام کا قیام عمل میں آیا جس کے مقاصد میں سرفہرست یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان کے لیے مؤثر جدوجہد کی جائے اور جو مسلمان ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں انہیں اس مجاہدانہ جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے بذریعہ تبلیغ آمادہ کیا جائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس عظیم قیادت کی

موجودگی نے مفتی محمد شفیع کے دل میں بھی تحریک پیدا کی اور آپ اس میں شامل ہو گئے اور مجلس عاملہ کے رکن بنائے گئے۔

جمعیت علمائے اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس حیدرآباد سندھ میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت علامہ شبیر احمد عثمانی کو کرنی تھی لیکن عین وقت پر انہیں شدید علالت پیش آ گئی۔ حضرت مفتی محمد شفیع کی عالمانہ صلاحیت کے سب ہی معترف تھے لہٰذا شبیر احمد عثمانی کی جگہ انہیں اس کانفرنس کے لیے سندھ روانہ کیا گیا۔

علماء اور عوام کا جم غفیر موجود تھا کہ مختلف تقاریر کے بعد مفتی صاحب خطبہ صدارت کے لیے اسٹیج پر تشریف لائے اور پھر دلائل و براہین کا ناقابلِ فراموش خطبہ عوام کے سامنے تھا۔

اس وقت قائداعظم اور مسلم لیگ پر ایک اعتراض شد و مد سے کیا جا رہا تھا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ مسلم لیگ کے لیڈر علم دین سے بے بہرہ اور اسلامی شعائر سے بے پرواہ ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی بجائے کانگریس کی حمایت کرنی چاہیے۔ مفتی محمد شفیع نے اس بحث کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا۔

اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر و قائد ہونا اور چیز ہے اور امارت شرعیہ اور چیز۔ بہت سے شبہات صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دے کر اس کے احکام اس پر جاری کیے جاتے ہیں اور اس کی تمام شرائط و صفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائداعظم قرار دیا ہے نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں۔ ان سے حرام و حلال کے احکام کا فتویٰ لیا جائے۔ ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لیے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ہندو اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر آزادی ہند کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس وقت یہ جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں آئین اور قانون کی ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لیے محمد علی جناح سے بہتر نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں نہیں بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں کس قدر بدنصیبی ہے اس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کے جھنڈے کے تلے جنگ آزادی لڑنے میں محض اس لیے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ اور طہارت کے خاص اوصاف نہیں پاتی۔

ریل، موٹر، جہاز کا ڈرائیور مقرر کرنے کے وقت بڑے سے بڑا متقی، دین دار اور دانش مند صرف اس کا اطمینان ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیوری کے فن میں ماہر ہے یا نہیں۔ اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال و افعال کا اچھا ہونا نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔

ایسے ہی اور دوسرے عقلی دلائل دیے کہ بعد شرعی دلائل سے اپنی تقریر کو سجایا۔

”حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب ”السیاسۃ الشرعیہ“ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کسی صوبے دار حاکم نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں ایک فوجی عہدہ کسی شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور دو آدمی میری نظر میں ہیں ایک تو نہایت قوی اور فنون حرب سے واقف ہے مگر پابند شرع نہیں اور دوسرا انہایت متقی پارسا ہے مگر قوی اور ماہر فن نہیں۔ آپ فیصلہ فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو یہ منصب سپرد کروں؟

آپ نے جواب دیا۔

”قوی کی قوت تو مسلمانوں کے کام آئے گی اور اس کے برے اعمال کی خرابی اس کی ذات کو پہنچے گی اور متقی کا تقویٰ اس کی ذات کے لیے اور اس کے ضعف ناواقفیت سے جو نقصان ہوگا وہ سب مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔“

کانفرنس ختم ہوئی تو مفتی محمد شفیع کی تقریر نے دلوں میں یہ جذبہ راسخ کر دیا تھا کہ مسلمان دینی اعتبار سے کیسا بھی گیا گزرا ہو کافر و مشرک سے بہرحال بہتر ہے۔

آپ کا یہ خطبہ صدارت ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر ان لوگوں تک پہنچا جو اس کانفرنس میں شریک نہیں تھے اور لوگوں کے قلوب کو متاثر کرنے کا باعث بنا۔

قیام پاکستان اور تقسیم ہند کا جو نقشہ تجویز کیا گیا تھا اس پر غور کرنے کے لیے قائداعظم نے مرکزی اسمبلی کے تمام مسلم ارکان کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ مفتی محمد شفیع اور شبیر احمد عثمانی اسمبلی کے رکن نہیں تھے لیکن یہ ان دونوں کی خدمات کا تقاضا تھا کہ خصوصی دعوت پر یہ دونوں حضرات بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔

11 جون 1947ء کو مفتی محمد شفیع اور مولانا شبیر احمد

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

عثمانی نے دہلی میں ایک اور ملاقات کی۔ شبیر احمد عثمانی نے قائداعظم کو حصول پاکستان پر مبارک باد پیش کی۔

قائداعظم نے فرمایا۔ ”مولانا اس مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں آپ ہی کی کوششوں سے یہ کامیابی ہوئی۔“ اس کے بعد قائداعظم نے نہایت تشویش کے ساتھ فرمایا۔ ”اس وقت سب سے اہم مسئلہ سلہٹ (بنگال) اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا ہے اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔“

ان حضرات نے فرمایا۔

”انشاء اللہ پاکستان اس میں کامیاب ہوگا۔“

حصول پاکستان میں علماء کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور خصوصیت کے ساتھ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع کی خدمات ناقابلِ فراموش تھیں۔

ان مخلصانہ کوششوں کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور پاکستان کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔

نئی سرزمین پاکستان میں پہلا جشن آزادی منایا جانے والا تھا۔ خدا کا شکر کہ بانیان پاکستان نے تحریک پاکستان کے اس سپاہی مفتی محمد شفیع کو فراموش نہیں کیا۔ اس جشن میں انہیں بھی مدعو کیا گیا لیکن وہ ان دنوں سخت علیل تھے۔ اپنی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے تڑپتے رہے لیکن سفر کے قابل نہ تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی اس تقریب میں شرکت کے لیے کراچی گئے اور قائداعظم کی خواہش پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اپنے دست مبارک سے بلند فرمایا۔

پاکستان بن گیا تھا اور ہندوؤں کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت دہلی، مشرقی پنجاب اور کئی دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ راستے مخدوش ہوگئے۔ دیوبند محفوظ تھا لیکن دہلی پڑوس میں تھا۔ وہاں سے آنے والی خبریں تھیں کہ دل دہلا رہی تھیں۔

فراقِ پاکستان میں آٹھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ہوا کا تازہ جھونکا آیا۔ شبیر احمد عثمانی کا گرامی نامہ ملا۔

شبیر احمد عثمانی پاکستان پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے رسوخ استعمال کیے اور مفتی صاحب کو مع اہل و عیال پاکستان لانے اور ان کے سفر کا مکمل انتظام کردیا اور انہیں مطلع بھی کردیا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے تو تعمیر شدہ مکان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اس سال مکان کی توسیع و تعمیر کرائی تھی۔ مکان کی تختی کے لیے شعر موزوں کیا تھا۔

دنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

غالباً سفرِ آخرت کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا گیا تھا لیکن اب اس کے دوسرے ہی معنی نکل رہے تھے۔ اب کسی اور کو یہاں مقیم ہونا تھا اور انہیں پاکستان ہجرت کرنی تھی۔

مکان سے نظر ہٹی تو وطن عزیز نے دامن پکڑا۔ بچپن یاد آیا۔ جوانی نے جھلک دکھائی، بڑھاپے کا خیال آیا دیوبند میں رہتے ہوئے 53 سال گزر گئے تھے۔ کبھی ایک مہینے سے زیادہ ان گلیوں کو چھوڑا نہیں تھا اور اب نہ جانے کب دیکھنے کو ملے۔ دارالعلوم کی دیواریں نظروں میں گھوم گئیں۔ وہ احباب یاد آئے جنہیں اب ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنا تھا۔ ایک طرف یہ خیالات تھے دوسری جانب وہ ملک تھا جو مدتوں کی تمنا تھا۔ جس کے لیے راتیں جاگیں دن کاٹے تھے۔ کوئی مالی منفعت نہیں تھی بس یہ خیال تھا کہ وہاں جانا خدمت دین ہے۔

ہجرت تو بذات خود ایک عبادت ہے۔ آپ کی عمر اس وقت 53 سال تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے ہجرت نبوی کی سنت کا اتباع نصیب فرمایا۔ آنحضرت کا سن شریف بھی ہجرت کے وقت 53 سال ہی کا تھا۔

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

اپنی عمر کا بہترین حصہ اپنے جدی مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پانچ بچوں کے ساتھ نہایت تنگی سے گزارا تھا۔ اب اللہ نے اتنا دے دیا کہ مکان سے ملحق کچھ زمین خرید کر مکان اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرایا تو ہجرت کا پیغام آگیا۔ اپنے ساتھ زوجہ اور غیر شادی شدہ بچوں کو لیا۔ کوئی سامان ساتھ نہ تھا صرف بدن کے کپڑے اور چند مسودات ساتھ لیے باقی سب سامان اور کتابیں وہیں چھوڑیں یکم مئی 1948ء کو دہلی کے لیے روانہ ہوئے وہاں سے براستہ کھوکھراپار کراچی پہنچ گئے۔

ایک مہربان نے عبداللہ ہارون روڈ پر رہنے کے لیے ایک فلیٹ دے دیا۔ فلیٹ بھی ایسا کہ آسمان صرف دریچے سے نظر آتا تھا۔ یہ خدشہ الگ کہ یہ فلیٹ نہ جانے کب ہاتھ سے نکل جائے۔ یہ تنگ فلیٹ اپنی جگہ لیکن پاکستان بننے اور یہاں پہنچنے کی خوشی ایسی تھی کہ کبھی بھول کر بھی دیوبند کا دو منزلہ مکان یاد نہ آیا۔ نہ یہ گلا بھی زبان پر آیا کہ ہم تو اپنا ذاتی مکان چھوڑ کر آگئے۔ اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملا۔

کوئی روزگار نہیں تھا۔ ضروریات کا پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ دیوبند میں جو تجارتی کتب خانہ دارالاشاعت کے نام سے کام کر رہا تھا۔ اس نے احکام حج کے نام سے دو کتابچے شائع کیے اور بڑے بیٹے نے جو اس کتب خانے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہ دونوں کتابچے کچھ تعداد میں تھیں بذریعہ ڈاک آپ کو بھیجے کہ انہیں فروخت کر کے کچھ منافع کما لیا جائے۔ خوش قسمتی سے یہ زمانہ حج کا تھا۔ مفتی صاحب نے اپنے دو بیٹوں ولی رازی اور رفیع عثمانی کو اپنے پاس بلایا۔

"کراچی میں دینی کتابیں ملتی نہیں ہیں۔ حاجیوں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ تم دونوں اگر حاجی کیمپ جا کر ان کتابوں کو فروخت کر آؤ تو ہر روپے کی فروخت پر تمہیں چار آنے ملیں گے۔"

"ہم یہ کتابیں فروخت کیسے کریں گے۔"

"خیموں کے پاس جا کر آواز لگانا۔ جسے کتاب چاہیے ہوگی وہ خرید لے گا۔"

دونوں بچے موجودہ حیدرآباد کالونی پہنچ گئے جہاں حاجی کیمپ ہوا کرتا تھا۔ خیموں کے آس پاس آواز لگا کر گشت کرتے رہے۔ ولی رازی نے ساڑھے سات روپے کی کتابیں فروخت کیں جب کہ محمد رفیع عثمانی چھوٹے تھے آواز لگانے میں شرم آ رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں کوئی کتاب فروخت نہیں ہوئی مگر والد نے انعام انہیں بھی دیا۔

جب یہ کتابیں ایک دو روز کی فروخت کے بعد ختم ہو گئیں تو پھر وہی معاشی تنگی، یہ بڑا مشکل وقت تھا۔ ایک دوست کی راشن کی دکان تھی۔ وہاں سے قرض راشن آنے لگا۔ مفتی صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ سرکاری حلقوں میں ان کی جان پہچان تھی۔ لیاقت علی خان تک کے پاس آنا جانا رہتا تھا لیکن انہوں نے کسی پر اپنی حالت ظاہر نہیں ہونے دی۔

چھ ماہ گزرے تھے کہ اللہ نے ایک اور کرم کیا۔ جو عیال دیوبند میں رہ گئے تھے وہ بھی کراچی پہنچ گئے پھر آہستہ آہستہ دوسرے اعزہ و احباب بھی پہنچنے لگے۔ اجنبیت دور ہونے لگی۔ کراچی دیوبند بن گیا، یہ فلیٹ چھوٹا پڑنے لگا تو انہوں نے جیکب لائنز میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔

اب لیاقت علی خان کے پیش نظر ایک اسلامی دستور کی تیاری کا مرحلہ آیا۔ یہ کام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع کو حل کرنا تھا۔ دستور سے پہلے دیباچہ تحریر کرنا تھا یعنی ایک ایسا خاکہ جسے اسمبلی سے پاس کرانا تھا جس میں بیان کردہ بنیادی نکات کی روشنی میں آئین پاکستان تیار کیا جا سکے۔

بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ اس اہم کام کی تیاری کے لیے ضروری کتابیں تک مہیا نہیں تھیں۔ دونوں کے کتب خانے دیوبند میں رہ گئے تھے۔ اس وقت کراچی میں کوئی قابل ذکر لائبریری بھی نہیں تھی۔ صرف ایک لائبریری میری ویدر ٹاور کے پاس تھی۔ دونوں افراد کو بہ کثرت وہیں جانا پڑتا تھا۔

دونوں حضرات نے نامساعد حالات کے باوجود طویل غوروخوض کے بعد "قرارداد مقاصد" کے عنوان سے آئین کا دیباچہ مرتب کر لیا۔

اسے مرتب کرنے میں اتنی محنت نہیں کرنی پڑی تھی جتنی اسے دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں کرنی پڑی۔ برسراقتدار طبقے کا ایک گروہ اس راہ میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا۔

مفتی صاحب کی معاشی حالت اب بھی دگرگوں تھی۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں اور کابینہ کے بیشتر وزراء سے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ آئے دن ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ رہتا تھا لیکن انہوں نے کسی پر اپنی معاشی حالت ظاہر نہیں ہونے دی۔ کسی کے سامنے اپنا رونا نہیں رویا۔ کسی کو بے جا سفارش کی زحمت نہیں دی۔ یہ بات کتنی عجیب لگتی ہے کہ سرکاری حلقوں میں جس کی پذیرائی کی جا رہی ہو وہ اپنے لیے کچھ بھی طلب نہ کرے۔

پاکستان میں آئین سازی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ قائد ملت لیاقت علی خاں نے اس کام کے لیے ایک اسلامی مشاورتی بورڈ بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ پیش کرے اور اس کی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے۔ سید سلیمان ندوی کو اس کا صدر بنایا گیا اور جناب ظفر احمد انصاری کو سیکریٹری بنایا گیا۔ مفتی محمد شفیع رکن تھے۔ ان کے علاوہ تین ارکان اور تھے۔ پروفیسر عبدالخالق، مولانا جعفر حسین مجتہد اور ڈاکٹر حمید اللہ۔

اس بورڈ کے ممبران کے لیے ایک ہزار روپے الاؤنس منظور ہوا۔ حضرت مفتی محمد شفیع نے اس الاؤنس کو قبول ضرور کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ایسی پابندیاں قبول نہیں کریں گے جو سرکاری ملازمین کی ہوتی ہیں۔ یہ پیش بندی اس لیے تھی کہ کلمہ حق کے اظہار میں رکاوٹ پیش نہ آئے، محض تنخواہ کے لالچ میں زبان بند کر کے نہ بیٹھ

جائیں۔ ان کی بے نیازی کو تنخواہ کی ضرورت بھی نہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک حکومتی عہدے دار سے اس کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا۔

"جب سے میں نے بورڈ کی رکنیت قبول کی تھی اسی دن سے جیب میں استعفیٰ لیے پھرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کو تو اپنے سوٹ کی شان وشوکت برقرار رکھنے کے لیے سرکاری تنخواہ کی ضرورت ہے۔ میرے سر سے لے کر پاؤں تک کا لباس صرف بیس روپے میں بن جاتا ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک ہزار روپے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔"

آئین سازی کا کام جاری ہی تھا کہ ایک لاء کمیشن بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لیے کہ "بورڈ آف تعلیمات اسلام" کا تعلق صرف دستور کی حد تک تھا۔ عام قوانین سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پاکستان کے موجودہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالا جائے۔ علامہ سید سلیمان ندوی حکومت پر برابر زور ڈال رہے تھے کہ آئین کے ساتھ ساتھ قوانین کو بھی اسلامی رنگ میں ڈھالا جائے۔ آخر حکومت ایک لاء کمیشن بنانے پر تیار ہوگئی۔ ابتداء میں صرف علامہ سید سلیمان ندوی کو اس کا ممبر بنایا گیا۔ جسٹس رشید اور جسٹس منیر ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کیے گئے۔

سید سلیمان ندوی حضرت مفتی محمد شفیع کی خدمات سے واقف اور ان کی صلاحیتوں کے قائل تھے۔ جانتے تھے کہ اسلامی قوانین پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ وہ اس وقت رکنیت قبول کریں گے جب مفتی محمد شفیع کو بھی اس کا رکن بنایا جائے۔ بالآخر حکومت کو انہیں بھی شامل کرنا پڑا۔ یہ کمیشن دو سال تک قائم رہا لیکن وزارتوں کی بار بار تبدیلی اور برسراقتدار طبقے کے بعض افراد کی جانب سے مسلسل رکاوٹوں کے باعث اس کمیشن کو کامیابی نہ مل سکی۔ بارہا اجلاس ہوتے رہے اور معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔

اسی زمانے میں غالباً 1950ء کے اواخر میں جب آپ کی رہائش برنس روڈ پر آرام باغ کے نزدیک اقبال منزل میں تھی انہوں نے مسجد باب الاسلام میں درس قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا۔

ابھی پورے قرآن شریف کا درس مکمل نہیں ہوا تھا کہ لسبیلہ چوک پر تعمیر ہونے والے اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے۔ مسجد باب الاسلام آرام باغ سے تو قریب ہی تھی۔ آپ کندھے پر رومال ڈالتے اور اٹھ کر چل دیتے۔ لسبیلہ منتقل ہونے کے بعد یہ فاصلہ بڑھ گیا۔ اب کیا ہو؟ درس بھی نہیں چھوڑا جاسکتا فاصلہ بھی کم نہیں ہوسکتا۔ درس بھی نماز فجر کے بعد ہوا کرتا تھا۔ آپ اس روز گھر سے نکلے اور بس اسٹاپ پر آکر کھڑے ہوگئے۔ وہاں اکا دکا مسافر موجود تھے آپ بھی کھڑے ہوگئے۔ کسی کو معلوم بھی نہیں تھا کہ ان کے برابر کون کھڑا ہے۔ بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن، لاء کمیشن کے رکن، زکوٰۃ کمیٹی کے رکن، مفتی، مدرس، بہت بڑے عالم۔ بس آئی اور وہ اس میں سوار ہوگئے۔ آرام باغ پہنچ کر مسجد باب الاسلام پہنچے، نماز میں شریک ہوئے اور حسب معمول درس کا سلسلہ شروع کردیا۔ پھر روز کا یہی طرز عمل ہو گیا۔ ضعف اور بڑھاپے کے باوجود آپ بس میں سفر کرتے رہے اور پورے قرآن کا درس مکمل کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس درس میں ایسی برکت دی کہ لوگ دور دور سے آکر اس میں شریک ہوتے اور اپنی زندگیوں میں تبدیلیاں محسوس کرتے۔

اسی درس کے دوران آپ نے مسجد باب الاسلام کے دروازے کے اوپر ایک کمرا تعمیر کرا لیا تھا اور اسے دارالافتاء کا نام دیا تھا تا کہ فتویٰ حاصل کرنے والوں کو سہولت ہو۔ نقل فتاویٰ کے لیے ایک صاحب کو تنخواہ پر رکھ لیا اور فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے ایک استاد امیر الزماں کشمیری کو مقرر فرمادیا۔ یہ کمرا گویا ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی بن گیا۔ یہیں بیٹھ کر آپ فتوے جاری کرتے اور یہیں جو چند طلبہ آنے لگے تھے اور خود ان کے فرزند تعلیم حاصل کرنے لگے۔

اب آہستہ آہستہ عوام الناس میں ان کی شہرت ہونے لگی تھی۔ خواص بھی اس سے خالی نہ تھے۔ ایک روز ان کے گھر کے سامنے ایک بڑی موٹر آکر رکی۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر بڑے لوگ آپ سے ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے لیکن اس میں سے جو شخص اترا وہ یہاں کے لیے بالکل نیا تھا۔ یہ مشہور شاعر اور ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری تھے۔

"حضرت آپ مسجد باب الاسلام میں درس دیتے ہیں اس کی بڑی شہرت ہے۔"

"یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے ورنہ احقر کی قابلیت اس پر ظاہر ہے۔"

''میں کئی مرتبہ خود بھی آپ کے درس میں شریک ہو کر آپ کی نکتہ سنجیاں ملاحظہ کر چکا ہوں۔''

''اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

''میں اس وقت آپ کو ایک زحمت دینے حاضر ہوا ہوں۔''

''فرمایئے۔''

''ریڈیو پاکستان سے قومی پروگرام میں جو درس قرآن روزانہ نشر ہوتا ہے وہ آپ دیا کریں۔''

''روزانہ کی پابندی میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔ میری مصروفیات اور بھی ہیں۔''

''اگر آپ کو عذر ہے تو میں ایک تجویز اور سوچ کر آیا ہوں۔''

''فرمایئے۔''

''یومیہ درس سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام ''معارف القرآن'' جاری کیا جائے جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیش نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے خاص خاص آیات کا انتخاب کر کے ان کی تفسیر بیان کی جائے۔''

''آپ کی تجویز صائب اور قابل عمل ہے لیکن میں ایک شرط پر اسے قبول کروں گا بلکہ دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں درس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کروں گا دوسرے یہ کہ کسی ایسی پابندی کو قبول نہیں کروں گا جو میرے نزدیک درس قرآن کے مناسب نہ ہو۔''

دونوں شرطیں منظور کر لی گئیں اور آپ نے درس معارف القرآن شروع کر دیا۔ یہ درس اتنا مقبول ہوا کہ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پاکستان کے دوسرے ریڈیو اسٹیشن دوسرے اوقات میں اس کی ریکارڈنگ نشر کرتے تھے۔ بیرونِ ممالک میں بھی اسے سنا اور پسند کیا جاتا تھا۔

لوگ تو یہ کرتے ہیں کہ ان کا کوئی پروگرام اگر مقبول ہونے لگے تو اپنے معاوضے میں اضافے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن مفتی صاحب نے تو پروگرام شروع ہی اس شرط کے ساتھ کیا تھا کہ کوئی معاوضہ نہیں لیں گے۔

اس زمانے میں ایک درس کا معاوضہ تیس روپے مقرر تھا۔ یہ پروگرام گیارہ سال تک چلتا رہا۔ اس اعتبار سے مجموعی رقم سولہ ہزار بنتی ہے لیکن مفتی صاحب نے ایک پیسا بھی گوارا نہیں کیا کہ معاملہ قرآن کا تھا۔

جب یہ درس تیرھویں پارے تک پہنچا تو ریڈیو پاکستان نے اسے بند کر دیا۔

حضرت مفتی محمد شفیع نے ان پروگراموں کو ہی بنیاد بنا کر اس تفسیر کو مکمل کیا اور ''معارف القرآن'' کے نام سے آٹھ جلدوں میں ترتیب دے لیا۔

☆......☆

مسجد باب الاسلام کے ایک کمرے میں دارالافتاء بھی تھا اور مدرسہ بھی طالب علموں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ مفتی صاحب فکرمند تھے۔ اللہ نے پھر مدد فرمائی۔ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ محلہ نانک واڑہ میں انگریزوں کے زمانے کے سکھوں کے ایک اسکول کی خالی عمارت اللہ نے عطا کر دی۔ آپ نے نہ چندے کی اپیل میں وقت ضائع کیا نہ ساز و سامان کی پروا کی۔ اللہ پر توکل کیا۔ ایک استاد اور چند طلبہ سے اس مدرسے کا آغاز کر دیا۔ اس وقت کراچی میں مدرسہ مظہر العلوم، کھڈا کے سوا کوئی دینی مدرسہ نہیں تھا بلکہ پورے پاکستان میں گنے چنے ہی مدارس تھے۔ یہ مدرسہ کھلا تو مفتی محمد شفیع کا نام سنتے ہی طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی۔ کراچی ہی سے نہیں ملک کے اطراف و اکناف سے بھی طلبہ آنے شروع ہو گئے۔ چند ماہ نہیں گزرے تھے کہ یہ چھوٹا سا مدرسہ، دارالعلوم کراچی بن گیا۔ حضرت نے دارالافتاء بھی یہیں منتقل کر لیا۔ آپ کا تمام وقت دستور اسلامی کی جدوجہد میں گزر رہا تھا۔ جو وقت بچتا تھا وہ درس فتویٰ اور دارالعلوم کی انتظامی نگرانی میں گزرنے لگا۔

سید سلمان ندوی کی وفات کے بعد جمعیت علمائے اسلام کی صدارت کا بار بھی آپ کے کاندھوں پر آپڑا تھا۔ دستوری مساعی کا بار الگ تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم کو بھی آپ نے پاکستان میں دستور اسلامی کے نفاذ کے لیے استعمال کیا۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے طول و عرض کے بار بار دورے کیے اور ضلع ضلع پہنچ کر اسلامی دستور کے لیے عوامی شعور کو بیدار کیا۔

بورڈ آف تعلیمات اسلامی نے نہایت عرق ریزی سے دستور پاکستان کے لیے جو سفارشات پیش کی تھیں اگرچہ 56ء اور 73ء کے دستوروں میں ان کی جھلک کسی حد تک موجود ہے لیکن اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام رو بہ عمل لائی گئیں نہ انہیں ارباب حل و عقد نے شائع کیا۔

☆......☆

نانک واڑہ میں مفتی محمد شفیع کے قائم کردہ دارالعلوم کے ہر شعبے میں کام اتنی تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا کہ یہ

عمارت تنگ محسوس ہونے لگی۔ حکومت سے کوئی اُمید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ ایک دینی دارالعلوم قائم کرنے کے لیے ایک کمیٹی سردار عبدالرب نشتر کی قیادت میں بنی تھی۔ حضرت مفتی شفیع اس اُمید پر اس کمیٹی کے آخر تک رکن رہے کہ شاید پاکستان میں اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے اسے ایک نمونے کی درس گاہ بنایا جا سکے۔ آپ نے دن رات کی محنت کے بعد موجودہ زمانے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ایک جدید نصاب بھی تیار کر لیا لیکن یہ منصوبہ بھی دوسرے کئی منصوبوں کی طرح سیاست کی نذر ہو گیا۔

ہجرتِ پاکستان کے بعد ہی پاکستان کے شایانِ شان ایک دارالعلوم کی تعمیر کو آپ نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ ابتدائی دو سال تو قراردادِ مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجہد کی مشغولیت میں گزر گئے۔ معاشی مسائل الگ دامن پکڑے کھڑے تھے۔

اب عمر بھی ڈھلتی جارہی تھی۔ یہ خیال بجا طور پر تھا کہ میرے بعد اس طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔ جتنی جلد ہو ایک دینی دارالعلوم قائم ہو جائے۔ نانک واڑہ میں قائم دارالعلوم ناکافی ثابت ہونے لگا تھا۔ آپ نے اپنی ذاتی جدوجہد سے وہ احاطہ زمین جس میں علامہ شبیر احمد عثمانی کا مزار ہے باضابطہ طور پر حاصل کر لیا۔ نقشہ منظور کرا کے تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ آپ کی خوشی دیدنی تھی۔ دارالعلوم قائم ہو رہا تھا اور استاد محترم شبیر احمد عثمانی کے احاطہ مزار میں قائم ہو رہا تھا لیکن ابھی بنیادوں کی کھدائی ہو رہی تھی کہ بعض لوگوں نے مزاحمت کی۔ ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ نے تعمیر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ حکومت آپ کے ساتھ تھی۔ رفقائے کار نے بھی زور دیا کہ تعمیر جاری رکھی جائے لیکن آپ نے مزدور ہٹا لیے۔

"دارالعلوم بنانا فرضِ کفایہ اور مسلمانوں کو جھگڑے سے بچانا فرضِ عین ہے۔ فرضِ عین کو چھوڑ کر فرضِ کفایہ میں لگنا دین کی صحیح خدمت نہیں۔ میں جھگڑا مول لے کر یہاں ہرگز دارالعلوم نہیں بناؤں گا۔"

آپ کی اسی نیک نیتی کا ثمرہ تھا کہ بہت جلد آپ کو اللہ تعالیٰ نے کورنگی میں چھپن ایکڑ زمین دارالعلوم کے لیے عطا فرما دی۔ وہ زمین دیکھنے گئے تو دور تک "ہو" کا عالم طاری تھا۔ آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ذرا ہٹ کر چند گوٹھ تھے اور کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ جنگل جلیبی کے جھاڑ باڑھ بنائے کھڑے تھے۔ یہ زمین شہر سے اتنی دور تھی کہ بعض رفقا سوچ میں پڑ گئے کہ یہاں پڑھنے کون آئے گا اور ضروریاتِ زندگی کا کیا ہوگا۔ مفتی صاحب نے زندگی کے ہر مرحلے پر توکل الٰہی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ مطمئن تھے۔ ان کی آنکھیں آئندہ کے کسی خیال سے چمک رہی تھیں۔

"یہاں کی زمین زرخیز ہے۔" انہوں نے دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھ کر کہا لیکن اس بلیغ جملے کا مطلب یہ تھا کہ اس زمین کو اللہ برکت دے گا۔ دینِ الٰہی کے پودے خوب لہلہائیں گے۔ یہاں جو دارالعلوم قائم ہوگا دنیا کے عظیم ترین اداروں میں اسے ایک ممتاز مقام حاصل ہوگا۔

تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا اور بقدرِ ضرورت تعمیرات مکمل ہونے کے بعد دارالعلوم نانک واڑہ سے کورنگی منتقل ہو گیا۔

بورڈ آف تعلیمات اسلام ختم ہو گیا۔ پھر وزارتیں آئے دن تبدیل ہونے لگیں اور جب ملک میں مارشل لاء لگ گیا اور عوامی سطح پر اسلامی دستور و قانون کے لیے جدوجہد کے راستے مسدود ہو گئے، سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگ گئی تو آپ کی تمام تر توجہات کا مرکز دارالعلوم بن گیا۔ لسبیلہ سے روز کورنگی آنے جانے میں دقت ہوتی تھی لہٰذا یہی بہتر سمجھا کہ دارالعلوم ہی میں رہائش اختیار کر لی جائے۔ لسبیلہ چوک پر اپنا ذاتی مکان بنا لیا تھا۔ کرائے کے مختلف مکانوں میں رہنے کے بعد یہ مکان نصیب ہوا تھا لیکن خدمتِ دین کے لیے یہ مکان چھوڑ کر دارالعلوم کورنگی منتقل ہو گئے اور یہاں کھپریل کی چھت کے صرف دو کمروں میں گزارا فرمایا۔

درس و فتویٰ کا کام سرانجام دینے لگے۔ ابتدائی چار سالوں تک آپ نے ان خدمات کا کوئی معاوضہ نہیں لیا پھر مجلسِ منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے مشاہرہ لینا منظور فرمایا۔ تین سال بعد اس مشاہرے میں خود کمی کر کے صرف تین سو روپے ماہوار باقی رکھا۔ یہ رقم بھی دارالعلوم کی ضروریات پر ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ بعد میں یہ تین سو روپے لینا بھی بند کر دیے۔ جتنی رقم دارالعلوم سے لے چکے تھے وہ بھی مختلف اوقات میں بتدریج واپس کر دی۔ اسی رقم سے دارالعلوم کی جامع مسجد کے مصارف کے لیے دو کمرے احاطہ دارالعلوم میں اپنے خرچ پر تعمیر کر کے وقف فرمائے۔

دارالعلوم روز بروز ترقی کرتا گیا۔ قریب ہی ریلوے اسٹیشن تعمیر ہو گیا اور لوکل ٹرین چلنے لگی جس سے آمد و رفت میں سہولت ہو گئی۔

ایوب خان ہی کے زمانے میں دارالعلوم کے نزدیک مہاجروں کے لیے کوارٹر تعمیر ہوئے اور یہاں بستی آباد ہو گئی۔ ویرانے میں پھول کھل گئے۔ یہاں آبادی ہو جانے کے بعد نمازیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ چندے کا اہتمام بھی ہونے لگا۔ طلبہ کی تعداد بھی بڑھ گئی۔

آبادی ہوئی تو مارکیٹ، اسکول اور دیگر عمارتیں حکومت کی طرف سے تعمیر ہونے لگیں۔ دارالعلوم کے دیگر بلاک بھی تعمیر ہوئے۔ دارالعلوم کی عمارت ایک شاندار منظر پیش کرنے لگی۔

حضرت مفتی محمد شفیع کی دعائیں اور محنت رنگ لا رہی تھیں۔ اب آپ کے بیٹے بھی بڑے ہو گئے تھے جو مختلف شعبوں کا انتظام سنبھال رہے تھے۔

فتویٰ نویسی کا شغل جزو زندگی بنا ہوا تھا۔ عمر کے آخری دور میں یہ شغل اور زیادہ ہمہ گیر ہو گیا۔ فقہی سوالات کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جن مسائل میں علماء کا اختلاف ہوتا وہ بھی محاکمہ کے لیے مفتی صاحب ہی کے پاس حاضر ہوتے۔ خطوط کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا ملکی وغیر ملکی زعماء کے خطوط بکثرت موصول ہوتے۔ آپ روزانہ کی ڈاک کا روزانہ جواب دینے کے عادی تھے۔ لکھنے کی رفتار نہایت تیز تھی۔ قلم اٹھا کر کچھ دیر سوچتے اور پھر ایک مرتبہ لکھنا شروع کرتے تو کہیں نہ رکتے۔ یہ خطوط صرف خیریت پوچھنے کے لیے نہیں ہوتے تھے۔ بڑے بڑے فقہی سوالات پوچھے جاتے تھے۔ آپ بے تکان ان کے جوابات تحریر کرتے نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت نہ مشورے کی۔ ریل گاڑی میں کسی سفر کو نکلے ہوتے تو چلتی گاڑی میں بھی یہ شغل جاری رہتا۔

جب آپ کے دو بیٹے مولانا تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع عثمانی درس نظامی سے فارغ ہوئے تو آپ نے فتویٰ نویسی کی تربیت دینے کا شعبہ بھی قائم کیا۔ اس میں دو سالہ نصاب کی نگرانی آپ خود فرماتے تھے۔ اس کا مقصد ظاہر ہے ایسے مفتیان کرام تیار کرنا تھا جو فتویٰ نویسی میں کمال رکھتے ہوں اور ان کے بعد اسے جاری رکھ سکیں۔

ان کی زندگی ہی میں ان کے فرزند مولانا محمد رفیع عثمانی نائب مفتی مقرر ہوئے اور آپ نے ان کی تربیت فرمائی۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اب بھی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مصروفیات و مشغولیات کی اس کثرت میں آپ کی زندگی کا ایک شعبہ تصنیف و تالیف کے پہلو میں بھی چھپا ہوا تھا اور اس کا آغاز دیوبند ہی سے ہو گیا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اتنے سارے سرکاری و غیر سرکاری کاموں کو انجام دیتے ہوئے اتنا وقت کیسے بچ جاتا ہے کہ کتابیں اور کتابچے تحریر ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر کتابیں اردو میں اور کئی عربی میں ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد جب ان تصانیف کا شمار کیا گیا تو حیرت کے سوا کچھ سامنے نہیں تھا۔ آپ نے زندگی میں 162 کتابیں تصنیف فرمائیں۔ صرف فقہی موضوعات پر آپ کی پچانوے تصانیف ہیں۔

ان تصنیفات میں تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام، معیشت و سیاست، سیرت و تاریخ، اصلاح و ارشاد، تعلیم و تبلیغ، زبان و ادب اور دیگر موضوعات شامل ہیں۔

تفسیر المعارف القرآن کامل آٹھ جلدوں اور 5717 صفحات پر مشتمل ہے۔

احکام القرآن عربی میں ہے جو 538 صفحات پر مشتمل ہے۔

اگر ان فتاویٰ کی تعداد کو دیکھا جائے جو دارالعلوم دیوبند اور کراچی میں رہتے ہوئے انہوں نے تحریر کیے تو ان کی تعداد ستّر ہزار سے زیادہ بنتی ہے۔ زبانی دیے گئے فتاویٰ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

کوئی آدمی اتنے کام بھی کر سکتا ہے؟ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

عمر عزیز 75 سال کو پہنچی تو زندگی بھر کی تھکن نے بیماری کی شکل اختیار کر لی۔ کئی شدید امراض نے آپ کو گھیر لیا لیکن خدمت دین اب بھی پیش نظر تھی۔ طبیعت ذرا سنبھلتی تو آئے ہوئے سوالوں کا جواب لکھنے بیٹھ جاتے یا فرزند محمد رفیع عثمانی کو املا کرا دیتے اور تصدیق کے لیے دستخط فرما دیتے۔ اس طرح عمر عزیز نے چار سال اور گزار دیے۔

10 شوال 1396ھ 1976ء کو ایک فتویٰ املا کرایا اور اس پر دستخط فرمائے اور لیٹ گئے۔ بہ مشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دل نے کہا کچھ میرا بھی تو حق ہے۔ دل کا شدید دورہ پڑا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ معروفیات کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

احاطہ دارالعلوم کورنگی کے قبرستان میں ناریل کے ان پیڑوں کے درمیان دفن ہوئے جو بھی خود کھڑے ہو کر لگوائے تھے۔

**ماخذ**

حیات مفتی اعظم از: حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

# دلِ دردمند

ابن کبیر

ارضِ پاکستان وہ زرخیز خطہ ہے جہاں بے شمار نامور ہستیوں نے نمو پائی۔ کارہائے نمایاں کی فہرست ترتیب دی جائے تو بے شمار نام سامنے آئیں گے۔ انہی ناموں میں سے ایک نام وہ بھی ہے جس نے ایک انتہائی غریب گھر میں جنم لیا لیکن جب رختِ سفر باندھا تو کروڑوں کا اثاثہ تھا لیکن اس نے ان اثاثوں کو اپنا کبھی نہ کہا اور نہ کبھی ان اثاثوں کو اپنی ملکیت سمجھی۔ ٹوٹی ہوئی چپل اور پیوند لگے خستہ پیرہن میں زندگی گزار دی۔ بیمار ہوا تو لوگ غیر ممالک کے بڑے سے بڑے اسپتال میں اپنی طرف سے علاج کرانے کی استدعا کرتے رہے لیکن اس کی ایک ہی رٹ رہی کہ جن اسپتالوں میں غریبوں کا علاج ہوتا ہے وہیں میرا علاج بھی ہو گا اور جب وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہوا تو اسے قوم نے اسی اعزاز سے نوازا جس سے قائداعظم کو نوازا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسی نظیر کم ملتی ہے کہ جس کے جنازے میں تینوں فوج کے سربراہ تمام صوبوں کے وزیراعلیٰ اور صدر مملکت کے ساتھ ملک بھر کی اہم شخصیات نے شرکت کی ہو۔

**ایک حقیقی فقیر منش شخصیت کا احوالِ زیست**

صبح سے حبس تھا۔

کھیتوں میں فصل ساکت کھڑی تھی، مٹی سے بھاپ اٹھتی تھی۔ چرند پرند آسمان کو تک رہے تھے۔ چٹائی پر بیٹھے بچوں کے چہرے پر دھوپ تھی۔ عبدالغفور کو بھی اکتاہٹ نے گھیر لیا۔ آس پاس کی چپ کے باعث وہ غنودگی میں چلا گیا۔

طالب علموں نے استاد کو سوتے پایا تو ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر ہنسنے لگے۔ ایک بچے کا سر منڈا ہوا تھا۔ وہ چھٹی کے گھنٹے کا منتظر تھا۔ بچے نے چندیا سے پسینا صاف کیا۔ ذرا

سر اٹھایا۔ اسے دور آسمان پر ایک دھبا نظر آیا۔ اس نے آنکھیں ملیں کہ شاید نظر کا دھوکا ہوا، مگر دھبا وہیں تھا اور دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔

"دیکھو دیکھو بادل!" وہ چیخا۔

"بادل؟ کہاں ہیں بادل؟" ایک بچہ چونکا۔ دوسرے نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "یہ روٹی پاگل ہوگیا ہے!"

وہ سب اس کے گول، منڈھے ہوئے سر کی وجہ سے اسے روٹی کہا کرتے تھے۔ یہ اس کا باپ عبدالشکور تھا جو ہر ماہ بیٹے کے سر پر استرا پھیروا دیتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ انسان خود ہی کو سنوارنے میں لگا رہے گا تو اوروں کی کیا خاک مدد کرے گا۔

"نہیں نہیں۔ وہ دیکھو۔ ادھر۔" بچہ فرطِ جذبات سے کھڑا ہوگیا۔ کچھ ہلچل ہوئی۔ استاد نے آنکھ کھولی۔ ڈپٹ کر کہا۔ "عبدالستار، کیا غضب ہوا، کیوں شور مچاتے ہو؟"

"وہ... ادھر!" بچوں کی آنکھوں میں جوش تھا۔ وہ آسمان کی سمت دیکھ رہے تھے۔ کالی گھٹائیں جنوبی رتھ پر سوار گاؤں کی سمت آرہی تھیں۔ ہوا کا پہلا جھونکا خوشی کا احساس لایا۔ کچھ دیر بعد تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ فصلیں رقص کرتی معلوم ہوئیں۔

سیاہ بادل امڈ کر آئے۔ گھن گرج کے ساتھ مینہ برسا۔ بچوں میں خوشی دوڑ گئی۔ استاد نے چھٹی کا گھنٹا بجایا اور چادر ڈال کر گھر کو ہولیا۔ بچے کھیتوں میں اتر گئے۔ عبدالستار کچھ دیر تو دوستوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ برسات نے اسے مسرت سے بھر دیا تھا۔ پھر اچانک یاد آیا کہ ماں گھر میں انتظار کرتی ہوگی۔ عورت باقاعدگی سے آس پڑوس کے غربا میں کھانا تقسیم کرتی تھی اور تقسیم کا یہ کام اس کا بیٹا انجام دیتا تھا۔ وہ تھال اٹھا کر دوڑتا ہوا جاتا اور بھاگتا ہوا لوٹ آتا۔ بڑا پھرتیلا تھا۔

اور اس وقت بھی عبدالستار پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ بارش اب دھیمی پڑ چکی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ وہ زمین پر کھڑے پانی میں چھینٹیں اڑاتا جا رہا تھا۔

اچانک کچھ شور سنائی دیا۔ تجسس نے پیر پکڑ لیے۔ کچھ لڑکے دائرے میں کھڑے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک بدحال شخص کھڑا تھا۔ گھبراہٹ چہرے سے عیاں تھی۔ عبدالستار نے پہچان لیا۔ وہ فیکا تھا... فیکا، ایک فقیر، ایک ذہنی معذور۔

ایک لڑکے نے ہاتھ میں پکڑی شاخ اس کی قمیص میں گھسائی، باقی زور زور سے "سانپ، سانپ" پکارنے لگے۔ فیکا کا رنگ اڑ گیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو دوسرے لڑکے نے اسے پکڑ لیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایک بار پھر سانپ سانپ کا شور مچ گیا۔ فیکا کی چیخ سنائی دی۔

عبدالستار سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کی نصیحتیں گونجنے لگیں۔ "مظلوم اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے... مصیبت زدہ کا سہارا بننے والا کبھی بے سہارا نہیں ہوتا... زندگی کا مقصد سچ کے لیے آواز اٹھانا ہے۔"

بچے میں خیر کی روشنی تھی۔ اس نے آواز بلند کی۔ "ٹھہر جاؤ!"

لڑکوں نے حیرت سے آواز کی سمت دیکھا۔ بارش سے دھلے ہوئے پیڑ کے نیچے عبدالستار کھڑا تھا۔ آواز دے کر وہ بڑے وقار سے چلتا ہوا ان کے پاس آیا اور سمجھانے لگا۔ "اسے تنگ مت کرو، یہ معذور ہے بے چارا۔"

لڑکوں کو اس چھوٹے سے بچے کی نصیحت ناگوار گزری۔ ایک لڑکے نے منہ بنایا۔ "تنگ مت کرو۔ بڑا آیا مددگار بننے... چل نکل۔"

اس نے عبدالستار کو دھکا دیا۔ وہ زمین پر آرہا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہوگئے۔ اتنی دیر میں کہ وہ کھڑا ہوتا، لڑکوں نے پھر فقیر کو ڈرانا شروع کر دیا۔ "سانپ سانپ!"

عبدالستار ان کے اور فقیر کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ ایک لڑکا آستین چڑھاتے ہوئے آگے بڑھا اور اسے تھپڑ رسید کیا۔ دوسرے نے دھکا دیا۔ عبدالستار نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی مگر وہ تینوں عمر میں بڑے تھے۔ انھوں نے بچے کی خوب درگت بنائی۔

جب منہ سے خون بہنے لگا، تب اسے چھوڑا۔ وہ کیچڑ میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ جسم بے طرح دکھ رہا تھا مگر اس بات کا اطمینان تھا کہ فیکا اس پوری کارروائی کے درمیان وہاں سے کھسک گیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور گھر کی سمت چل دیا۔ پھر سے بوندا باندی ہونے لگی۔ اس کی ماں حور بائی دروازے پر کھڑی تھی۔ عورت نے اپنے بچے کو اس حال میں دیکھا تو دوڑی دوڑی آئی۔ وہ مضبوط دل کی سمجھ دار عورت تھی۔ جان گئی کہ کہیں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔

سوال کرنے کی بجائے وہ اسے اندر لے گئی۔ زخم دھوئے۔ ٹنچر لگایا۔ بچہ زخموں کی جلن سے اچھلنے لگے۔ جب حالت سکون میں آئی تب عورت نے پوچھا۔ "عبدالستار یہ

سب کیا ہے؟"

بچے نے پوری کہانی سنا دی۔ عورت کے چہرے پر اطمینان تھا۔ "تم نے بہت اچھا کیا۔"

"ہاں، مگر ان بدتمیز لڑکوں نے مجھے بہت مارا۔" اس نے اپنے زخم سہلائے۔

"کوئی بات نہیں، وہ بھی سمجھ جائیں گے۔" پھر اچانک جیسے عورت کو کچھ یاد آیا۔ "دیکھو، وہ بے چارا فقیر... وہ بھوکا ہوگا، اسے کھانے دے آؤ۔"

عبدالستار کھڑا ہوگیا۔ "اسے تو ڈھونڈنا پڑے گا، ڈر کر بھاگ گیا تھا۔"

مگر اسے تلاش نہیں کرنا پڑا۔ فقیر کچھ دور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔ ننھے عبدالستار کو دیکھ کر وہ چونکا۔ آنکھوں میں شناسائی ابھری۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، اللہ میاں نے آج بادل بھیجے۔" عبدالستار نے خوشی سے تالی بجائی۔ وہ اپنے زخموں کو بھول گیا تھا۔

فقیر بھی ہنسنے لگا۔

☆......☆

درخت پر ایک پرندہ اترا تھا۔ وہ یہاں اجنبی تھا۔ شاید اپنی ڈار سے بچھڑ گیا تھا۔

عبدالستار نے بستہ ایک طرف دھرا اور اشتیاق سے اسے تکنے لگا۔ اسکول پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ ماسٹر جی نے چھڑی سے استقبال کیا۔ وہ اوئی اوئی کرتا رہا اور بچے پیٹ پکڑ کر ہنستے رہے۔

نہ تو اُسے اسکول اچھا لگتا تھا، نہ ہی کتابیں۔ اس کا دل تو شرارتوں اور کھیل کود میں اٹکا رہتا اور ان ہی شرارتوں کے ساتھ وہ بانٹوا کی تنگ اور تاریک گلیوں میں پل کر جوان ہونے والا تھا۔ اور پھر وہ لمحہ آنا تھا، جب اُسے اپنا آبائی اپنا گاؤں، وہاں کے کھیت کھلیان... سب چھوڑ کر اجنبی زمینوں کی سمت کوچ کرنا تھا، مگر ابھی اس واقعے میں کچھ وقت تھا۔ ابھی تو بچپن کے جادو سے اس کی آنکھیں دمکتی تھیں۔ کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتا۔

جن بچوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا، ان کا ایک معنوں میں لیڈر تھا۔ سارے منصوبے وہی بناتا۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور آتے جاتے لوگوں کو خوفناک آواز نکال کر ڈراتے۔ پھر پتھروں کی ڈھیر لگاتے۔ بھاگتے ہوئے آکر اس ڈھیر کو ٹھوکر لگاتے۔ جو ڈھیر پہلے گرا دیتا، وہ فاتح ٹھہرتا۔ اس دوران خوب شور مچایا جاتا۔ وہ سڑک پر گھات لگا کر بیٹھ جاتے۔ جونہی پھل مارکیٹ جانے والی گاڑیاں ادھر سے گزرتیں، وہ جھاڑیوں سے نکل آتے۔ دوڑتے ہوئے چند پھل اٹھا لیتے اور پھر کھیتوں میں بیٹھ کر ان سے لطف اندوز ہوتے۔ عبدالستار کا بیشتر وقت کھیتوں اور گرد آلود راستوں پر دوڑتے، کھیلتے کودتے گزرا کرتا۔

عبدالستار کے اجداد نے تین صدیوں قبل ٹھٹھہ کے ایک بزرگ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ کہتے ہیں، بزرگ نے اس قبیلے کا نام مومن رکھا، جو بعد میں بگڑ کر میمن ہوگیا۔ اس قبیلے نے رسول کریم ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ سندھ کے علاقے ہالہ سے چلا اور تھر سے ہوتا ہوا گجرات پہنچا اور کاٹھیاواڑ کے علاقے میں سکونت اختیار کیا۔ جہاں جہاں اس قبیلے کے افراد ٹھہرتے گئے، مستقبل میں ان ہی جگہوں کے ناموں سے انھیں شناخت کیے گئے۔ عبدالستار کے بڑوں نے بانٹوا نامی گاؤں کا رخ کیا، تو وہ بانٹوا میمن کہلائے۔ وہاں انھوں نے کشادہ گھر بنائے۔

عبدالستار 28 فروری 1928 کو اسی گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس وقت بانٹوا کی آبادی لگ بھگ پچیس ہزار تھی، جن میں ایک چوتھائی میمن تھے۔ ویسے نسلاً وہ ایدھی تھا۔ اس کے دادا حاجی رحمت علی بتاتے تھے کہ کبھی ایدھی نامی ایک گاؤں ہوا کرتا تھا، جو پھر معدوم ہوگیا۔

"ایدھی میمنی زبان کا لفظ ہے عبدالستار۔ اس کے معنی ہیں سست اور کاہل۔" جب حاجی رحمت علی نے یہ کہا تو بچے کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ "دادا، ہم... سست اور کاہل؟ آپ اور ابا تو اتنی محنت کرتے ہیں۔"

بوڑھا ہنسنے لگا۔ رحمت علی ایک درویش صفت انسان تھا۔ جھگڑوں میں ثالث بنتا۔ پریشان حال لوگوں کی مدد کرتا۔ قناعت پسند آدمی تھا۔ کاروبار جما ہوا تھا۔ پھر بیٹے بھی کمانے لگے مگر وہ سادہ طرزِ زندگی کو ترجیح دیتا۔ اوروں کو بھی اسی کی نصیحت کرتا تھا۔

اس نے اپنے پوتے سے کہا۔ "ہاں، سست اور کاہل۔ مگر وہ اپنے نام کا یکسر الٹ تھے۔ محنت کی عظمت کے قائل۔ کبھی مشقت سے جی نہیں چراتے۔ انسان دوست اور امن پسند۔"

"ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا!" ننھا عبدالستار اپنے منڈے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتا۔

حاجی رحمت علی کے بیٹے عبدالشکور نے بمبئی میں کمیشن

ایجنٹ کے طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ محمد علی جناح کی ہدایت پر دو بڑے مسلمان تاجروں نے حبیب بینک کی بنیاد رکھی تھی۔ عبدالشکور نے اپنے علاقے میں بینک کے کھاتے کھلوانے کے لیے خاصا کام کیا۔

عبدالشکور نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی دو بیویوں کے انتقال کے بعد حور بائی، جسے سب غربا کہا کرتے، اس کے نکاح میں آئی۔ غربا ایک بیوہ تھی۔ پہلے شوہر سے اس کے دو بچے تھے، مگر اس زمانے میں بیوہ سے شادی کرنا معمول کی بات تھی اور ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان دنوں شادی کے لیے مناسب لڑکی کا حصول بھی آسان نہیں تھا، بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی تھی۔ غربا کو بھی شادی میں دس تولہ سونا بطور تحفہ ملا۔

وہ ایک سگھڑ اور خدا ترس عورت تھی۔ گھر گرہستی سنبھالنے میں ماہر۔ اپنے پرائے کی مدد کرنے والی۔ رمضان میں وہ آس پڑوس کی عورتوں کے ساتھ مل کر افطاری کے پیکٹ تیار کرتی جو ناداروں میں تقسیم کیے جاتے۔ یہی گن اس کے بڑے بیٹے عبدالستار کو وارثت میں ملے۔ شوہر اسے ساٹھ روپے ماہانہ دیا کرتا تھا۔ یہ اچھی رقم تھی، جس میں بہ آسانی گزر بسر ہو جاتی۔

بعد میں اُس نے زبیدہ اور عزیز کو جنم دیا۔ ان بچوں کی تربیت ان ہی خطوط پر کی، جن پر عبدالستار کی کی تھی۔ ہر ماں کی طرح وہ سوچتی تھی کہ اس کے بچے خاندان کا نام روشن کریں گے، گاؤں کے لیے فخر کا نشان بن جائیں گے۔ تسبیح پڑھنے کے بعد وہ یہی دعائیں مانگتی۔ جب وہ دعاؤں میں مگن ہوتی... آسمان میں ستارے ٹمٹماتے، قدرت بھی مسکراتی ہو گی۔

خدا نے اس کے بیٹے کو چن لیا تھا، اسے روشنی کا مینار بننا تھا۔

☆......☆

رات اتر آئی۔ بھوبی باڑہ سے آتی ہواؤں میں خنکی تھی۔ عبدالستار نے ٹھنڈ محسوس کی۔

اس گھر سے سادگی عیاں تھی۔ فقط ایک کمرا۔ ایک بنا چھت کا غسل خانہ۔ ایک بڑا برآمدہ۔ گرمیوں میں تو وہاں سونے میں لطف آتا، مگر سردیوں میں کمرے میں لحاف لپیٹ کر سونا پڑتا۔ پالا ہڈیوں میں اترتا محسوس ہوتا تھا۔ رات پڑتی تو فرش پر روئی کے گدے بچھ جاتے۔ سب ان ہی پر سوتے۔

آج کی رات نیند عبدالستار کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ شام اس نے اپنی ماں کو بے طرح کھانستے دیکھا تھا۔ اسے بخار تھا۔ اس کے باوجود وہ کام کاج میں لگی رہی۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹے۔ انھیں دھویا۔ عبدالستار کو آواز دی کہ انھیں طاق پر رکھ دے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ وہ صبح عبدالستار کو الماری پر چڑھا دیتی، تا کہ وہ طاق سے برتن اتار دے۔ ان میں کھانا پکتا، شام انھیں دھو دھا کر رکھ دیا جاتا۔ عبدالستار کو علم تھا کہ اوپر طاق میں ایک ایسا برتن بھی ہے، جو کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ عورت بچت کے پیسے اس میں رکھا کرتی تھی۔ بعد میں یہی برتن عبدالستار کا پہلا گلا بننے والا تھا۔

سوچتے سوچتے اسے اسکول کا پہلا دن یاد آ گیا۔ وہ عام دنوں سے یکسر مختلف تھا۔ معمولات زندگی بدلنے کو تھے۔ صاف ستھرا لباس۔ سلیٹ۔ کئی ہدایتیں۔ اور ساتھ ہی اسے پہلی بار جیب خرچ ملا: دو پیسے۔

وہ بڑا خوش ہوا۔ منصوبے بنانے لگا۔ سر اٹھایا، تو ماں کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ”بیٹے، یہ دو پیسے ہیں۔ ایک خود استعمال کرو، ایک سے کسی غریب کی مدد کرو۔“

اسکول کا پہلا دن کئی تجربات لایا۔ گو وہ زیادہ خوش نہیں تھا، چٹائی پر گھنٹوں بیٹھے رہنا، استاد کی سخت گیری، بار بار ایک ہی لفظ کو دہرانا... مگر خوشی اس بات کی تھی کہ جیب میں دو پیسے تھے۔

چھٹی ہوئی، تو دوڑا دوڑا گیا۔ ا؎ رو دو والے سے ایک پیسے کی چار پھانکیں لیں۔ انھیں چٹ کیا۔ پھر نظر لڈو والے پر پڑی۔ کیسے خوش ذائقہ لڈو تھے۔ منہ میں رکھتے ہی گھل گئے۔ گھر پہنچنے تک منہ میں بیسن کا ذائقہ رہا، مگر جونہی ماں نے پوچھا کہ ان پیسوں کا کیا کیا؟ منہ سے لڈو کی مٹھاس جاتی رہی۔ اسے ماں کی نصیحت یاد آ گئی اور اس دکھ نے آن لیا کہ وہ اس پر عمل نہ کر سکا۔ عورت نے بھانپ لیا۔ چہرے پر ناپسندیدگی تھی۔

عبدالستار وضاحتیں دینے لگا۔ عورت خاموش کھڑی رہی۔ آخر اس نے کہا۔ ”خود غرض لوگ اپنے سوا کسی کا نہیں سوچتے۔“

ماں کے رنجیدہ چہرے نے عبدالستار کو پریشان کر دیا۔ کہاں کچھ دیر پہلے اتنا خوش تھا اور کہاں اچانک غم آن پڑا۔ اس نے تیزی سے کھانا کھایا۔ برتن سمیٹے۔ عورت نے جب عبدالستار کو شرمسار پایا، تو کہا۔ ”بیٹا، غریبوں کی ہر ممکن مدد کرو۔ اور پرائے کو راضی کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ سمجھ گئے۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ عورت نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بیٹے کو گلے لگا لیا۔

اگلے روز جب عبدالستار اسکول سے لوٹا تو ماں کے سامنے امرود کی دو پھانکیں رکھیں۔ ''ایک آپ کی اور ایک میری۔''

''بس، دو ہی پھانکیں۔ امرود تو بڑے مہنگے ہو گئے ہیں۔'' عورت کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ تھی۔

''دو پھانکیں نہیں چار۔'' بچے نے فوراً کہا۔ ''کلاس میں ایک لڑکا ہے، رشید۔ اس کی امی بیمار ہیں۔ وہ ناشتا کر کے نہیں آیا تھا، میں نے دو پھانک اسے دے دیں اور ایک پیسے کے اسے چنے دلا دیے۔''

''شاباش۔ بس اسی طرح غریبوں کا خیال رکھنا۔''

ماں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ اور اس سرد رات... روئی کے گدے پر لیٹے عبدالستار کو یہ پانچ برس پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ گو بہت سا وقت گزر گیا تھا مگر اس محبت کی گرمائش وہ آج بھی محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اب وہ تھوڑی بہتر تھی۔

اسے کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ اب وہ گیارہ برس کا ہونے کو تھا۔ تعلیم میں کبھی اس کا دل نہیں لگا۔ اسکول سے لوٹ کر پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانا، پڑوسیوں میں کھانے کی تقسیم، کسی سے دوا کا پوچھنا، کسی سے راشن کی خبر لینا... اور پھر کھیل کود میں لگ جاتا۔ ان کاموں سے فرصت ملتی تو شام اتر آتی۔

وہ بمشکل چوتھی جماعت تک پڑھ سکا۔ آخر اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ اس کے باپ نے اپنے ایک دوست حاجی عبداللہ سے عبدالستار کا ذکر کیا۔ وہ کپڑے کا تاجر تھا۔ سیٹھ نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''بھائی عبدالشکور، دوستی اپنی جگہ، کاروبار اپنی جگہ۔ چھوکرے کو سمجھا دینا۔''

عبدالشکور کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی، اس کی بیوی پہلے ہی اپنے بیٹے کے ذہن کو نصیحتوں سے بھر چکی تھی۔ رٹا رٹایا سبق اس نے باپ کے سامنے دہرا دیا۔

''دیانت داری سے اپنا کام کرو، ایک پیسے کی بھی بے ایمانی مت کرنا، وقت پر دکان پہنچ جاؤ اور جب تک سیٹھ اجازت نہ دے، وہیں رہو۔''

''بہت خوب۔'' باپ نے کاندھا تھپکا۔ ''تمھاری ماہانہ اُجرت پانچ روپے ہے۔''

کام سمجھنے میں اسے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ پھر محنتی بھی تھا، پھرتی سے ہر کام نمٹا دیتا۔ شروع شروع میں حاجی عبداللہ نے تربیت کی غرض سے کچھ سختی کی۔ دو تین بار ڈانٹا بھی۔ مشکل کام اسے سونپے۔ البتہ جلد وہ مطمئن ہو گیا۔ لڑکا باقی ملازمین میں بھی گھل مل گیا تھا۔

ایک ماہ کیسے گزرا، پتا ہی نہیں چلا۔ صبح وہ دکان میں داخل ہوا، تو ہر چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ہر ملازم چہک رہا تھا۔ جب اس نے ماحول میں رچی بسی خوشی کا سبب دریافت کیا، تو ایک ملازم نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ ''کیا پوچھ رہے ہو بھائی، مہینے بھر کی محنت کے بعد آج پگار ملے گی، خوب مزے کریں گے۔''

دوسرے نے ٹہوکا دیا۔ ''آج ہمارا میلہ دیکھنے کا پروگرام ہے، ساتھ چلو گے؟''

''نہیں بھائی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''مجھے تو یہ فضول خرچی گوارا نہیں۔''

شام ملازمین میں تنخواہ تقسیم ہوئی۔ سیٹھ نے اس کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھے تو سرسری طور پر پوچھا۔ ''اس رقم کا کیا کرو گے عبدالستار؟''

''چار روپے اماں کو دوں گا۔'' اس نے فوراً کہا۔

''اچھا۔'' آدمی ہنسا۔ ''اور باقی ایک روپے کا کیا ہوگا؟''

''اسے گلے میں ڈال دوں گا۔'' عبدالستار نے کہا۔ ''دادا کہا کرتے تھے، جتنا کماؤ، اس کا بیس فیصد جمع کرو۔''

''خوب۔'' سیٹھ نے کاندھا تھپکا۔

گھر لوٹ کر اس نے وہی کیا، جس کا سیٹھ کے سامنے اظہار کیا تھا۔ چار روپے ماں کے ہاتھ پر رکھے، ایک روپیا طاق میں رکھی اسی ہانڈی میں ڈال دیا... جہاں اس کی ماں بچت کے پیسے رکھتی تھی۔ جب عبدالستار نے مڑ کر ماں کو دیکھا، تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

سیٹھ دروازے کے ساتھ چھوٹی سی میز کے پیچھے تکیہ لگا کر بیٹھا کرتا تھا جہاں سے تمام ملازمین پر گہری نظر رکھتا۔ عبدالستار کی محنت اور لگن نے سیٹھ کو متاثر کیا۔ اس نے اپنے بچوں کو اسکول سے لانے اور دن بھر کی چائے کا اہتمام بھی اسے سونپ دیا تھا۔ بطور انعام بھی کچھ پیسے مل جاتے۔ محلے کے گھروں سے بلاوا آتا تو وہ اور دیگر ملازم کپڑوں کی گٹھری اٹھائے پہنچ جاتے۔ وہاں بھاؤ تاؤ کرتے، بحثیں ہوتیں۔ عبدالستار نرخ بتاتا۔ عورتیں قیمت کم کرنے پر اصرار کرتیں۔ آخر میں جو نرخ طے پاتے، وہ دونوں کے لیے قابلِ قبول ہوتے۔

دیگر ملازمین عبدالستار کی ترقی سے جلنے لگے۔ آخر

انھوں نے ایک سازش تیار کی۔ ایک سہ پہر جب عبدالستار کپڑے کی گٹھری اٹھائے دور پرے کے ایک محلے میں گیا، وہ سیٹھ کے گرد جمع ہو گئے اور لگے کان بھرنے۔

ایک نے کہا۔ ”حاجی صاحب، یہ لڑکا تو بڑا بے ایمان ہے۔“

”اچھا۔“ سیٹھ کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”ایسا کیا ہوا شکیل؟“

”حاجی صاحب۔ وہ گاہک کو زیادہ قیمت بتا کر بیچتا ہے۔ اور اضافی رقم چپکے سے اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔“ شکیل نامی نوجوان نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

”یہی نہیں سیٹھ، وہ گلے سے پیسے بھی چراتا ہے۔“ دوسرے نے بات آگے بڑھائی۔ ”میں نے کل اسے اپنے رومال میں پیسے باندھتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”جھوٹ بولنا بند کرو۔“ سیٹھ دہاڑا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ”وہ ایک شریف باپ کا محنتی بیٹا ہے۔ بے ایمان تو تم لوگ ہو جو اس پر الزام لگاتے ہو۔“

”نہیں سیٹھ، وہ...... ہم تو...... سچ کہہ......“ شکیل نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر سیٹھ کو دیکھ کر آواز دم توڑ گئی۔ اسی وقت عبدالستار دکان میں داخل ہوا۔ اس نے کپڑے کی گٹھری رکھی اور جیب سے نکال کر رقم کا حساب کرنے لگا۔

”یہ لیجیے حاجی صاحب، میسور کی جارٹ بیچی ہے۔ پانچ گز۔ پیسے گن لیجیے۔“ لڑکے نے کہا اور ماتھے سے پسینا پونچھا۔

”گننے کی ضرورت نہیں۔“ سیٹھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”گلے میں ڈال دو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔“

عبدالستار پر الزام لگانے والوں کے سر شرم سے جھکے ہوئے تھے۔

☆......☆

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، ہنستے مسکراتے چلے جا رہے تھے۔ ہر سوں رنگ تھے۔ نامعلوم کا اسرار تھا۔

یہ احمد آباد تھا۔ نیا شہر۔ جہاں ہر شے تازہ اور روشن۔ دوستوں نے آج سنیما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ عبدالستار کو بھی ساتھ چلنے کے لیے قائل کر لیا۔ وہ پہلی بار بانٹوا سے باہر نکلا تھا۔ وہ رنگوں کی عجیب پُراسرار دنیا تھی، جو انسان کو خوابوں میں لے جائے۔ پھر وہ سنیما میں داخل ہوئے۔ حبس زدہ ہال، بڑی سی اسکرین، اس پر ناچتے رنگ۔ ایک وجیہہ نوجوان، ایک حسینہ اور رقص، دل موہ لینے والے گیت۔

پردے پر مشہور زمانہ فلم پکار چل رہی تھی۔ مغلیہ سلطنت کا شہنشاہ جہانگیر اس کے سامنے تھا۔

وہ سحر انگیز ماحول تھا۔ سب ٹکٹکی باندھے اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ البتہ عبدالستار کو گھٹن پریشان کر رہی تھی۔ جب انٹرول ہوا اور تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا، تو کچھ طبیعت بحال ہوئی۔

لوٹتے سے سب مسرور تھے۔ وہ خوش گپیوں میں معروف تھے۔ ہیرو کے انداز کی نقل کر رہے تھے۔ ہیروئن کے حسن کی تعریف کر رہے تھے۔ عبدالستار بھی دلچسپی لے رہا تھا مگر جب اگلے روز وہ میدان پہنچا تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ آج دوستوں کا کھیلنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ وہ سب بڑے بن ٹھن کر آئے تھے۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے قمیص صاف ستھری، پیروں میں جوتے، کوئی پیڑ سے ٹیک لگائے کھڑا ہے، کوئی گذشتہ رات دیکھی ہوئی فلم کے گیت گا رہا ہے، کوئی ہیرو کے مکالمے بول رہا ہے۔

کچھ دیر تک وہ ان سے باتیں کرتا رہا، پھر اکتا گیا۔ ”چلو بھائی، کچھ کھاتے ہیں، پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔“

اس جملے نے چھن سے سحر توڑ دیا۔ سب چونکے۔ ایک دوست نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ ”ابے تو ہر وقت روٹی کھانے کا سوچتا رہتا ہے۔ دیکھ تو یار، آج موسم کیسا سہانا ہے۔“

”آج... ارے نہیں، کل بھی ایسا ہی موسم تھا۔“ عبدالستار نے آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور بھئی، مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔“

وہ گھر کی سمت چل دیا۔ دوست پھر خوابوں کی دنیا میں گم ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد عبدالستار نے ملازمت چھوڑ دی۔ باپ نے اُسے ایک بڑے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ پڑھائی میں دل لگائے، امتحان بھی پاس کر لیا، مگر دل اسکول میں لگتا ہی نہیں تھا۔ اسے تو انسانوں میں دلچسپی تھی، ان ہی کے بارے میں جاننے کی للک تھی۔

اِسی للک نے باپ کی کتابوں کی سمت متوجہ کیا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سی کتاب اٹھائے۔ ایک کے سرورق پر رسول کریم ﷺ کا نام لکھا دیکھا تو وہ کتاب اٹھالی۔ اس کتاب نے نوجوان عبدالستار پر اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ کتنے ہی مقامات پر اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اسے لگا کہ ماں کے تربیتی

اصول رسول اللہ ﷺ ہی کی زندگی سے کشید کردہ تھے۔ سادگی، سچائی، اخلاص، ایمان داری، مہمان نواز، وسیع القلبی... رسول کریم ﷺ اعلیٰ ترین اوصاف کا مجموعہ تھے۔ ایک حقیقی رول ماڈل۔

کتابوں میں عبدالستار کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس نے پھر ابا کے چھوٹے سے صندوق کا رخ کیا۔ کچھ اور کتابیں ہاتھ لگیں۔ اب اس نے صحابیِ رسول حضرت ابوذر غفاری کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اس سادہ مزاج، قناعت پسند، اصول پسند انسان نے عبدالستار کو بہت متاثر کیا۔ بالخصوص ذخیرہ اندوزی کے خلاف ان کی کوششوں نے سوچ کے نئے در وا کیے۔

پھر صندوق کی سمت گیا۔ کچھ کتابیں ابھی تازہ تھیں۔ کچھ ہی روز قبل خریدی گئی تھیں۔ ان کا سرورق سرخ تھا۔ مون سون میں وہ کتابیں عبدالستار کے ہاتھ لگیں۔ وہ ایک بار پھر اسکول چھوڑ چکا تھا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے خواب آنکھوں میں تھے۔ اور جو کتابیں اس کے روبرو تھیں اور اس خواب کے لیے مہمیز کا کام کرنے والی تھیں۔ یہ انقلابیوں کی سوانح حیات تھیں۔ جنھیں برستی دوپہروں میں وہ لحاف میں گھسا پڑھا کرتا۔ وہ تجسس اور جوش سے بھرا ہوا تھا۔ نظریے کی قوت نے خود کو اس پر آشکار کر دیا۔ تیز ہواؤں نے روح پر دستک دی۔ تبدیلی کی آرزو انگڑائی لینے لگی۔

اس زمانے میں عبدالستار نے جہاں اقوامِ عالم اور ہندوستان کی تاریخ پڑھی، وہیں مارکس اور لینن کے نظریات بھی مطالعے میں آئے۔ سمجھ گیا کہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور عدم مساوات ہی مسائل کی جڑ ہے۔ محنت کی عظمت کا تو قائل تھا۔ جانتا تھا کہ کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا مگر اب یہ احساس اجاگر ہونے لگا کہ اردگرد جو کرب ہے، اس کے خاتمے کے لیے اُسے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اوروں کے لیے جینا ہوگا۔

اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ سڑکوں پر ماچس فروخت کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ بچت کرے گا۔ ان پیسوں سے شیئرز خریدے گا۔ اور ان سے جو آمدنی ہوگی اسے بانٹوا کی باسیوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرے گا۔

اس کے خواب ستھرے تھے، ارادے نیک تھے، مگر قدرت کا منصوبہ کچھ اور تھا۔ اس پودے کو درخت بننے کے لیے نئی زمین کی ضرورت تھی۔

☆......☆

اُس کی آواز پاٹ دار تھی۔ الفاظ سیدھے دل میں اتر جاتے۔

بڑی ہی باوقار شخصیت تھا۔ چال میں ایک شان۔ انداز نرالا۔ لباس نفیس۔ اجنبی تھا، مگر جب بولتا تو یوں لگتا جیسے کوئی اپنا بول رہا ہو۔ جو اسے سنتا، اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ اس کے پیچھے چل پڑتا۔

ہندوستان میں آزادی کے نعرے گونج رہے تھے۔ انگریز سرکار کمزور پڑ رہی تھی۔ جنگِ عظیم دوم نے اس کے کس بل نکال دیے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہندوستان اس کی گرفت سے نکل جائے گا۔ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس سرگرم تھی مگر ساتھ ہی مسلمانوں کی ایک شناخت بھی ابھر آئی تھی۔ مسلم لیگ نے خود کو ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت

ثابت کروایا تھا۔ جذبات کی ایک لہر تھی۔ ہندوستان آزادی کے ساتھ تقسیم بھی ہونے والا تھا۔ ایک نیا ملک معروض وجود میں آنے کو تھا۔ اور یہ عظیم کارنامہ وہ بوڑھا نحیف شخص انجام دینے کو تھا جو اس شام بانٹوا میں موجود تھا۔ اس کا نام محمد علی جناح تھا۔ سب اسے قائداعظم کہہ کر پکارتے تھے۔

وہ ایک بڑا جلسہ تھا۔ میمن برادری نے بھرپور انداز میں اس میں شرکت کی۔ ان کی آنکھوں میں اس شخص کے لیے عقیدت تھی۔ جناح نے اپنی تقریر میں جہاں اور کئی باتیں کہیں، وہیں میمن برادری کو پاکستان آنے کا مشورہ بھی دیا۔ ""آپ کا کاروباری تجربہ اور فہم نئی ریاست کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔""

بانٹوا "بن کے رہے گا پاکستان" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ بانٹوا کے مسلمانوں نے پارٹی کے لیے 35 ہزار روپے کا چندہ اکٹھا کیا۔ چار چار آنے چندہ میں دے کر بہت سے لوگ پارٹی کے رکن بن گئے۔ اس روز جلسے گاہ میں عبدالستار بھی موجود تھا۔ گو ابھی وہ کم سن تھا، گجرات سے باہر نہیں نکلا تھا، مگر اسے اندازہ تھا کہ تبدیلی کا ایک طوفان آنے والا ہے۔

اس وقت تک وہ محبت کے پُراسرار تجربہ سے گزر رہا تھا۔ اس کیفیت کو سمجھ چکا تھا، جو فلم دیکھ کر اس کے دوستوں پر طاری ہوئی تھی۔ یہ کیفیت اس دوشیزہ کو دیکھ کر اسے بھی تھی، جس کی آنکھیں گہری اور زلفیں کوّے سی کالی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا جو دی تھی۔ ایک دن اسے یہ منحوس خبر ملی کہ اس لڑکی کی منگنی ہو گئی ہے۔ پھر کبھی نہ تو وہ گلی میں دکھائی دی، نہ ہی چھت پر اس کی جھلک نظر آئی۔ کہانی شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو گئی۔

گویا اب وہ سیانا ہو گیا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ زیرِ زمین لاوا پک رہا ہے۔ میمن برادری محمد علی جناح کے ساتھ تھی۔ کچھ گھرانے ہجرت کا فیصلہ کر چکے تھے، مگر بہت سے تذبذب کا شکار تھے مگر کانگریسی لیڈر ولبھ بھائی پٹیل کی سازشوں نے انھیں رختِ سفر باندھنے پر مجبور کر ہی دیا۔

ملک بھر میں ہندو مسلمان فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ گجرات بھی اس سے متاثر ہوا۔ انتہا پسند ہندوؤں نے مسلم بستیوں پر حملے شروع کر دیے۔ بانٹوا کے گرد و نواح سے ہولناک خبریں آ رہی تھیں۔ سورج کی روشنی چھن گئی تھی۔ راتیں خوف ساتھ لاتیں۔ آخر ایک دن عبدالستار کے باپ نے جھنجلا کر کہا۔ ""ہمیں پاکستان چلے جانا چاہیے، اب ہم ہندوستان میں ایک خودمختار قوم کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے۔""

چھ ستمبر کو عبدالستار کا گھرانا اُس ٹرین میں سوار ہوا جو چار ہزار افراد کو اوچھ پورٹ کے مہاجر کیمپ لے کر جانے والی تھی۔ اب بھارتی حکومت کو اپنی غفلت کا اندازہ ہوا۔ ایک بڑی کاروباری برادری ہجرت کرنے کو تھی۔ انھوں نے میمنوں کو روکنے کی کوشش تو کی، مگر اب ہندوستان ان کے دل سے اتر چکا تھا۔

وہ سفر پانچ روز پر محیط تھا۔ انتہائی کٹھن اور دشوار۔ بے سکونی، خوف، فاقہ کشی۔ رات بھر بچے روتے رہتے۔ عورتیں بین کرتیں۔ ٹرین کے سفر کے بعد انھیں بحیرۂ عرب کی ہواؤں اور لہروں کا مقابلہ کرنا تھا۔ بحری سفر دو دنوں پر پھیلا تھا۔ آخر ایک صبح ان کی کشتی ساحل سے آ لگی۔

جب عبدالستار بندرگاہ پر اترا، تو مچھلی کی تیز بو سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ماں کی سمت دیکھا، جس کی گود میں اس کا چھوٹا بھائی عزیز تھا۔ خود اس نے اپنی بہن کو اٹھا رکھا تھا۔ باپ کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اسے حوصلہ ملا۔

وہ ایک نیا جہان تھا۔ بانٹوا، وہاں کے کھیت کھلیان، وہ ہانڈی میں رکھے بچت کے پیسے.... سب پیچھے رہ گئے تھے۔ سب کچھ وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب پاکستان عبدالستار کی شناخت بننے والا تھا۔

☆......☆

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کواڑ پر دستک ہوئی تھی۔ کوئی اُسے پکار رہا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ بہت دیر تک ہل نہیں سکا۔ سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔

یہ ایک پرانی آسیبی عمارت تھی جو پاکستان آمد کے بعد عبدالستار کے خاندان کا اوّلین مسکن ٹھہری۔ شروع میں تو وہ ویران تھی۔ شام اترتے ہی وحشت ہونے لگتی۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، وہاں عجیب و غریب بولیاں سنائی دینے لگیں۔ ہندوستان کے دیگر شہروں سے لٹے پٹے قافلے، الم ناک کہانیاں لیے پاکستان آ رہے تھے۔ جنھیں چھت مل جاتی، وہ خود کو خوش نصیب گردانتے۔ ورنہ بہت سے لوگ کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور تھے۔ عجب کسمپرسی کا عالم تھا۔ بے چارگی تھی۔ عبدالستار کا دل بڑا کڑھتا۔ اس کی ماں جو کچھ پکاتی، اس کا ایک حصہ عمارت میں مقیم ان لوگوں کے لیے بچا لیتی جنھیں بدحالی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

وہیں، اسی آسیبی دنیا میں اس نے پہلی بار غربت کی کریہہ شکل دیکھی۔ لین دین کے معاملے میں دو آدمیوں میں

جھگڑا ہوا۔ ایک نے دوسرے کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ اس کی روح دہل گئی تھی۔ مگر یہ فقط آغاز تھا، آنے والے برسوں میں اسے اس نوع کے کئی انسانیت سوز مناظر دیکھنے تھے۔

کچھ عرصے بعد یہ خاندان جوڑیا بازار اٹھ آیا۔ عبدالشکور نے ادھر ایک گھر کرایہ پر لے لیا تھا۔ یہ ایک گنجان علاقہ تھا۔ دن بھر کاروبار جاری رہتا، پھر گاڑیوں کا شور۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ پیڑ بھی کم تھے۔ ہوا میں نمی سی تھی۔ یہ دنیا بانٹوا سے یکسر الگ تھی، مگر اب یہی عبدالستار کا نیا گھر تھا۔

اس نے جلد ماضی سے پیچھا چھڑا لیا۔ وہ ایک بار پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے تیار تھا۔

وہ پھیری لگا کر ماچس، پنسل اور تولیہ فروخت کرنے لگا۔ لوگ خوب بھاؤ تاؤ کرتے۔ چیزیں لینے سے پہلے دس طرح کے سوال کرتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے، جو اتنی بحث کے بعد کمال بے نیازی سے آگے بڑھ جاتے۔ عبدالستار کبھی نہیں جھنجلایا۔ اسے گاہکوں سے معاملہ کرنا آتا تھا۔ بچپن کی تربیت کام آرہی تھی۔ یہاں بھی اس نے بچت کی عادت نہیں چھوڑی۔ کچھ پیسے جمع ہوگئے تو ایک ٹھیلا خرید لیا اور پان بیچنے لگا۔

اس کی محنت کا ثمر گھر والوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ نئی زمین پر اس خاندان کے پاؤں جمنے لگے۔ بھائی کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ بانٹوا کے کئی گھرانے جوڑیا بازار میں آکر بس گئے تھے۔ کچھ پرانے دوستوں سے بھی رابطہ ہوگیا۔ وہ چائے کے ایک ہوٹل میں اکٹھے ہونے لگے۔ ایک روز دوستوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اس بار انھوں نے فلم "جھروکا" دیکھی۔ بھاگ دوڑ کے عادی عبدالستار کے لیے تین گھنٹے ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا ایک بار پھر... دشوار ثابت ہوا۔ اس دن کے بعد اس نے فلم بینی کو وقت کا زیاں ٹھہرایا اور پھر کبھی سینما ہال کا رخ نہیں کیا۔

کچھ عرصے وہ بہاول پور کے ایک تاجر کے ہاں ملازم رہا۔ گھر سے دور دل نہیں لگتا تھا سو کراچی لوٹ آیا۔ اب یہ شہر اسے اپنا اپنا لگنے لگا تھا۔ یہاں کے در و دیوار سے دوستی ہوگئی تھی۔ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتا ہوا عبدالستار کمیشن ایجنٹ بن گیا تھا۔

وہ منزل کا متلاشی تھا۔ اپنے مقصدِ حیات کی کھوج میں رات رات بھر جاگتا۔ کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ پھر ایک روز ...اخبار میں شائع ہونے والا ایک اشتہار دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ رستہ ظاہر ہونے لگا... جو اُسے منزل تک لے جانے والا تھا۔ گو اس وقت وہ اس بات سے یکسر لاعلم تھا۔

یہ 1948 کا موسم سرما تھا۔ میٹھادر میں آباد بانٹوا برادری کے بزرگوں نے ایک فلاحی تنظیم بنانے کا اعلان کیا۔ اس کا نام بانٹوا میمن ڈسپنسری رکھا گیا۔ انھیں رضاکار درکار تھے۔

اشتہار پڑھتے ہی بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کے باپ کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔ اسے اپنے بیٹے کے جذبات کا ......علم تھا۔ اس کی دھیمی مسکراہٹ کے پیچھے عبدالستار کے لیے دعائیں تھیں۔ برادری والوں نے اوروں کے مانند عبدالشکور سے بھی پوچھا۔ "بھائی شکور، تم ڈسپنسری کے لیے کتنے پیسے عطیہ کرو گے؟"

اس نے کہا تھا۔ "میں ایک ایسی چیز عطیہ کروں گا جو پیسوں سے بڑی ہوگی۔" پھر اپنے بیٹے کی سمت اشارہ کیا۔ "ایک جیتا جاگتا انسان۔"

عبدالستار پُرجوش تھا۔ دن میں کپڑے کی ایک دکان پر مصروف رہتا۔ شام پڑتی تو گھر جانے کی بجائے سیدھا ڈسپنسری آجاتا اور کام میں جت جاتا۔ عبدالستار کی ماں کو بڑی فکر ستاتی۔ جب وہ رات گئے گھر لوٹتا تو فوراً پوچھتی۔ "عبدالستار تو نے کھانا کھالیا؟"

وہ لاکھ کہتا کہ اماں میں نے کھانا کھالیا تھا مگر ماں کی ممتا ایک نہ سنتی۔ کھانا فوراً گرم کرکے اس کے سامنے رکھ دیا جاتا اور اسے وہ کھانا پڑتا۔

وہ مسرور تھا۔ زندگی کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ مگر ایک چیز کا قلق تھا۔ ڈسپنسری صرف بانٹوا برادری کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص تھی۔ دیگر افراد کو علاج معالجے کے لیے طویل قطار میں کھڑا رہنا پڑتا۔ اُسے یہ افسوسناک خبر بھی مل چکی تھی کہ ادویہ اور ایکسرے جیسی مفت خدمات کے لیے ملازمین چھوٹے موٹے نذرانے لینے لگے ہیں۔ بیواؤں میں جو سلائی مشینیں تقسیم کی جاتی ہیں، اُن پر بھی کمیشن لیا جاتا تھا۔ اس بے ایمانی پر اسے بڑا غصہ آیا۔

اس کے احتجاج نے بدعنوان ساتھیوں کو چونکا دیا۔ انھیں قطعی توقع نہیں تھی کہ یہ دھان پان سا بظاہر بے ضرر معلوم ہونے والا شخص اندر سے ایک انقلابی ہے۔ اس کے لیے ناپسندیدگی بڑھنے لگی۔ اب عبدالستار نے اپنے طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ برادری کے علاوہ دیگر مریضوں کو بھی مفت دوائیں فراہم کرنے لگا۔ ان کے مسائل دوڑ دوڑ کر حل کرتا۔ اس نیک عمل نے جلد ایک شکایت کی شکل اختیار کرلی۔

بزرگ کمیٹی کے کان بھرے جانے لگے۔

اگلے ماہوار اجلاس میں اس نے کڑے الفاظ میں ڈسپنسری کے طریقے کار پر تنقید کی۔ مارکس کا حوالہ بھی دیا، کہا۔ ”اگر فلاحی کاموں کا یہی طریقہ ہے، تو پھر ہمیں خود کو اپنے گھروں تک محدود کر لینا چاہیے۔“

اس کے مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے الٹا اس کے خلاف کارروائی کی گئی۔ رسیدوں پر دستخط کے اختیارات واپس لے لیے گئے اور اسے دیوار سے لگانے کی کوششوں کا آغاز ہو گیا۔ مخالفین اس پر کمیونسٹ کمیونسٹ کی آوازیں کستے۔

وہ مایوس نہیں ہوا۔ خدمت کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس نے ڈسپنسری جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک شام ڈسپنسری کو چندہ دینے والے سیٹھ حضرات کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی۔ وہ بھی گیا۔ بڑی پروقار تقریب تھی۔ لوگوں نے سیٹھوں کی تعریف میں الفاظ کے دریا بہا دیے۔ جب سب کہہ چکے تو عبدالستار نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔ بزرگ کمیٹی کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ لڑکا کوئی سخت بات کہے گا۔

ایک کونے سے آواز آئی۔ ”چپ کرو، تم کون ہوتے ہو بولنے والے۔“

ایک اور شخص نے کہا۔ ”اسے باہر کا راستہ دکھاؤ۔“

پورا مجمع اس کے خلاف ہو گیا، مگر وہ چٹان کی مانند اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ذرا نہ گھبرایا۔ گہری سانس لی اور جذبات کو آزاد چھوڑ دیا۔

”بس بہت ہوا صاحب۔ یہ فلاحی کام کرنے کا کوئی طریقہ ہے... آپ نے فلاحی کاموں کو اپنی فیاضی کا اشتہار بنا لیا ہے..... جس طرح بیواؤں اور یتیموں کی مدد کی جاتی ہے، اس سے ان کی بے عزتی ہوتی ہے... یہ فقط خودنمائی اور ذاتی تشہیر ہے۔“

تقریر کے دوران لوگ پھبتیاں کستے رہے۔ جملے اچھالتے رہے۔ تقریر کے اختتام پر ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”نکل جاؤ یہاں سے۔ آج سے تمھارا اس ڈسپنسری سے کوئی تعلق نہیں۔“

وہ باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ واپسی کا سفر طویل تھا۔ راستے تاریک تھے مگر اس کے دل میں ایک خواہش پنپ رہی تھی۔

☆......☆

گھر لوٹا، تو ماں منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بیماری سے ماند پڑنے لگی تھی۔ باپ بھی موجود تھا۔

عبدالستار نے پوری کہانی سنا ڈالی۔ اور آخر میں وہ خواہش بھی ظاہر کر دی جو اس وقت دیوانے کا خواب معلوم ہوتی تھی۔ ”ابا، اب میں خود ایک ڈسپنسری کھولوں گا، جہاں ہر نسل، علاقے اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی بلاامتیاز خدمت کی جائے گی۔“

اس کے الفاظ کی گونج بہت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ کھڑکی کے باہر پورا چاند تھا۔ ہوا میں سستی تھی۔

عبدالستار کو خدشہ تھا کہ کہیں اس کا باپ اس خیال کو رد نہ کر دے۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر لینا کسے پسند ہوگا۔ باپ خاموشی سے کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عبدالستار نے ماں کی سمت دیکھا۔ اس کے چہرے پر شفقت تھی۔

آخر باپ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”بیٹا، وہ بہت بااثر لوگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے، اب سب تمھارے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

عبدالستار کو لگا، اس کے پیروں میں باپ کے حکم کی بیڑی پڑنے والی ہے، مگر۔ جو الفاظ اس کے باپ کی زبان سے ادا ہوئے، انھوں نے اسے سرشار کر دیا۔ ”تم مخالفین کی جانب بالکل بھی توجہ نہ دینا۔ ان کا نوٹس ہی نہ لینا۔ یہی ان سے نمٹنے کا بہترین طریقہ ہے۔“

اس نے لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بال چاندنی میں نہائے ہوئے تھے۔ ”اور یاد رکھنا، کبھی کسی کا احسان نہ لینا۔ جو کرنا ہے، اکیلے کرنا۔ سمجھ گئے۔“

وہ اپنے باپ کے گلے لگ گیا۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ عورت کھانسی تھی۔ عبدالستار ماں کے پاس گیا۔ ”اماں، تم ٹھیک تو ہو۔ لیٹ جاؤ۔“ وہ گھبرایا ہوا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹے۔“ عورت کی آنکھوں میں بھی خوشی تیر رہی تھی۔ ”میرا عبدالستار اب بڑا ہو گیا ہے۔“

اس نے ماں کے ہاتھ چومے۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں ماں، ساری زندگی آپ کی نصیحتوں پر عمل کروں گا۔ بے کس اور لاچاروں کی مدد کروں گا۔“

اس رات کھڑکی کے باہر پورا چاند تھا۔ میٹھا در کے گھروں میں نیند کے قدموں کی چاپ تھی۔

☆......☆

بوڑھے نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ جسم ہولے ہولے

کانپ رہا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

عبدالستار نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح تپ رہا تھا۔ گھر کے مالک نے اشارہ کیا۔ صحن میں اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ عبدالستار سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بابا پچاس سال سے ہمارے خاندان کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھ پر لازم ہے کہ ان کی آخری خواہش پوری کروں۔" گھر کے مالک عبدالماجد نے کہا۔ "مگر میرے بچے چھوٹے ہیں۔ میں اکیلا یہ کام نہیں کرسکتا۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔"

لڑکے نے گہرا سانس لیا۔ اس گھرانے سے عبدالستار کے خاندان کی اچھی سلام دعا تھی۔ عبدالماجد اس کے باپ کا دوست تھا۔ ایک سہ پہر وہ ایک عجیب وغریب درخواست لے کر اس کے گھر آیا۔

ان کا بوڑھا ملازم شدید بیمار تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ بوڑھے کا تعلق بہار سے تھا۔ وہ مالکوں کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی تو آ گیا، مگر اب اُسے اپنے آبائی گاؤں کی یاد ستاتی تھی۔ وہ وہیں دفن ہونا چاہتا تھا۔

"یہ برٹش ایرویز کے دو ٹکٹ ہیں۔" آدمی نے لفافہ کھولا۔ "اور یہ کچھ پیسے۔ تم بابا کو بہار پہنچا دو۔ ان کا خاندان کوئلے کی کانوں کے پاس آباد ہے۔"

یہ ایک مشکل فیصلہ تھا، مگر کسی دکھیارے کی مدد کرنے سے بھلا وہ کیسے انکار کرسکتا تھا۔ پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا تجسس اپنی جگہ، مگر جب بوڑھا دورانِ سفر بے ہوش ہو گیا، تو اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ کلکتہ ایئرپورٹ پر اترتے ہی اس نے ریڈ کراس کی ایمبولینس کے ذریعے اسے اسپتال پہنچایا اور اس کے اہل خانہ کو اطلاع دی۔ وہ دوڑے دوڑے آئے۔ بوڑھے کا علاج ہوا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اب واپسی کا سفر تھا۔ عبدالستار نے سوچا، شاید ایسا موقع پھر نہ ملے، کیوں ناں مشرقی پاکستان کا بھی چکر لگا لیا جائے۔ اس کا سوتیلا بھائی وہیں مقیم تھا۔ وہ ڈھاکے سے ہوتا ہوا واپس کراچی پہنچا، تو تجربات اور مشاہدات سے لیس ایک شخص تھا، جو کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار تھا۔

ڈسپنسری بنانے کے خواب کا کچھ دوستوں سے ذکر کیا۔ پہلے تو وہ خوب ہنسے، جب مگر اسے سنجیدہ پایا، تو سمجھانے لگے۔ "میاں اس میں بڑا پیسا خرچ ہوتا ہے۔ غریبوں کا مسیحا بننا آسان نہیں۔ تمھاری جیب تو خالی ہے۔ پہلے سیٹھ بن جاؤ، پھر یہ کام کرنا..."

مگر عبدالستار کے سر پر تو دھن سوار تھی۔ بچت کرنے کی عادت بھی کام آئی۔ اس نے کچھ پیسے جوڑ رکھے تھے۔ یہ رقم تین ہزار کے قریب تھی۔

1951 میں عبدالستار نے وہ قدم اٹھایا، جو اُسے امر کرنے والا تھا۔ اگر اس وقت کوئی عبدالشکور کو بتاتا کہ کل تمھارے بیٹے کا نام پوری دنیا میں گونجے گا... کروڑوں سر اس کے سامنے جھک جائیں گے... اسے عالمی رہنماؤں سے زیادہ محبت ملے گی، تو ہنس پڑتا۔

مگر یہی حقیقت تھی۔ بانٹوا کا عبدالستار عظمت کی راہ پر قدم رکھ چکا تھا۔

اس نے میٹھادر کے علاقے میں دو ہزار تین سو روپے میں ایک چھوٹی سی دکان پگڑی پر لے کر اس میں ڈسپنسری کھول لی۔ ایک میز اور دو کرسیاں رکھیں۔ کچھ دوائیں اور مرہم پٹی کا سامان رکھا۔ اور نام دیا، میمن والنٹیئر!

وہاں اس نے چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ بھی رکھ دیا کہ آتے جاتے لوگ کچھ ریزگاری ڈال دیں۔ عبدالستار کی ڈسپنسری ہر وقت کھلی رہتی۔ بازار بند ہونے کے بعد بھی وہ بیٹھا رہتا۔ رات پڑتی، تو گھر جانے کی بجائے وہیں باہر سیمنٹ کی بینچ پر سو جاتا۔ گھر یوں نہیں جاتا تھا کہ اگر اس دوران کوئی مریض آ گیا، تو بےچارے کو مایوس لوٹنا پڑے گا اور یہ اسے گوارا نہیں تھا۔

ماں اکثر کہتی۔ "عبدالستار گھر آ کر سویا کر یا کم از کم ایک تکیہ اور چادر لے جا، وہاں کتنے مچھر ہوں گے۔" مگر اس کے سر پر تو بھوت سوار تھا۔

آغاز میں مفت ادویہ کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا۔ دوستوں نے جب دیکھا کہ ایدھی یہ قدم اٹھا چکا ہے، تو انھوں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ اپنے اپنے طور پر حصہ ڈالا۔ کچھ رضاکار بھی آن ملے۔ برادری کے غریب طبقے نے تو داد دی، مگر امرا نے ناک بھوں چڑھائی۔ مخالفین پھبتیاں کس رہے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے، جنھوں نے اسے پچھلی ڈسپنسری سے نکلوایا تھا۔ وہ ہنستے تھے۔ "دیکھو، اس کی جیب خالی ہے مگر وہ محل تعمیر کرنا چاہتا ہے، اپنی حیثیت دیکھ، پھر اوروں کی مدد کرنا۔"

بازار سے گزرتے ہوئے یہ جملے اس کے کانوں میں پڑتے مگر اُسے اپنے والد کی نصیحت یاد تھی۔ اس نے چنداں پروا نہ کی۔ اسے فکر تھی تو بس پریشان حال مریضوں کی۔

جلد عبدالستار کو احساس ہو گیا کہ فقط دوا سے کام نہیں بنے گا۔ اس نے ایک مستقل ڈاکٹر رکھ لیا۔ کام دھیرے

وہ بے چین رہا تھا، ہم خیال لوگ اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے تھے۔ اعتماد بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی ایک خواہش بھی انگڑائی لے رہی تھی۔ دنیا دیکھنے کی خواہش۔

☆......☆

برسوں بعد جب عبدالستار کی سوانح حیات لکھی گئی تو مصنف نے اس کے 1956 کے سفر یورپ کی خواہش کو ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے سفر کا منطقی نتیجہ قرار دیا، جس نے عبدالستار کو یہ احساس دلایا کہ بانٹوا اور کراچی سے پرے بھی ایک دنیا ہے.... جو اسے پکارتی ہے۔

وہ سفر بھی عجیب تھا۔ عبدالستار نے ایک تھیلا اٹھایا، ایک جوڑا، ایک چادر، کچھ پیسے اور کھانے پینے کی کچھ اشیاء ڈالیں اور ایک بس میں سوار ہو گیا۔ پہلے ایران کا رخ کیا۔ پھر ترکی پہنچا۔ سفر کے ساتھ دیوانگی بڑھتی گئی۔ ادھر سے بلغاریہ اور یوگوسلاویہ جانا ہوا۔ امیگریشن افسران اس سادہ مزاج، بے فکر نوجوان کو حیرت سے دیکھتے، جس کے سر پر ٹوپی تھی، ہلکی سی داڑھی تھی۔ جسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ بس، اپنی دھن میں آگے بڑھے جا رہا تھا۔

دوران سفر کچھ خدا ترس لوگ اسے کھانے پینے کی چیزیں دے دیتے۔ کچھ مفلس سمجھ کر پیسے بھی دیتے، جنھیں خرچ کرنے کے بجائے وہ ڈسپنسری کے لیے رکھ لیتا۔ دن بھر گھومتا رہتا۔ رات کسی فٹ پاتھ پر گزارتا۔ صبح اٹھتا، تو سرہانے ریزگاری رکھی ہوتی۔ روم میں سویا، تو کوئی اٹھائی گیرا جوتے لے اڑا۔ اور بھی کئی دلچسپ تجربات ہوئے۔ دوران سفر ایک اجنبی حسینہ سے ملاقات ہوئی۔ دھڑکن تیز ہو گئی۔ پہلی بار کسی کو اپنا بنانے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ مگر یہ سفر تھا... جلد راستہ جدا ہو گیا۔

لندن میں ایک عزیز سے ملاقات ہوئی، جس نے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں بھائی، مجھے تو کراچی جانا ہے، اپنی ڈسپنسری سنبھالنی ہے۔“

جب وہ کراچی پہنچا، موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ درختوں پر دھول جمی تھی اور وبائیں پھوٹنے والی تھیں۔

☆......☆

ظہر کے بعد مسجد سے اعلان ہوا۔ ”جناب نثار میمن کی بیگم کا انتقال ہو گیا، نماز جنازہ میں شرکت فرمائیں۔“ اگلے روز عصر کے بعد فہد احمد کی بیٹی کی موت کی خبر ملی۔ تین روز بعد پھر ایک عورت وفات پا گئی۔

عبدالستار ان لوگوں میں سے نہیں تھا، جو نماز جنازہ کے بعد مرنے والے کی مغفرت کی دعا کرتے اور اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔ اسے کرید ہوئی۔ معلومات اکٹھی کرنی شروع کر دی۔ گو ماں بیمار تھیں، مگر اس تحقیق میں اس خدا ترس عورت نے ہاتھ بٹایا۔ مختصر سے سروے کے بعد اندازہ ہوا کہ گزشتہ پانچ ماہ میں خواتین کی زیادہ تر اموات زچگی کے دوران ہوئی ہیں۔

جن انقلابیوں کے افکار نے عبدالستار کے ذہن کو جلا بخشی، وہ سب انسانیت کے علم بردار تھے اور سماج میں عورت کو برابری کا مقام دینے کے خواہش مند تھے۔ عبدالستار کی سوچ بھی انقلابی تھی۔ اس کے اپنے سماج میں عورت مصائب کا شکار تھی۔ شادی کے فوراً بعد آگے پیچھے بچوں کی پیدائش، گھر کی ذمے داریاں، پھر شوہر کے تقاضے... کچھ ہی برسوں میں عورت ٹوٹ جاتی۔ اگر اس کی صحت کا خیال نہ رکھا جائے، دباؤ زیادہ ہو، تو نتیجہ اس مظلوم کی موت پر منتج ہوتا۔

عبدالستار نے اندازہ لگایا کہ شہر کی آبادی بڑھ رہی ہے، علاقے تنگ ہوتے جا رہے ہیں اور خواتین کے صحت کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، جن سے فوری نہیں نمٹا گیا تو یہ حالات بگڑ سکتے ہیں۔ اس نے ایک میٹرنٹی ہوم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ڈسپنسری کی اوپری منزل کرائے پر لی اور نرسنگ کورس کا اشتہار دے دیا۔

یہ ایک جرأت مندانہ قدم تھا۔ تین ماہ پر محیط اپنی نوعیت کے اس پہلے نرسنگ کورس کی کوئی فیس نہیں تھی۔ الٹا سیکھنے والوں کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔ بس، شرط یہ تھی کہ وہ سیکھ کر تین ماہ تک نئی لڑکیوں کو یہ کورس کرائیں، پھر جہاں چاہیں ملازمت کریں۔

اس اشتہار نے مخالفین کو آگ بگولا کر دیا۔ وہ الزامات کا ٹوکرا اٹھائے میدان میں آ گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ عبدالستار فحاشی کا اڈا شروع کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک واہیات الزام تھا۔ کوئی اور ہوتا، تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ مگر اس نے فقط گہری سانس لی۔ رب سے استقامت کی دعا کی اور اپنے کام میں جت گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا عمل ہی سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔

ایک لیڈی ڈاکٹر کی سرپرستی میں نرسنگ ہوم کا آغاز کیا گیا۔ خدشہ تھا کہ شاید برادری کی خواتین اس سمت آنے سے جھجکیں مگر حیرت انگیز طور پر کئی درخواستیں موصول ہوئیں۔ پروپیگنڈا ناکام ہو گیا تھا۔ میٹرنٹی ہوم میں کیسز آنے لگے، جنھیں لیڈی ڈاکٹر اور زیر تربیت لڑکیاں خوش اسلوبی سے

سنبھالتیں۔ عبدالستار کا کام پھیلنے لگا تھا۔ گو وہ ایک نرم مزاج آدمی تھا، مگر اچھا منتظم بننے کے لیے اس نے خود پر سخت گیری طاری کرلی۔ کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کرتا۔

میٹھادر میں کئی بوڑھے، بچے اور عورتیں بے سروسامانی کے ساتھ کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور تھے۔ یہی حال کراچی کے دیگر علاقوں کا تھا۔ اس کے ذہن میں بے گھر افراد کے لیے کام کرنے کا منصوبہ بھی تھا، مگر اس کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ ابھی تو فقط یہی کرسکتا تھا کہ جو لوگ ڈسپنسری کے نیچے آکر بیٹھتے، انھیں اپنی چھت تلے پناہ دے دیتا۔ یہ احساس بھی تھا کہ چندے کا چھوٹا سا ڈبہ کافی نہیں۔ اسے مزید عطیات اکٹھے کرنے ہوں گے۔ بہار کی ایک خوشگوار صبح... نماز فجر کی ادائی کے بعد اس کے ذہن میں قربانی کی کھالیں جمع کرنے کا خیال سوجھا۔

عید قربان سے قبل اس نے ایک بینر لگادیا۔ "قربانی کی کھالیں ہمیں عطیہ کیجیے!"

ردِعمل حیران کن رہا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں کھالیں دیں۔ علاقہ اب اس پر، عبدالستار پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ وہ مطمئن ہوگیا۔ البتہ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ایک طوفان اس کا منتظر ہے۔

☆......☆

موسم بدل رہا تھا۔ بادل آسمان سے غائب ہوگئے۔ دن بھر دھوپ رہتی۔ شامیں بھی گرم ہوتیں۔

ادھر ڈسپنسری کا کام بڑھ رہا تھا، ادھر اس کی ماں سکڑتی جارہی تھی۔ وہ خاصی نحیف ہوگئی تھی۔ اب کم ہی بولتی۔ بس تسبیح پڑھتی رہتی۔ عبدالستار کے لیے دعائیں کرتی۔ عورت کو چیک اپ کے لیے اسپتال لے جانے کی ذمے داری اسی کی تھی۔ اس زمانے میں مریضوں کو اسپتال لے جانے کے لیے آج کی طرح ایمبولینسیں نہیں ہوتی تھیں۔ شہر میں فقط ایک ایمبولینس تھی، جو ریڈ کراس کی ملکیت تھی۔ عبدالستار کبھی تانگے میں تو کبھی رکشے میں اپنی ماں کو اسپتال لے کر جاتا۔ یہ سفر انتہائی اذیت ناک ہوتا۔ ماں کی حالت بگڑ جاتی۔

ایک دوپہر، جب بلا کا حبس تھا اور درخت ساکت کھڑے تھے، وہ ڈسپنسری میں بیٹھا خاموش تھا۔ جانے کیوں آج طبیعت بوجھل تھی۔

اس خاموشی میں کسی نے اسے دھیرے سے پکارا تھا۔ یہ ایک شفیق اور مانوس آواز تھی۔ اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔ باہر جون کی گرم دوپہر تھی۔ اس نے دیکھا، دور سے ایک شخص دوڑتا آرہا ہے۔ اس کے پیچھے اندیشے لگے تھے۔ وہ ڈسپنسری کے دروازے پر آکر رک گیا۔ عبدالستار کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ کسی نے اسے پھر پکارا تھا... دھیرے سے۔ اس نے پہچان لیا، یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔

"عبدالستار بھائی...." آدمی ہانپ رہا تھا۔ "وہ اماں گھر میں گر... گئیں۔"

وہ دوڑا دوڑا گھر پہنچا۔ ماں پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس کا بایاں حصہ بے کار ہوگیا۔ وہ عورت، جس نے اسے پالا پوسا، اس کی تربیت کی، بے بسی کی تصویر بنی اس کے سامنے پڑی تھی۔ عبدالستار کا امتحان شروع ہو چکا تھا۔

اس روز سے ماں اس کی پہلی ترجیح بن گئی۔ اب وہ اس کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ ماضی کے قصے بیان کرتا، پُرمسرت دن بازیافت کرتا، تاکہ اس کا دل لگا رہے، مگر عورت کو خبر تھی کہ اس کی رخصتی قریب ہے۔ وہ بس یہی کہتی۔ "عبدالستار، دعا کر.... اللہ مجھے اس محتاجی سے آزاد کردے۔"

وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔ "نہیں اماں، کیسی باتیں کررہی ہو، ابھی تو تمھیں بہت جینا ہے۔"

صبح اٹھ کر وہ ماں کے ناشتے کا انتظام کرتا۔ اس کے کپڑے بدلتا۔ پھر دوا دیتا۔ دن کا بڑا حصہ ماں کی تیمارداری میں گزرتا، ڈسپنسری کے کام سے لوگ اس کے گھر ہی چلے آتے۔

اب احساس ہوا کہ اسے شادی کرلینی چاہیے تھی۔ بیوی ہوتی تو گھر کو سنبھالتی، ماں کا خیال رکھتی۔ وہ بھی اطمینان سے اپنا مشن جاری رکھ سکتا تھا۔

اسی خیال کے تحت اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی ڈسپنسری میں امینہ نامی ایک نیک دل عورت کام کرتی تھی۔ شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ اس کا ایک بچہ تھا۔ وہ ذہین اور پُراعتماد عورت تھی۔ ایک روز عبدالستار نے ہمت کرکے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا مجھ سے شادی کروگی؟"

وہ ہنس دی۔ "اماں سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"

کچھ دن یونہی گزر گئے۔ امینہ کی طرف سے خاموشی رہی۔ ایک دن عبدالستار نے دریافت کیا۔ "ہاں بھئی، کیا فیصلہ ہے؟"

"اماں راضی نہیں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ پوچھتی ہے، تم اپنی بیوی کو رکھو گے کہاں، اس ڈسپنسری میں۔ تمھارے پاس اسے دینے کے لیے کچھ

نہیں۔ خود پنج پر سوتے ہو۔ داڑھی رکھ لی ہے۔ سب مولانا کہتے ہیں۔“

اولین احساس ناگواری کا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا، مگر پھر خود سے کہا۔ ”وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ مجھ جیسے شخص سے بھلا کون شادی کرے گا۔“

اس ناکامی کا غم غلط کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ اپنے کام میں خود کو غرق کر لے۔ البتہ ماں کا غم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ گھلتی جا رہی تھی۔ اب عورت چارپائی تک محدود ہو گئی تھی۔ وہ آنکھوں میں کرب لیے اپنے بیٹے کو تکتی رہتی، جس نے ایک ایسی راہ چنی تھی، جس کے بارے میں اس کے ہم عمر سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

پھر وہ صبح آئی، جو غم میں گندھی تھی، اداسی سے لبریز تھی جسے عبدالستار کبھی نہیں بھولنے والا تھا۔

اس کی ماں کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ اگلے چند روز عورت زندگی اور موت کی کشمکش میں رہی۔ اور پھر اس نے خاموشی سے شعور کی دہلیز عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اس روز آسمان پوری قوت سے برسا تھا۔ عبدالستار بارش میں بھیگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اندرون سلگ رہا تھا۔ ایک درد تھا، جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ درد سے نجات چاہتا تھا، سو اس سمت جا رہا تھا جہاں دوا تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ڈسپنسری کے سامنے کھڑا تھا۔ بازار میں لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سب کو خبر تھی کہ آج ہی اس کی ماں کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈسپنسری کا شٹر کھول دیا۔ وہ خاموش اور دل گرفتہ تھا مگر مقصد کی طاقت نے اسے سنبھال رکھا تھا۔

ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔ اس کی گود میں ایک بیمار بچی تھی۔ بادل زور سے گرجا۔ عبدالستار اپنی کرسی سے اٹھا اور بچے کو اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اب وہ اس کا بخار چیک کر رہا تھا۔

ڈسپنسری کے باہر ایک ہجوم تھا۔ اس برستی شام کچھ لوگوں نے اس کے گرد روشنی کا ہالا دیکھنے کا دعویٰ کیا، کچھ کا کہنا تھا، اس کی آنکھوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دشمن بھی آج چپ تھے۔

☆......☆

کچھ برتن، کچھ کپڑے، ایک تکیہ، ایک چادر، ایک چپل... زندہ رہنے کے لیے اسے بس ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی۔

میٹرنٹی ہوم کے اوپر اس نے ایک چھوٹا سا کمرا کرائے پر لے لیا۔ خستہ حال، بدبودار کمرا۔ یہاں رہنا آسان نہیں تھا مگر عبدالستار تو مشکل حالات میں رہنے کا عادی تھا اور پھر اس نے گھر کو خیرباد کہہ کر ڈسپنسری کی توسیع کو اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ بیشتر چیزیں غریبوں میں بانٹ دیں۔ ماں نے جو سبز رنگ کے کئی جوڑے تیار کیے تھے، وہ بھی اپنے پاس نہیں رکھے۔ وہ سلیٹی رنگ کی شلوار قمیص پہننے لگا جو مستقبل میں اس کی شناخت بننے والی تھی۔

اس کا طریقہ کار دیگر فلاحی تنظیموں سے یکسر مختلف تھا۔ دن بھر طرح طرح کے منصوبے بناتا۔ اسے فلاحی کاموں کے روایتی ڈھب پر اعتراض تھا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ فرسودہ طریقے ایک رکاوٹ ہیں۔

ان دنوں ذہن میں ایک اور خبط سما گیا تھا۔ صفائی کا خبط۔ بازار میں جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر تھے۔ گوبر پڑا رہتا، کیچڑ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے فضا بوجھل رہتی۔ بیماریاں بھی پھیلتیں۔ ایک دن اس نے بیلچہ اٹھایا اور بازار کی صفائی میں لگ گیا۔ گوبر اٹھا کر ٹرالی میں ڈالا اور بازار سے دور کچرا کنڈی میں لے جا کر پھینک آیا۔ یہ عمل وہ متواتر دہراتا رہا۔ شروع شروع میں تو لوگ اسے حیرت سے دیکھتے۔ پھر وہ ہنسنے لگے کہ دیکھو عبدالستار خاکروب بن گیا مگر اس نے کسی کی نہیں سنی... پھر ایک دن ایسا آیا، جب بچے اور نوجوان بھی ہمت کر کے اس کے ساتھ آن کھڑے ہوئے... علاقے میں صفائی مہم شروع ہو چکی تھی۔

ڈسپنسری میں توسیع کے لیے اس نے ایک بینر آویزاں کر دیا۔ بڑے دلچسپ انداز میں امداد کی اپیل کی گئی تھی۔

”انسانیت کے نام پر جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے، اس کا بھی بھلا!“

یہ بینر صدقہ و خیرات اکٹھا کرنے کا باقاعدہ آغاز تھا۔ آنے والے دنوں میں وہ کشکول اٹھا کر بھیک بھی مانگنے والا تھا۔ مخالفین نے حسب روایت شور مچایا مگر وہ تو فقیر تھا۔ اسے زمانے کی کہاں پروا تھی۔ اس کے سروں پر غیر مرئی پر پھڑپھڑاتے۔

اس زمانے میں کراچی میں ایک ہولناک وبا پھیلی....

یہ 1958 کا ذکر ہے۔ شہر کو ہانگ کانگ فلو نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کئی افراد اس کی لپیٹ میں آئے۔ اموات کی تعداد دن بہ دن بڑھنے لگی۔ ہر سوں خوف

تھا۔ عبدالستار نے میٹھادر سے باہر نکل کر کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا تو دوستوں نے سمجھایا... بھائی اس کے لیے بہت وسائل چاہئیں، یہ تمہارے لیے ممکن نہیں مگر وہ کہاں سننے والا تھا۔ ملیر کے علاقے میں عبدالستار نے تیرہ کیمپ لگائے۔ ابتدا میں بالکل تنہا تھا۔ پھر چند رضا کار بھی آن ملے۔ وہ مشکل وقت تھا۔ عبدالستار نے قدرت کا جبر دیکھا، انسانیت کی بے بسی دیکھی، مرض کی ہولناک قوت نے کتنی ہی زندگیوں کو نچوڑ لیا تھا، سبھوں کی روشنی چھن گئی۔ اس نے ہمت نہیں ہاری، جتنی زندگیاں بچا سکتا تھا، بچائیں۔

یہ پہلا موقع تھا، جب عبدالستار کا نام جسے لوگ اب مولانا کہہ کر پکارتے تھے، دیگر علاقوں میں بھی سنا گیا۔ اوروں کو بھی خبر ہوئی کہ ایک فلاحی کارکن موجود ہے، جو بلاامتیاز خدمت پر یقین رکھتا ہے۔ جن لوگوں نے سراہا، ان میں ایک ضعیف العمر تاجر بھی تھا۔ عجیب شخص تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا متکبر ہے۔ لہجے میں رعونت تھی۔ ایک شام کیمپ کے سامنے ایک چمکتی دمکتی گاڑی آکر رکی۔ تاجر اترا، عبدالستار کے پاس آیا۔ کاندھا تھپکا اور بیس ہزار خطیر رقم کا چیک کاٹ کر اسے تھما دیا۔

آدمی جا چکا تھا۔ عبدالستار کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ سورج بادلوں کے پیچھے مسکرا رہا تھا۔

کوئی اور ہوتا، تو ان پیسوں کو ڈسپنسری کی حالت بہتر بنانے میں صرف کرتا، مگر اس کے منصوبے ایک ڈسپنسری، ایک علاقے تک محدود نہیں تھے۔ پھر اسے وہ وقت بھی یاد تھا جب اسے بوڑھی بیمار ماں کو اسپتال لے جانے کے لیے خستہ حال رکشوں پر انحصار کرنے پڑتے تھے۔

تو ان بیس ہزار سے... عبدالستار نے ایک وین خرید لی۔ سمجھ لیجیے، ایمبولینس... وہ خستہ حال، پرانی وین ہی وہ بنیاد تھی، جس پر دنیا کا سب سے بڑا ایمبولینس نیٹ ورک تشکیل پانے والا تھا۔

عبدالستار نے اس کا نام "غریب آدمی کی وین" رکھا۔

چار پہیے کیا آئے، اس کے کام کو پر لگ گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ فعال ہو گیا۔ یہ وین میٹھادر کے اطراف میں دوڑتی پھرتی۔ ایک معنوں میں اس نے اشتہار کا کام کیا۔ اس زمانے میں کراچی کے سرکاری اسپتالوں میں فقط پانچ ایمبولینسیں تھیں۔ ان کی پیشگی بکنگ کروانی پڑتی تھی۔ مصیبت میں ضرورت مند عبدالستار کی سمت دوڑے آتے۔ وہ بھی آگے بڑھ کر ان کی مدد کرتا۔ دن ہو یا رات، آندھی ہو یا طوفان، وہ کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ کبھی کبھار ڈرائیو نگ کرتے ہوئے وہ سوچتا۔ "ہمارے پاس امدادی کاموں کے لیے ایک ہیلی کاپٹر بھی ہونا چاہیے۔" پھر اپنی خواہش پر خود ہی ہنس دیتا۔ "عبدالستار، زیادہ خواب مت دیکھو۔"

غریب آدمی کی اس وین نے عبدالستار کے ادارے کو استحکام بخشا۔ ایک روز ایک درد دل رکھنے والے صنعت کار نے اسے عطیے میں تین لاکھ کی خطیر رقم دی۔ احساسِ تشکر سے عبدالستار کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس رقم سے پرانی ایکسرے مشین خریدی گئی۔ ڈسپنسری کو کشادہ کیا گیا۔ ساتھ طبی سہولیات دینے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ فون بھی لگ گیا تھا۔ اس نے زچہ بچہ کے عقب میں دو ہال اور چند کمرے کرایے پر لے لیا۔ یہ پہلا شیلٹر ہوم تھا، جہاں اس نے بے گھر اور معذور افراد کے قیام کا انتظام کیا تھا۔

مارکیٹ کمیٹی کو اس پر شدید اعتراض تھا۔ "مولانا، علاج معالجہ ٹھیک ہے، زچہ بچہ پر بھی ہم نے تمہاری بات مان لی، مگر یہ فقیروں کو تو یہاں اکٹھا نہ کرو۔ کیوں ماحول خراب کرتے ہو۔"

اُسے بہت غصہ آیا، مگر الجھنے سے اجتناب کیا۔ یہ کہہ کر کہ اگر میں نے کوئی خلاف قانون کام کیا ہے تو آپ کارروائی کر سکتے ہیں... آگے بڑھ گیا۔

ایک روز خبر آئی کہ میٹھادر کی ایک کچرا کنڈی سے پرانی لاش ملی ہے۔ لوگ اُس سمت جا رہے تھے۔ وہ بھی گیا۔ لاش چار پانچ روز پرانی تھی۔ تعفن اٹھ رہا تھا۔ لوگوں نے شناخت کر لیا۔ وہ ایک نشئی تھا، جو کچھ روز سے غائب تھا۔ غالب امکان تھا کہ وہ کچرے کے ڈھیر میں گرا اور وہیں اُس کی روح پرواز کر گئی۔ ادھر لوگ کچرا ڈالتے رہے۔ کچرے تلے اُس کی لاش دفن ہو گئی۔

عجیب کیفیت تھی۔ کوئی پاس جانے کو تیار نہیں تھا۔ اُس کا کوئی والی وارث بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر عبدالستار خاموش کھڑا رہا۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ لاش کو کچرے سے نکالا۔ لوگ پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ مسلمان تھا۔ چلو، اسے غسل دے کر اسلامی طریقے سے تدفین کریں۔" اس کے ان الفاظ نے لوگوں کو خواب غفلت سے جگا دیا۔ لوگ جی کڑا کر کے آگے بڑھے۔ اس لاوارث، خستہ حال لاش کو قریبی قبرستان میں دفنا گیا۔

کچھ روز بعد جب وہ ڈسپنسری میں بیٹھا کھاتوں کا جائزہ

لے رہا تھا کہ کچھ لوگ اسے تلاش کرتے آئے۔

”جی بھائی، فرمائیں۔“ اس نے فائل بند کر دی۔

مضافاتی علاقے کا ایک رہائشی کچھ روز سے لاپتا تھا۔ پھر ایک اندھے کنویں سے تعفن اٹھنے لگا۔ تب لوگوں کو اندازہ ہوا کہ وہ بدنصیب کنویں میں گر کر ہلاک ہو گیا ہے۔ کسی کی اُسے نکالنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اللہ کا نام لے کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی کنویں سے کچھ دور تھا کہ بدبو کا بھبکا آیا۔ کنویں کے پاس بہت سے لوگ منہ ڈھانپے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں رنج اور بے بسی تھی۔ عبدالستار نے ہمت کی۔ گہرائی سے وہ پھولی ہوئی لاش نکالی۔ اس لاش میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ اس نے لاش کو غسل دیا اور وین میں رکھ کی قبرستان کی سمت چل پڑا۔ لوگ آنکھوں میں تعجب اور احترام لیے وین کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

ایک بوڑھی عورت نے آکر اُس کا نام پوچھا۔ پھر کانپتے ہاتھ اس کے سر پر رکھے۔ وہ مرنے والے کی بے کس ماں تھی۔

عبدالستار کو میتیں لے کر بیرونِ شہر بھی جانا پڑتا۔ کبھی منزل ٹھٹھہ ہوتی، کبھی نواب شاہ۔ اس وین نے بلوچستان تک کا سفر کیا۔ اخبارات میں خصوصی رپورٹس اور فیچر شائع ہونے لگے۔

عبدالستار ایدھی کا نام اب سرحدوں کو عبور کرنے لگا تھا۔ حاسدین کو یہ کہاں برداشت تھا، انھوں نے ڈسپنسری کے کھاتے چیک کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ ان کا الزام تھا کہ عطیات کے استعمال میں گھپلے ہوئے ہیں۔ اس مطالبے نے زور پکڑا تو کچھ ساتھی گھبرا گئے، مگر وہ انھیں تسلی دینے کے لیے موجود تھا۔ ”جب کوئی گڑبڑ نہیں کی، تو ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اور پھر وہ کس حق سے مطالبہ کر رہے ہیں، کیا انھوں نے کبھی ہمارا ہاتھ بٹایا، ہمیں عطیات دیے؟“

وہ تو مطمئن تھا، مگر مطالبات بڑھتے جا رہے تھے۔ میمن برادری کے بااثر لوگ اس کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے۔

ایک سرد رات، جب وہ تاریکی میں سر جھکائے بیٹھا اللہ کو یاد کر رہا تھا، ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ایک آواز آئی۔ ”عبدالستار، تم فقط اپنے نام کی ذمے داری لے سکتے ہو، پوری برادری کی نہیں۔“

یہ ایک اشارہ تھا۔ صبح تک منظر صاف ہو چکا تھا۔ اس نے میمن والنٹیئر کور کا نام بدل کر ایدھی ڈسپنسری کر دیا... اب یہ کسی برادری تک محدود نہیں تھی۔ وہ اس کا مالک بھی تھا اور ذمے دار بھی۔ وین پر بھی سرخ رنگ سے ایدھی کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ مستقبل میں اللہ اسے اسی نام سے عزت دینے والا تھا۔

کچھ روز بعد اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مخالفین نے رضاکاروں کے بھیس میں اپنے کارندے اس کی ٹیم میں شامل کر دیے ہیں، جو اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ اس نے فوری انھیں شناخت کیا اور اپنی ٹیم سے نکال باہر کیا۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ ان بے ایمانوں کا ایدھی ڈسپنسری سے اب کوئی تعلق نہیں۔ اب عطیات کی پرچی پر یہ عبارت بھی لکھی ہوتی کہ اگر عطیہ دینے والا کوئی شخص کسی شبے کا شکار ہے، تو وہ اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔

اس انتہائی اقدام سے مخالفین کے منہ بند ہو گئے۔ پھر کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے، جنھوں نے منظر بدل دیا۔

عبدالستار کی مخالفت میں ایک سیٹھ پیش پیش رہتا تھا۔ جھوٹے الزامات لگاتا، مغلظات بکتا۔ ایک روز اس کی بچی چھت سے گر گئی۔ اس نے ایمبولینس کے لیے اسپتال فون کیا، مگر کوئی ایمبولینس دستیاب نہیں تھی۔ آخر اس نے ایدھی ڈسپنسری کا رخ کیا۔

ساتھی تو حق میں نہیں تھے کہ وہ سیٹھ کی مدد کرے، مگر عبدالستار اپنے ماں باپ کی تربیت کے ہاتھوں مجبور تھا، وہ سنت رسول ﷺ پر عمل پیرا تھا، مصیبت کے مارے ہر شخص کی مدد اس پر لازم تھی۔ ایدھی ایمبولینس ہی سے اس بچی کو اسپتال پہنچایا گیا۔ اگلے رمضان جب سیٹھ نے زکوۃ نکالی، تو اس نے بیوی سے ایک حصہ ایدھی ڈسپنسری پہنچا دیا۔

اسی زمانے میں کسی نے اُسے تین لاکھ کو عطیہ دیا۔ عبدالستار اب سمجھ چکا تھا کہ فلاحی خدمت ایک جگہ بیٹھ کر نہیں کی جا سکتی، انھیں گاڑیوں کی ضرورت تھی۔ اس رقم سے تین ایمبولینسیں خرید لی گئیں۔ اب عبدالستار ایدھی ایک خستہ حال وین تک محدود نہیں تھا۔

اس زمانے میں ترقی پسندی کا شہرہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی خاصی متحرک تھی۔ نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ ان نظریات کا گرویدہ تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ بیٹھادر کے ایدھی کی طرزِ زندگی اور اندازِ خدمت میں بھی کمیونسٹ افکار شامل ہیں۔ یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ اس نے مارکس اور لینن کی زندگیوں اور افکار کا مطالعہ کیا تھا۔

ایک دن کچھ نوجوان ڈسپنسری آئے۔ وہ بڑے پرجوش تھے۔ آنکھوں میں احترام تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ عبدالستار

ان کے لیڈروں سے ملے۔ وہ ملاقات عبدالستار کے لیے یادگار رہی۔ البتہ اس نے واضح کر دیا کہ وہ کسی فکر سے خود کو باندھنا نہیں چاہتا۔ اسلام میں حقوق العباد کا واضح تصور موجود ہے اور وہ اسی پر عمل پیرا ہے۔

عبدالستار کی فکر میں سیاسی رنگ کا کبھی غلبہ نہیں رہا، مگر اس وقت حالات ہی ایسے تھے۔ فوجی حکومت کے خلاف سیاسی کارکن، صحافی اور طلبا برسرِ پیکار تھے۔ ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا نظام متعارف کروایا، تو عبدالستار نے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔

لوگ خوب ہنسے مگر اسے کہاں پروا تھی۔ وہ سلیٹی رنگ کی شلوار قمیص پہنے، سر پر ٹوپی جمائے کام میں مگن رہا۔ مخالفین کے پروپیگنڈے کے باوجود وہ سیٹ جیتنے میں کامیاب رہا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

1964 کے صدارتی انتخابات میں اُس نے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ انھیں ایک سازش کے تحت ہروا دیا گیا، جس کا اسے قلق تھا۔ اور یہ دکھ اس وقت مزید بڑھ گیا، جب حکومت نے فتح کا جشن منانے کے لیے ایک ریلی منعقد کی، جس کے نتیجے میں کراچی میں پہلے لسانی فسادات ہوئے۔

سیاست کا تجربہ تلخ ثابت ہوا۔ وہ واپس ڈسپنسری کی سمت لوٹ آیا۔ اس کے والد اب خاصے ضعیف ہو گئے تھے۔ وہ اکثر اس سے ملنے چلے آتے۔ وہ خواہش مند تھے کہ وہ جلد از جلد شادی کر لے۔

وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ کہا کرتا۔ ”کوئی عورت اس جیسے خبطی انسان کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔“

اس کا اندازہ غلط تھا...

☆......☆

تاریکی کچھ اور بڑھ گئی۔ سناٹے میں وحشت گونج رہی تھی۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے رہتے۔

1965 کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ شہر خوف کی لپیٹ میں تھا۔ دن بھر کرفیو رہتا۔ مریضوں کے لیے اسپتال پہنچنا دشوار ہو گیا۔ کئی محلوں میں غذائی بحران پیدا ہو گیا تھا۔ عبدالستار کے تجربے نے اُسے وقت سے پہلے چوکنا کر دیا۔ رضا کاروں کی ٹیم ہمہ وقت مصروف رہتی۔ وہ کبھی آتے جاتے اُنھیں ہدایات جاری کرتا رہتا۔ کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا۔

ایسی ہی ایک سہ پہر تھی، جب وہ چند کاہل کارکنوں کی سرزنش کر رہا تھا کہ دروازے پر روشنی جھلملائی۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔ جب وہ مسکرائی، تو کانوں میں گھنگھرو سے بج جاتے۔

اس کی منظر میں آمد ہوئی، تو جیسے وقت ٹھہر گیا۔ عبدالستار کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

”میں بھی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“ لڑکی نے کہا تھا۔ اس کی آواز نقرئی گھنٹیوں سی تھی۔ وہ خاصی کم عمر معلوم ہوتی تھی۔ ایک سینئر خاتون کارکن اس کا اندراج کرنے لگی۔ عبدالستار آگے بڑھ گیا، مگر دروازے پر جھلملاتی روشنی تعاقب کر رہی تھی۔ کانوں میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

جنگ کے ہنگامے نمٹے، تب اسے پتا چلا کہ لڑکی کا نام بلقیس ہے۔ سولہ برس کی ہے۔ اور نرس بننے کی آرزو مند ہے۔ وہ اپنی خالہ کے ساتھ ملنے آئی۔ عبدالستار نے سمجھایا کہ یہاں کام کرنا بچوں کا کھیل نہیں، مگر وہ بھی دھن کی پکی تھی۔

آنے والے دنوں میں کئی بار عبدالستار کا اس سے سامنا ہوا۔ ڈسپنسری آنے کے بعد وہ اس کے آفس کے سامنے سے گزرتی تھی۔ اندر جھانکتی۔ سلام کرتی۔ اور آگے بڑھ جاتی۔ اور اس کے جانے کے بعد اسے دیر تک گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی۔

عبدالستار کا مزاج بدلنے لگا تھا۔ اس کی سخت گیری کچھ کم ہوئی۔ رویہ خوشگوار ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے... ارے یہ عبدالستار مسکراتا بھی ہے... اسے انسانوں کے مانند ہنسی بھی آتی ہے۔

بلقیس جلد ڈسپنسری کا حصہ بن گئی۔ عبدالستار کے رعب کی وجہ سے ماحول پر سنجیدگی طاری رہتی تھی، مگر جب وہ آتی تو ہر طرف روشنی سی بکھر جاتی۔ ڈسپنسری کی اداس فضا یکدم مہک اٹھتی۔ وہ گپ شپ کی شوقین ایک باتونی لڑکی تھی۔ اسکول کے زمانے میں اس کی شرارتیں مشہور تھیں، مگر ڈسپنسری کے کاموں میں وہ ذرہ برابر غفلت نہیں برتتی۔ میٹرنٹی ہوم کی لیڈی ڈاکٹر بھی اس کی تعریف کیا کرتی تھی۔

ایک شام بلقیس اس کے کمرے میں آئی۔ ہاتھ میں ایک ڈبا تھا، جس میں گاجر کا حلوا تھا۔ ”یہ اماں نے بھیجا ہے۔“

”جی شکریہ۔“ عبدالستار کی کیفیت عجیب تھی۔ کیا یہ ایک اشارہ تھا۔

آخر ایک روز میٹرنٹی ہوم کی سیڑھیوں پر عبدالستار نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ کام کرو گی؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ہاں!“

ڈسپنسری میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ عبدالستار نے بلقیس کو شادی کی پیشکش کر دی ہے۔ اس پر طرح طرح کے

تبصرے ہوتے۔ نرسیں عبدالستار کی نقل اتارتیں اور خوب ہنستیں۔

کچھ دن عبدالستار متذبذب رہا، مگر پھر ایک دوپہر ...اس نے بلقیس کی ماں سے اس موضوع پر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جہاں دیدہ عورت تھی۔ عبدالستار کے جذبے کی قدر کرتی تھی، مگر اسے یہ اندازہ بھی تھا کہ اس شخص کو اپنی کوئی پروا نہیں، دن بھر ایمبولینس میں دوڑتا پھرتا تھا، رات بینچ پر سوتا ہے، بیوی کا.... کیا خاک خیال رکھے گا۔

"بیٹے، میں بلقیس سے بات کرلوں، پھر بتاتی ہوں؟" عورت نے اسے چائے پیش کرتے ہوئے کہا۔

عبدالستار مطمئن تھا۔ وہ اپنا حصے کا کردار ادا کر چکا تھا۔ اب بلقیس کو فیصلہ کرنا تھا۔ اور اس کے فیصلے نے سب کو چونکا دیا۔ اس نے عبدالستار ایدھی نامی دیوانے سے شادی کے لیے ہاں کردی تھی۔

اس کی سہیلیوں نے سمجھایا۔ "پاگل ہوگئی ہو کیا۔ مولانا اپنی اجازت کے بغیر تمھیں سانس بھی نہیں لینے دے گا۔" دوسری بولی۔ "معذوروں کے سروں سے جوئیں نکلوائے گا، ان کی خدمت کروائے گا..."

میٹرنٹی ہوم کی ایک ساتھی نے بھی پھبتی کسی۔ "کیا پاگل پن ہے بلقیس۔ ہم اپنے شوہروں کے ساتھ پکنک پر جارہی ہوں گی اور تمھارا شوہر تمھیں قبرستان لے جارہا ہوگا۔ ارے کچھ تو عقل کرو۔"

اب بلقیس انھیں کیا بتاتی کہ ایسے معاملے میں دماغ کی نہیں، دل کی سنی جاتی ہے۔ اور اس کا دل فیصلہ صادر کر چکا تھا۔

عبدالستار پر خاصا دباؤ تھا۔ دوستوں کا خیال تھا کہ بلقیس سے شادی کرتے ہی اس کا مشن دم توڑ دے گا۔ دونوں کی عمروں میں فرق تھا۔ سازشی ٹولہ بھی متحرک ہو چکا تھا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہا تھا۔ مگر تمام افواہیں 19 اپریل 1966 کو دم توڑ گئیں، جب عبدالستار اور بلقیس ایک اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔

وہ شادی بھی عجیب تھی۔ اتنی سادہ کہ اس پر شادی کا گمان ہی نہ ہوتا۔ نکاح مسجد میں ہوا۔ جب بارات روانہ ہونے کو تھی، عبدالستار کو اطلاع ملی کہ ایک بچہ جان کنی کی حالت میں ہے۔ پرانے جوڑے میں ملبوس دولہے میاں اپنی دلہن کو بھول گئے اور ایمبولینس لے کر اسے بچانے کو نکل گئے۔

باقاعدہ رخصتی بھی نہیں ہوئی۔ شادی کی رات بلقیس اپنے رشتے داروں کے گھر رہی۔ اگلی صبح اس کی ماں اسے ڈسپنسری لے آئی، جہاں اوپری منزل کا ایک چھوٹا سا، تاریک کمرا عبدالستار کی کل کائنات تھا۔ وہ کائنات، جسے وہ بلقیس کے ساتھ بانٹنے والا تھا۔ اور اس کائنات میں آرام کا ایک لمحہ نہیں تھا۔

بلقیس کو پورا احساس تھا کہ اس کے نام کے ساتھ ایدھی کا لاحقہ لگ گیا ہے۔ اور ایدھی نام ہے، خدمت اور قربانی کا۔ اس نے روایتی بیویوں سا رویہ اختیار نہیں کیا۔ نہ تو فرمائشیں کیں، نہ ہی خواہشات کی فہرست تیار کی۔ نئی دلہن کے مانند آرام بھی نہ کیا۔ اگلی صبح وہ تندہی سے ڈسپنسری کے کاموں میں جتی تھی۔

پہلے وہ حجاب میں ڈسپنسری آتی تھی، مگر آج وہ باہر سے حجاب میں نہیں آئی تھی، بلکہ اوپری کمرے سے سفید یونیفارم میں اتری تھی۔ باقی عملہ حیران تھا۔ انھیں توقع نہیں تھی کہ بلقیس... ایک نئی نویلی دلہن، جو اب اس جگہ کی مالکن بھی ہے، دوبارہ ملازموں والا حلیہ اختیار کرلے گی۔ مگر بلقیس ملازمہ نہیں تھی... وہ تو خدمت گار تھی، ٹھیک اپنے شوہر عبدالستار ایدھی کے مانند۔ قدرت ان کا انتخاب کر چکی تھی۔

کچھ ہی روز بعد دیگر ملازمین بھول گئے کہ وہ ایک نئی نویلی دلہن ہے۔ فلاحی کاموں میں پہلے سے بھی زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ ہر کام میں عبدالستار کا ہاتھ بٹاتی۔ بے گھر، معذور اور یتیم بچے اس کی شفقت کا محور تھے۔ ان کے لیے وہ ایک گھنا درخت تھی۔

عبدالستار کے جذبے نے بلقیس کو یکسر بدل دیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی۔ "ایک ایدھی اور ایک میں، ہم دونوں مل کر بنے گیارہ۔"

شادی کے ایک سال کے بعد ان کے گھر بیٹے کی پیدائش ہوئی، جس کا نام قطب رکھا گیا۔ موقع تو خوشی کا تھا، مگر عبدالستار مٹھائی بانٹنے کو اسراف سمجھتا تھا۔ ہاں، غریبوں کو کھانے کھلانے کی اجازت دے دی۔

ہنگامی حالات کے دوران بلقیس نے عبدالستار کے ساتھ جائے وقوعہ پر جانا شروع کردیا۔ گو شوہر نے سمجھایا کہ اکثر حادثے کی جگہوں پر بڑے ہی کربناک مناظر ہوتے ہیں، جن کا ہر کوئی متحمل نہیں ہوسکتا، مگر وہ نہیں مانتی تھی۔

ایک روز ایک مسافر بس تیز رفتار ٹرین کی زد میں آکر پاش پاش ہوگئی۔ مسافروں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ یہ منظر ہیبت ناک تھا۔ بلقیس نے جب یہ منظر دیکھا، تو چیخ اٹھی۔ "سب

چلے گئے۔ خدایا یہ کیا ہو گیا؟"

ابھی شہر اس ہولناک واقعے کے صدمے میں تھا کہ ایک روز خبر آئی، ناظم آباد سے پکنک کے لیے میانی جانے والے چودہ افراد کو خونیں لہروں نے نگل لیا ہے۔ یہ ایک وحشت ناک واقعہ تھا۔ خوف اور کرب کی دھند تھی۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ میتوں کو ساحل سے عبدالستار کی ایمبولینسیں ہی میٹھادر لائیں۔ اتنی لاشوں کو رکھنے کے لیے کوئی مردہ خانہ نہیں تھا۔ پھر اس نے یہ لاشیں اہلِ خانہ تک پہنچائیں۔ اور اہل خانہ میں بچا کون تھا، ایک بوڑھی عورت.... جس پر مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

اس واقعے کو عبدالستار کبھی نہیں بھلا سکا۔

☆......☆

وقت کو پر لگ گئے تھے۔ موسم بدل رہے تھے۔

ڈسپنسری کا کام پھیلتا جا رہا تھا، مگر یہ پھیلاؤ اس کے اصولوں کو نہ بدل سکا۔

ایک روز اس کی بہن زبیدہ ڈسپنسری آئی۔ عملے نے اسے پہچان لیا۔ لائن میں کھڑے مریض بھی احتراماً پیچھے ہٹ گئے۔ بظاہر یہ ایک عام سا معاملہ تھا، مگر عبدالستار نے یہ دیکھا، تو چلّا اٹھا۔ "یہ ہماری ذاتی جاگیر نہیں ہے۔ قطار میں آجاؤ اور اپنی باری کا انتظار کرو۔"

بہن کو یہ بات ناگوار گزری۔ وہ چلی گئی۔ بلقیس نے سمجھایا، مگر وہ اپنوں اور غیروں میں تفریق کے سخت خلاف تھا۔ اسی اصول نے تو اس ڈسپنسری کی بنیاد رکھی تھی۔

اگلے چند برسوں میں خدا نے عبدالستار... کو دو بیٹیاں عطا کیں، جن کا نام کبریٰ اور الماس رکھا گیا۔ بچے دھیرے دھیرے بڑے ہو رہے تھے۔ عبدالستار تو اپنے کاموں میں مصروف رہتا، مگر بلقیس ایک فلاحی کارکن کے ساتھ ساتھ ایک چوکس ماں کا کردار بھی بخوبی ادا کر رہی تھی۔

ڈسپنسری میں ایک ٹی بی وارڈ کھول لیا گیا تھا۔ اس زمانے میں یہ بیماری خاصی مہلک تصور کی جاتی تھی۔ لوگ مریض کے پاس آنے سے گھبراتے تھے، مگر عبدالستار اس کی پروا کیے بغیر مریضوں کی تیمارداری کرتا۔ ڈاکٹر ہنستے ہوئے کہتے تھے۔ "بھئی، یہ جراثیم عبدالستار ایدھی پر اثر نہیں کر سکتے۔"

ہاں... بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ وہ کچھ عرصے اپنی نانی کے ہاں رہے۔

1967 میں ملکی سیاست نے کروٹ لی۔ منظر میں ذوالفقار علی بھٹو کی آمد ہوئی، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عالم کو گرویدہ بنا لیا۔ "روٹی کپڑا اور مکان" کا نعرہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا۔ عبدالستار بھی کچھ دوستوں کے ہمراہ بھٹو سے ملا۔ وہ اس شخص کی ذہانت سے تو متاثر ہوا، مگر اس کی فکر کو اپنے نظریے سے ہم آہنگ نہیں کر سکا۔ اس کا خیال تھا بھٹو نے عوام سے جو وعدے کیے ہیں، انھیں پورا کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے جو ایثار، قربانی اور توانائی درکار ہے۔ وہ سیاست دانوں میں کہاں ہوتی ہے۔

سیاسی ماحول گرم ہوا تو عبدالستار نے ایک بار پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ 1970 کے الیکشن میں وہ میٹھادر سے صوبائی اور قومی اسمبلی کی نشستوں پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوا۔

بلقیس ہنسا کرتی تھی۔ "ایسے بھی کوئی الیکشن مہم چلتی ہے۔ آپ تو ایک پھوٹی کوڑی خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ لکھ لیں، بری طرح ہار جائیں گے۔"

اسے خود بھی اندازہ تھا۔ دوسری طرف برادری کا ایک بااثر سیٹھ تھا۔ وہ پی پی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا تھا۔ ایک طرف بھٹو کا سحر تھا، دوسری طرف غریب کا مائیکرو فون۔ وہ گلیوں، سڑکوں پر کھڑا ہو کر تقاریر کرتا۔ اپنے دل کی بات کہتا۔ بے تکان بولتا۔

بلقیس کی پیشگوئی غلط نہیں تھی۔ ہاں وہ ہار گیا... مگر اتنی بری طرح نہیں۔ اسے خاصے ووٹ پڑے۔ لوگ اس سے محبت جو کرتے تھے۔

1971 میں سقوط ڈھاکا کا سانحہ پیش آیا۔ اس نے عبدالستار کے کام کو شدید متاثر کیا۔ اُسے مشرقی پاکستان سے بڑے پیمانے پر عطیات ملا کرتے تھے۔ مگر مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ اسے عطیہ دینے والے مخیّر حضرات بے سرو سامانی کی حالت میں پاکستان آنے لگے۔ اب عبدالستار کو اُن کی مدد کرنی تھی۔ اس نے بہت سے افراد کی رسید دیکھ کر اُن کی عطیہ کردہ رقوم لوٹا دیں۔

عبدالستار کو اپنی بڑھتی عمر کا تو احساس نہیں تھا، مگر اُسے یہ خبر تھی کہ اُس کا باپ عبدالشکور ضعیف ہو گیا ہے۔ اب وہ اکثر بیمار رہتے۔ گھر سے کم ہی نکلتے تھے۔ آخر ایک سہ پہر وہ سانحہ ہو گیا، جس کا خوف اس کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ہارٹ اٹیک نے اسے اپنے باپ سے محروم کر دیا۔ گو وہ حادثات کا عادی ہو گیا تھا، مگر عبدالشکور کی موت کے بعد ادھورے پن کا ایسا احساس ہوا، جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

1973 میں ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ اس بار

حجاج کے قافلے خشکی کے راستے سعودی عرب جا سکیں گے۔

اس اعلان نے عبدالستار کو سرشار کر دیا۔ برسوں سے یہ خواب دل میں تھا کہ وہ پیدل حج کو جائے۔ ان کا قافلہ 250 افراد پر مشتمل تھا۔ اس میں چھ بسیں، ایک ویگن اور ایک ایمبولینس۔ عبدالستار نے ایمبولینس کے ڈرائیور کا کردار چنا۔ بلقیس بھی بطور نرس اس کے ساتھ تھی۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جسے میاں بیوی برسوں تک یاد رکھنے والے تھے۔ اس میں عقیدت سے لبریز لمحات بھی آئے اور پریشانیاں بھی۔ دونوں میں نوک جھوک بھی ہوتی۔ حج کے دوران عبدالستار کی ایمبولینس ایک چلتی پھرتی ڈسپنسری تھی۔ دن میں حجاج کو طبی امداد فراہم کرتا۔ رات میں وہ دونوں ایمبولینس کے پردے گرا کر سو جاتے۔ بلقیس شکایت کرتی۔ ”کم از کم رات کے لیے ہوٹل میں ایک کمرا لے لیتے ہیں۔“

وہ کفایت شعاری پر لیکچر دینے لگتا۔ بلقیس چادر کھینچ کر سو جاتی۔

مکہ، مدینہ منورہ، کربلا... کیسے کیسے مقدس مقامات سے یہ قافلہ گزرا۔ اور ہر مقام پر سنت رسول ﷺ پر عمل پیرا عبدالستار ایدھی خدمت خلق میں مصروف رہا۔

☆......☆

1976 کا ماہ رمضان عبدالستار کبھی نہیں بھول سکا۔

ایک سبب تو یہ تھا کہ ماہ مقدس میں خدا نے اسے ایک بیٹے سے نوازا، جس کا نام فیصل رکھا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسی ماہ کراچی کی تاریخ کا سب سے ہولناک حادثہ پیش آیا۔ شہر کے گنجان علاقے میں ایک چھ منزلہ خستہ حال عمارت گر کر ڈھیر ہوگئی۔ جب وہ جائے وقوعہ پر پہنچا تو بہت سے دہل گیا۔ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ ایک سو سولہ افراد ملبے تلے دب گئے تھے۔ پتھروں کی ڈھیر سے انسانی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ اندازوں کے مطابق پچیس خاندان اس حادثے کا شکار ہوئے تھے، جن میں عورتوں اور بچوں کی بڑی تعداد شامل تھی۔

فلاحی سرگرمیاں تو شروع ہوگئی تھیں مگر رضا کاروں کے لیے یہ ایک کٹھن امتحان تھا۔ بھاری بھر کم ملبا ہٹانے کے لیے نہ تو ان کے پاس کرینیں تھیں نہ ہی درکار مہارت۔ وہ بس دعا ہی کر سکتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے بھی جائے حادثہ کا دورہ کیا۔ وزیر اعظم کی آمد نے انتظامیہ کو بھی متحرک کر دیا۔ بھٹو نے عبدالستار کو دیکھا، تو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ کہا۔ ”ایدھی، کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف کہنا۔“

وہ مسکرا دیا۔ ”میں اپنے حال میں خوش ہوں۔ بس، متاثرین کے لیے متبادل رہائش کا انتظام کر دیجیے۔“

وزیر اعظم نے فوراً اس مخلص انسان کی درخواست قبول کر لی۔

دو روز بعد ایک بدحال عورت عبدالستار کے پاس آئی۔ اس کی بیٹی کا انتقال ہو گیا تھا۔ میت اندرون سندھ کے دور افتادہ گاؤں سکرنڈ پہنچانی تھی۔ ایدھی ایمبولینس کا تیل چیک کر رہا تھا کہ خبر ملی کہ بلقیس اور بچے بھی تیار ہیں۔ اس نے لاکھ سمجھایا کہ راستہ خطرناک ہے، مگر بچوں نے ایک نہ مانی۔

وہ ایک مشکل سفر تھا۔ راستہ کٹھن۔ رات پڑی۔ تو یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ وہ عورت اپنے گاؤں کا راستہ بھول گئی ہے۔ اب ایمبولینس ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک بندوق بردار نقاب پوش کھڑکی میں کھڑا تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس کی آواز کرخت اور اجنبی تھی۔ شاید عورتیں اور بچے دیکھ کر رعایت کی۔ ورنہ اسے گولی مار چکا ہوتا۔

”میں عبدالستار ایدھی ہوں۔ یہ میت پہنچانے آیا ہوں یہاں۔ یہ میری بیوی بچے ہیں۔“

آدمی کی آنکھیں چھوٹی اور تیز تھیں۔ وہ اپنے ساتھوں کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پلٹا۔ ”ایدھی صاحب، یہ علاقہ خطرناک ہے۔ رات کو سفر مت کرنا۔ چلو جاؤ۔ بس، دعاؤں میں یاد رکھنا۔“

یہ پہلا موقع نہیں تھا، جب جرائم پیشہ افراد نے عبدالستار کی شرافت اور اخلاص کے سامنے احتراماً سر جھکا دیا ہو۔ ایک بار کراچی میں ایک بینک ڈکیتی ہوئی۔ پولیس نے ڈاکوؤں کو گھیر لیا۔ دو طرفہ فائرنگ شروع ہوگئی۔ دو ڈاکو اور ایک افسر گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ کچھ دیر بعد ایدھی ایمبولینس سائرن بجاتی منظر میں داخل ہوئی۔ پولیس تو پولیس... ڈاکوؤں نے بھی فائرنگ روک دی۔ جب وہ لاشیں اٹھا کر چلا گیا۔ جنگ دوبارہ شروع ہوگئی۔

مگر ہر بار قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ عبدالستار سندھ کے پرخطر راستہ سے تو بچ نکلا، مگر پنجاب کا سفر ایک گہرا صدمہ ثابت ہوا۔

اُسے پنجاب کے ایک دور دراز پہاڑی گاؤں میت پہنچانی تھی۔ بلقیس بھی ساتھ ہولی۔ بڑا بیٹا قطب اس کی گود

میں تھا۔ رحیم یار خان تک تو سب ٹھیک رہا، مگر پہاڑی علاقے میں داخل ہوتے ہی دھند چھا گئی۔ راستہ بھی اوبڑ کھابڑ۔ ایک بڑے گڑھے سے نکلنے کی کوشش میں ایمبولینس نے قلابازی کھائی اور الٹ گئی۔

عبدالستار اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اسے گہری چوٹ آئی تھی۔ غنودگی میں اترنے سے قبل اس نے بلقیس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔ اس کا بیٹا قطب رو رہا تھا...

ہوش آیا تو وہ رحیم یار خان کے سرکاری اسپتال میں تھا جہاں نہ تو ڈاکٹر تھے نہ ہی ادویہ۔ بلقیس اور قطب تو معجزانہ طور پر محفوظ رہے، مگر عبدالستار کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ سر پر زخم تھے اور آنکھ سے خون بہہ رہا تھا۔

میٹھا در میں یہ خبر پھیل گئی کہ عبدالستار ایدھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ لوگ بین کرنے لگے۔ تاجروں نے دکانیں بند کر دیں۔ دشمن بھی آج چپ تھے۔ چوبیس گھنٹے بعد بمشکل ڈسپنسری کے ساتھی رحیم یار خان پہنچے۔

اگلے روز ذوالفقار علی بھٹو متاثرین میں فلیٹ تقسیم کرنے پہنچے، تو اپنے سیکریٹری سے دریافت کیا۔ ''ایدھی کہاں ہے، اسے بلاؤ۔''

انھیں بتایا گیا کہ وہ رحیم یار خان کے ایک خستہ حال اسپتال میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ بھٹو نے فوراً احکامات جاری کیے۔ آخر ہوائی جہاز کے ذریعے عبدالستار کو کراچی پہنچایا گیا، جہاں سول اسپتال کے ماہر سرجن نے اس کا آپریشن کیا۔ وہ دو ماہ زیرِ علاج رہا۔ صحت یاب ہونے میں بھی کچھ وقت لگا، مگر جوں ہی طبیعت سنبھلی، وہ پھر کام میں جت گیا۔ لوگ کہتے تھے، یہ انسان نہیں، جن ہے جن۔

حادثے کے بعد عبدالستار نے ملک کے طول و عرض میں لنگر خانے بنانے کا فیصلہ کیا۔ دوستوں نے سمجھایا۔ ''بھائی، یہ ناممکن ہے۔''

جواب میں اس نے کہا۔ ''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں....''

☆......☆

''ایدھی حرام کاری کو فروغ دے رہا ہے...وہ بے حیائی کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے!''

ایک عرصے سے ایدھی سینٹر میں ان لاوارث بچوں کی پرورش کی جا رہی تھی جنھیں ان کے ماں باپ بدنامی کے خوف سے کچرے کے ڈھیر، درگاہوں اور جھاڑیوں میں چھوڑ جاتے تھے۔ ان مظلوموں کی اکثریت موسم اور بھوک کے آگے دم توڑ

## شاہراہ ایشیا
## (Asian Highway)

ایشیا کی طویل ترین مجوزہ شاہراہ، اس شاہراہ کی تعمیر کے سلسلے میں ایشیا کے 23 ممالک نے 2004ء میں دستخط کیے تھے۔ یہ شاہراہ 1,40,000 کلومیٹر طویل ہوگی اور یہ ٹوکیوں کو سنگاپور اور استنبول کو سینٹ پیٹرز برگ سے باہم ملائے گی اور اس شاہراہ کا گزر تمام ایشیائی ممالک سے ہوگا۔ اس شاہراہ کی تعمیر سے سب سے زیادہ فائدہ بھوٹان، لاؤس، قازقستان کرغزستان، منگولیا، نیپال اور ازبکستان کو ہوگا۔

مرسلہ: فرہاد تیموری، سیالکوٹ

دیتی، کچھ جانوروں کا شکار بن جاتے، جو معجزانہ طور پر بچ جاتے انھیں لوگ ایدھی سینٹر پہنچا دیتے۔ عبدالستار ان کا باپ بن جاتا، بلقیس ان کے لیے ماں کا روپ دھار لیتی۔ وہ ان کی پرورش کرتے۔ ان بچوں کو بے اولاد افراد خوشی خوشی گود لے لیتے۔

ایک عرصے سے عبدالستار اس سنگین مسئلہ پر غور کر رہا تھا۔ سماج ان معصوموں کو گناہ کی علامت سمجھتا تھا۔ انھیں بیدردی سے قتل کر کے ویرانوں، بے نام قبروں میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ ایک روز اُسے پتا چلا کہ مسجد کے باہر ایک لاوارث بچے کو سنگسار کر دیا گیا ہے۔ وہ تڑپ اٹھا۔ ظلم کی انتہا ہو گئی۔ اب وہ چپ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے ایدھی سینٹروں کے باہر جھولے رکھوا دیے۔

ماں باپ کے لیے بھی پیغام تھا کہ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ مت کیجیے، یہ بچہ ہماری نگرانی میں دے دیں۔ ہم اس کی پرورش کریں گے۔

اس فیصلے کی اتنی شدید مذمت ہوئی کہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ لاؤڈ اسپیکروں سے فتوے صادر کیے گئے۔ اُسے کافر قرار دیا گیا تھا۔ انڈے اور ٹماٹر مارے گئے۔ لوگوں کو کہا جانے لگا کہ ایسے بچوں کو گود لینا حرام ہے۔ مساجد سے اعلان ہوتا کہ عوام عبدالستار ایدھی کو عطیات نہ دیں کہ ان کی حلال کے پیسے سے حرامی نسل کی پرورش کی

جاری ہے۔

اس نے دلائل دیے۔ سمجھایا کہ وہ ان بچوں کو ویرانے میں تو پھینک نہیں سکتا جہاں وہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائیں، اسلام بھی اس کی اجازت نہیں دیتا... مگر جہل کے آگے دلیل بے معنی ہے۔ آخراس نے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ سر جھکالیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

ایمبولینسوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی... کراچی کے بعد اب دیگر شہروں میں بھی ایدھی سینٹرز کھلنے لگے۔ اور ہر سینٹر کے باہر ایک جھولا ہوتا۔

وہ لاوارث اور مظلوم بچوں کا باپ تھا اور ان کی زندگی بچانے کی ہر قسم کی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ لوگ سچ ہی کہتے تھے، وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھا۔

یا شاید وہ انسان تھا، جسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔

☆......☆

یہ 1982 کا سال تھا۔

بچے اب بڑے ہوگئے تھے۔ وہ اسکول جانے لگے۔

جب وہ کسی کو بتاتے کہ ہمارے باپ کا نام عبدالستار ایدھی ہے، تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ لوگ کہتے، تم اتنے بڑے آدمی کے بیٹے کیسے ہوسکتے ہو، تم تو بس میں سفر کرتے ہو۔ تمھارا یونیفارم اور جوتے پرانے ہیں، تمھاری جیب بھی خالی ہے۔

اب بچے ان باتوں کا بھلا کیا جواب دیتے۔ دراصل لوگ سمجھتے تھے کہ ایدھی کے پاس بہت پیسا ہے۔

اسی برس ضیا الحق نے ملک کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے کے لیے مجلس شوریٰ کا اعلان کیا۔ ایدھی کو بھی مجلس شوریٰ کا حصہ بننے کی پیشکش کی گئی۔ عبدالستار نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ اسمبلی کے بڑے بڑے لوگ اپنے پہلو میں ایک فقیر کی بو بھلا کیسے برداشت کریں گے۔ مگر صدر کے اصرار پر اسے ہامی بھرنے پڑی۔ ایک دو بار وہ اسلام آباد گیا، مجلس کے اجلاسوں میں تقریریں بھی کیں، مشورے بھی دیے... مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ چل نہیں سکا۔ وہ دنیا الگ تھی۔ محلات کے ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر مرغن غذا شکم میں اتارنے کے بعد، ہوائی جہازوں میں سفر کرنے والے عوام کے مصائب کا اندازہ بھلا کیسے لگا سکتے تھے۔ عوام....جو حشرات سی زندگی بسر کررہے ہیں۔ عبدالستار تو ان حشرات کے درمیان رہنے والا آدمی تھا، اس کے فلاحی کاموں کے طریقے امراء کی سوچ سے یکسر مختلف تھے۔ تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی۔

گو اسے ضیا الحق کے قریب تصور کیا جاتا تھا، مگر جب ضیا مخالفین نے بحالی جمہوریت کی تحریک شروع کی اور حکومت نے اُسے طاقت کے زور سے کچلا، تو مظالم کی ایک طویل داستان رقم ہوئی۔ عبدالستار اس بار بھی مظلوموں کے ساتھ تھا۔ اس نے بلاتفریق زخمیوں اور مرنے والوں کے لواحقین کی مدد کی۔

اس زمانے میں وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ ”یہ بہت غلط ہورہا ہے۔ شہری اور دیہی علاقوں میں فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ مقامی آبادی اور مہاجرین کے درمیان تصادم کا خطرہ ہے۔“

کسے اندازہ تھا کہ چند برس سانحہ علی گڑھ کی صورت... یہ پیشگوئی ایک مکروہ حقیقت کا روپ اختیار کرلے گی۔

1986 میں فلپائن سے ایک پُرمسرت خبر موصول ہوئی۔ حکومت فلپائن نے اس کی خدمات کے اعتراف میں اپنا سب سے بڑا تمغہ ”میگا سے“ دینا کا اعلان کیا تھا۔ اس ایوارڈ کو کچھ لوگ ایشیا کا نوبل پرائز کہا کرتے تھے۔ وہ خوش تو تھا مگر اسے وصول کرنے سے متعلق متذبذب تھا۔ انعامات اور اعزازات اس کے نزدیک جھنجھٹ تھے۔ یہ بلقیس تھی، جس نے اسے قائل کیا۔ ”یہ تو بڑی عزت کی بات ہے۔ آپ انکار نہیں کرسکتے، اس کا تعلق فقط آپ سے نہیں، آپ کے وطن سے ہے۔“

مان تو گیا، مگر جب فلپائن گیا تو وہی کپڑے کا ایک تھیلا۔ دو جوڑے، ربڑ کے سلیپر۔ بیوی بھی اسی کے رنگ میں رنگی تھی۔ وہ دو فقیر تھے، مل گئے تو بادشاہ بن گئے۔

1988 میں لینن پیس پرائز جیسا اہم ایوارڈ اس کے حصے میں آیا۔ یہ افغان وار کا زمانہ تھا۔ پاکستان امریکی بلاک میں ہونے کے باعث براہِ راست سوویت یونین کا دشمن تھا مگر روسیوں نے انسانیت کے اس علم بردار کی خدمات کے اعتراف میں کسی قسم کی کنجوسی نہیں کی۔

ان ہی برسوں میں اوجھڑی کیمپ اور بوہری بازار کے وحشت ناک سانحے ہوئے۔ دونوں ہی مواقع پر بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا۔ انسانیت خون خون ہوگئی۔

ان دونوں واقعات میں فقط ایک چیز مشترکہ تھی۔ جب فلاحی کام شروع ہوا... عبدالستار ایدھی سب سے آگے تھا۔

☆......☆

88ء کے الیکشن کے دوران واشنگٹن پوسٹ کی ایک خاتون صحافی پاکستان آئی تو اس نے عبدالستار ایدھی کا بھی

انٹرویو کیا۔

جب بوڑھے آدمی نے اسے بتایا کہ اس کے تمام امدادی سینٹر چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں، تو وہ بڑی حیران ہوئی۔ دور دراز کے ایک سینٹر فون کیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر رضا کار نے فون اٹھالیا۔ اس نے پلٹ کر بوڑھے سے کہا۔ "ایسا تو امریکا میں صرف ایک ادارہ ہے۔ 911۔ آپ تو کمال ہیں مسٹر ایدھی۔"

اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب میرے اللہ کا احسان ہے۔"

خدمت کا دائرہ خاصا پھیل گیا تھا۔ اسے عالمی خیراتی اداروں کی جانب سے عطیات کی پیشکش کی گئی، مگر اس نے ابتدا ہی میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ایدھی فاؤنڈیشن کو عوام کے چندہ اور عطیات سے چلائے گا۔ حکومتی امداد کا بھی قائل نہیں تھا۔ کوئی وزرائے اعظم نے بڑے احترام سے پیشکش کی، مگر ان کا کل انحصار اپنے جیسے دردِ دل رکھنے والے انسانوں پر رہا۔

افغان وار نے سماج پر جہاں کئی منفی اثرات مرتب کیے، وہیں یہ جنگ ہیروئن کی منحوس لت بھی لائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ناسور کراچی میں پھیل گیا۔ نوجوان چلتی پھرتی لاشیں بن گئے۔ جب بھی کوئی مصیبت آتی تھی، عبدالستار ایدھی اس سے لڑنے والوں کی اوّلین صف میں شامل ہوتا۔ اس بار بھی وہ پیش پیش تھا۔ اس نے متاثروں کی مدد کا فیصلہ کیا۔ نشے کے عادی افراد کو شہر کی گلیوں اور کچرا کنڈیوں سے اٹھا کر ایدھی مراکز پہنچایا جانے لگا، جہاں ان کا علاج ہوتا اور انھیں نشے کی لت سے نجات دلائی جاتی۔

جنگ کی وجہ سے بھکاری بھی یکدم بڑھ گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر پیشہ ور تھے۔ پورا ایک نیٹ ورک تھا۔ ایدھی نے گداگری کے خلاف بھی مہم چلائی۔ گو یہ ایک منظم اور مضبوط گروپ تھا، مگر ایدھی نے کئی معذوروں کو اپنے سینٹروں میں رکھا، انھیں مناسب تربیت دی اور سماج کے لیے کارآمد بنایا۔

بڑے حادثات میں سب سے گمبھیر مسئلہ لاشوں کی دیکھ ریکھ کا ہوتا ہے۔ کراچی میں سرد خانوں کی کمی تھی۔ ایدھی فاؤنڈیشن نے ایک بڑا سرد خانہ قائم کیا۔ بعد میں... آنے والی فلاحی تنظیموں نے اس کے نقوش پا کی پیروی کی۔ اس کی فاؤنڈیشن نے کراچی سمیت کئی بڑے شہروں میں قبرستان بنائے، جہاں لاوارث لاشوں کو دفنایا جاتا۔ لنگر خانے کا سلسلہ تو 70 کی دہائی ہی میں شروع کر دیا تھا، وقت کے ساتھ وہ اسے پھیلاتا چلا گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا، جب کراچی میں کئی لنگر خانے کھل گئے۔ اب بے چھت اور مفلس افراد بھوکے نہیں سوتے تھے۔ کسی نہ کسی دسترخوان سے انھیں پیٹ بھرنے کو روٹی مل ہی جاتی۔

ایدھی فاؤنڈیشن نے ملک بھر میں شیلٹر ہومز بنائے، جہاں بے سہارا بچوں، عورتوں اور بوڑھے کو پناہ دی جاتی۔ ان کا علاج ہوتا۔ خیال رکھا جاتا۔ جہاں عبدالستار نے لاوارث بچوں کے لیے جھولے رکھوائے تھے، وہیں ان ضعیف افراد کے لیے، جنھوں ان کے گھر والے ایک بوجھ تصور کرنے لگتے تھے... "اپنا گھر" کا تصور متعارف کروائے۔ ایدھی سینٹر کا ایک ایسا گوشہ جو بوڑھوں کے لیے مختص تھا۔ غریب بچے بچیوں کے لیے اسکول بھی قائم کیے گئے، جہاں مفت تعلیم دی جاتی۔

اب اجتماعی شادیوں کا سلسلہ شروع کیا گیا، جو بڑا کامیاب رہا۔ ایدھی ہوم میں پروان چڑھنے والی لاوارث لڑکیوں کی شادی کے موقع پر عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی کے جذبات حقیقی ماں باپ والے ہوتے۔ لڑکیاں بھی انھیں ممی، پاپا کہا کرتی تھیں۔ شیلٹر ہوم کے لاوارث بچوں کے لیے عبدالستار مولانا ابو ٹھہرا۔

جب عبدالستار ایدھی نے پہلی ایمبولینس خریدی تھی، تب اس نے ہیلی کاپٹر خریدنے کا خواب دیکھا تھا۔ آخر یہ خواب بھی پورا ہوگیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب امدادی کاموں کے لیے اس فاؤنڈیشن نے ایک جہاز خریدلیا۔ ایک بحری سروس بھی شروع کردی۔ جو دریا اور سمندر میں پھنسنے والوں کی مدد کیا کرتی۔ ملک میں جہاں کہیں حادثہ ہوتا جس سمت سے بری خبر آتی، ایدھی فاؤنڈیشن کے رضا کار آلات سے لیس جائے وقوعہ کی سمت دوڑے جاتے۔ بوڑھا عبدالستار سب سے آگے ہوتا۔ سندھ میں سیلاب آتا تو سب سے پہلے ایدھی فاؤنڈیشن کے کارکن وہاں پہنچتے۔ کشمیر میں زلزلہ آتا تو اس تنظیم کے اہلکار وہاں نظر آتے۔ کوئی عمارت گر جاتی، ٹرین حادثہ ہوتا، بم دھما کا ہوجاتا، تو ایدھی کی ایمبولینس اس سمت دوڑی جاتی۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہ تنظیم خدمات فراہم کررہی تھی۔

اور یہ خدمات پاکستان تک محدود نہیں تھیں۔ یہ فاؤنڈیشن اب افغانستان، عراق، چیچنیا، بوسنیا، سوڈان، ایتھوپیا میں بھی کام کررہی تھی۔

اسے متعدد یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریوں سے نوازا۔ کئی ممالک نے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ پیش کیے۔ ہندوستان نے اسے گاندھی پیس ایوارڈ دیا۔ یونیسکو نے اپنے ایک اہم ایوارڈ کے لیے اسے چنا۔

حکومت نے بھی اس محسن پاکستان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اسے نشان امتیاز، جناح ایوارڈ، خدمت ایوارڈ اور ہیومن رائٹس ایوارڈ سمیت متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ بس... نوبیل انعام بدقسمت تھا۔ اس کے شیلف میں سجنے کے اعزاز سے محروم رہ گیا۔

پاکستان ٹیلی ویژن نے میاں بیوی کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ جب وہ ہال میں داخل ہوئے تو لوگوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ تقریب کے میزبان نے دوران گفتگو بلقیس ایدھی سے پوچھا۔ "ایدھی صاحب پر کچھ روشنی ڈالیں۔"

بلقیس دھیرے سے مسکرائی۔ "اب میں روشنی پر مزید کیا روشنی ڈالوں۔"

☆......☆

گو اس کی شہرت اب سرحدوں سے آزاد تھی، ترقی یافتہ ممالک کے سربراہان اس کے سامنے سر جھکاتے تھے، عوام اس سے محبت کرتے تھے مگر یہ شخص مفاد پرستوں کی آنکھوں میں اب بھی کھٹکتا تھا۔ پہلے صرف میٹھادر کے سیٹھ اس کے مخالف تھے مگر اب اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ جس کا سبب اس کی شہرت اور نیک نامی ٹھہری۔

کچھ اور گروہوں نے بھی فلاحی خدمت کے میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ سیاسی جماعتیں بھی عطیات اکٹھے کرنے لگی تھیں اور انھیں یہ بات کھلتی تھی کہ عوام کی اکثریت اپنے عطیات ایدھی فاؤنڈیشن کو دیتی ہے۔ انھوں نے اس نیک طینت انسان کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ کبھی اسرائیل کا تو کبھی انڈیا کا ایجنٹ قرار دیا۔ نام نہاد علما کے فتویٰ کو بھی خوب استعمال کیا گیا۔ دیگر الزامات بھی لگے جن کا ذکر کرتے ہوئے قلم لڑکھڑا جاتا ہے، مگر یہ شخص عوام کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

تنظیموں نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ قربانی کی کھالیں اور زکوٰۃ طاقت کے زور پر وصول کی جانے لگیں۔ یہی نہیں، ایدھی کو بھی سمجھایا گیا کہ راستے سے ہٹ جاؤ بڑے میاں، بہت کما لیا، اب دوسرے کو موقع دو۔

اس طرح کی باتیں سے اسے تکلیف دیتیں مگر وہ کڑوا گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا۔ اس کے سینٹرز میں ڈکیتیوں کی وارداتیں ہوئیں۔ لسانی فسادات کے دوران سینٹر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ ساتھیوں کو خرید لیا گیا۔ کچھ لوگ کوشش بھی کر رہے تھے کہ ایدھی فاؤنڈیشن کے ڈھانچے کو توڑ کر ایک ایسا ٹرسٹ بنائیں، جس کا اختیار ان کے ہاتھ میں ہو۔ کچھ جھوٹے مقدمات بھی بنے... ایدھی کو ایک طویل جنگ لڑنی تھی۔

کچھ گروہ اُسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ انسانی اعضا کی اسمگلنگ کا الزام بھی لگایا۔ کورنگی اور لانڈھی میں اس کی ایمبولینس اغوا کر لی گئی۔ حالات بگڑتے چلے گئے۔ ایک وقت ایسا آیا جب اس نے میٹھادر آفس کو تالا ڈال دیا اور سہراب گوٹھ کے دفتر میں بیٹھنے لگا۔ پھر اس پر قاتلانہ حملہ ہوا...

دو نوجوان اُسے دھوکے سے ساتھ لے گئے۔ ایمبولینس ایک تاریک گلی میں رکوا دی۔ اس پر خنجر سے حملہ کیا گیا۔ قسمت ساتھ تھی۔ عبدالستار اور اس کے ساتھی کو بروقت ان کے ارادوں کا اندازہ ہو گیا۔ وہ پہلے ہی دفاعی پوزیشن میں تھے۔ یوں یہ حملہ ناکام ہوا۔ اس واقعے کے بعد وہ تھوڑی احتیاط برتنے لگا۔

ایدھی فاؤنڈیشن کے ڈرائیوروں کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ کچھ علاقوں میں ایمبولینس پر فائرنگ بھی ہوئی۔ عجیب معاملہ تھا۔ پھر ایک روز... پولیس نے اتفاقاً ایک جرائم پیشہ گروہ پکڑا۔ جب تفتیش ہوئی تو انکشاف ہوا کہ اس میں ایدھی فاؤنڈیشن کے کچھ سابق ڈرائیور بھی شامل ہیں، جنھیں بدعنوانی پر برخاست کر دیا تھا۔ حالیہ کارروائیوں کے پیچھے وہ گروپ تھا۔

☆......☆

کسی سیاست داں نے کہا تھا۔ "حکومتیں گرانے والے گروپ اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر گرتے ہیں۔"

1994ء میں حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا۔ اس وقت کی حکومت کے خلاف ایک پریشر گروپ بن رہا تھا۔ اس گروپ کے پیچھے کچھ پُراسرار، مگر طاقتور ہاتھ تھے۔ چند سیاست داں، کچھ ریٹائرڈ افسر۔ لندن میں ایک نووارد سیاست داں سے ایدھی کی ملاقات ہوئی، جس نے کینسر اسپتال بنانے کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ بھی چندہ مہم چلا رہا تھا۔ اس نے حکومت پر خوب تنقید کی اور تبدیلی کا ایک پلان پیش کیا۔ ایدھی اس سے متفق نہیں تھا۔

واپس کراچی پہنچا تو ایک سابق فوجی افسر کی کال آئی۔ وہ لوگ بہت جلدی میں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ عبدالستار تبدیلی کے اس منصوبے میں ان کا ساتھ دے۔ چودہ

اگست کو ایک ریلی نکالی جارہی تھی۔ پریشر گروپ چاہتا تھا کہ وہ ریلی میں ان کی منشا کے مطابق تقریر کرے۔

عبدالستار نے تقریر تو کی، مگر ان کی لائن پر چلنے کے بجائے اپنے دل کی بات کہی اور لوٹ آیا۔ اسے لگا تھا کہ یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ کچھ روز خاموشی رہی۔ مگر پھر رابطے شروع ہوگئے۔ آخر ایدھی نے پریس میں ایک بیان دیا کہ اس کا کام غیر سیاسی ہے۔ "بھائی، سوشل ورکر ہوں، سوشل ورکر ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

پھر کچھ روز وہ چپ، مگر معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔

کراچی میں پھر ایک بڑی امن ریلی کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ایدھی پر واضح کر دیا گیا کہ اسے شرکت کرنی ہی پڑے گی۔ بادل نخواستہ اس نے ریلی میں شرکت کی، مگر عجب بے چینی تھی۔ اگلے روز کراچی کے ایک معروف صحافی کا قتل ہوگیا۔ افواہ گردش کرنے لگی کہ ہٹ لسٹ میں کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ عبدالستار کا نام سرفہرست ہے۔

اس صورتِ حال سے نجات کا یہی طریقہ تھا کہ وہ خاموشی سے لندن چلا جائے۔ کچھ عرصے تہار ہے۔ خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ اس نے ایک دستاویز تیار کی اور اعلان کر دیا کہ اگر مجھے قتل کر دیا جائے، تو یہ ڈاکومنٹ عام کر دیا جائے۔

جب پاکستان کے عوام کو اندازہ ہوا کہ ایدھی کے بیرون ملک جانے کے پیچھے اس کے قتل کی سازش تھی، تو انھوں نے بھرپور احتجاج کیا۔ ممتاز شخصیات نے اس کے حق میں بیانات دیے اور اس کے ساتھ کھڑے ہونے کا عزم ظاہر کیا۔ سینیٹ نے اس کی واپسی کا بل پاس کیا۔ صدر پاکستان نے خود رابطہ کیا۔

آخر کار جنوری 95ء میں وہ لوٹ آیا۔ اس کا شاندار استقبال ہوا۔ عوام اس کے ساتھ تھے۔ اس نے طویل پریس کانفرنس کی۔ 35 اخبارات کے رپورٹروں نے اس سے کئی سوالات کیے۔ جن میں ان لوگوں کا بھی تذکرہ آیا، جنھوں نے پریشر گروپ بنانے کے لیے اس پر دباؤ ڈالا تھا، مگر اس نے کڑی تنقید کرنے کے بجائے معتدل رویہ اختیار کیا۔

☆......☆

عبدالستار کے دونوں بیٹے... قطب اور فیصل بیرونِ ملک تھے۔

باپ کے بڑھاپے اور بڑھتے مسائل کے پیشِ نظر فیصل نے فیصلہ کیا کہ اب وہ پاکستان ہی میں رہے گا۔ اگرچہ بلقیس اس کے خلاف تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ فیصل مزاجاً بہت نرم ہے۔ مگر نوجوان نے اعلان کر دیا۔ "ابا اب کمزور ہوگئے ہیں، مجھے ان کی مدد کرنی ہوگی۔"

کراچی کے حالات بگڑتے جارہے تھے۔ کشیدگی فضاؤں میں منجمد تھی۔ کوئی بھی، کہیں بھی، کسی بھی وقت قتل کر دیا جاتا۔ ایدھی فاؤنڈیشن کے کارکن دن رات مصروف رہتے۔ اس کی ایمبولینس ان علاقوں میں چلی جاتیں، جہاں جاتے ہوئے پولیس گھبراتی تھی۔

فیصل نے جلد خود کو ٹیم کا حصہ بنالیا۔ وہ بڑا پُرجوش تھا۔ ذہن میں نئے نئے منصوبے تھے۔ اس نے کارکنوں کے لیے نیا یونیفارم بنانے کا منصوبہ پیش کیا، جسے عبدالستار نے منظور کیا۔ عبدالستار کی بیٹی کبریٰ بھی تنظیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ اس کی شوہر سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ ایدھی سینٹر میں پیش آنے والے ایک حادثے میں اس نے اپنے پیارے بیٹے عدنان کو کھو دیا، جس کا اُسے شدید صدمہ تھا۔ اس مشکل سے نکلنے کا یہی طریقہ تھا کہ کبریٰ خود کو کام میں غرق کر دے۔ بچے کے انتقال نے بلقیس اور عبدالستار کو توڑ دیا تھا۔ مگر زندگی کہاں رکتی ہے۔

ان ہی دنوں کراچی کے علاقے بفرزون میں ذہنی امراض میں مبتلا خواتین کے لیے ایک خصوصی نفسیاتی کلینک قائم کیا گیا۔ پھر نارتھ کراچی کے علاقے میں ایک ہوسٹل اور تربیتی مرکز بنایا گیا، جہاں دو ہزار خواتین کی گنجائش تھی۔

ایک انٹرویو میں جب اس کی کوششوں کو اشتراکیت سے مماثل ٹھہرایا گیا، تو اس نے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں، اشتراکیت ناکام ہوگئی، مگر سرمایہ دارانہ نظام اب تک چل رہا ہے۔ اس سے مجھے کوئی لینا دینا نہیں۔ حقوق العباد کا نظریہ تو ناکام نہیں ہوا ناں۔ انبیا کے عہد میں سماجی بہبود کا نظام عروج پر تھا، معاشرے میں عدل و انصاف تھا۔ اشتراکیت انفرادی ترقی کے راستے بند کرتی ہے جب کہ اسلام اجتماعی اور انفرادی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھانسنے لگا۔ اب وہ خاصا بوڑھا ہوگیا تھا۔ وزن گھٹتا جارہا تھا۔ مگر حرام ہے، جو ٹک کر بیٹھ جائے۔ تھر میں موروں کو ایک موذی مرض نے آن لیا۔ یہ خوبصورت جانور مرنے لگا تو عبدالستار انھیں بچانے نکل کھڑا ہوا۔ بلقیس نے چڑ کر کہا۔ "اپنے گھٹنوں میں درد ہے، چلا جاتا نہیں اور تھر جا کر موروں کو بچائیں گے۔"

اسی طرح جب شمالی علاقے بدترین بارشوں اور سیلاب کی زد میں آئے، سیکڑوں بستیاں اجڑ گئیں تو عبدالستار اپنی ٹیم

کے ساتھ آفت زدہ علاقوں کی سمت چل پڑا۔ اس مشن میں کئی کٹھن لمحات آئے۔ ایک بار وہ خطرناک علاقے میں پھنس گئے۔ اپنی ٹیم سے اس کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ میڈیا میں یہ خبر آئی تو کھلبلی مچ گئی۔ عوام اندیشوں کا شکار تھے۔ حکومت نے عبدالستار کی تلاش میں ٹیمیں روانہ کیں۔ اس کے چاہنے والے مصلے پر بیٹھ گئے۔ خدشات کئی گھنٹوں تک گردش کرتے رہے۔ بالآخر عبدالستار کو تلاش کر لیا گیا۔ وہ ایک آفت زدہ گاؤں کے لوگوں کو طبی امداد فراہم کر رہا تھا۔ لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔

ہندوستانی لڑکی گیتا کا ایشو عالمی خبروں کی زینت بنا، تو اس کا سبب ایدھی فاؤنڈیشن ہی تھی۔ وہ مظلوم جانے کیسے پاکستان آ گئی۔ یہاں اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔ بلقیس ایدھی نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔ اس مظلوم کو اپنے گھر پہنچانے کا عہد کیا۔ پاک بھارت کشیدگی کے باوجود راستہ نکل آیا۔ اور سبب تھا... بوڑھا عبدالستار ایدھی، جسے 2013 میں ایک امریکی نیوز ایجنسی نے انسانیت کا سب سے بڑا علم بردار ٹھہرایا تھا۔ مغربی میڈیا حیرت سے اس بات کا تذکرہ کرتا کہ بیس ہزار لاوارث بچوں کی سرکاری دستاویز میں باپ کے خانے میں عبدالستار ایدھی کا نام لکھا ہے۔

ایدھی کی کوششیں رنگ لائیں۔ گیتا اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ عبدالستار اور بلقیس بھی گئے۔ بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے، جسے ایک متعصب شخص تصور کیا جاتا ہے، گجرات قتل عام کا ذمے دار ٹھہرایا جاتا ہے... عبدالستار کے سامنے احتراماً سر جھکا دیا۔ بھارتی حکومت نے امداد کی پیشکش بھی کی، مگر اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ ”ہم حکومت اور اداروں سے امداد نہیں لیتے۔“

وہ اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کمر بستر سے لگ گئی۔ جب ڈاکٹر کہتے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا، تو وہ مسکرا دیتا۔

اُسے وہ شام یاد تھی، جب اس نے اور بلقیس نے فیصلہ کیا تھا کہ کراچی سے ستر کلو میٹر دور... سپر ہائے وے واقع ایدھی ویلج کے سامنے ایک بورڈ لگایا جائے، جس پر لکھا ہو: یہ عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی کی آخری آرام گاہ ہے۔ اس نے کہا تھا۔ ”یہ بورڈ وہاں سے گزرنے والوں کو ہمارا پیغام یاد دلاتا رہے گا۔“

تو وہ مطمئن تھا۔ اس سفر میں اس نے ہزاروں بچوں کی زندگیاں بچائیں، بے شمار مظلوم عورتوں کو سہارا دیا، لاتعداد ضعیف افراد کو چھت فراہم کی، ان گنت زخموں پر مرہم رکھا، کتنی بے گور لاشیں دفنائیں۔ اس کے مراکز کی تعداد 250 کی حد عبور کر گئی تھی۔ وہ 135 ایدھی ہائی وی سینٹرز قائم کر چکا تھا، جہاں ٹریفک حادثات کا شکار بننے والوں کو فوری مدد فراہم کی جاتی۔ ملک بھر میں قائم ایدھی ایمرجینسی پوسٹوں کی تعداد 60 ہے۔ بے سہارا افراد کے لیے تیرہ ایدھی ہومز۔ بچوں کے لیے چھ ایدھی گھر۔ پانچ مکمل اسپتال، بلڈ بینک، شوگر کا مرکز، کینسر اسپتال، کشتی دواخانے، ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر۔ پھر نیو یارک، برطانیہ، کینیڈا، جاپان، آسٹریلیا میں دفاتر۔ اور سب سے بڑھ کر 1600 ایمبولینس.... سب سے بڑا نیٹ ورک۔

تو وہ مطمئن تھا۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔

کبھی کوئی وزیر اس کی عیادت کے لیے آتا، کبھی کوئی غیر ملکی سفیر گلدستہ لیے پہنچ جاتا۔ صدر اور وزیر اعظم کے پیغامات موصول ہوتے۔ اسے بیرونِ ملک علاج کروانے کی پیشکش کی گئی۔ وہ مسکرا دیا۔ اس کا جینا مرنا پاکستان میں تھا۔

8 جولائی 2016 کو حالت بہت بگڑ گئی۔ وہ غنودگی میں چلا گیا۔ جانے کتنا وقت گزرا۔ اُسے ایک آواز سنائی دی.. عبدالستار!!

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ہر سوں روشنی تھی۔ لطیف احساس تھا۔ اس نے ایک مانوس چہرہ دیکھا۔ ایک عورت اس کے پاس آئی۔

”عبدالستار۔ آج تو نے دو پیسوں کا کیا کیا!“

”ماں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”میں نے وہ دونوں پیسے ایک فقیر کو دے دیے۔ میں نے... سب کچھ دے دیا ماں۔ تیری نصیحت پر عمل کیا۔ اپنے پاس کچھ نہ رکھا۔“

”آ۔ میں نے کھانا لگا دیا ہے۔“ ماں نے کہا۔

وہ ماں کے ساتھ چل دیا۔ ہر سوں روشنی تھی۔ ان کے سر پر بادلوں کا سایہ تھے۔ پنچھی اس کے ساتھ ساتھ اڑتے تھے۔ فرشتے سر جھکائے کھڑے تھے۔ سنہری دروازہ کھول دیا تھا۔

محسن پاکستان... آسمان کی سمت چلا گیا تھا۔

**ماخذات:**

وکی پیڈیا، بی بی سی، عبدالستار ایدھی (تصویری کہانی سلسلہ: آمنہ اظفر) بچوں کے عبدالستار ایدھی، ایدھی: کھلی کتاب (تہمینہ درانی)

# ولپیٹ کے بچے

اختر شہاب

**گھنے جنگلوں میں جانوروں کے درمیان پروان چڑھنے والے بچوں کی روداد جس نے زمانے بھر کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔**

**یورپ بھر میں تہلکہ مچا دینے والی خبر کا تذکرہ**

یہ واقعہ انگلستان کے شاہ اسٹیفن کے عہد کا ہے جس کا دورِ حکومت 1135ء تا 1154ء تک رہا۔ یہ واقعہ وول پٹ گاؤں میں پیش آیا۔ وول پٹ نامی یہ گاؤں مشرقی انگلستان میں واقع سفولک (Suffolk) کاؤنٹی میں ہے جو برے سینٹ ایڈمنڈز (Bury st.Edmnds) کے مشرق میں تقریباً 7 میل دور واقع ہے۔ زمانہ وسطیٰ سے یہ سرے سینٹ ایڈمنڈز کے ابی (Ebby) کی ملکیت تھا اور انگلستان کے دیہاتی علاقوں میں سب سے آباد علاقہ تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا اور فصل کی کٹائی کا زمانہ تھا۔ کسان حسبِ معمول فصل کی کٹائی کے لیے صبح سویرے ہی پہنچ گئے تھے اور اپنے کام میں تندہی سے مصروف تھے۔

فصل کاٹتے کاٹتے ان میں سے ایک کی نگاہ اچانک دور سے آتے ہوئے دو بچوں پر پڑی تو وہ چونکا کیونکہ وہ دونوں بچے اچانک اس سمت سے نمودار ہوئے تھے جدھر انہوں نے بھیڑیوں کے شکار کے لیے گڑھے بنائے ہوئے تھے۔ بھیڑیوں کے انہی گڑھوں کی بنیاد پر ان کے گاؤں کا نام وولف پٹ یعنی بھیڑیوں کے گڑھوں والا گاؤں ٹھہر گیا تھا جو بعد میں بگڑتے بگڑتے وول پٹ رہ گیا۔ وہ ان دونوں بچوں کو اس طرف سے آتے ہوئے دیکھ کر پریشان سا ہو گیا تھا کیونکہ گاؤں اور اردگرد کے تمام لوگوں کو اس علاقے کے خطرناک ہونے کا علم تھا۔ اس لیے اس طرف سے کسی بھی شخص کی آمد اس کے لیے غیر متوقع تھی چہ جائیکہ دو عدد چھوٹے بچے اس طرف سے نمودار ہوں۔

اس نے اپنے ساتھی کسان کی توجہ ان بچوں کی طرف دلائی تو وہ بھی تجسس سے انہیں دیکھنے لگا۔ دور سے وہ دونوں بچے انہیں کچھ عجیب سے محسوس ہوئے تو وہ دونوں کسان انہیں غور سے دیکھنے لگے۔ بچے کچھ نزدیک آئے تو انہیں اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک لڑکی ہے دوسرا لڑکا۔ اس کے علاوہ انہوں نے انوکھے رنگوں اور عجیب سے ڈیزائن کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ایسے ڈیزائن کے جس کا رواج مشرقی انگلستان میں تو ہرگز نہ تھا۔

''اے کون ہو تم......'' آخر اس سے نہ رہا گیا تو اس نے بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آواز دی۔

بچے جو ابھی تک سیدھے چلے آرہے تھے۔ اس کی آواز کو سن کر چونکے ان کی طرف دیکھا اور گھبرا کر واپس بھاگنے لگے۔

وہ بچوں کو واپس بھاگتا دیکھ کر مشکوک ہو گیا اور انہیں پکڑنے کو ان کے پیچھے بھاگا۔ اسے بھاگتا دیکھ کر اس کا ساتھی کسان بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ اس شور وغوغا سے دوسرے کسان بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور معلوم کرنے لگے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

دیہاتی کی رفتار چونکہ بچوں سے تیز تھی اس لیے اس نے جلد ہی ان بچوں کو جالیا۔ بچے ڈر کے مارے اِدھر اُدھر گڑھوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگے مگر جب کوئی چارہ نہ رہا تو ڈر کے مارے ایک جگہ پر دبک گئے۔ دیہاتی انہیں نزدیک سے دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ ان دونوں بچوں کی جلد کا رنگ سبز تھا اور اس کے علاوہ انہوں نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ سوتی نہیں تھے کسی اور مادے کے بنے ہوئے تھے۔

''یہ دونوں شاید خلائی مخلوق ہیں۔'' اس نے سوچا اور انہیں ہاتھ لگانے سے اور پکڑنے سے ڈر گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے ان بچوں سے نقصان پہنچ جائے۔

اسی اثناء میں دوسرے دیہاتی بھی اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ وہ سب بھی ان بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پھر احتیاطاً ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے تا کہ وہ بھاگ نہ سکیں۔

''کون ہو تم لوگ اور کہاں سے آئے ہو۔'' ان میں سے ایک دیہاتی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

یہ سن کر بچے رونے لگے اور ایسی زبان میں کچھ بولنے لگے جو انہوں نے کبھی سنی نہ تھی۔ اب تو ان کو پکا یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ بچے ضرور کوئی خلائی مخلوق ہیں۔

ڈر کے مارے ان کو کوئی ہاتھ نہ لگا رہا تھا۔ پھر چند لوگوں نے ہمت کی اور ان بچوں کو پکڑ کر کھیتوں کی طرف لائے اور پھر وہاں سے گاؤں کی طرف لے چلے۔ ان بچوں کو دیکھ کر ہر شخص نے اپنا کام بند کر دیا تھا اور یہ جاننے کے لیے تجسس تھا کہ آخر یہ بچے کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔

سبز بچوں کی اطلاع آن کی آن میں دور دور تک پھیل گئی اور آس پاس کی کاؤنٹی سے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں ان کے گرد ٹھٹھ... لگ گئے۔ ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا اور ان بچوں سے سوالات کر رہا تھا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کیونکہ یا تو بچے رو رہے تھے یا پھر وہ جو زبان بول رہے تھے وہ ان کی سمجھ سے بالا تھی۔

آخر گاؤں کے چند بڑوں کے مشورے سے ان کو گاؤں کے مالک رچرڈ ڈی کلون کی حویلی میں لے جانے کا فیصلہ کیا گیا جو وانکس سے چند میل دور تھی۔

کلین کے مکان تک ان بچوں کو لانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ بچے اپنی نامانوس زبان میں چلاتے اور روتے تھے۔ ان بچوں کو بس ایک فائدہ ہوا تھا کہ انہیں لوگوں کے ہجوم سے نہ صرف نجات مل گئی تھی بلکہ رہنے کو بھی اک پناہ گاہ میسر آ گئی تھی۔ جب پوچھ گچھ سے فرصت ہوئی تو کسی کو ان بچوں کے کھانے پینے کا خیال آیا۔ فوراً ہی ان کے سامنے اس وقت موجود غذا حاضر کر دی گئی مگر بچوں نے ان میں سے کسی بھی چیز کو کھانے سے انکار کر دیا۔

اب یہ بڑا مسئلہ ہو گیا تھا کہ ان بچوں کو آخر کون سی غذا دی جائے جو یہ کھا سکیں ورنہ یہ تو بھوک سے ہلاک ہو جائیں گے۔ اتفاق سے لوبیا کا اک گٹھر جو وہاں اس مقصد سے رکھا گیا تھا کہ اس میں سے بیج نکالے جائیں تجربے کے طور پر ان بچوں کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے بے تابی سے اسے جھپٹ لیا مگر حیرت انگیز طور پر وہ پھلیوں کے بجائے ڈنٹھل چھیل کر اس میں سے لوبیا کے بیج تلاش کرنے لگے۔ اس پر وہاں پر موجود لوگوں نے ان کی مدد کی اور پھلیوں سے بیج نکال کر دیے جو انہوں نے رغبت سے کھائے۔ یوں ان کے کھانے کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا۔ ان کی غذا کافی عرصے تک لوبیا کے بیج ہی رہے مگر آہستہ آہستہ جب وہ لوگوں سے مانوس ہوتے گئے اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالتے گئے تو انہوں نے دوسری غذا بھی لینا شروع کر دی۔

جب وہ سبز بین کے علاوہ دوسری غذا کھانے کے قابل ہوئے تو ان کی جلد کی سبز رنگت بھی غائب ہونا شروع ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد لڑکا جو لڑکی سے عمر میں چھوٹا تھا۔ پژمردہ سا دکھائی دینے لگا۔ بالآخر وہ بیمار ہو گیا اور ایک سال کے اندر اندر اس کا انتقال ہو گیا۔ مرنے سے کافی پہلے اس کی سبز رنگت ختم ہو گئی تھی۔ جب کہ لڑکی نے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا اور وہ کافی عرصہ زندہ رہی۔

جب لڑکی نے خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا اور اسے کافی حد تک انگریزی بولنا آگئی تو اسے گاؤں میں منعقدہ ایک تقریب میں ایگنس کے نام سے بپتسمہ دیا گیا۔

ان بچوں کو جب کافی حد تک انگلش بولنا آگئی تو ان بچوں سے پوچھا گیا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور وول پٹ میں کیسے پہنچے۔

اس پر لڑکی بولی کہ وہ دونوں بہن بھائی ہیں اور سینٹ مارٹن کی سرزمین سے آئے ہیں جہاں دائمی دھند لکا چھایا رہتا ہے اور وہاں کے تمام باشندوں کی رنگت انہی کی طرح سبز ہے۔ لڑکی سے جب پوچھا گیا کہ سینٹ مارٹن کی سرزمین کہاں ہے تو لڑکی نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا پر اتنا ضرور کہا کہ ان کے علاقے سے گزرنے والے ایک وسیع دریا کے دوسرے کنارے پر انہیں ایک روشن و چمکدار علاقہ نظر آتا تھا۔

ان سے سوال کیا گیا کہ وہ یہاں کیسے پہنچے؟ اس پر لڑکی نے کہا کہ وہ اپنے والد کے مویشی چرانے نکلے تو ایک غار میں جا پہنچے۔ جہاں انہیں دور سے گھنٹیوں کی تیز آواز

سنائی دی تو وہ اس آواز کے منبع کی تلاش میں غار کے اندر چلے گئے اور بالآخر وول پٹ میں واقع ایک غار کے دہانے تک آ پہنچے۔ جب وہ باہر نکلے تو سورج کی شعاعوں نے ان کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ وہ کافی دیر آنکھیں کھولنے سے قاصر رہے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر او نگھتے رہے۔ جب ان کی آنکھیں سورج کی روشنی کو برداشت کرنے کے قابل ہوئیں تو انہوں نے آگے بڑھ کر اس نئی دنیا کا جائزہ لینا شروع کیا مگر جب کسانوں نے انہیں دیکھ لیا اور انہیں آواز دی تو وہ خوفزدہ ہو گئے اور واپس اپنی دنیا میں جانے کے لیے بھاگے مگر بدقسمتی سے وہ غار کا رستہ بھول گئے اور پکڑے گئے۔

بہر حال لڑکی جب کچھ کرنے کے قابل ہوئی تو اسے کلون کے گھر میں ہی بطور خادمہ کئی سال تک کام کرنا پڑا۔ اس لڑکی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک گستاخ اور بدکردار لڑکی ہے۔

لڑکے کے مرنے کے بعد بھی لڑکی کافی عرصہ زندہ رہی اور جوان ہونے پر اس نے نزدیکی قصبے لیون ہام کے رہائشی رچرڈ بیری سے شادی کر لی جو شاہ ہنری دوئم کا ایک سفارت کار تھا۔ پھر شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی۔ اس کی اولاد کے بارے میں زیادہ تفصیل تو نہیں ملی مگر موجودہ ارل فیروز کا تعلق اس کی اولاد سے بتایا جاتا ہے۔

☆......☆

یہ پریوں کی داستان جیسی متنازعہ کہانی انگلستان کی تاریخ کے اوراق میں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ اس کہانی کی مصنفہ ستے اور ہرانے ہیں۔ دونوں ہی مصنف بارہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک کا نام ولیم آف نیو برگ (1198-1336) ہے جو ایک انگریز تاریخ دان تھا۔ اس نے اس کہانی کو اپنے کام ”ہسٹری آف انگلش افیئرز“ جو انگلستان کی 1066 سے 1198 کی تاریخ کے بارے میں ہے، میں شامل کیا ہے

دوسرے کا نام ”رالف آف کوگس پال“ ہے جو ایکس کے کوگس پال صومعہ میں ایبٹ کے طور پر 1207 سے لے کر 1218 تک کام کرتا رہا۔ جو وول پٹ کے جنوب میں تقریباً 16 میل دور واقع تھی۔ اس کی سبز بچوں کے بارے میں شہادت انگلش کرانیکل میں شامل ہے جس میں وہ 1187 سے 1220 تک لکھتا رہا۔ اس کا انتقال 1228 میں ہوا۔

جیسا کہ تواریخ سے ظاہر ہے کہ ان مصنفین نے اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے برسوں بعد اس واقعے کے بارے میں لکھا لہٰذا ان دونوں کی تحریروں میں کافی تضادات موجود ہیں۔

رالف چونکہ ایسکس میں رہتا تھا جو سفولک کی پڑوسی کاؤنٹی ہے تو اس کے پاس اس واقعے سے متعلق لوگوں سے ملنے کے مواقع زیادہ تھے۔ وہ اپنے کرانیکل میں لکھتا ہے کہ اس نے یہ کہانی سبز جلد والی خادمہ ایگنس کے مالک رچرڈ ڈی کلون سے خود سنی ہے۔

اس کے علاوہ رالف کے مطابق بچے اس وقت گم ہوئے جب وہ مویشی چراتے ہوئے ایک غار میں پہنچے اور وہاں بجنے والی گھنٹیوں کی رہنمائی میں بالآخر وہ وول پٹ میں وارد ہوئے۔

رالف کے مطابق بچے کسی ایسی جگہ سے آئے تھے جہاں سورج کی شعاعیں نہیں پہنچ سکتیں اور وہاں روشنی کا دھندلکا سا رہتا ہے۔

رالف مزید لکھتا ہے کہ لڑکی وہاں رچرڈ ڈی کلین کے گھر میں کئی سال بطور خادمہ کام کرتی رہی۔ اس دوران اس کا شمار چال چلن کے حوالے سے بدتہذیب اور اوباش لڑکی کے طور پر ہوتا تھا۔ رالف کے مطابق لڑکی نے وول پٹ کے شمال میں چار میل دور ووکنگ لائن نامی قصبے کے ایک نوجوان سے شادی کر لی۔ ولیم اس کہانی کے بارے میں کہتا ہے کہ بچے اپنا گھر سینٹ مارٹن کی سرزمین میں بتاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ وول پٹ میں اپنی آمد کا ذریعہ بتانے سے بھی قاصر تھے۔ ان کے مطابق وہ دونوں اپنے والد کے مویشی چرا رہے تھے کہ انہوں نے ایک زوردار آواز سنی۔ جس سے انہیں کوئی ہوش نہ رہا اور ہوش میں آنے کے بعد انہوں نے خود کو وول پٹ میں پایا۔

آخر میں ولیم اعتراف کرتا ہے کہ میں اتنی بہت سی ٹھوس شہادتوں کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔ جب کہ نہ تو مجھے رچرڈ ڈی کلون کا کوئی سراغ ملا نہ ایسکس میں اس کا گھر تاہم کوگس ویل سے چند میل دور ایسکس کاؤنٹی میں ایک ویکس کلون میز ضرور موجود ہے۔

اس کے علاوہ ایگنس کے شاہ ہنری دوئم کے سفارت کار سے شادی کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کیونکہ رچرڈ بیری نام کا ایک چانسلر اس دور میں ضرور موجود تھا پھر 1202 کے بعد رچرڈ ریٹائر ہو گیا اور دسمبر میں آسٹن کینن بن گیا لہٰذا

وہ ایکنس کا شوہر نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اینگلو سکین کرانیکل جو 1154 تک انگلش تاریخ کا احاطہ کرتا ہے میں سبز بچوں کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ کوئی فرضی کہانی ہے یا پھر یہ شاہ ہنری دوئم کے زمانے کا قصہ ہے نا کہ شاہ اسٹیفن کے زمانے کا۔

☆......☆

اس کہانی کی حقیقت کے بارے میں بھی متضاد خیالات پیش کیے جاتے ہیں مثلاً ایک خیال تو یہ ہے کہ یہ درحقیقت ایک کہانی ہے۔ جس میں ایک خیال دنیا کے لوگوں کا اس دنیا کے لوگوں سے رابطے کے تصور کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس بارے میں کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں بچوں کا غار میں داخل ہو کر کسی دوسری دنیا میں جانکلنا ایک مقبول کہانی کا خیال ہوا کرتا تھا۔

گیرالڈ آف ویلز اس سلسلے میں ایک کہانی کا حوالہ بھی دیتا ہے۔ جس میں ایک بچہ اپنے آقا کے ظلم و ستم سے تنگ آکر جب وہاں سے بھاگتا ہے تو اسے راستے میں دو Pigmies ملتے ہیں جو اسے زیر زمین راستے سے ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں خوب صورت دریا اور کھیت ہوتے ہیں اور جہاں روشنی سورج کے بجائے کسی پُراسرار ذریعے سے آتی ہے۔ اسے کہانی کہنے والوں کی بات میں وزن یوں بھی ہے کہ عام طور پر کہانیوں میں پُراسرار مخلوق اور پریوں کی رنگت سبز ہی بیان کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کا سبز لوبیا کھانے کا شوق بھی ان کے دوسری دنیا سے تعلق کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ لوبیا کو عام طور پر مُردوں کی خوراک کہا جاتا ہے۔

رومن مذہب میں لی موریا نامہ ایک سالانہ تہوار ہوا کرتا تھا جس میں لوگ مرے ہوئے لوگوں کی بدروحوں کو اپنے گھر سے بھگانے کے لیے لوبیا کے دانے کا چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ نہ صرف قدیم یونان مصر اور روم بلکہ میڈائیول انگلستان میں بھی لوگوں کا عقیدہ تھا کہ لوبیا میں مردہ لوگوں کی روحیں رہتی ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر فلکیات ڈنکن لونن کی تھیوری یہ ہے کہ سبز بچے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تھے جو منتقل کرنے والے ٹرانسمیٹر کی خرابی کی وجہ سے زمین پر آگئے تھے۔ اس بارے میں سب سے مقبول وضاحت پال حارث کی ہے۔ جو اس نے 1998 میں کی، اس کے نظریے

کے مطابق اگر اس واقعے کی تاریخ آگے بڑھا کر 1173 کردی جائے جو شاہ اسٹیفن کے بعد آنے والے شاہ ہنری دوئم کا عہد ہے تو پھر یہ بچے ممکنہ طور پر فلیمش (شمالی بلغارین) مہاجرین کے بچے ہو سکتے ہیں جن کے والدین سول دور میں ہلاک ہو گئے۔

اس کے مطابق فلیمش مہاجرین جو کھڈی کے کام کے ماہر اور تاجر تھے گیارہویں صدی کے شروع میں انگلستان آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہنری دوئم کے عہد میں انہیں انگلستان سے نکالنے کا کام شروع ہوا اور 1173 میں فارن ہام جو سفلوک میں واقع ہے کی جنگ میں ہزاروں فلیمش مہاجرین کا قتل عام ہوا۔

وہ کہتا ہے کہ شاید یہ بچے فارن یام، ٹسیٹ مارٹن کے نزدیک یا اس کے اندر رہنے والے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی میں سینٹ مارٹن کا ذکر آتا ہے۔ اس گاؤں کو جو وول پٹ سے چند میل پرے واقع ہے۔ لارک نامی ایک دریا جدا کرتا ہے۔ شاید یہی وہ دریا ہے جس کا ذکر لڑکی اپنی کہانی میں کرتی ہے۔ اپنے والدین کے قتل کے بعد دونوں بچے تھیٹ فورڈ نامی گھنے جنگل میں چھپ گئے اور سورج کی شعاعوں کی عدم دستیابی اور غذائی قلت کی وجہ سے خون میں کمی کے سبب ان کی جلد کی رنگت سبزی مائل ہو گئی۔ گھنٹیوں کی جو آوازیں انہوں نے سنیں وہ نزدیکی چرچ بری سینٹ ایڈمنڈ کی ہو سکتی ہیں۔ ان کا زیر زمین راستہ وہاں موجود چار ہزار سال پرانی کانوں (جو نیو لیتھک عہد سے موجود ہیں) کا رستہ ہو سکتا ہے۔ ان کانوں میں سفر کرتے ہوئے وہ بالآخر وول پٹ میں نکل آئے جہاں وول پٹ کے دیہاتوں کے لیے فلمیش لوگوں کا لباس اور ان کی زبان یقیناً نامانوس ہوگی اور اس کے علاوہ ان کی جلد کی سبز رنگت بھی ان کے لیے اچنبھے کا باعث بنی ہوگی جس کی بنیاد پر انہیں دوسری دنیا کی مخلوق سمجھ لیا گیا۔ ورنہ بعد میں نارمل غذا ملنے کے بعد جلد کی اصل رنگت لوٹ آنا انہیں اس دنیا کی مخلوق ظاہر کرتا ہے۔

سفولک کاؤنٹی کے لوگ اس بارے میں کہتے ہیں کہ کہانی نورفوک کے ایک خواب سے تعلق رکھتی ہے۔ جو ان بچوں کی جایداد کا نگراں تھا۔ نواب نے پہلے تو ان بچوں کو سنکھیا کھلا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہنے پر آخری کوشش کے طور پر انہیں خود فوک اور سفوک کی سرحد پر موجود تھیٹ فورڈ نامی جنگل میں چھوڑ دیا تا کہ وہ وہاں بھوک پیاس سے ہلاک ہو جائیں یا جنگلی جانوروں کی خوراک بن جائیں اور وہ ان کی جایداد کا مالک بن جائے ورنہ بالغ ہونے کی صورت میں اسے ان بچوں کی جایداد ان کے حوالے کرنا پڑتی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے وہ دونوں بچے کسی نہ کسی طرح وول پٹ پہنچ گئے اور وول پٹ کے لوگوں نے ان بچوں کو سبز بچوں کے حوالے سے مشہور کر دیا کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سنکھیا کے مسلسل استعمال سے جلد کی رنگت سبزی مائل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خون کی کمی اور غذائی قلت بھی اس کا سبب ہو سکتا ہے جس کا یہ دونوں بچے شکار تھے یہی وجہ ہے کہ بچوں نے شروع میں خوف کی وجہ سے عام غذا کھانے سے انکار کیا اور جب وہ عام غذا کھانے لگے تو ان کی جلد کی اصل رنگت لوٹ آئی۔

سبز بچوں کی اس کہانی نے مزید شہرت اس وقت حاصل کی جب مزید سبز بچوں کی موجودگی کی اطلاع بینجوش اسپین میں اگست 1887 میں ملی۔ کسانوں کے مطابق انہوں نے نزدیکی غار سے ان بچوں کی خوفزدہ سی آوازیں سنیں وہ کسی ایسی زبان میں رو اور چلا رہے تھے جو اسپینی نہ تھی۔ انہوں نے عجیب سے دھاتی کپڑوں کا لباس پہنا ہوا تھا اور ان کی جلد کی رنگت سبز تھی۔

ان دونوں بچوں کو کسان گاؤں میں لے گئے جہاں انہوں نے ان کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کی لیکن بچوں نے کوئی بھی چیز کھانے سے انکار کر دیا۔ لڑکا جلد ہی بیمار ہوا اور مر گیا جب کہ لڑکی نے تازہ سبزیاں خاص طور پر سبز لوبیا کھانا شروع کر دیا مگر پانچ سال بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

سبز بچوں کی اس کہانی کے اسپینی ورژن کے بارے میں جب تحقیق کی گئی تو علم ہوا کہ یہ وول پٹ کی کہانی کا چربہ ہے اور اسپین میں بینجوس نامی قصبے کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اگر اسپینی بچوں کی کہانی سچ ثابت ہو جاتی تو شاید وول پٹ کے بچوں کی داستان کو بھی دوام مل جاتا اور اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں دم توڑ دیتیں مگر اسپینی ورژن جھوٹا ثابت ہونے کے بعد وول پٹ کے سبز بچوں کے بارے میں پینڈورا بکس پھر سے کھل گیا ہے۔ بہرحال اس کہانی کی جو بھی حقیقت ہو جب تک ایلنس بیری کے پس ماندگان کا پتا نہ مل جائے یا پھر اس دور کی کوئی دستاویزی شہادت نہ مل جائے تب تک سبز بچوں کی کہانی کا شمار انگلستان کی سب سے زیادہ معمائی رہنے والی داستان کے طور پر ہوتا رہے گا۔

# جہدِ مسلسل

اعجاز احمد راحیل

اس نے غربت کے نچلے درجے میں رہ رہے لوگوں کے درمیان آنکھیں کھولیں۔ جہالت و غربت کا ہمیشہ سے ساتھ رہا ہے۔ اس کے گھر اور پاس پڑوس والے بھی ناخواندگی کے ساتھ محتاجی کی زندگی گزار رہے تھے اور یہ سب اسے گوارہ نہ تھا۔ اس نے کم سنی میں ہی کچھ ایسا کر دکھایا کہ ہالی ووڈ کی میڈونا چونک اٹھی۔ کراچی کا نام دور دور تک سنا جانے لگا۔

**کراچی کی ایک کم سن دوشیزہ کا ذکرِ خاص جو عالمی پیمانے پر مشہور ہوئی**

پچھلے دنوں ایک میٹنگ کے سلسلے میں سکھر سے کراچی جانا ہوا۔ وہاں سے فارغ ہوا تو اپنے ایک دوست عبداللہ کے پاس چلا گیا جو کہ کراچی کے مضافاتی علاقے مواچھ گوٹھ میں رہائش پذیر ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ عبداللہ اور میرا بچپن سکھر میں گزرا تھا۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کے ابو کراچی شفٹ ہوئے تو ہمیں نہ چاہتے ہوئے جدا ہونا پڑا۔ تاہم ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت اور احترام پہلے ہی کی طرح تھے۔ اس کے ابو

عبدالرحمٰن انکل نے کراچی میں کاسمیٹکس اسٹور کھول لیا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ کام کرتا تھا۔ مجھے سکھر کے ایک اخبار میں جاب مل گئی تھی۔ ہم کافی دنوں بعد ملے تھے۔ ایک دوسرے کا حال احوال جاننے کے بعد گپ شپ لگانے لگے۔ یوں شام سے رات ہوگئی، اکٹھے کھانا کھایا، کھانے کے دوران اس نے کہا۔ ”اخباری رپورٹر صاحب! آج آپ کو ایک لڑکی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔“ وہ اکثر مجھے میرے نام سے مخاطب کرنے کی بجائے اخباری رپورٹر ہی کہتا تھا۔

”جی عبداللہ بھائی سنائیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ کہانی اس وقت شروع ہوئی تھی، جب دریائے سندھ کی بپھری موجوں نے اس لڑکی کے گاؤں کو ڈبو دیا تھا۔ اس بے گھر و بے آسرا، چھ سالہ بچی کو علم نہ تھا کہ در بدری اب اس کا بہت سالوں تک پیچھا کرنے والی ہے۔ ایک غریب گھرانے کا رہا سہا سامان سیلاب میں بہہ گیا تو باہمت والدین اپنے بچوں کا ہاتھ تھام کر، گاؤں سے نکل آئے۔ انہیں پتا نہ تھا کہ اگلا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ انہیں ایک کٹھن سفر طے کرنا تھا، نہ کوئی منزل تھی نہ زادِ سفر۔ ان کے پاس معصوم بچوں اور غربت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ در بدر بھٹکتے، مانگ تانگ کر گزارا کرتے، کچی پکی راہوں پر چلتے چلتے کراچی کے مواچھ گوٹھ آن پہنچے۔ یہ علاقہ کئی معنوں میں بدنام تھا۔ غریب پرور شہر کے مضافات نے سر چھپانے کی جگہ تو دے دی مگر جان کی امان کہاں سے ملے؟“ عبداللہ کہانی سناتا رہا۔ ”جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ علاقہ اس شاہراہ پر واقع ہے جو بلوچستان کو کراچی سے ملاتی ہے۔ یہیں وہ قبرستان بھی ہے جہاں ایدھی کو ملنے والی نامعلوم لاشیں امانتاً دفن کی جاتی ہیں۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب تک اس قبرستان میں ستر ہزار بے نام افراد کی قبریں بن چکی ہیں۔ قبرستان کی خاموش فضا میں رہ رہ کر بلکہ دن رات فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ ان آوازوں سے بچیاں سہم سہم جاتی تھیں۔ علاقے پر منشیات فروشوں اور جرائم پیشہ گروہوں کا راج تھا جن کے لیے اغوا، قتل اور لوٹ مار عام بات تھی۔ باپ مزدوری کے لیے جاتا تھا تو بچیوں کو سختی سے تاکید کرتا تھا کہ باہر نہ نکلیں اور بچیاں بھی اپنے باپ کی بحفاظت واپسی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ بچیوں کی پڑھنے کی عمر تھی۔ ماں نے اصرار کیا کہ ان کو اسکول میں داخل کرایا جائے مگر باپ نہ مانا۔ ماں کے بہت اصرار کے بعد باپ نے ہامی بھری تو اس کی ماں نے حمیرا کو بھی اس کی بہن کے ساتھ اسکول میں داخل کروا دیا۔“ میں اس لڑکی کی روداد انہماک سے سن رہا تھا۔ مجھے یہ کہانی اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ بولا۔ ”وہ علاقے میں اسکول میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی تھی۔ پہلے پہل اس کو اپنا اسکول جانا بھی سزا لگتا تھا۔ اس کی ہم عمر بچیاں گلی میں کھیلتی پھرتی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی مگر اس کو اجازت نہ تھی۔ اس کا حساس ذہن بہت سے سوال اٹھاتا تھا مگر جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔“ لمحاتی توقف کے بعد، بولا۔ ”پھر ایک رات، جب وہ چھ سال کی تھی۔ پڑوس کے گھر سے بلند ہونے والی چیخوں نے اس کا دل دہلا دیا۔ اسے اگلے دن پتا چلا کہ اس کی ایک سہیلی، جو پیٹ کے درد میں مبتلا تھی، رات پرانی دوا پینے سے مرگئی تھی۔ اس کے ماں باپ ناخواندہ تھے۔ پڑھ نہ سکے کہ جو دوا وہ میڈیکل اسٹور سے لائے ہیں، وہ ایکسپائرڈ تھی۔ ابھی اس واقعے کو چند دن ہی گزرے تھے کہ اسے ایک اور تلخ واقعے کی گونج سنائی دی۔ اس کی رشتے کی ایک چچی کو ڈاکٹر نے وہ انجکشن لگا دیا جو گھوڑوں کو لگایا جاتا ہے۔ چچی بھی مرگئی۔ وہ میت والے گھر پہنچی تو اس کا دل ہولنے لگا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گئی اور گم صم سی یہ سب دیکھتی رہی کہ ناخواندہ افراد کس طرح میت تیار کرتے ہیں۔

وہ دس سال کی ہوئی تو باپ نے تعلیم سے ہاتھ اٹھالیا۔“ اس کے باپ نے کہا۔ ”اب اس کی شادی ہونی چاہیے۔ ماں لرز کر رہ گئی۔ دس سال کی بچی کہاں یہ بوجھ اٹھا پائے گی؟ باپ کے آگے ہاتھ جوڑے۔ فریادیں کیں۔ بیٹی بھی قدموں میں گرگئی۔ کہنے لگی۔ ”ابا مجھے میٹرک کرنے دو۔ پھر چاہے کانے، لنگڑے، پاگل سے شادی کرنے کا کہو گے تب بھی انکار نہ کروں گی۔“ باپ مان گیا۔ وہ بارہ سال کی ہوئی تو اس کا حساس ذہن جو ان گنت سوالوں کے جوابوں کی تلاش میں تھا، حالات سے ٹکرانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اسے یہ زندگی قبول نہیں تھی۔ اب وہ تعلیم کو سزا نہیں سمجھتی تھی اور اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر کتنی اہم ہو چکی ہے۔ اس نے اپنے آس پاس کی بچیوں کو بھی بدلنے کی ٹھان لی۔ وہ دن میں اسکول جاتی۔ واپس آکر ماں کا ہاتھ بٹاتی اور شام سے رات تک ان بچوں کو پڑھانے لگی جو اسکول جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔“ باپ نے بیٹی کا شوق دیکھا تو پہلے پہل رکاوٹ ڈالی۔ پھر اس کے

عزم کی شدت دیکھی تو خاموش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا، بیٹی کا شوق چند دن کا ہے۔ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ مگر بیٹی کے دل میں جو لگن جاگی تو بڑھتی ہی گئی۔ علاقے سے جوق در جوق بچے پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ تعداد بڑھی تو جگہ اور پڑھانے والوں کی بھی کمی ہوئی۔ اس کے گھر کا باورچی خانہ جہاں بچے فرش پر بیٹھ کر پڑھتے تھے، اب مزید بچوں کو نہیں سمو سکتا تھا۔ لہٰذا سڑک کو ہی اسکول بنا لیا۔ پڑھانے کے لیے اس نے اپنی ہم جماعتوں سے مدد مانگی۔ کچھ تیار ہو گئیں۔ کچھ نے تمسخر اڑایا۔ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ایک شام لیاری کے نوجوانوں کا گروپ اس سے ملنے آیا۔ انہوں نے اس کے کام کی شہرت سنی تھی۔ وہ جب یہاں پہنچے تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چھوٹی چھوٹی استانیاں سڑک پر بیٹھی، ننھے منے غریب بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی پنسلوں سے، مڑی تڑی کاپیوں کو پاؤں پر رکھ کر، بچے لکھنے میں مگن تھے۔ اکثر اوقات اس استانی کی آواز پاس سے گزرتی بس کے پریشر ہارن میں گم ہو جاتی تھی تو وہ اگلی بار گلے کی پوری طاقت سے چیخ کر اپنا جملہ دوہراتی تھی۔ ٹائروں سے اڑتی دھول سے سب کے چہرے آلودہ تھے مگر آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دلوں میں موجود اُمید کی تازگی کا احساس دلاتی تھی۔ لیاری کے نوجوانوں نے اس کا رابطہ روٹری کلب، کراچی سے کرایا۔ اور تب ترقی کا وہ سفر شروع ہوا جس میں مواچھ گوٹھ کے رہنے والے غریب لوگ اور ڈیفنس، کلفٹن میں رہنے والے امیر باشندے ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ روٹری کلب نے اپنے ممبران سے اسکول کی مدد کی اپیل کی تو جلد ہی ایک بڑی رقم جمع ہو گئی اور یوں وہ بچے، جو کبھی سڑک پر بیٹھ کر پڑھ رہے تھے۔ ایک پختہ اور کشادہ عمارت میں منتقل ہو گئے۔ پھر ”لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا“ کے مصداق، چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا گیا۔ مواچھ گوٹھ میں روشن ہونے والی ایک شمع کی لرزتی کانپتی لو آج ایک طاقت ور مشعل کی صورت اختیار کر گئی ہے جس کی تپش ساری دنیا کے دلوں کو گرما رہی ہے۔ اس بچی کی کہانی دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہے۔ جب وہ اپنے معصوم سے دل پر غربت کے ہاتھوں لگنے والے زخموں کو بیان کرتی ہے تو پاکستان سے لے کر امریکا تک حساس ذہن شل کر رہ جاتے ہیں۔ مگر پھر اس کی آواز کی مضبوطی، قدموں کا استحکام، سوچ کی روانی اور ارادے کی پختگی ہر ایک کو اس کا شریکِ سفر بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مواچھ گوٹھ میں موجود جرائم پیشہ گروہ بھی اب اس کے اسکول کی حفاظت کرتے ہیں۔ تمام مافیاؤں میں ایک اسکول کے احترام کا ان دیکھا ضابطہ اخلاق طے پا چکا ہے۔ لہٰذا اب اسے بھتے کی پرچیاں نہیں ملتی ہیں اور کوئی گروہ اس کے اسکول کے سامنے سڑک پر آکر فائرنگ یا ہنگامہ نہیں کرتا۔ اسکول کی عزت پورا علاقہ کرتا ہے جو آہستہ آہستہ مواچھ گوٹھ کو اندر سے بدل رہا ہے۔

بارہ سال کی عمر میں فروغ تعلیم کی مشعل تھامنے والی اس بچی کی عمر اب ستائیس سال ہے۔ اس نے مواچھ گوٹھ میں گیم چینج کر دیا ہے اور اس کا نام حمیرا بچل ہے۔ حمیرا نے زندگی کے تلخ تجربات سے گزرنے کے باوجود ہمت نہ ہاری۔ اس نے خواب دیکھنے کا سلسلہ روکا نہیں۔ مواچھ گوٹھ میں تعلیم کے فروغ کے لیے اس نے 'ڈریم اسکول' بنایا جو آج ساری دنیا میں پاکستان اور پاکستانیوں کا نام روشن کر رہا ہے۔ پہلے یہ اسکول سڑک پر قائم تھا۔ پھر روٹری کلب نے گراؤنڈ فلور تعمیر کرایا اور اگلی دو منزلوں کا وعدہ امریکی گلوکارہ میڈونا نے کیا تھا جو پورا ہو چکا ہے۔ اب اس اسکول کے اٹھارہ کمروں میں علاقے کے غریب اور بے سہارا بارہ سو افراد تعلیم اور ہنر پا رہے ہیں۔ صبح سات سے رات دس بجے تک یہاں شفٹوں میں چوبیس استانیاں پڑھاتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں جوان لڑکیوں کے لیے تعلیم بالغاں کے پروگرام اور ماؤں کے لیے صحت اور آگہی کے پروگرام بھی چلائے جا رہے ہیں۔ ”ڈریم فاؤنڈیشن ٹرسٹ“ کو اب متعدد ملکی اور بین الاقوامی اداروں کا تعاون حاصل ہے۔

”حمیرا نے دنیا کے کئی ملکوں کا سفر کیا ہے۔ اب وہ اپنے کام کے پریزنٹیشن کی ماہر ہے۔ کسی تجربہ کار ترقیاتی ماہر کی طرح، وہ گفتگو میں بھاری بھرکم الفاظ بھی روانی سے استعمال کرتی ہے۔“ عبداللہ نے اس لڑکی کی کہانی سنا کر سوچوں کے کئی در وا کر دیے تھے۔ میں اس لڑکی کی ہمت کو داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے تھے۔ ہماری گفتگو کا محور حمیرا بچل تھی۔ اس کی ہمت اور سچی لگن کی باتیں تھیں۔ ہم لگ بھگ تین بجے سوئے تھے۔ اس دوران بھابی ہمیں چائے بنا کر دیتی رہی تھیں۔ ہم چائے پیتے رہے اور اس کی باتیں کرتے رہے۔ اگلے دن اتوار تھا، اور شام کو میری واپسی تھی۔ میں نے واپسی کا پروگرام مؤخر کر دیا۔ اتوار کے دن فارغ ہی تھا۔ میں نے سارا دن مواچھ گوٹھ میں گزارا۔ اس لڑکی کے بارے میں مقامی

لوگوں سے پوچھتا رہا۔ ان سے بھی کافی کچھ معلوم ہوا تھا۔ عبداللہ کی سب باتیں حرف بہ حرف سچ تھیں۔

☆☆☆

مواچھ گوٹھ کے ایک بزرگ نے حمیرا اجگل کے متعلق کافی معلومات دیں۔ میرے ذہن کو اس باہمت لڑکی کی جدو جہد نے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ ایک غریب گھر کی روشن خیال لڑکی نے کس طرح مسائل اور حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس طرح کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہی خیال آتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اگلے ہی لمحے خود بخود اس بات کا جواب بھی مل جاتا تھا۔ وقت، حالات اور درپیش مسائل حساس اذہان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ ہر حساس دل و دماغ رکھنے والا انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ لوگوں کی حالت پہ اس کا دل کڑھتا رہتا ہے۔ پھر وہ عملی قدم اٹھاتا ہے۔ ہاں تب زندگی کے پہاڑ سے خیر کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس سے تشنہ لوگ سیراب ہوتے ہیں۔ وہ بزرگ جن کا نام باسط تھا، بتانے لگے۔ ”جس طرح کراچی کے گنجان آباد کچے علاقے مواچھ گوٹھ کی رہائشی حمیرا اجگل نے بارہ سال کی عمر میں بچیوں کو اپنے گھر کے ایک کمرے سے تعلیم دینے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ آج ”ڈریم ماڈل اسٹریٹ اسکول“ کی شکل میں دنیا کے سامنے موجود ہے۔ حمیرا اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہی نہیں بلکہ وہ پہلی فرد ہے، جس نے تعلیم حاصل کی۔ اس سے پہلے اس گھرانے میں لفظ تعلیم کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ والد اور والدہ کا تعلق مختلف ثقافت سے تھا۔ والد کا تعلق سندھ اور والدہ کا بلوچستان سے تھا۔ والدہ خود تو تعلیم یافتہ نہیں لیکن ان کے خاندان میں کچھ لوگوں نے تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ تو انہیں اس کی اہمیت کا احساس تھا اس لیے وہ اسے تعلیم دلانا چاہتی تھیں۔ ابتدا میں تو اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن جب بچے بڑے ہونا شروع ہوئے تو خاندان کی طرف سے پابندیاں عائد ہونا شروع ہوئیں کہ اب لڑکیاں بڑی ہو گئیں ہیں ان کو گھر سے نہیں نکالنا۔ یہ پابندیاں اس کے والد اور بھائیوں کی جانب سے لگائی جاتی تھیں لیکن اس کی والدہ اس بات پر ڈٹی رہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے ضرور آراستہ کریں گی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جو کچھ انہوں نے سہا ان کی بیٹیاں بھی وہی برداشت کریں۔“

اسے تعلیم کے حصول کے معاملے میں باہر کی بجائے گھر کے اندر بھی اسے تکلیف دہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پرائمری تک تو سب ٹھیک چلتا رہا لیکن جب سیکنڈری کی بات آگئی، خاص طور سے نویں اور دسویں جماعت کی، تو اس کے والد کی جانب سے بہت مخالفت تھی۔ اس صورتِ حال کے باعث حمیرا سے والدہ نے کہا۔ تم فی الحال والد کو بتائے بغیر داخلہ لے لو کیونکہ ان کو پتا چلا تو وہ اجازت نہیں دیں گے۔ اس طرح اس نے داخلہ لے لیا وہ بھی اس طرح کہ اس کی کتابیں اور یونیفارم ایک سہیلی کے گھر ہوتا جہاں سے وہ تیار ہو کر والد کے علم میں لائے بغیر اسکول جاتی تھی۔ لیکن ایک دن والد کو علم ہو گیا۔ اس پر بہت مار بھی پڑی اور کافی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر اس کے باوجود وہ سوچتی تھی کہ آخر عورت ہونا کوئی جرم ہے؟ جو اسے اس قدر سختیوں اور ظلم کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ یہ سوال ذہن میں اٹھتے تھے۔

ایک ایسی عمر، جس میں بچے بے فکری کی زندگی کھیل کود کر گزارتے ہیں، اس میں اپنا ایک اسکول شروع کرنے کا خیال کس طرح آیا؟ اس سوال پر حمیرا کا کہنا ہے۔ ”میرے گاؤں میں جہاں سے میرا تعلق ہے۔ ایک ایسا حادثہ ہوا، جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ہمارے پڑوس میں ایک عورت نے اپنی بیٹی جو کہ بیمار تھی، دوا پلائی۔ جس کے کچھ دیر بعد ہی اس بچی جو میری سہیلی تھی، کا انتقال ہو گیا۔ وہ عورت کیونکہ پڑھ نہیں سکتی تھی اس لیے وہ جان نہیں سکی کہ جو دوا وہ اپنے بچی کو دے رہی ہے، اس کی ڈیٹ ایکسپائر ہو چکی ہے، جس کی وجہ سے وہ بچی موت کے منہ میں چلی گئی۔

اس واقعے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کوئی تاریخ بھی نہیں پڑھ سکے۔ اس وقت بارہ سال کی عمر میں چھٹی کلاس کی طالبہ ہوتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں لوگوں کو تاریخیں پڑھنا سکھاؤں گی اور اسی کو میں نے اپنا مشن بنا لیا۔ اسی کے تحت میں نے اپنے گھر میں محلے کے بچوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرنا شروع کر دیا۔ انہیں اپنی نوٹ بک میں سے صفحے پھاڑ کر دیتی تھی۔ جب اسکول میں اس بات پر ڈانٹ پڑتی تو سوچا کہ کوئی اور راستہ اختیار کیا جائے۔ بس پھر گورنمنٹ اسکول میں چھوٹی چھوٹی مہمات چلائیں، ہر دس دن میں ایک ٹک ڈے رکھتے، لوگوں سے کتابیں مانگنے نکلتے۔ ہم نے سوچا جو کرنا ہے، ہم نے خود کرنا ہے۔ بس اپنی کوششوں سے ہم نے دس بچوں کے ساتھ اس اسکول کا آغاز کیا اور تب سے یہ

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سلسلہ چل نکلا۔"

ایک ایسے علاقے میں، جہاں تعلیم کا تصور نہیں تھا اور بچیوں کا گھر سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، وہاں بچیوں کو تعلیم دینے میں، جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا اس حوالے سے حمیرا بتاتی ہے۔ "ابتدا میں تو مسئلہ نہیں ہوا۔ اس وقت میں خود بھی چھوٹی تھی یعنی گیارہ بارہ سال کی تو لوگوں کی نظر میں یہ ایک کھیل تھا۔ میرے گھر والے اور کمیونٹی کے لوگوں کو یہ ہی لگا کہ بچی ہے، کھیل رہی ہے، تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن جیسے جیسے یہ ایک پراجیکٹ کی شکل بنتا گیا تو لوگوں کو پریشانی ہونے لگی کہ یہ کھیل تو سنجیدہ ہوتا جارہا ہے۔ پہلے یہ مذاق گھر کے کمرے سے شروع ہوا، پھر صحن میں آگیا، پھر گلی میں اور پھر یہ مذاق کرائے کی جگہ تلاش کررہا تھا تاکہ اس کو اسکول کی شکل دی جائے تو اس وقت لوگوں کے سامنے ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ لیکن اس وقت تک دس کے بجائے ہم ایک سو بیس بچوں کے ساتھ کھڑے تھے تو ہمارے حساب سے ہمارا مشن اور سنجیدہ ہوگیا تھا۔ بس پھر مشکلات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے اغوا کرنے کا پلان بنایا گیا، ہمیں گاؤں سے نکالا گیا، گاؤں والوں نے عرصے تک میرے والدین سے ناطہ توڑے رکھا، خاندان کے لوگوں نے ناطہ توڑ دیا، جس کمیونٹی میں ہم رہ رہے تھے۔ وہاں یہ باتیں ہونے لگیں کہ ان کو یہاں نہیں رہنے دینا کیونکہ ان کی بیٹیوں کی وجہ سے ہمارے بیٹیاں بدظن ہوجائیں گی، خراب ہو جائیں گی۔ لوگ آتے جاتے ہمیں گالیاں دیتے تھے۔ اسکول پر پتھراؤ کرتے۔ پھر ہم نے شرکت گاہ نامی این جی او کا سہارا لیا تو لوگوں کو احساس ہوا کہ ہم اتنے اکیلے نہیں، جتنا وہ ہمیں سمجھ رہے تھے۔ ان سب حالات میں ڈر بھی لگتا تھا، پریشانی بھی ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ باہر والوں کی مخالفت تو برداشت ہوجاتی ہے لیکن گھر میں موجود مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ گھر میں بھائی اکثر کہا کرتے تھے۔ "حمیرا تم ہمارے لیے باعث شرمندگی ہو۔ تمہاری وجہ سے ہم محلے میں نکل نہیں سکتے، گلی میں بیٹھ نہیں سکتے۔" لیکن میں اپنی والدہ کی سپورٹ کی بدولت اس کام کو کرتی رہی۔"

"ڈریم ماڈل اسٹریٹ اسکول" کے حوالے سے وہ بتاتی ہیں۔ "ابتدا میں، جہاں یہ اسکول ہم نے بنایا، وہاں ایسا کوئی پڑھا لکھا تھا ہی نہیں، جو اس اسکول میں پڑھاتا۔ میں نے خود پڑھانا شروع کیا اور ان بچیوں کو آہستہ آہستہ خود تربیت دی، ان کے والدین کو سمجھایا۔ میرا یہ ماننا تھا کہ جو بھی پڑھائے اس کا تعلق اسی کمیونٹی سے ہو کیونکہ اگر باہر سے کسی ٹیچر کو لایا جائے گا تو لوگ اسے غلط ہی سمجھیں گے لیکن اگر اپنی بچیاں تعلیم دیں گی تو لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ تو جب میرے اسکول سے پہلا بیچ 2007 میں میٹرک کرکے نکلا تو وہ دس لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے ہی اس اسکول کو جوائن کیا اور وہ اساتذہ کے فرائض بھی انجام دینے لگیں اور دیگر فرائض بھی سنبھالنے لگیں۔ جب لوگوں کو احساس ہوا کہ ان کی بیٹیاں یہ کام کررہی ہیں، جس سے کمیونٹی کے دوسرے بچوں کو پڑھنا آرہا ہے تو لوگوں کی جانب سے مخالفت میں کمی آنے لگی۔ اور آج صورت حال یہ ہے کہ 2001ء میں، جس اسکول میں صرف ایک ٹیچر کام کررہی تھی، وہاں اب کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے چالیس افراد کا اسٹاف موجود ہے، جہاں ستائیس کمروں پر مشتمل اسکول میں بارہ سو سے زائد بچوں کو تعلیم دی جارہی ہے۔"

حمیرا کی ان تھک کاوشوں اور حالات سے لڑتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھنے کا اعتراف صرف ان کی کمیونٹی میں ہی نہیں کیا جارہا بلکہ عالمی سطح پر بھی کیا جارہا ہے۔ اس بات کا ثبوت انٹرنیشنل ٹیچر پرائز 2016ء میں حمیرا کا ایوارڈ کے لیے نامزد ہونا ہے، جس میں دنیا کے 148 ممالک کی جانب سے آٹھ ہزار سے زائد افراد امیدوار تھے۔ حمیرا کا انتخاب ایوارڈ کے لیے نامزد چالیس حتمی امیدواروں میں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ آسکر ایوارڈ یافتہ ہدایتکارہ شرمین عبید چنائے کی ڈاکومنٹری "حمیرا، دا ڈریم کیچر" نے بھی عالمی سطح پر دنیا کی توجہ حمیرا کی جانب مبذول کروائی۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ دنیائے موسیقی کی عالمی شہرت یافتہ گلوکارہ میڈونا بھی حمیرا کے کام کے معترف ہیں اور چند برسوں سے ان کے اسکول کے لیے فنڈز بھی فراہم کررہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہالی ووڈ کی مشہور زمانہ حسینہ سلمیٰ ہائیک بھی انہیں نیک دل لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک باہمت پاکستانی خاتون کے تعلیمی منصوبے کی بے پناہ مدد کرکے پاکستانی غریبوں کے بچوں کے ساتھ بے مثال محبت کی مثال قائم کردی ہے۔ کراچی کی ایک کچی آبادی میں حمیرا بچل نامی خاتون نے غریب بچوں کی تعلیم سے محرومی کو دیکھتے ہوئے "ڈریم ماڈل اسٹریٹ اسکول" کی بنیاد رکھی۔

پاکستان کی بدقسمتی دیکھیے کہ ایک طرف تو حکمرانوں کو عوام کی تعلیم وترقی سے قطعاً کوئی غرض نہیں اور دوسری طرف اگر کوئی ہمت کرکے خود ہی کسی عظیم مقصد کے لیے کھڑا ہو

جائے تو اسے بھی ساتھ رہنے والے بیرون وطن سے ہی حل پاتے ہیں۔ ہالی ووڈ کی مشہور زمانہ حسینہ سلمیٰ ہائیک نے اس کے جذبے سے متاثر ہو کر اس کے لیے خصوصی فنڈ مہم کا آغاز کیا اور بالآخر بدترین غربت کا شکار بچوں کو ایک انتہائی عالیشان اسکول میسر آ گیا۔ جس میں کھیلنے کا میدان، لائبریری اور کمپیوٹر لیب بھی ہے اور اب اس میں طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد قریباً ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے جب کہ مقامی سطح پر خواتین کے لیے بطور ٹیچر اور معاون ایک نوکری کے حصول کا بھی باعث بنا ہے۔ سلمیٰ نے حمیرا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے پاکستان میں تعلیم کے فروغ کے لیے جدوجہد کرنے والی اس سماجی کارکن کی زندگی پر "حمیرا، دا گیم چینجر" کے عنوان سے ایک دستاویزی فلم بھی بنائی جس کی ڈائریکٹر آسکر ایوارڈ یافتہ پاکستانی خاتون شرمین عبید چنائے ہیں۔

اخبار ڈیلی میل کی رپورٹ کے مطابق 42 سالہ سلمیٰ ہائیک نے اس دستاویزی فلم کی لانچنگ کے موقع پر کہا کہ وہ جب چھ سال کی تھیں تب ایک واقعہ نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ وہ خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں، سلمیٰ نے بتایا کہ وہ اپنے آبائی شہر میکسیکو سٹی میں اپنے والدین کے ہمراہ بازار میں جا رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بیدردی سے مار رہا ہے، جب والد اس خاتون کی مدد کے لیے بڑھے تو خاتون نے بجائے میرے والد کے مشکور ہونے کے الٹا انھیں گالیاں دینا شروع کر دیں اور اپنے شوہر کی وکالت میں بول اٹھی کہ "تمہاری جرأت کیسے ہوئی، وہ جو چاہے مجھ سے کر سکتا ہے۔" وہ خاتون جو سوچ رکھتی تھی وہ اس کی مستحق بھی تھی۔ سلمیٰ ہائیک ان دنوں خواتین کے گھریلو تشدد کے خلاف بھی امدادی کام میں مصروف ہے، ہائیک نے اس سلسلہ میں "For Change Chime" این جی او بھی بنا رکھی ہے جس میں لڑکیوں اور خواتین کے حقوق کے لیے کام کیا جاتا ہے جب کہ اس کام میں سلمیٰ ہائیک کی معاونت بیوسی اور گوکسی کی ڈائریکٹر فریدا جیانی کر رہی ہیں۔ لندن میں تینوں گلوکار خواتین نے اپنے اپنے لائیو کنسرٹس میں خواتین کے حقوق کے لیے بھی آواز اٹھائی ہے جس میں کئی معتبر شخصیات بھی آئی تھیں۔

☆☆☆

یہ اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے شروع کی جانے والی مہم 'ریز آف لائٹ' پراجیکٹ کا حصہ ہے عالمی شہرت یافتہ پاپ گلوکارہ، میڈونا کی امداد سے ہی 'ڈریم اسکول' کی تعمیر مکمل ہوئی ہے۔ معروف پاپ گلوکارہ نے سوشل میڈیا سائٹ پر 'ڈریم اسکول' کی تصویر پوسٹ کی، جس میں وہ لکھتی ہیں کہ اسکول کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ میڈونا کے ذاتی سوشل میڈیا اکاؤنٹ پر مزید لکھا ہے کہ "پاکستان میں محبت کا انقلاب جاری ہے۔"

کراچی میں قائم کیا گیا یہ اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے شروع کی جانے والی مہم 'ریز آف لائٹ' "روشنی کی ایک کرن" نامی پراجیکٹ کا حصہ ہے۔ گزشتہ سال، میڈونا کی آفیشل ویب سائٹ 'میڈونا ڈاٹ کام' پر جاری ہونے والی ایک پریس ریلیز کے مطابق، میڈونا نے کراچی میں لڑکیوں کے اسکول کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ میڈونا نے لندن میں ہونے والے ایک لائیو کنسرٹ میں اس مہم کا بذات خود آغاز کیا تھا۔ حمیرا بچل کے اسکول کے لیے گلوکارہ میڈونا نے کنسرٹ میں اسٹیج پر اپنے ساتھ حمیرا بچل کو کھڑا کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ڈریم نے سیکڑوں بچوں کی زندگیاں بدل دی ہیں، ہر بچی جاننے کا حق رکھتی ہے چاہے وہ کہیں بھی پیدا ہوئی ہو۔" ڈیلی میل کی رپورٹ کے مطابق پھر گلوکارہ میڈونا نے مزید کہا تھا کہ "حمیرا ایک آزادی کی جنگ لڑنے والی جنگجو ہے۔ وہ سب لڑکیوں کے لیے ایک ہیرو ہے اور ہم سب کے لیے بھی ایک مثال ہے۔"

'وائس آف امریکا' سے گفتگو میں، ڈریم فاؤنڈیشن ٹرسٹ کی سربراہ حمیرا بچل نے بتایا کہ 'اسکول کا نام ڈریم ماڈل اسٹریٹ اسکول رکھا گیا ہے، جہاں پندرہ سو کے قریب لڑکیاں اور لڑکے زیر تعلیم ہیں۔ حمیرا نے مزید بتایا کہ "اس کے نچلے حصے کی تعمیر ڈریم فاؤنڈیشن کی جانب سے کی گئی، جبکہ اسکول کی بقیہ تعمیر میڈونا کی تنظیم کی جانب سے کی گئی مالی امداد کی جانب سے مکمل ہوئی ہے۔"

حمیرا بتاتی ہیں کہ "مسئلہ صرف اسکول کی عمارت نہیں ہے مگر وہاں مختلف زبانوں اور ذاتوں کے لوگ آباد ہیں جو زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے طبقے میں لڑکیوں کی تعلیم ایک اہم مسئلہ ہے، جس کے حل کے لیے وہ اپنے علاقے مواچھ گوٹھ میں لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے اور اسے عام کرنے کے لیے کافی پرعزم ہیں۔"

وہ 22 مارچ 1938ء کو خمرہ ہندوستان کے شہر علی گڑھ میں پیدا ہوئی۔ ہند کے اس علاقے میں ایک نام بہت زیادہ سنا جاتا تھا۔ اس نام کو سنتے ہی لوگ اپنا سر تعظیم میں جھکا دیتے تھے۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے دیوی کا درجہ دیتے تھے کیونکہ اس نے اپنی سرزمین کے لیے مرد بن کر جنگیں لڑی تھیں۔ وہ نام تھا ”چھیلی باگی“۔ اسی لیے وہ روہیل کھنڈ بندیل کھنڈ ہی نہیں۔ پورے ہند میں آنکھ کی پتلی بن گئی تھی۔ عقیدت کا مرکز قرار دے دی گئی تھی۔ گھر والوں نے

# لاکھوں میں ایک

انور فرہاد

پاکستانی فلم کی تاریخ مرتب کی جائے تو ایک ایسا نام جو جہدِ مسلسل کی عبارت ہے اور سپراسٹار کے زمرے میں آئے وہ صرف ایک ہی نظر آتا ہے جس کا نام سن کر تقسیم کار فوراً فلم خرید لیا کرتے تھے کیونکہ وہ نام فلم کی کامیابی کا ضامن تھا۔ وہ خود میں ایک انجمن تھی۔ بطور ہیروین آئی تو دلوں کا قرار لوٹ گئی پھر جب ہدایت کارہ بنی تو فن کی بلندیوں پر نظر آئی۔ وہ بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھی۔

ایک معروف فلمی شخصیت کے شب و روز کا احوال

اسی لیے تو نومولود کا نام پتلی بائی رکھ دیا تھا۔ اس کے والد کا نام سید علی احمد تھا۔ والدہ کی عدم موجودگی میں اس کی پرورش نانی اقبال بیگم نے کی۔ پتلی بائی کا نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا۔ ماں کی جگہ نانی کا پیار ملا تھا اس لیے فطری طور پر وہ اپنی نانی سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان کے دبدبہ سے ڈرتی بھی تھی۔ اس لیے اپنا کوئی کام ان کی مرضی اور حکم کے بغیر نہیں کرتی تھی۔

ابھی وہ کمسنی کی سیڑھیوں پر تھی کہ برصغیر کا سیاسی افق تبدیل ہوگیا اور پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد سید علی احمد کا خاندان پتلی بائی کے ہمراہ ہجرت کر کے کراچی آن بسا۔ اگرچہ وہ ایک دبلی پتلی اور سانولی سلونی لڑکی تھی مگر اس کی نانی اقبال بیگم اور ماموں محمد عثمان اسے فلمی اداکارہ بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ انہی دنوں ہارون فیملی سے تعلق رکھنے والے سعید ہارون نے ایسٹرن اسٹوڈیو کے نام سے فلم اسٹوڈیو تعمیر کیا تھا۔ فلمساز و ہدایت کار نجم نقوی بھی تازہ بہ تازہ بھارت سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعید ہارون نے انہیں اپنے نگار خانے میں فلم بنانے کو کہا جسے نجم نقوی نے بخوشی قبول کرلیا اور ''کنواری بیوہ'' کے نام سے فلم بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اقبال بیگم ایسے ہی کسی وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے ہفت روزہ نگار میں ایسٹرن اسٹوڈیو میں فلم سازی کے آغاز کی خبر پڑھی تو انہیں اپنے خواب کی تعبیر نظر آگئی۔ وہ نگار کے مالک و مدیر الیاس رشیدی صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔

''الیاس میاں! ہماری پتلی بائی کو بھی فلمی اداکارہ بنا دو نا۔''

''ارے بھئی! میں کیسے تمہاری پتلی بائی کو اداکارہ بناؤں؟ میں کوئی فلم تو نہیں بنا رہا ہوں۔''

''اوہو! میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم فلم بنا رہے ہو۔ تمہارے دوست سعید اے ہارون کے اسٹوڈیو میں جو فلم بن رہی ہے۔ ان سے کہہ کر میری نواسی کو بھی کام دلوا دو۔''

''وہ سعید ہارون کی فلم نہیں، نجم نقوی کی فلم ہے۔''

''تم سعید ہارون سے کہو۔ سعید ہارون نجم نقوی کو کہیں گے تو وہ انکار نہیں کریں گے۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ الیاس رشیدی نے اپنے یار سعید اے ہارون سے کہا۔ سعید ہارون الیاس رشیدی کی بات نہیں ٹال سکتے تھے۔ انہوں نے ان کے اسٹوڈیو کی تکمیل تک ان کی بڑی معاونت کی تھی۔ اپنے اخبار کے ذریعہ بڑی تشہیر کی تھی۔ سعید ہارون نے نجم نقوی سے کہا۔ ''نقوی صاحب! تمہاری فلم کی تیاری کہاں تک پہنچی ہے؟''

''اسکرپٹ مکمل ہوگیا ہے اور اب آرٹسٹوں کا انتخاب زیرِ غور ہے۔''

''ہماری جاننے والی ایک لڑکی ہے اسے بھی دیکھ لو۔''

''اگر آپ کی کوئی لڑکی ہے تو اسے بھیج دیجیے۔ اسے دیکھنا دکھانا کیا۔ سمجھئے اس کا انتخاب ہوگیا۔''

''ارے یار! وہ میری لڑکی نہیں۔ میرے کسی جاننے والی کی لڑکی ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ میرے لیے......''

''اور......'' سعید ہارون نے نجم نقوی کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ آنکھ بند کر کے اس کا سلیکشن کرلو۔ یہاں پاکستان میں یہ تمہاری پہلی فلم ہے۔ اس میں کام کرنے والے ہر شخص کو اچھی طرح دیکھ بھال کرلو کہ تمہارے کام کا ہے یا نہیں۔''

نجم نقوی سے اس گفتگو کے بعد سعید اے ہارون نے اپنے آفس سے الیاس رشیدی کو فون کیا۔ علیک سلیک اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد بولے۔ ''الیاس بھائی! تم نے کسی لڑکی کے بارے میں کہا تھا نا......''

''پتا نہیں۔ آپ کس لڑکی کے بارے میں کہہ رہے ہو، کیا کہا تھا میں نے۔''

''الیاس بھائی! تم پوری بات سننے سے پہلے ٹوک دو گے تو تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔''

''اچھا...... اچھا! اب نہیں ٹوکوں گا۔ بتاؤ میں نے کس لڑکی کے بارے میں کیا کہا تھا؟''

''آپ نے کسی لڑکی کو نجم نقوی کی فلم میں اداکارہ کے طور پر پیش کرنے کو کہا تھا۔''

''ہاں ہاں یاد آیا۔ اقبال بیگم کی نواسی کے بارے میں کہا تھا۔''

''تو نجم نقوی کے پاس اس لڑکی کو بھیج دو۔ میرا مطلب ہے اسٹوڈیو میں اس کے دفتر میں بھیجو۔''

الیاس رشیدی نے سعید ہارون کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پتلی بائی کی نانی اقبال بیگم کو خبر بھیج دی۔ ''بیگم صاحبہ! اپنی نواسی کو لے کر ایسٹرن اسٹوڈیو جائیں اور نجم نقوی سے ان

کے دفتر میں تھیں۔"

اقبال بیگم نے پہلے تو الیاس رشیدی کا شکریہ ادا کیا پھر بولیں۔ "کیا وہاں جا کر آپ کا حوالہ دوں کہ الیاس رشیدی نے بھیجا ہے؟"

"نہیں میرا نہیں۔ ایسٹرن اسٹوڈیو کے مالک سعید اے ہارون کا حوالہ دیں کہ انہوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کہیں گے۔"

اور پھر اقبال بیگم اپنی نواسی پتلی بائی کو اپنے ساتھ لے کر پہلی ہی فرصت میں ایسٹرن اسٹوڈیو پہنچ گئیں۔ نجم نقوی نے اپنے سامنے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ کر کہا۔ "جی...... فرمائیے۔"

"سعید اے ہارون صاحب نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"اچھا۔" کہہ کر نقوی صاحب نے لڑکی کو گہری نظر سے دیکھا اور بیگم صاحبہ سے کہا۔ "تشریف رکھیے۔"

لڑکی دبلی پتلی سی تھی۔ سانولا رنگ اور عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر اقبال بیگم اندر ہی اندر سہم کر رہ گئیں۔ شاید انہیں پتلی بائی پسند نہیں آئی۔ شاید اگلے لمحے وہ معذرت کر دیں، کہہ دیں۔ یہ ہمارے کام کی نہیں ہے۔ تبھی نقوی صاحب نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔ جس کی آواز سن کر چپراسی اندر آیا۔ "چائے لاؤ۔"

اس حکم پر وہ الٹے قدموں واپس چلا گیا اور اقبال بیگم دل ہی دل میں کہنے لگیں۔ "چائے پلا کر دل جلانے کی کیا ضرورت ہے نقوی صاحب۔ دو ٹوک انکار کر دو۔" وہ نجم نقوی کی طرف ... دیکھ ہی رہی تھیں کہ وہ بولے۔ "بس یہ سمجھیے ...... بچی کا سلیکشن ہو گیا۔"

اقبال بیگم کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ان کی عجیب کیفیت تھی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔ "جی؟"

"میرا مطلب ہے۔" نقوی صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس بچی کو ہم نے اپنی فلم کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

اقبال بیگم پر تو خوشی نے ایسا دھاوا بول دیا تھا کہ ان کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ نانی کو خاموش دیکھ کر لڑکی خود ہی بولی۔ "پتلی بائی۔"

نجم نقوی مسکرا دیے۔ "تم پر یہ نام بہت جچتا ہے۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا مگر فلمی اداکارہ کے طور پر نہیں چلے گا۔ ہم تمہارا کوئی اچھا سا فلمی نام رکھ دیں گے۔"

چائے آ گئی تھی۔ نجم نقوی نے اقبال بانو کو مخاطب کر کے کہا۔ "چائے پیجیے۔"

اقبال بیگم نے شکریہ کہا مگر یہ محض چائے کے لیے نہیں تھا۔ پتلی بائی کو قبول کرنے کا بھی تھا۔ ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ دل کھول کر نجم نقوی کا شکریہ ادا کریں مگر وہ بڑی گھاگ خاتون تھیں۔ اپنے طوفانی جذبات کو قابو میں رکھا۔ کپ اٹھا کر منہ سے لگایا اور سپ لیا۔ اسٹوڈیو کی چائے انتہائی بدمزہ تھی مگر ان کو مٹھاس لگی۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" انہوں نے چائے کی گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

"کس بات پر اعتراض نہیں؟"

"اس کا نام بدلنے پر۔ دراصل یہ اتنی دبلی پتلی ہے کہ پتلی سے پتلی بن کر رہ گئی۔"

نجم نقوی مسکرا کر رہ گئے۔ اقبال بیگم بولیں۔ "تو پھر اس کا کام کب سے شروع ہوگا؟"

"پہلے ہم اس کے کچھ ٹیسٹ لیں گے پھر۔"

"کیسا ٹیسٹ؟"

"اسکرین ٹیسٹ وغیرہ۔ پھر جیسا نتیجہ آئے گا اسی کی مناسبت سے اس کے لیے کردار کا انتخاب ہوگا۔"

اقبال بیگم اسٹوڈیو سے نکل کر گھر نہیں گئیں۔ راستے سے مٹھائی خریدی اور سیدھے الیاس رشیدی کے دفتر جا پہنچیں۔ "الیاس میاں! مبارک ہو۔ تم لوگوں کی سفارش کام آ گئی۔ نجم نقوی نے اس اللہ ماری کو اپنی فلم کے لیے منتخب کر لیا ہے، لو منہ میٹھا کرو۔" انہوں نے مٹھائی کا ڈبہ ان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بھی مبارک ہو۔" کہتے ہوئے الیاس صاحب نے پتلی بائی کو گھور کر دیکھا۔ وہ اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے اگر میں اس لڑکی کو پہلے دیکھ چکا ہوتا تو ہرگز اس کی سفارش نہیں کرتا۔

قصہ مختصر یہ کہ پتلی بائی تمام ٹیسٹ میں کامیاب ہوئی اور نجم نقوی نے سلیکشن کا فائنل فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج سے تم پتلی بائی نہیں، شمیم آراء ہو۔ تمہارا نام ہندوانہ نہیں مسلمانوں جیسا ہونا چاہیے۔"

لڑکی کی بجائے اس کی نانی بول پڑی۔ "ماشاء اللہ بہت پیارا نام ہے۔ خدا کرے یہ فلمی دنیا میں خوشبو ہی کی

طرح پھیل جائے۔"

کچھ باخبر صحافیوں کو اندر کی بات معلوم ہوئی کہ "کنواری بیوہ" کے فلم ساز اے جی مرزا نے دبی زبان سے اس لڑکی کے انتخاب پر اعتراض کیا ہے جس پر نجم نقوی نے انہیں مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ "مرزا صاحب! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کا سلیکشن میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ بظاہر اس میں اداکاراؤں والی کوئی بات نہیں مگر اسے اداکارہ بنانا ہمارا کام ہے۔ فلم کی کہانی کی مناسبت سے وہ انشاء اللہ پرفیکٹ ثابت ہوگی۔"

"تو کیا اسے کنواری بیوہ کے کردار میں پیش کریں گے؟"

"جی ہاں۔ بطور ہیروئن۔ اس لڑکی میں بے پناہ فنی صلاحیت ہے جب کہ......" اس کے بعد وہ رک گئے تھے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ "نگار خانے کے مالک سعید اے ہارون نے یونہی اس کی سفارش نہیں کی ہے۔ انہوں نے بھی اس میں کچھ گن...... کچھ خوبی دیکھی ہے۔ ہم نے ان کی بات مان کر ان پر ایک احسان کیا ہے۔ اس لیے وہ اس فلم کی تکمیل تک ہم پر احسانات کرتے رہیں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟ ہم فلم والوں کو دور تک دیکھنا اور سوچنا پڑتا ہے۔"

اے جی مرزا کو اپنے ہدایت کار کے دور تک دیکھنے اور آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت پر خوشی ہوئی۔

اے جی مرزا اپنی یہ فلم حیدری پکچرز کے بینر تلے بنا رہے تھے۔ ان کی یہ فلم کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل تھی۔ یہ کراچی کے نئے اسٹوڈیو ایسٹرن اسٹوڈیو کی پہلی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار نجم نقوی کی بھی پاکستان میں پہلی فلم تھی اور ایک نئی اداکارہ شمیم آراء کی بھی پہلی فلم تھی۔

الیاس رشیدی اپنے اخبار نگار میں جہاں ایسٹرن اسٹوڈیو کی دل کھول کر پبلسٹی کررہے تھے وہاں نئی اداکارہ شمیم آراء کی تصویریں بھی ہر شمارے میں نت نئے انداز میں شائع کرتے تھے۔ اس طرح جہاں ایسٹرن اسٹوڈیو کی تشہیر ہورہی تھی وہاں اس کی پہلی فلم "کنواری بیوہ" کے بارے میں بھی عوام کو باخبر کیا جارہا تھا۔ "کنواری بیوہ" کی ہیروئن جو بظاہر اپنے قد و قامت اور چہرے مہرے سے دیکھنے والوں کو زیادہ متاثر نہیں کرتی تھی لیکن اس کی جو تصویریں چھپتی تھیں وہ بہت حسین و جمیل نظر آتی تھیں۔ اسکرین کے لیے اس کا چہرہ نہایت موزوں تھا۔ کیمرا خواہ کسی جگہ رکھ دیجیے۔ اس کی تصویر ہر اینگل سے بے حد خوب صورت آتی تھی۔ یہ انفرادیت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ ہزاروں میں کوئی ایک آدھ چہرہ ہی ایسا ہوتا ہے۔

"کنواری بیوہ" کے فلم ساز اے جی مرزا صاحب اور ایسٹرن اسٹوڈیو کے مالک سعید اے ہارون سمیت یونٹ کے کئی لوگ نجم نقوی کی اس گوہر شناسی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

اس فلم کے لیے نئی اداکارہ شمیم آراء سے معاہدہ چھ ہزار میں ہوا تھا۔ اس وقت کے لحاظ سے ایک نئی اداکارہ کے لیے یہ ایک معقول رقم تھی بلکہ بہت بڑی رقم تھی۔ شمیم آراء کی نانی تو اس بات پر بھی آمادہ تھیں کہ اگر مفت میں بھی کام کرنا پڑے گا تو گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔ انہیں اس موقع پر انہیں اپنی بیٹی شمیم آراء کی ماں بڑی شدت سے یاد آتی تھی جو ایک ماہر رقاصہ تھی اور اسی نسبت سے اسے بھی فلمی دنیا میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ اسے یہ آرزو تھی کہ وہ فلم کی اسکرین پر دھوم مچائے۔ اسے فلمی فنکارہ بننے اور کہلانے کا بڑا شوق تھا لیکن اس غریب کی قسمت میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ یہ پتلی بائی تب بہت چھوٹی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ چلو اس کی ماں نہ سہی اس کی بیٹی نے فلمی دنیا میں قدم رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بڑی اداکارہ، بڑی فنکارہ بننا نصیب کرے۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔

جواں سال بیٹی کا غم بہت دنوں تک اقبال بیگم کو رلاتا رہا۔ انہوں نے پتلی بائی اور اس کی ایک بہن اور ایک بھائی کو مرنے والی کی نشانی سمجھ کر پرورش کی ذمہ داری سنبھال لی جسے وہ باحسن طریقے سے پورا کررہی تھیں۔ جس کا ثبوت ان کی وہ بھاگ دوڑ ہے جو انہوں نے اسے شمیم آراء بنانے میں کی تھی۔

شمیم آراء کی پہلی فلم "کنواری بیوہ" میں اس کا پہلا ہیرو ایاز تھا جب کہ بو بیگم نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا جب کہ اس کے نغمات طفیل ہوشیار پوری اور فیاض ہاشمی کے تھے۔ مجموعی طور پر نو گانے تھے جن میں سے چند یہ ہیں۔

"میں بھی جوان ہوں دل بھی جوان ہے" (نذیر بیگم) "تم ملے زندگی مسکرانے لگی (مہدی حسن، کوثر پروین)، "ہر رات پوچھتے ہیں یہ چاند یہ ستارے (زبیدہ خانم) موسیقار قدیر فریدی اور رفیق علی خان تھے۔"

فلم کی پبلسٹی بہت زبردست ہوئی تھی۔ تماشائی بڑی شدت سے اس فلم کا انتظار کر رہے تھے مگر جب ریلیز ہوئی تو تماشائیوں کے معیار پر پوری نہیں اتری لیکن سانولی سلونی اداکارہ شمیم آراء اپنے تیکھے نقوش کی وجہ سے پسند کی گئی۔ اگرچہ اپنی پہلی فلم کی ناکامی سے شمیم آراء بہت مایوس ہوئی تھی لیکن اس کی جہاندیدہ نانی نے اس کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

"اری پگلی! فلم کی ناکامی پر تو کیوں ہلکان ہوتی ہے۔ تجھے اور تیرے کام کو مبصرین اور ناقدین کے علاوہ فلم بینوں کی اکثریت نے بھی پسند کیا ہے۔ تجھے آئندہ بھی فلمیں ملیں گی اور انہیں کامیابی بھی حاصل ہوگی۔"

اور ایسا ہی ہوا اس کی بعد کی تین فلمیں مس 56، انار کلی اور واہ رے زمانے، کنواری بیوہ کی طرح فلاپ نہیں ہوئیں۔ درمیانی درجے کی رہیں۔ "مس 56" فلم ساز جے سی آنند اور ہدایت کار روپ کے شوری کی فلم تھی۔ اس فلم میں ہندوستان کی نامور اداکارہ مینا شوری کے مقابل شمیم آراء کو ہی لیا گیا تھا جس میں اس نے ایسی بھرپور اداکاری کی تھی کہ فلم والوں کو اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ اسی طرح "انار کلی" ہدایت کار انور کمال پاشا کی فلم تھی۔ الیاس رشیدی کے کہنے پر پاشا صاحب نے شمیم آراء کو اس فلم میں کاسٹ کیا اور نور جہاں کی بہن ثریا کے کردار میں پیش کیا۔ اس فلم میں بھی شمیم آراء نے نور جہاں، راگنی، سدھیر اور ہمالیہ والا جیسے کہنہ مشق فنکاروں کے ساتھ اس طرح جم کر اداکاری کی کہ اس کے کام کی سب نے تعریف کی۔ اس کی اداکاری سے متاثر ہونے والوں میں برصغیر ہند و پاک کے نامور ہدایت کار و فلم ساز ایس ایم یوسف بھی تھے۔

متذکرہ بالا تین کامیاب فلموں کے بعد "عالم آرا" (فلم ساز جے سی آنند، ہدایت کار داؤد چاند) اور "مسکراہٹ" (فلم ساز، ہدایت کار اور کہانی نویس ای این اختر) کی فلمیں ناکام ثابت ہوئیں جس پر شمیم آراء ایک بار پھر پریشان ہو گئیں مگر اس بار بھی اس کی نانی اماں نے اسے سمجھایا۔ "ارے بھئی! فلمیں کسی ایک شخص کی وجہ سے کامیاب یا ناکام نہیں ہوتیں۔ ٹیم ورک کے نتیجے میں فلم بنتی ہے۔ اس لیے بڑے بڑوں کی فلمیں بھی اکثر ناکام ہو جاتی ہیں۔ تم صرف اپنے کام پر نظر رکھو۔ ان فلموں میں تمہاری پرفارمنس کو کوئی برا نہیں کہہ سکتا۔ تم اچھے لوگوں کی اچھی فلم

## شمیم آراء۔ ایک نظر میں

اصلی نام: پتلی بائی
فلمی نام: شمیم آراء
پیدائش: 22 مارچ 1938ء
مقام پیدائش: علی گڑھ (انڈیا)
والد: سید علی احمد
والدہ: بچپن میں انتقال کر گئیں
نانی: اقبال بیگم (جنہوں نے ماں بن کر پرورش کی)
پہلی فلم: کنواری بیوہ (بطور اداکارہ)
آخری فلم: تیس مار خان (بطور اداکارہ)
شادی: چار شادیاں کیں
شوہر: سردار رند، سلمان مجید کریم، فرید احمد، دبیر الحسن
اولاد: واحد اولاد ڈاکٹر سلمان مجید کریم
پہلی فلم بطور فلم ساز: صاعقہ
آخری فلم بطور فلم ساز: بھول
پہلی ذاتی فلم بطور فلم ساز و ہدایت کارہ: جیو اور جینے دو
آخری ذاتی فلم بطور فلم ساز و ہدایت کارہ: مس کولمبو
دیگر فلم سازوں کی فلمیں جو ڈائریکٹ کیں:
مس سنگاپور، لیڈی اسمگلر، لیڈی کمانڈو، آخری مجرا، بیٹا، ہاتھی میرے ساتھی، منڈا بگڑا جائے، ہم تو چلے سسرال، مس استنبول، ہم کسی سے کم نہیں، لو 95۔
انتقال: 5 اگست 2016ء
تدفین: 8 اگست 2016 (لندن میں)

میں بڑی کامیابی حاصل کرو گی۔"

نانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ جعفر بخاری کی فلم "فیصلہ" اور ہمایوں مرزا کی فلم "راز" سپر ہٹ ہوئیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ "مس 56" جو ایک ہلکی پھلکی نغماتی فلم تھی۔ اس میں مال مصالحہ بھی بھرپور تھا۔ اس میں شمیم آراء کو اسلم پرویز کے مقابل سائیڈ ہیروئن کے طور پر پیش کیا گیا تھا جب کہ سنتوش کمار اس فلم کے ہیرو تھے۔ مینا شوری ہیروئن، ظریف اور چارلی بھی کاسٹ میں

شامل تھے۔ موسیقی ا بابی اے چشتی کی تھی جب کہ ڈی این مدھوک کے نغمات تھے جو بمبئی کے اس دور کے نامور فلمی شاعر تھے۔ اسکرپٹ ولی صاحب کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ''مس 56'' خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کرسکی تھی۔ جب اس بات کا فلمی پنڈتوں نے جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ کراچی کی فلم انڈسٹری میں ابھی وہ دم خم اور صلاحیت نہیں جو لاہور کو حاصل ہے۔ اس لیے الیاس رشیدی نے شمیم آراء کی نانی سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! اگر آپ اپنی نواسی کو بڑی اور کامیاب اداکارہ بنانا چاہتی ہیں تو میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ لاہور شفٹ ہو جائیں۔''

''مگر الیاس میاں! وہاں تو ہمیں کوئی جانتا نہیں۔ ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟ یہاں تو آپ جیسے لوگ ہیں۔''

الیاس صاحب نے خوش دلی سے کہا۔ ''وہاں جانے کے بعد بھی ہم آپ کے رہیں گے۔ آپ سے ناتا ختم تو نہیں ہوگا۔''

اور الیاس رشیدی نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ شمیم آراء اور ان کی نانی کے لاہور جانے کے بعد یہ الیاس رشیدی ہی تھے کہ انہوں نے انور کمال پاشا سے شمیم آراء کو اپنی فلم میں کاسٹ کرنے کو کہا اور پاشا صاحب نے ''انارکلی'' میں اسے انارکلی کی بہن کے کردار میں پیش کیا۔ یہ لاہور کی فلم تھی اور اس میں اس دور کے لحاظ سے بھرپور اور بہترین صلاحیتوں کے حامل افراد نے کام کیا تھا۔ یہ ایک رومانی، نغماتی فلم تھی، اس کے تمام گانے مقبول ہوئے۔ اس کے نغمات قتیل شفائی، سیف الدین سیف، تنویر نقوی، طفیل ہوشیار پوری اور حکیم احمد شجاع نے لکھے تھے۔ موسیقار ماسٹر عنایت حسین اور رشید عطرے تھے۔ یہ فلم اگرچہ درمیانی درجے کی کامیابی حاصل کرسکی مگر اپنی گوناں گوں خوبیوں کی وجہ سے بہت اہم فلم تھی۔ شمیم آراء کی یہ لاہور میں پہلی فلم تھی۔ اس فلم کے بعد لاہور کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس کی فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا جب کہ کراچی کے فلم ساز و ہدایت کار بھی اسے کاسٹ کرتے رہے، اب وہ لاہور کی اداکارہ کی حیثیت سے کراچی آتی اور فلموں کی شوٹنگ کروا کر لاہور واپس چلی جاتی۔ ''انارکلی'' کے بعد ریلیز ہونے والی کراچی کی فلمیں ''واہ رے زمانے'' (فلم ساز وزیر علی، ہدایت کار رفیق رضوی) درمیانے درجے کی فلم تھی جب کہ ''عالم آرا'' (فلم ساز بے بی آنند، ہدایت کار داؤد چاند) اور ''مسکراہٹ'' (فلم ساز و ہدایت کار ای این اختر) ناکام فلمیں ثابت ہوئیں مگر کراچی کی فلم ''فیصلہ'' (فلم ساز و ہدایت کار جعفر بخاری) اور لاہور کی ''راز'' (فلم ساز و ہدایت کار ہمایوں مرزا) سپرہٹ فلمیں ثابت ہوئیں۔

1956ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''کنواری بیوہ'' کی ناکامی کے بعد سے 1958ء میں نمائش پذیر ہونے والی فلم ''واہ رے زمانے'' تک شمیم آراء کی کوئی بھی فلم اس طرح کی کامیابی حاصل نہ کرسکی تھی جو ان فلموں سے فلم بینوں نے اُمید لگا رکھی تھی۔ یوں شمیم آراء کا فلمی دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا لیکن اپنی نانی کی حوصلہ افزائی اور اپنے عزم و ہمت کے سہارے اس نے تھک ہار کر بیٹھ جانا گوارا نہیں کیا۔ اس اندھیرے میں بھی اپنے قدموں کو لڑکھڑانے نہیں دیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ ''وابستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ'' آنے والے کل سے بہتری کی امیدیں وابستہ کردیں۔ نانی کی ہدایت پر اپنے کام پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی۔ زیادہ سے زیادہ محنت کرنا شروع کردی۔ اس کی محنت، لگن اور حوصلے کے نتیجے میں اسے فلمیں ملتی رہیں۔

''شمیم آراء نے اپنی فلمی زندگی میں فلمی دنیا کے بڑے نشیب و فراز دیکھے مگر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے باصلاحیت باہمت اور بلند حوصلہ ہونے کا ثبوت دیا۔ ان میں دو خوبیاں درجۂ کمال تک موجود تھیں جو ابتداء سے ان کی ترقی، مقبولیت اور کامیابی میں ہر قدم پر ان کے لیے معاون ثابت ہوئیں۔ وہ ان کی انتہائی شائستہ و شستہ زبان و بیان اور تہذیب و تمدن ادب و احترام اور سلیقہ تھے۔

ناکامیوں کے باوجود ان کی قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ انہیں فلمیں مل رہی تھیں اور اچھے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ 1959ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''عالم آرا'' میں ان کے مقابل ہیرو اکمل تھے جو اس دور کے دلیپ کمار کہلاتے تھے مگر جعفر بخاری کی فلم ''فیصلہ'' اور ہمایوں مرزا کی فلم ''راز'' میں انہیں ہیروئن کی بجائے سائیڈ ہیروئن کے طور پر پیش کیا گیا۔ بہرحال میں صابر و شاکر رہنے والی اداکارہ نے انکار نہیں کیا۔ ''فیصلہ'' میں جمیلہ رزاق اور ''راز'' میں مسرت نذیر ہیروئن تھیں جو ان سے سینئر اور بڑی اداکارہ تھیں۔ شمیم آراء کا ان کے

مقابلے میں کمتر رول ہونے کے باوجود اداکاری کے معیار میں وہ ان سے کسی طرح کم تر نہیں تھیں۔ ناقدین اور مبصرین کے علاوہ فلم بین نے بھی شمیم آراء کی پرفارمنس اور بہترین کردار نگاری کی دل کھول کر تعریف کی۔ ان سپرہٹ فلموں سے شمیم آراء کی ساکھ پر بھی خوشگوار اثر پڑا اور فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے انہیں بے کھٹکے کاسٹ کرنا شروع کردیا۔

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں اس دوران وہ کراچی کی فلموں میں بھی کام کرتی رہیں۔ کراچی کی فلموں میں جعفر بخاری کی فلم ''فیصلہ'' رفیق رضوی کی فلم ''اپنا پرایا'' منور رشید کی فلم ''انسان بدلتا ہے'' کے علاوہ دیگر فلمیں بھی تھیں۔

شمیم آراء کی دوسری سپرہٹ فلم ''راز'' بھی جو سسپنس سے بھرپور ایک مکمل جاسوسی فلم تھی۔ اس کے ستاروں میں مسرت نذیر، اعجاز اور علاؤالدین نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ شمیم آراء سائیڈ ہیروئن تھیں۔ اس فلم میں شمیم آراء کی زبردست فنی صلاحیتوں کے فلمی حلقوں میں تذکرے ہونے لگے اور انہیں ایک باصلاحیت اداکارہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔ اس سے متاثر ہونے والوں میں برصغیر پاک و ہند کے معروف ہدایت کار ایس ایم یوسف بھی تھے۔ ان کے صاحبزادے ہدایت کار اقبال یوسف کی جاسوسی فلم ''رات کے راہی'' میں بھی شمیم آراء کی پرفارمنس پر ایس ایم یوسف نے اس ابھرتی ہوئی اداکارہ کو ایک باصلاحیت پرفارمر کی حیثیت دی تھی۔ لہٰذا جب انہوں نے 1960ء میں اپنی ذاتی فلم ''سہیلی'' پروڈیوس کی تو اس میں شمیم آراء کو مرکزی کرداروں میں شامل کیا۔ اس فلم کے دیگر مرکزی کردار نیر سلطانہ، درپن، اسلم پرویز اور بہار بیگم نے کیے تھے۔ ان جیسے کہنہ مشق فنکاروں کے ساتھ کام کرنا شمیم آراء کے لیے کسی آزمائش سے کم نہ تھا مگر جب فلم نمائش پذیر ہوئی تو وہ فن کی بلندیوں پر نظر آئیں۔ یہ سپرہٹ فلم نہ صرف 1960ء کی بہترین فلم تسلیم کی گئی اور اسے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا بلکہ نیر سلطانہ کے ساتھ شمیم آراء بھی سال کی بہترین اداکارہ تسلیم کی گئیں۔ اس فلم میں انہیں بہترین معاون اداکارہ کا نگار ایوارڈ بھی ملا۔

نگار ایوارڈ کے حوالے سے یہ بتانا ضروری ہے کہ ان کی (شمیم آراء کی) بہترین کردار نگاری پر انہیں ''فرنگی''، ''نائلہ''، ''لاکھوں میں ایک'' اور ''صاعقہ'' میں بہترین ہیروئن کے نگار ایوارڈز ملے۔ شمیم آراء نے فلموں میں ایسے ایسے شاندار کردار ادا کیے ہیں جن کی مثال ممکن نہیں۔ خاص کر انہوں نے المیہ کردار نگاری میں اپنی فنی صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں حسن طارق کی ''وحشی''، لئیق اختر کی ''صاعقہ'' خواجہ خورشید کی ''ہمراز'' اور قمر زیدی کی ''سالگرہ'' میں ان کی المیہ اداکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

''سہیلی'' کی بلاک بسٹرڈ کامیابی سے شمیم آراء کے لیے فلم انڈسٹری کے سارے دروازے کھل گئے۔ بڑی فلموں کے لیے بڑے ہدایت کار بڑے اعتماد کے ساتھ شمیم آراء کو اپنی فلم کے مشکل سے مشکل تر کردار کے لیے بھی کاسٹ کرنے لگے۔ ایسے ہدایت کاروں میں خواجہ خورشید انور، خلیل قیصر، پرویز ملک، حسن طارق، ایس ایم یوسف، نذیر اجمیری، محسن، انور کمال پاشا، ایم جے رانا، ایس سلیمان، منشی دل، شباب کیرانوی، شریف نیر، رضا میر،

## شمیم آراء کی ہدایت کاری میں بننے والی فلمیں

شمیم آراء نے بطور فلم ساز پہلی فلم 1968ء میں ''صاعقہ'' بنائی تھی۔ جو نامور ناول نگار رضیہ بٹ کے اسی نام سے مشہور ناول سے ماخوذ تھی۔ اس فلم کو شائقین فلم بالخصوص خواتین نے بہت پسند کیا تھا جب کہ بطور ہدایت کارہ ان کی پہلی فلم ''جیو اور جینے دو'' تھی جو 1976ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد کئی برسوں تک انہوں نے کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کی۔ کئی سال کے وقفے کے بعد انہوں نے ''پلے بوائے'' (1978ء) میں بنائی۔ اس کے بعد سلسلہ چل نکلا اور ''مس ہانگ کانگ'' (1979ء) ''مس سنگاپور'' (1985ء) ''مس کولمبو'' (1984ء) ''لیڈی اسمگلر (1987ء)۔ ''لیڈی کمانڈو'' (1989ء)، ''آخری مجرا'' (1994ء)، ''بیٹا'' (1993ء)، ''ہاتھی میرے ساتھی'' (1993ء)، ''منڈا بگڑا جائے'' (1995ء) اس فلم نے باکس آفس پر ڈائمنڈ جوبلی کیا تھا۔ ''ہم تو چلے سسرال'' (1996ء)، ''مس استنبول (1996ء)، ''ہم کسی سے کم نہیں'' (1997ء) اور ''لو 95'' (1996ء) ڈائریکٹ کی۔

اقبال اختر، فرید احمد، ظفر شباب اور ایم اے رشید کے علاوہ دیگر بھی شامل ہیں۔ اس دوران ان کی قابلِ ذکر فلموں میں فرنگی، ہمراز، دوسری ماں، دوراہا، جانِ آرزو، دل بے تاب، چنگاری، آنچل، پرائی آگ، لاکھوں میں ایک، خاک اور خون، وحشی، غرناطہ، میخانہ، دل کے ٹکڑے، نائلہ، آگ کا دریا، دل میرا دھڑکن تیری، آنسو بن گئے موتی، زندگی ایک سفر ہے، انگارے، میرا گھر میری جنت، فرض اور نائٹ کلب شامل ہیں۔

شمیم آراء کے فنی سفر کا آغاز اردو فلم ''کنواری بیوہ'' سے ہوا تھا جب کہ اختتام پنجابی فلم ''تیس مار خان'' سے ہوا جو ہدایت کار اقبال کاشمیری کی فلم تھی۔ ''تیس مار خان'' شمیم آراء کی دوسری اور آخری پنجابی فلم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اداکارانہ کیریئر کی بھی آخری فلم تھی۔ شمیم آراء کی پہلی پنجابی فلم ہدایت کار ریاض احمد راجو کی فلم ''جائیداد'' تھی جس میں انہوں نے سائیڈ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا مگر اس فلم میں ان کے سارے مکالمے اردو میں تھے۔

شمیم آراء نے ہماری فلم انڈسٹری کے تقریباً تمام ہی نمایاں ہیروز کے مقابل کام کیا تھا۔ جن میں سدھیر (فرنگی، شعلہ و شبنم، اور قبلہ) حبیب، (محبوب، دل کے ٹکڑے، پردہ، دیوداس، کالا پانی) سید کمال، (نائٹ کلب، آج اور کل، کھلونا، فرض، زمانہ کیا کہے گا، سویرا، دوسری ماں، پیار کی سزا اور عالیہ)، وحید مراد (دل میرا دھڑکن تیری، ہل اسٹیشن، دوراہا، جیو اور جینے دو، سالگرہ، آرزو اور زیب النساء)، محمد علی (صاعقہ، وحشی، آنسو بن گئے موتی، آنچ، ہمراز، آگ کا دریا اور دل بے تاب)، ندیم (سہاگ، پرائی آگ)، سنتوش کمار، (فیشن، مجبور اور چنگاری) لیکن جس ہیرو کے ساتھ شمیم آراء کی جوڑی کو فلم بینوں نے بے حد پسند کیا وہ تھا نیلی آنکھوں والا خوب صورت ہیرو درپن (شباب، شکاری، اک میرا سہارا، آنچل، قیدی، میرے محبوب، انسان بدلتا ہے، صاعقہ، باپ کا باپ، سہیلی، نائلہ)۔

ان فلموں میں ''نائلہ'' وہ واحد فلم تھی جس میں درپن نے شمیم آراء کے ہمراہ ولین کا کردار ادا کیا تھا جب کہ اس کا حقیقی بھائی سنتوش کمار اس فلم کا ہیرو تھا۔ ان دونوں سپر اسٹارز کے ساتھ شمیم آراء ''نائلہ'' میں فن کی بلندیوں پر نظر آئی تھیں۔

اگر شمیم آراء کی بہترین کردار نگاری کے حوالے سے بات کی جائے تو کئی فلمیں ایسی نظر آتی ہیں جن کو فلم بین کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان میں ہمایوں مرزا کی فلم ''آگ کا دریا'' بھی ہے جس میں شمیم آراء نے محمد علی جیسے ڈرامائی ہیرو کے ساتھ اس طرح اعتماد کے ساتھ اپنی فنی کردار نگاری کا مظاہرہ کیا جس کا ہر ایک نے اعتراف کیا اور دل کھول کر تعریف کی۔ اس طرح خلیل قیصر کی فلم ''فرنگی'' کو کون بھول سکتا ہے جس میں شمیم آراء نے ایک نابینا انقلابی لڑکی کا ناقابلِ تسخیر کردار ادا کیا۔ اس فلم میں شمیم آراء کے ساتھ جنگجو ہیرو کا کردار لالہ سدھیر نے کیا تھا۔ اس کی اداکاری بھی عروج پر تھی۔ طالش نے بھی اعلیٰ کردار نگاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ فلم اپنے وقت کی سپر ہٹ اور کلاسیکل فلم تھی۔ ایک اور یادگار فلم ''چنگاری'' تھی جو خواجہ خورشید انور کی ڈائریکشن میں تیار کی گئی تھی۔ اگرچہ کاروباری لحاظ سے یہ فلم قابلِ ذکر نہیں تھی مگر تکنیکی لحاظ سے اعلیٰ درجے کی فلم تھی۔ اس فلم میں سنتوش کمار، اعجاز اور دیبا کے ساتھ شمیم آراء نے اپنی زندگی کی بہترین کردار نگاری کی تھی۔ تجارتی لحاظ سے ناکام رہنے والی ایک اور فلم ''ہمراز'' تھی۔ یہ بھی خواجہ خورشید انور کی فلم تھی لیکن تخلیقی اعتبار سے ایک یادگار فلم تھی۔ اس کا شمار بہترین فلموں میں ہوتا ہے۔ محمد علی، طارق عزیز، نبیلہ اور رنگیلا نے اس فلم میں کلیدی کردار نبھائے تھے لیکن شمیم آراء نے اپنے مرکزی کردار میں جس پائے کی کردار نگاری کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان دونوں ناکام فلموں کے مقابلے میں ہدایت کار رضا میر کی فلم ''لاکھوں میں ایک'' ایسی فلم تھی جس نے اپنے فلم ساز کو لاکھوں کما کر بھی دیا اور اعلیٰ معیار پر بھی پوری اتری۔ اس فلم کی کامیابی میں شمیم آراء کی بلند کردار نگاری کا بھی بڑا حصہ ہے اور اس پر فلمائے گئے گانوں کا بھی۔ ''چلو اچھا ہوا تم بھول گئے، اک بھول ہی تھا میرا پیار'' اس گانے کو کون بھول سکتا ہے جو شمیم آراء پر فلمایا گیا تھا اور اس نے اس گانے کے دوران اپنی جذبات نگاری کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ تماشائیوں پر ایک سحر طاری ہو گیا تھا۔ یہ فیاض ہاشمی کا لکھا ہوا گیت تھا جسے نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

گانوں کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ شمیم آراء کو گانوں کی پکچرائزیشن پر بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ اداکار ہو یا اداکارہ ہر ایک کو گانوں کی عکسبندی کو جلا بخشا، جان ڈالنا نہیں آتا۔ جس طرح وحید مراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معمولی سے معمولی گیت کو بھی اپنی پکچرائزیشن

سے یادگار بنادیتے تھے، اسی طرح شمیم آراء بھی گیتوں کی فلم بندی کے وقت اپنی سپر پرفارمنس کا ایسا مظاہرہ کرتی تھیں کہ گیت کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس موقع پر ان پر عکس بند ہونے والے چند گیتوں کی مثال دوں گا جن لوگوں نے ان گیتوں کو ان پر فلمایا ہوا دیکھا ہے وہ میری بات کی گواہی دیں گے۔

”ہر رات پوچھتے ہیں یہ چاند یہ ستارے (آواز زبیدہ خانم۔ موسیقی طفیل ہوشیار پوری، قادر فرید، فلم ”کنواری بیوہ)۔ رات سلونی آئی، بات انوکھی لائی جو ہم کسی سے نہ کہیں گے (آواز ناہید نیازی، موسیقی مصلح الدین۔ بول فیاض ہاشمی، فلم زمانہ کیا کہے گا)۔ ”یاد کر کے ساری ساری رات، میں روتی رہی شبنم کے ساتھ (آواز نور جہاں، موسیقی رشید عطرے، فلم قیدی)۔ ”مجھ کو معلوم نہیں تجھ کو بھلا کیا معلوم“ (آواز ناہید نیازی، بول حمایت علی شاعر، موسیقی خلیل احمد فلم آنچل)۔ ”نگاہیں ملا کر بدل جانے والے مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے“ (آواز نور جہاں، موسیقی رشید عطرے، فلم محبوب)۔ ”کلی کلی منڈلائے بھنورا، کہیں بھی چین نہ پائے (آواز نور جہاں، موسیقی خواجہ خورشید انور، فلم چنگاری)۔ ”آ بھی جا دل دارا، ابھی جا دل دارا (آواز نسیم بیگم، موسیقی رشید عطرے، فلم فرنگی)۔ ”بن کے مرا پروانہ آئے گا دلبر خاناں (آواز مالا، موسیقی رشید عطرے، فلم فرنگی)۔ ”اپنے وعدوں کو بھلا دو، کہیں ایسا تو نہیں (آواز نسیم بیگم، احمد رشدی، بول قتیل شفائی، موسیقی بخشی وزیر علی فلم فیشن)۔ ”ایک سنہرے گاؤں میں، چاند کی ٹھنڈی چھاؤں میں“ (آواز نسیم بیگم، بول قتیل شفائی، موسیقی تصدق حسین، فلم مجبور)۔ ”غم دل کو ان آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے (بول قتیل شفائی، آواز مالا، موسیقی ماسٹر عنایت حسین فلم نائلہ)۔ ”ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں“ (آواز مالا، موسیقی رحمان ورما فلم قبیلہ)۔ ”من جا من جا بالم من جا، ناٹھکرا میرا پیار“ (آواز نور جہاں، بول جوش ملیح آبادی، موسیقی غلام نبی عبداللطیف فلم آگ کا دریا)۔ ”کیا خبر تھی ہمیں ٹوٹ جائے گا دل“ (آواز نور جہاں، بول کلیم عثمانی، موسیقی ناشاد فلم جلوہ)۔ ”ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ“ (آواز نور جہاں، بول حمایت علی شاعر، موسیقی خلیل احمد، فلم میرے محبوب)۔ ”بھولی ہوئی ہوں داستاں گزرا ہوا خیال ہوں“ (آواز مالا، بول مسرور انور، موسیقی سہیل رعنا، فلم دوراہا)۔ ”میرا محبوب آئے گا، بہاریں ساتھ لائے گا، جوانی گیت گائے گی“ (آواز مالا، بول تنویر نقوی، موسیقی منظور اشرف، فلم شعلہ و شبنم)۔ ”جانے کل تک تری حیات ہو نہ ہو جھوم لے“ (آواز نور جہاں، موسیقی خواجہ خورشید انور، فلم ہمراز)۔ ”اے میرے دل بے تاب نہ رو، یہ غم ہی تیرا سرمایہ ہے“ (آواز مالا، بول مسرور انور، موسیقی لعل محمد اقبال، فلم دوسری ماں)۔ ”کیا ہے جو پیار تو پڑے گا نبھانا، رکھ دیا قدموں پہ دل نذرانہ“ (آواز مالا، بول قتیل شفائی، موسیقی ماسٹر عنایت حسین، فلم دل میرا دھڑکن تیری)۔ ”آجا میرے پیار میں ہے دل بے قرار“ (آواز رونا لیلیٰ، بول مسرور انور، موسیقی نثار بزمی، فلم صاعقہ)۔ ”میری زندگی ہے نغمہ میری زندگی ترانہ“ (آواز نور جہاں، بول شیون رضوی، موسیقی ناشاد، فلم سالگرہ)۔ ”ہم سے بدل گئیں وہ نگاہیں تو کیا ہوا“ (آواز نور جہاں، بول قتیل شفائی، موسیقی ماسٹر عنایت حسین، فلم دل بے تاب)۔ ”اے مصور تری تصویر ادھوری ہے ابھی“ (آواز نور جہاں، بول قتیل شفائی، موسیقی خلیل احمد فلم آنچل)۔ ”ابھی ڈھونڈ ہی رہی تھی تمہیں یہ نظر ہماری“ (آواز نور جہاں، بول کلیم عثمانی، موسیقی نثار بزمی، فلم ۔ بے وفا)۔ ”زندگی اپنی گزر جائے گی آرام کے ساتھ“ (آواز نور جہاں، رجب علی، بول تسلیم فاضلی، موسیقی ناشاد، فلم خاک اور خون)۔ ”زندگی پر مجھے خواب کا ہے گماں، آ گئی آ گئی میں کہاں“ (آواز نسیم بیگم، بول تنویر نقوی، موسیقی

## شمیم آراء کی ذاتی فلمیں

### بطور فلم ساز

صاعقہ (1968ء) ہدایت کار لئیق اختر
سہاگ (1972ء) ہدایت کار فرید احمد
فرض (1973ء) ہدایت کار لئیق اختر
بھول (1974ء) ہدایت کار ایس سلیمان

### بطور ہدایت کارہ

جیو اور جینے دو (1976ء)
پلے بوائے (1978ء)
مس ہانگ کانگ (1979ء)
میرے اپنے (1981ء)
مس کولمبو (1984ء)

خواجہ خورشید انور، فلم پرائی آگ)۔ "میرے سینے پہ سر رکھ دو، میرے دل میں سما جاؤ" (آواز مالا، بشیر احمد، بول تسلیم فاضلی، موسیقی ناشاد، فلم بل اسٹیشن)۔ "سنو بہارو آج پیا سے ہو گئی ملاقات" (آواز مالا، نسیم بیگم، بول فیاض ہاشمی، موسیقی اے حمید، فلم زندگی ایک سفر ہے)۔ "مجھ کو غم حالات کی تصویر سمجھنا، اس خط کو میری آخری تحریر سمجھنا" (آواز نور جہاں، بول مسرور انور، موسیقی ناشاد، فلم سہاگ)۔ "اے میرے دل کے سہارے، آرزوؤں کے روشن ستارے" (آواز مالا، موسیقی ناشاد، فلم فرض)۔ "کل بھی تم سے پیار تھا مجھ کو، تم سے محبت آج بھی ہے" (آواز رونا لیلیٰ، مسعود رانا، بول مسرور انور، موسیقی اے حمید، فلم خواب اور زندگی)۔"

گانوں کی پکچرائزیشن صرف اسی کا نام نہیں کہ گیتوں کے بول پر لب ہلا دیں اور ہاتھ پیر کو متحرک کر کے اپنی ذمہ داری پوری کر دیں۔ اچھے، سمجھ دار اور حقیقی طور پر فن شناس فنکار گیتوں میں بیان کیے گئے۔ حالات و واقعات کے تناظر میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں اور اپنے جذبات کی عکاسی سے گیت کے تاثر کو نمایاں کرتے ہیں۔ گیت میں خوشی کی بات ہو تو اپنے انگ انگ سے خوشی کا اظہار کرتے ہیں، غم والم کی کیفیت ہو تو گانے کی عکاسی کراتے وقت غم و الم کی تصویر بن جاتے ہیں۔ شمیم آراء مناظر کی عکاسی کی طرح گیتوں کی فلمبندی کے دوران بھی اپنے آپ کو گیتوں کے بولوں میں موجود تاثرات کو نمایاں کرنے میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔ انہوں نے اداکاری کو کبھی بھی آسان اور سہل نہیں سمجھا۔ جو بھی کردار کرنے کو انہیں دیا گیا، انہوں نے اس کی ڈیمانڈ کے مطابق اسے ادا کر کے اس کردار کو زندگی بخشنے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ خداداد فنی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ انہوں نے اپنی فنی خوبیوں کا اظہار نہایت دیانت داری کے ساتھ کر کے اپنے ہر کردار کو یادگار بنانے کی کوشش کی۔ جب جب انہیں چیلنجنگ کردار ملے۔ انہوں نے اپنی ساری فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نہ صرف اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ ان کرداروں کو یادگار بنا دیا۔

شمیم آراء کی فنی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کا پہلا دور اداکاری کا ہے۔ یہ دور ان کی سخت جدوجہد اور آزمائشوں کا دور تھا مگر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

ان کا دوسرا دور فلم سازی کا ہے جس میں انہوں نے فلم پروڈکشن کی طرف توجہ دی اور اپنی خوب صورت اداکاری کی طرح خوب صورت فلمیں بنا کر ثابت کیا کہ اچھے لوگ ہی اچھی فلمیں بنا سکتے ہیں۔

شمیم آراء کا تیسرا اور آخری دور جسے ان کی زندگی کا سب سے سنہرا دور کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ یہ دور بحیثیت ہدایت کارہ کا ہے۔ انہوں نے اپنے پہلے دور میں جس طرح خود کو ایک کامیاب و باصلاحیت اداکارہ ثابت کیا اور اداکاری میں اپنا لوہا منوایا بالکل اسی طرح انہوں نے اپنی ہدایت کاری کے دور میں بھی خود کو ایک کامیاب ترین ہدایت کارہ کے طور پر منوا کر چھوڑا۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کی زیر ہدایت بننے والی یکے بعد دیگرے چار فلمیں نہ صرف بے حد کامیاب ہوئیں بلکہ معیار کے لحاظ سے بھی فلم بینوں میں بہت پسند کی گئیں۔

بطور فلم ساز شمیم آراء کی پہلی فلم "صاعقہ" تھی۔ اس کی کہانی خواتین کی پسندیدہ ناول نگار رضیہ بٹ کے ناول پر مبنی تھی۔ مصنفہ کے طور پر رضیہ بٹ کا نام ہی استعمال کیا گیا تھا۔ ہدایت کاری کے فرائض لئیق اختر کو سونپے گئے تھے۔ اس فلم کے شریک فلم ساز ان کے ماموں محمد عثمان اور اے رشید تھے۔ نثار بزمی کی دلوں میں اتر جانے والی موسیقی نے اس فلم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ شمیم آراء نے اس کا ٹائٹل رول خود ادا کیا تھا۔ یہ فلم 13 ستمبر 1968ء کو ریلیز ہوئی تھی اور گولڈن جوبلی کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی۔ مسلسل 50 ہفتے چلنے والی فلم گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کی تھی۔

بحیثیت فلم ساز شمیم آراء کی دوسری فلم "سہاگ" تھی جسے فرید احمد نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ خواتین کی ایک اور مقبول ناول نگار حمیدہ جبیں اس کی مصنفہ تھیں۔ جب کہ مکالمہ نقی مصطفیٰ تھے۔ موسیقی ناشاد کی تھی۔ یہ فلم 1972ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی مگر کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اس فلم میں بھی شمیم آراء نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

"فرض" ان کی فلم ساز کی حیثیت سے تیسری فلم تھی جو اگلے ہی برس یعنی 1973ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کی ہدایت کاری ایک بار پھر لئیق اختر کو سونپی گئی تھی۔ معروف نغمہ نگار مسرور انور نے اس فلم کے گانوں کے علاوہ اس کے مکالمے بھی لکھے تھے اور اسکرین پلے بھی ان ہی سے لکھوایا گیا تھا۔ ناشاد اس فلم کے بھی موسیقار تھے۔ یہ فلم صاعقہ کی طرح کامیاب تو نہ ہو سکی مگر ناکام بھی ثابت نہیں ہوئی۔ 25

ہفتے مسلسل چل کر اس نے سلور جوبلی منائی۔

''بھول'' بحیثیت فلم ساز شمیم آراء کی چوتھی فلم تھی۔ اس کی ہدایت کاری کے فرائض انہوں نے ایس سلیمان کو سونپے تھے۔ جو ''باجی'' جیسی فلم بنا کر فلم انڈسٹری میں اپنا ایک ممتاز مقام بنا چکے تھے۔ یہ ان کی اپنی پہلی فلم تھی جس میں انہوں نے اداکاری نہیں کی تھی۔ اس فلم کی کاسٹ میں ندیم، شبنم، ممتاز، بابرا شریف، زمرد، آغا سجاد، نجمہ محبوب، افضال احمد، حنیف، عشرت چودھری، منور سعید اور شہنشاہ ظرافت، منور ظریف شامل تھے۔ ''بھول'' رضیہ بٹ کے ناول ''صائمہ'' سے ماخوذ تھی۔ جسے فلم کے لیے حمیدہ جبیں نے تحریر کیا تھا جب کہ اس کا اسکرین پلے اور مکالمے آغا حسن امتثال کے تحریر کردہ تھے۔ فلم کے مصنف کے خانے میں حمیدہ جبیں ہی کا نام دیا گیا تھا۔ روبن گھوش نے موسیقی ترتیب دی تھی جب کہ نغمات خواجہ پرویز نے تحریر کیے تھے۔ یہ فلم یکم نومبر 1974ء کو ریلیز ہوئی تھی جس نے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ کامیڈی کنگ منور ظریف کو اس فلم (بھول) کی شوٹنگ کے دوران بابرا شریف سے بہت قریب رہنے کی وجہ سے پیار ہو گیا تھا۔ منور ظریف جواں سال تھے، خوبرو تھے اور کامیڈین کی حیثیت سے ان کا ستارہ عروج پر تھا۔ ایک دن موقع مناسب دیکھ کر انہوں نے بابرا شریف کو پرپوز کر دیا۔

''بابرا! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے میں تمہیں زندگی بھر کے لیے اپنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

''تم بہت اچھے ہو۔ کسی لڑکی کے لیے بھی بہت اچھے شوہر ثابت ہو سکتے ہو مگر مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں...... مجھ میں کیا خرابی ہے؟''

''میں نے کہا نا...... تم بہت اچھے ہو۔ خرابی مجھ میں ہے کہ میں نے اپنے آپ سے عہد کر رکھا ہے کہ اب زندگی بھر دوبارہ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔''

واضح رہے کہ بابرا شریف نے اداکار شاہد سے بڑے ڈرامائی انداز میں شادی کی تھی مگر وہ بے وفا ثابت ہوا۔ اس کی حیثیت بھنورے کی سی تھی۔ وہ کسی ایک کا ہو کر رہنے والا نہیں تھا۔ اس شادی کی ناکامی کے بعد بابرا شریف نے غالباً عہد کر لیا تھا کہ وہ اب اور کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

منور ظریف کے لیے بابرا شریف کا انکار، بہت بڑے دکھ اور صدمے کا سبب بنا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی جواں مرگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی۔

''بھول'' کے بعد شمیم آراء نے اپنی پانچ ذاتی فلمیں خود ڈائریکٹ کیں۔ بطور فلم ساز و ہدایت کارہ ان کی یہ فلمیں ''جیو اور جینے دو'' (1976ء) ''پلے بوائے'' (1978ء) ''مس ہانگ کانگ'' (1979ء) ''میرے اپنے'' (1981ء) ''مس کولمبو'' (1984ء) ہیں۔

بطور ہدایت کارہ ان کی پہلی فلم ''جیو اور جینے دو'' میں انہوں نے ندیم، وحید مراد، کویتا، غلام محی الدین، ممتاز اور مصطفیٰ قریشی کو کاسٹ میں شامل کیا تھا مگر یہ فلم متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی لیکن بعد کی فلموں نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ کامیابیوں سے ہمکنار ہوئیں اور کامیاب ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئیں جس کے بعد دوسرے فلم سازوں نے بھی ان سے اپنی فلمیں ڈائریکٹ کروانا شروع کر دیں۔ ان فلموں نے کامیابیوں کے نئے ریکارڈ قائم کر کے شمیم آراء کو صف اول کی ہدایت کاروں میں شامل کر دیا۔ شمیم آراء کی بحیثیت ہدایت کارہ پہلی فلم ''جیو اور جینے دو'' تھی جب کہ آخری فلم ''کون بنے گا کروڑ پتی'' تھی۔

1993ء میں شمیم آراء کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلم ''ہاتھی میرے ساتھی'' ریلیز ہوئی تو اس کی شاندار کامیابی نے پورے ملک میں جھنڈے گاڑ دیے۔ یہ فلم ساز شمیم خورشید کی فلم تھی۔ مظہر انجم اس کے مصنف اور ارشاد بھٹی کیمرا مین تھے۔ اس فلم کا بہت بڑا حصہ سری لنکا میں فلمایا گیا تھا۔ محسن حسن خان، ریما، جان ریمبو، صاحبہ، زیبا شہناز، اسماعیل تارا، عرفان ہاشمی اور شفقت چیمہ اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کی بہترین ہدایت کاری پر شمیم آراء کو بہترین ہدایت کارہ کا نگار کے علاوہ دوسرے ایوارڈز بھی ملے۔

1994ء میں شمیم آراء کی ہدایات میں مکمل ہونے والی فلمیں ''بیٹا'' اور ''آخری مجرا'' ریلیز ہوئی۔ ''آخری مجرا'' کئی سال تک التوا کا شکار رہنے کے بعد ریلیز ہوئی تھی مگر اس نے نہایت کامیاب بزنس کیا۔ مظہر انجم نے اس فلم کے بے حد اعلیٰ معیار کے مکالمے تحریر کیے تھے جنہیں شائقین فلم نے بہت پسند کیا تھا۔ فلم ''بیٹا'' کے فلم ساز حاجی عبدالرشید تھے اس کی کہانی علی سفیان آفاقی نے لکھی تھی۔ موسیقار واجد ناشاد تھے جب کہ کیمرا مین حسین خان تھے۔

ریما، محسن خان، جان ریمبو، صاحبہ، اسماعیل تارا، زیبا شہناز اور شفقت چیمہ اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔

"آخری مجرا" جو طویل التوا کے بعد ریلیز ہوئی تھی اور جس کی کاسٹ میں نیلی، ریما، جاوید شیخ، شان، بہروز سبزواری، زمرد، صاعقہ، طالش، جمیل بابر، افشاں قریشی، اسد نذیر احمد، ریاض احمد شامل تھے۔ اداکارہ نیلی نے ریما کی والدہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم نے کئی ایوارڈز حاصل کیے تھے۔ جن میں شمیم آراء کو بہترین ہدایت کارہ کا، مظہر انجم کو بہترین کہانی نویس اور مکالمہ نگار کا نیلی کو بہترین اداکارہ اور طالش کو بہترین معاون اداکار کا، بہترین کامیڈین کا ایوارڈ اسماعیل تارا کو، بہترین موسیقار کا ایوارڈ واجد علی ناشاد کو، بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ حمیرا چنا کو اور بہترین آرٹ ڈائریکٹر کا ایوارڈ جمال سیفی کو دیا گیا۔

1995ء میں شمیم آراء کی ایک ریکارڈ ساز فلم "منڈا بگڑا جائے" بطور ہدایت کارہ ریلیز ہوئی۔ اس تاریخ ساز فلم کے فلم ساز حاجی عبدالرشید تھے جب کہ موسیقار ایم اشرف، اس فلم کی کہانی شمیم آراء کے شوہر دبیر الحسن نے تحریر کی تھی۔ فلم کا ٹائٹل رول جان ریمبو نے ادا کیا تھا۔ اس کی ہیروئن صاحبہ تھی۔ جب کہ مرکزی کردار ریما اور بابر علی نے ادا کیے تھے دیگر کاسٹ میں مصطفیٰ بیگ، شکیل صدیقی، زیبا شہناز، اسماعیل تارا، شرجیل انجم اور شفقت چیمہ شامل تھے۔

یہ پاکستان کی سب سے زیادہ بزنس کرنے والی اس دور کی فلم تھی۔ اس وقت تک ایسی کامیابی کسی پاکستانی، ہندوستانی اور انگریزی فلم نے بھی حاصل نہیں کی تھی۔ جس کا ریکارڈ بعد میں سید نور کی فلم "چوڑیاں" نے توڑ دیا تھا۔

اس موقع پر یہ ذکر ضروری ہے کہ شمیم آراء ایک اچھی اداکارہ اور فلم ساز و ہدایت کارہ ہی نہیں تھیں۔ ایک دوربین نگاہ رکھنے والی دانش ور بھی تھیں۔ انہوں نے پاکستانی فلم انڈسٹری کے اس دور میں بھی اپنی سوجھ بوجھ اور دانشمندی کا ثبوت دیا جب سارے فلم والے غلط راستے پر چل رہے تھے۔ چند اردو فلموں کی ناکامی کے بعد قومی زبان میں فلمیں بنانا بند کردی گئیں۔ سارے فلم ساز پنجابی فلمیں بنانے لگے یا بہت تیر مارا تو ڈبل ورژن کی فلم بنادی۔ شمیم آراء ایسے دور میں بھی ثابت قدم رہیں۔ انہوں نے کوئی فلم ڈبل ورژن میں نہیں بنائی۔ جب ہر فلم ساز و ہدایت کار پنجابی فلم بنا رہا تھا، شمیم آراء نے ایک اردو فلم "ہاتھی میرے ساتھی" بنانے کا اعلان کیا تو فلم انڈسٹری میں ان کا مذاق اڑایا گیا۔ ان پر تنقید کی گئی کہ وہ فلم ساز کا سرمایہ برباد کرنے والی ہیں مگر جب "ہاتھی میرے ساتھی" بن کر ریلیز ہوئی تو اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ "منڈا بگڑا جائے" بھی ان کی اسی دور کی فلم ہے جب اردو فلمیں بنانے سے فلم ساز کتراتے تھے۔ شمیم آراء نے ایسے آزمائشی دور میں بے حد اعتماد کے ساتھ یہ فلم بنائی اور ثابت کردیا کہ فلم کی کامیابی یا ناکامی کا سبب اس کی زبان نہیں ہوتی۔ اچھی فلم جس زبان میں بھی بنائی جائے گی کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔

"منڈا بگڑا جائے" کو نہ صرف ملک بھر کے عوام نے زبردست پسندیدگی کی سند عطا کی بلکہ ناقدین اور مبصرین نے بھی اسے ایک دلچسپ عوامی تفریح کی حامل فلم قرار دیا۔ جب کہ شمیم آراء کو "منڈا بگڑا جائے" کی بلاک بسٹر کامیابی پر ایک خصوصی ایوارڈ برائے ہدایت کارہ دیا گیا۔ جب کہ اس فلم کے بہترین مکالمے لکھنے پر دبیر الحسن کو بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔ اسماعیل تارا کو بہترین کامیڈین۔ زیبا شہناز کو بہترین معاون اداکارہ اور اشرف شیرازی کو بہترین ڈانس ڈائریکٹر کے ایوارڈ سے نوازا گیا جب کہ جان ریمبو اور صاحبہ کو بھی خصوصی ایوارڈز دیے گئے۔ اس فلم کے حوالے سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس فلم کی ریکارڈ ساز کامیابی کی خوشی میں اس فلم کے تقسیم کار میاں راشد کی بیگم نے شمیم آراء کو سونے کا تاج بھی پہنایا۔

اعزاز اور ایوارڈ کی بات چلی ہے تو یہ بتا تا چلوں کہ شمیم آراء کو ان کی بہترین کارکردگی کے صلہ میں بہت سے ایوارڈز ملے۔ جن میں صدارتی ایوارڈ کے علاوہ پاکستان کے سب سے بڑے نگار ایوارڈز اور دیگر ایوارڈز ان کی بہترین فنی کارکردگی پر ملتے رہے۔ 1960ء میں فلم "سہیلی" میں انہیں بہترین سپورٹنگ ایکٹریس کا نگار ایوارڈ ملا جس کے بعد 1964ء، 1965ء، 1967ء اور 1968ء میں مسلسل بہترین اداکارہ کے نگار ایوارڈز ان کے حصے میں آئے۔ 1993ء اور 1994ء میں بہترین ڈائریکٹر کے نگار ایوارڈ بھی انہوں نے حاصل کیے جب کہ 1999ء میں انہیں نگار کی جانب سے الیاس رشیدی گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔

شمیم آراء نے اپنی فنی زندگی میں بطور اداکارہ، بطور فلم ساز اور بطور ہدایت کارہ جتنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے جھومر اپنے ماتھے پر سجائے، جتنی عزت، شہرت اور دولت کمائی، اپنی نجی زندگی میں وہ اتنی ہی ناکامیوں اور مایوسیوں

کاشکار رہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہیں اپنی ذاتی زندگی میں خوشیوں کی بجائے، دکھ درد اور مصیبتیں ملیں۔ انہوں نے ایک ناکام زندگی بسر کی۔ ابھی وہ بہت چھوٹی تھیں کہ..... جنم دینے والی ماں کے سائے سے محروم ہوگئیں۔ نانی نے ماں کی کمی پوری کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر ماں کی محبت سے محرومی کا داغ ان کے دل پر ایک زخم کی طرح ہمیشہ تازہ رہا۔ لڑکیاں جب جوان ہوتی ہیں تو شادی کا سندر سپنا دیکھنا شروع کرتی ہیں کہ ایک چاہنے والا شوہر اور اس کا گھر ملے گا جو اس کا اپنا گھر بھی ہوگا۔ اس معاملے میں بھی شمیم آراء کا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اداکارائیں جب شہرت کے آسمان پر چاند بن کر چمکنے لگتی ہیں تو بہت سے صاحب حیثیت لوگ انہیں اپنانے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور کوئی انہیں چاہنے والا مل جاتا ہے مگر بدنصیب شمیم آراء نے کئی شادیاں کیں مگر ان کی کوئی شادی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

ان کی نانی ابتدائی دنوں سے ہی اس بات کی جستجو میں تھیں کہ کوئی قابلِ اعتماد بندہ ملے تو اس کے گھر اس کی ڈولی پہنچا دیں۔ جب مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم ''تنہا'' میں فلم ساز و ہدایت کار بے بی اسلام کی دعوت پر وہ شمیم آراء کو لے کر ڈھاکا گئیں تو انہیں معلوم ہوا اس فلم کا ہیرو ہارون ایک شریف اور متمول فیملی کا چشم و چراغ ہے۔ اس کے والد مشرقی پاکستان میں اسٹیل کنگ کی حیثیت کے کاروباری آدمی ہیں۔ لوہے کے ساز و سامان بنانے والی سب سے بڑی فیکٹری کے مالک ہیں۔ نانی نے سوچا اگر یہ لونڈا میری لونڈیا پر مرمٹے تو شادی کا مرحلہ آسکتا ہے۔ یہ سوچ کر انہوں نے کچھ دنوں کے لیے سائے کی طرح شمیم آراء کی نگرانی ترک کر دی۔ پھر جب فلم کے مصنف اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی نے ان سے کہا۔ ''نانی اماں! ہم کلکتے لے جا کر شمیم آراء کو وہاں کی کچھ بنگالی فلمیں دکھانا چاہتے ہیں تا کہ شمیم آراء اور ہارون ان فلموں جیسی اور نیچرل اداکاری کر سکیں، تو نانی اماں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دل ہی دل میں ضرور مسکرائی ہوں گی کہ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تمہارا ہیرو ہماری ہیروئن سے اتنا قریب ہو جائے کہ اسے اپنی زندگی کی حقیقی ہیروئن بنانے پر آمادہ ہو جائے۔

مگر ان کی اس حسرت میں اس وقت پانی پھر گیا جب فلم کے اختتامی مرحلے پر نانی اماں نے سرور صاحب سے کہا۔ ''میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ آپ لوگ کلکتے سے واپس آ کر کہیں گے کہ ہارون کو شمیم آراء بہت اچھی لگی ہے اور وہ اسے اپنی دلہن بنانا چاہتا ہے۔''

سرور صاحب بولے۔ ''نانی اماں! بڑی مشکلوں سے تو میں نے ہارون کے والد سے اس فلم میں کام کرنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ وہ پشاور کے پٹھان ہیں۔ بڑے سخت آدمی ہیں اگر ہارون نے کوئی ایسی بات کی تو وہ اسے گھر سے نکال دیں گے۔ عاق کر دیں گے۔''

نانی اماں اس کے بعد اور کیا کہتیں۔ اپنی حسرتیں اپنے دل میں لیے واپس کراچی آگئیں مگر ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی بڑے آدمی سے اس کا رشتہ کروا کر اپنی ذمہ داری نبھا دیں۔ علی گڑھ میں جس طرح انہوں نے اپنی بیٹی کو صرف ناچنے گانے تک محدود رکھا تھا۔ اسی طرح کراچی آنے کے بعد اپنی پتلی بائی کو بھی ناچ گانے کی حد تک ہی رکھا تھا۔ ان کے پیشِ نظر یہ باتیں ابتدا ہی سے تھیں کہ اس کی ماں کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی اور وہ فلموں کی اداکارہ نہ بن سکی مگر میں اس کی بیٹی کو فلمی اداکارہ ضرور بناؤں گی اور جب وہ اس میدان میں رہ کر شہرت کے پر پرزے نکالے گی تو کسی بڑے اور دولت مند پرستار سے دو بول پڑھوا کر اس کے حوالے کر دیں گی۔

بڑی مدت کے بعد ان کی شادی کا پہلا مرحلہ آیا۔ یہ سندھ کے ایک بڑے زمیندار سردار رند تھے جنہوں نے محض اپنی ضد کی وجہ سے شمیم آراء سے شادی کی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک اور اداکارہ حسنہ سے شادی کر چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اس سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ شمیم آراء کے ساتھ بھی ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں رہی کیونکہ یہ زور زبردستی کی شادی تھی جس میں شمیم آراء کی مرضی اور محبت شامل نہیں تھی۔ ایک کار ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں سردار رند کا انتقال ہو گیا تو ان سے شادی کا بندھن ٹوٹا اور شمیم آراء کو بیوگی کی صورت میں آزادی نصیب ہوئی۔ سردار رند نے اپنی دولت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے غالباً اقبال بیگم (شمیم آراء کی نانی) کو اس شادی پر رضامند کیا ہوگا۔ شمیم آراء کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا مگر نانی کے اثر میں رہنے کی وجہ سے ان کی حکم عدولی کی اس میں جرأت نہیں تھی اس لیے کچھ دنوں تک سردار رند کی سردارنی کی حیثیت سے انہیں رہنا پڑا۔

کچھ عرصے کے بعد ان کی دوسری شادی مجید کریم سے ہوئی جو ایک معزز شہری اور ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ وہ پاکستان میں اکثر گیورنٹ کمپنی کی فلموں کے تقسیم کار تھے۔ پاکستانی فلموں کے لیے زیادہ تر ان ہی کی فلمیں

استعمال کی جاتی تھیں۔ اس لیے فلم والوں سے ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ شمیم آراء ایک کامیاب اداکارہ کے ساتھ ساتھ ایک ابھرتی ہوئی فلم ساز بھی تھیں۔ قیاس اغلب ہے کہ کاروباری معاملات کے دوران انہیں شمیم آراء نے متاثر کیا ہوگا۔ انہوں نے شمیم آراء کے بزرگوں سے شمیم آراء کا رشتہ مانگا تو انہوں نے مجید کریم کو ایک معزز شخص اور ایک کامیاب کاروباری شخصیت کی حیثیت سے پسند کیا اور شادی پر رضامند ہوگئے۔

مجید کریم اگرچہ شادی شدہ اور بال بچے دار تھے اس کے باوجود جہاندیدہ نانی اور ماموں اور بہن بہنوئی نے یہ جان کر ان کا رشتہ قبول کرلیا کہ مرد کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ دوسری بیوی کے حقوق دیانتداری سے ادا کر سکتا ہے تو ایسے مرد سے شادی کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ شمیم آراء کی قریبی دوستوں اور سہیلیوں کا کہنا ہے کہ اس شادی میں بھی شمیم آراء کی اپنی مرضی شامل نہیں تھی۔ بہرحال یہ شادی ہوئی اور ٹھیک ٹھاک طریقے پر ہوئی مگر مجید کریم کے گھر والے اس شادی پر خوش نہیں تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ شادی شدہ اور بال بچے دار تھے جب کہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے گھر والے ایک فلمی اداکارہ کو بہو کے روپ میں قبول کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ اس کشمکش میں مجید کریم زیادہ دنوں تک اس شادی کی یہ گاڑی نہ چلا سکے اور گھر کے لوگوں کے بے حد دباؤ سے مجبور ہو کر شمیم آراء کو طلاق دینا پڑی۔ اگرچہ اس دوران وہ دونوں ایک بیٹے کے ماں باپ بن چکے تھے۔ طلاق کے بعد مجید کریم کے گھر والوں نے شمیم آراء کے بطن سے پیدا ہونے والے سلمان مجید کو بھی مجید کریم کے گھر رکھنا قبول نہیں کیا لہٰذا شمیم آراء نے اسے آخری دم تک اپنے کلیجے سے لگا کر رکھا۔ یہ وہی سلمان مجید ہے جس نے اپنی ماں سے ٹوٹ کر محبت کی اور اس کے علاج معالجے میں کسی کمی یا کوتاہی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ وہی ڈاکٹر سلمان مجید ہے جس نے سات سال تک لندن کے ایک اسپتال میں مسلسل ماں کا علاج کروایا اور ماں کے انتقال کے بعد لندن میں اپنی رہائش گاہ کے قریب ترین قبرستان میں اس لیے سپرد خاک کیا کہ موت کے بعد بھی وہ اپنی ماں سے زیادہ دور نہ رہے۔

شمیم آراء کی تیسری شادی ڈبلیو زیڈ احمد کے صاحبزادے ہدایت کار فرید احمد سے ہوئی۔ فرید احمد کو شمیم آراء کی ایک فلم ”سہاگ“ ڈائریکٹ کرنے کا موقع ملا جب کہ اپنی ہدایت کاری میں بننے والی فلموں انگارے، خواب اور زندگی اور زیب النساء میں بطور اداکارہ شامل کیا اور ان کے ساتھ کام کیا تو اس کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ طویل عرصہ تک برقرار رہنے والے عشق کا اختتام شادی پر ہوا مگر افسوس صد افسوس کہ یہ شادی چند دنوں بعد ہی بربادی کی صورت میں ختم ہوگئی۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی شمیم آراء جو پریس کانفرنس کررہی ہے اس میں وہ فرید احمد سے طلاق حاصل کرنے کا اعلان کرے گی۔ اس چٹ شادی پٹ طلاق کے بعد لوگوں نے یہی سمجھا کہ ایسی طلاق کی جو وجہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ نے شمیم آراء کو فرید احمد سے طلاق حاصل کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ اگرچہ کچھ فلم والے اس بات پر حیران اور پریشان بھی ہوتے تھے کہ ایسا کیسے ممکن ہوا؟ فرید احمد نے تو پہلے بھی ایک شادی تھیٹر کی مقبول اداکارہ ثمینہ سے کی تھی جو کامیابی کے ساتھ تھوڑے عرصے تک برقرار رہی تھی۔

چند ہفتوں اور مہینوں تک اخبارات و جرائد میں سہاگ رات سے شروع ہو کر سہاگ رات پر ختم ہوجانے والی اس شادی پر دلچسپ خبریں، مضامین اور کالم شائع ہوتے رہے۔ شمیم آراء اس ناکام شادی پر اپنی قسمت کو قصوروار قرار دے کر روتی دھوتی رہیں اور فرید احمد منہ چھپائے پھرتے رہے۔

شادی ایک انسانی ضرورت ہے۔ اس لیے کچھ عرصے کے بعد شمیم آراء کو ایک بار پھر ایک جیون ساتھی کی ضرورت کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اس دوران ان کی ملاقات کراچی کی ایک شخصیت دبیر الحسن سے ہوئی۔ وہ بظاہر انہیں اچھے لگے اور کچھ دنوں کے بعد دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ دبیر الحسن کو کچھ لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ انہوں نے ایک دو فلمی کہانیاں لکھیں جو کامیاب ہوگئیں اور وہ اس ”تکے“ کے بعد فلم رائٹر بن گئے۔ اگرچہ وہ سرے سے رائٹر تھے ہی نہیں۔ دوسری طرف شمیم آراء ایک سادہ لوح اور صلح جو شخصیت کی حامل تھیں۔ ان کی طبیعت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دبیر الحسن ازدواجی زندگی کے ساتھ ساتھ شمیم آراء کی فلمی زندگی میں بھی دخل اندازی کرنے لگے۔ شمیم آراء اپنے اخلاق اور اطوار کی وجہ سے فلم انڈسٹری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ سنا جاتا ہے کہ دبیر الحسن... نے کچھ ایسے کام کیے جس کی وجہ سے شمیم آراء کے دل میں اس کی جو عزت تھی جو احترام تھا ختم کردیا۔

جو لوگ شمیم آراء سے بہت قریب تھے ان کا کہنا ہے کہ دبیر الحسن اگر ان کی زندگی میں نہ آتے یہ شادی نہ ہوئی ہوتی تو شمیم آراء کی زندگی پُرسکون ہوتی ان کے آخری دور میں انہیں متعدد صدموں سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ وہ ذہنی اور قلبی طور پر بیمار نہ ہوتیں۔ پہلی بار جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو انہیں علاج کے لیے لندن جانا پڑا۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ صحت یاب ہو کر واپس لاہور آئیں تو انہیں اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب معلوم ہوا کہ ان کی قدیم رہائش گاہ پر قبضہ گروپ قابض ہے۔ ان کی یہ رہائش گاہ گلبرگ میں چودھری ظہور الٰہی روڈ پر واقع تھی۔ یہ وسیع و عریض کوٹھی فلمی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ جہاں پروڈیوسرز اور اداکاراؤں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کوٹھی میں جب اس کی مالکہ کو داخل ہونے نہیں دیا گیا تو ان کی بے حد عزیز سہیلی بہار بیگم انہیں اپنے گھر لے گئیں اور اپنے ساتھ رکھا۔ شمیم آراء پر دوسرا فالج کا شدید حملہ اس وقت ہوا جب انہیں پتا چلا کہ ان کی رہائش گاہ پر قبضہ نہیں ہوا بلکہ اسے [illegible] ان کی علالت کے دوران جب وہ لندن میں زیرِ علاج تھیں۔ پنجاب کالج کے مالکان کے ہاتھوں خطیر رقم کے عوض فروخت کر دیا ہے۔ شمیم آراء پر فالج کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دوبارہ صحت یاب نہ ہو سکیں۔ چھ سال تک کومے میں رہنے کے بعد وہاں کوچ کر گئیں جہاں انہیں اپنا بن کر کوئی دھوکا نہیں دے گا، فریب نہیں دے گا۔ اس بات میں کتنی سچائی ہے یہ تو لاہور والے ہی بتا سکتے ہیں۔

شمیم آراء ایک اداکارہ، ایک فلمساز اور ایک ہدایت کارہ ہی نہیں تھیں فلمی صنعت کے ایک سنہرے دور کی علامت تھیں۔ ایک روشن دور ان کی ذات سے وابستہ تھا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کا کام ان کی سوچ اور فنی صلاحیتوں کی باتیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔

وہ صبیحہ خانم، نیر سلطانہ اور زیبا بیگم کی طرح نگاہوں کو خیرہ کرنے والے حسن کا پیکر نہیں تھیں۔ ایک سانولی سلونی رنگت کی دبلی پتلی خاتون تھیں مگر رب العزت نے ان کو بے پناہ فنی خوب صورتیوں کی مالک بنایا تھا۔ ایک عام شکل و صورت کی ہونے کے باوجود ان کو پاکستانی فلمی صنعت کی بہت بڑی بڑی فلموں کی اداکارہ، فلمساز اور ہدایت کارہ بننے کا اعزاز حاصل تھا۔ ان کی سوچ، سمجھ اور وژن، ان کا اخلاق، طور طریقہ، رواداری، حسن سلوک اور ٹھنڈے دل و

دماغ نے انہیں ایک ممتاز فلمی شخصیت کا مالک بنا رکھا تھا۔

صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، بہار بیگم اور نغمہ کی طرح انہوں نے ڈھلتی عمر کے بعد کیریکٹر اداکاری نہیں کی۔ وہ فن اداکاری کا ایک سمندر تھیں۔ چاہتیں تو بہت دنوں تک کیریکٹر رول ادا کرسکتی تھیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ 1970ء کی دہائی کے اوائل میں انہوں نے لیڈنگ ایکٹریس کے طور پر ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس موقع پر بظاہر ان کا کیریئر ختم ہوگیا لیکن پاکستانی فلمی صنعت سے انہوں نے اپنا رشتہ ختم نہیں کیا۔ فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے اپنی کارکردگی کا سلسلہ جاری رکھا اور دونوں طریقے پر اچھی اور کامیاب فلمیں بنا کر فلم انڈسٹری کو استحکام بخشا۔

ایک طرف تو ایک فنکارہ کے طور پر انہیں ہر میدان میں کامیابی و کامرانی ملی۔ دوسری طرف اپنی نجی زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکر۔ برصغیر میں عام طور پر اداکار اور اداکاراؤں میں ایک رجحان یہ رہا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے عروج کے دور میں شادی کرلی تو ان کی عوامی مقبولیت ختم ہو جائے گی۔ کچھ دنوں تک شمیم آراء نے بھی اس خیال سے شادی نہیں کی اور ان کی عمر بڑھتی رہی۔ جب ان سے شادی کے بارے میں صحافی سوال کرتے تو وہ کہتیں۔ شادی ضرور کروں گی اور جب بھی کروں گی آپ کو ضرور دعوت دوں گی۔" ایک بار انہوں نے کہا۔ "جو کشمیر میں پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا، میں اس سے شادی کروں گی۔"

نہ کسی نے کشمیر میں پاکستانی جھنڈا لہرایا نہ ان کی شادی کا مرحلہ آیا مگر فلم انڈسٹری کے اندر اور فلم انڈسٹری کے باہر بہت سے لوگ ان سے شادی کرنے کا خواب دیکھتے رہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ دلچسپ بات معلوم ہے کہ شمیم آراء سے شادی کے خواہش مند علی سفیان آفاقی بھی تھے۔ جب شمیم آراء، الیاس رشیدی کی سفارش پر انور کمال پاشا کی فلم "انارکلی" میں کام کرنے کے لیے لاہور گئی تھیں تو رشیدی صاحب نے آفاقی صاحب کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ شمیم آراء کو ایئرپورٹ سے ہوٹل تک پہنچائیں اور جب تک وہ لاہور میں رہیں، شمیم آراء کا خیال رکھیں۔ آفاقی صاحب، الیاس صاحب کے خاص آدمی تھے۔ نگار کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس لیے شمیم آراء اور ان کی نانی اس حوالے سے ان کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ جب انہوں نے لاہور میں مستقل رہائش اختیار کرلی تو آفاقی صاحب ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ آفاقی صاحب نے ابتدائی دور میں شمیم آراء کو کئی فلمیں دلوانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ پھر جب انہوں نے فلم سازی شروع کی تو آفاقی صاحب سے اسکرپٹ بھی لکھوائے۔

آفاقی صاحب اچھے صحافی اور اچھے فلم رائٹر اور ڈائریکٹر کے ساتھ ساتھ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک بھی تھے۔ لطیفے سنانے، چھیڑ چھاڑ کرنے اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو تنگ کرنے کے معاملے میں مشہور تھے۔ ان کی اس چلبلی طبیعت سے شمیم آراء بھی محظوظ ہوتی تھیں۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ آفاقی صاحب اس دوستی کو کچھ اور بھی سمجھنے لگے تھے اور سوچنے لگے تھے اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں تو شاید یہ کہہ دیں "مجھے تم سے محبت ہے"۔ مگر یہ حسرت ہمیشہ ان کے دل میں رہی۔ ان میں خود اتنی ہمت نہیں تھی کہ اظہار محبت کرتے۔ بس انتظار کرتے رہے کہ شاید کبھی انہیں میرا بھی خیال آجائے۔ بعض لوگ ان کے بارے میں اسکینڈل بھی بناتے رہے مگر شمیم آراء نے ایسی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ دوسری طرف وہ شادی پر شادی کرتی رہیں۔ کسی بھی شادی میں ناکامی کے بعد بھی جب شمیم آراء کو آفاقی صاحب کا خیال نہیں آیا تو وہ شمیم آراء کی طرف سے مایوس ہوگئے اور بالآخر طویل انتظار کے بعد شادی کرلی۔

شمیم آراء کو چپکے چپکے چاہنے والوں میں ہدایت کار فرید احمد بھی تھے جو بہت دنوں کی تپسیا کے بعد آخرکار شادی کے بندھن میں شمیم آراء کو باندھنے میں کامیاب ہوگئے مگر جانے کیوں اگلے ہی مرحلے میں اسے اپنا بنائے رکھنے کے معاملے میں ناکام ہوگئے۔ آدمی جب کسی مقصد کے لیے کوئی چیز حاصل کرتا ہے جب وہی مقصد حاصل نہ ہو تو اس کے لیے بے کار ہو جاتا ہے۔ شمیم آراء نے بھی فرید احمد کو ناکارہ شے سمجھ کر اس بندھن کو کھول دیا جو دو بول پڑھوا کر باندھا گیا تھا۔

شمیم آراء کو چاہنے والوں میں ہیرو سید کمال بھی تھے۔ وہ پہلے چاہنے والے تھے جنہیں شمیم آراء بھی چاہنے لگی تھیں۔ ان کی جتنی بھی شادیاں ہوئیں ان میں ان کی محبت شامل نہیں تھی۔ دوسروں کی مرضی یا اپنی خودغرضی ہوتی تھی۔ کمال سے مل کر ان کا دل پہلی بار دھڑکا تھا۔ ایسا ان کی تمام شادیوں سے پہلے ہوا تھا۔ اس وقت کمال کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کمال نے اپنی اس چاہت کا اعتراف اپنی خود نوشت "داستان کمال" میں کیا ہے۔

اس محبت کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا اقتباس پیش خدمت ہے۔

کراچی کی ایک نوخیز اداکارہ شمیم آراء جو کراچی سے لاہور آ کر سمن آباد میں آباد ہوگئی تھی۔ اس وقت وہ انار کلی، راز اور سہیلی میں کام کر رہی تھیں۔ ہماری ان سے اس وقت تک کوئی خاص سلام دعا نہیں تھی۔ وہ رتن کمار کے بھائی وزیر علی کی فلم ''واہ رے زمانے'' میں کام کرنے کے لیے کراچی گئی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں فلم ''سویرا'' کے فلم ساز ممنون حسن خان نے ہمیں بھی اس فلم کی شوٹنگ کے لیے کراچی بلوایا۔ فلم کے ہدایت کار رفیق رضوی اس وقت ''واہ رے زمانے'' کی شوٹنگ کر رہے تھے۔ ممنون حسن خان ہمیں اس فلم کے سیٹ پر لے گئے۔ شمیم آراء اور اعجاز ریہرسل کر رہے تھے۔ ہمارا شمیم آراء اور ہدایت کار رفیق رضوی سے تعارف کرایا گیا۔ جس کے بعد ہم شوٹنگ دیکھنے بیٹھ گئے۔

ہم نے وہاں زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ لہٰذا رفیق رضوی سے اجازت مانگی۔ وہ بولے۔ ''رات کو آپ کا جوڑ شمیم آراء کے ساتھ ڈال رہا ہوں۔'' ہم اس فقرے کو نہ سمجھ سکے مگر رات کو جب ''سویرا'' کی شوٹنگ کا آغاز ہوا تو ہم اس جملے کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے۔

''سویرا'' کی شوٹنگ کے لیے باپو (رفیق رضوی کی عرفیت) نے اس قسم کا منظر چنا کہ کسی غلط فہمی کے رفع ہو جانے کے بعد ہم شمیم آراء کے گھر آتے ہیں۔ وہ بھاگ کر روتی ہوئی ہمارے گلے لگ جاتی ہے اور ہم دونوں فرطِ محبت سے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ باپو نے اس منظر کی فلم بندی کوئی آٹھ دس بار مختلف زاویوں سے کرانے کے بعد شوٹنگ پیک اپ کرادی۔ ہم نے تعجب سے پوچھا کہ اتنی جلدی شوٹنگ کیوں ختم کردی؟ بولے کہ آج تو آپ لوگوں کا اچھی طرح تعارف کرایا تھا اور واقعی اس عرصہ میں ہمارے اور شمیم آراء کے درمیان خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ ہمیں وہ اچھی بھی لگی تھی اور خوش مزاج بھی۔ حالانکہ یہ وہی شمیم آراء تھی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ قبل ہم نے اقبال یوسف کی فلم ''رات کے راہی'' میں کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔

''سویرا'' کی شوٹنگ کے دوران ہماری اور شمیم آراء کی خوب اچھی طرح نبھی۔ کھانے کے وقفے کے دوران شمیم آراء کے دولہا بھائی دہلی کالی ہوٹل سے مزے دار کھانے لے کر آتے اور ہم مل کر کھاتے۔ صدر کے ایک درمیانہ ہوٹل میں ہم لوگ

> **سیکا (Cika)**
>
> علاقائی تنظیم، جس کا پورا نام (Conference on Interaction and Confidence building measures in Asia) ہے۔ اس کا قیام اکتوبر 1992ء میں قازقستان کے صدر نور سلطان نذر بانیوف کی تجویز پر عمل میں آیا۔ اس کا مقصد رکن ممالک کے مابین پائے جانے والے تنازعات کو باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا ہے۔
>
> مرسلہ: ضمیر الحسن، خانیوال

ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں محمد رفیع کا ایک گانا ''یوں تو ہم نے لاکھ حسیں دیکھے ہیں۔ تم سا نہیں دیکھا'' بہت مقبول تھا۔ ہم ہوٹل کی بالکونی سے یہ گانا زور زور سے گاتے تھے اور شمیم آراء بہت محظوظ ہوا کرتی تھیں۔

شمیم آراء یوں تو دیکھنے میں ایک معمولی سا نولی سلونی لڑکی تھی مگر بات چیت میں ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

''زمانہ کیا کہے گا'' کی شوٹنگ کے دوران سوات کے ایک ہوٹل میں ہم لوگوں کا قیام کوئی 20 دن رہا مگر یہ دن بڑی تیزی سے گزر گئے۔ ہمارا شمیم آراء سے اچھا خاصا میل جول بڑھ گیا تھا۔ ہماری شرارتوں میں وہ خاصی دلچسپی لیتی تھی اور خود بھی شرارت کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔ شمیم آراء کی نانی اماں سائے کی طرح ساتھ رہتی تھیں۔ ہم اور اقبال یوسف جب ان سے کہتے کہ آپ ہوٹل میں آرام کریں تو وہ ہمیں ڈانٹ دیا کرتی تھیں۔ رات کو جب ہم لوگ شمیم آراء کے کمرے میں تاش کھیلنے کے لیے بیٹھ جاتے تو وہ بے دھڑک کہہ دیا کرتی تھیں۔ ''بھئی! اب تم لوگ جاؤ۔ شمیم آراء کو آرام کرنا ہے۔'' دراصل نیند تو خود انہیں آرہی ہوتی تھی۔ شمیم آراء خود بھی نانی کے اس کنٹرول سے پریشان تھی مگر چونکہ وہ ان سے بہت ڈرتی تھی اس لیے ان کے حکم کی اسے تعمیل کرنی پڑتی تھی۔

سوات میں شوٹنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ایک دن نانی اماں اقبال یوسف سے بولیں۔ ''بھئی اقبال! تم اپنا کام ختم کرلو تو میں کل ہی چلی جاؤں گی۔'' میں برجستہ بولا۔ ''اچھا آپ چلی جائیں ہم شمیم آراء کو لے کر آجائیں گے۔''

سب لوگ ہنس پڑے۔ نانی اماں کو غصہ آ گیا۔ بولیں۔ ''چپ چھچھورے! میں کوئی تیری عمر کی ہوں؟''

یہ فقرہ اتنا مشہور ہوا کہ ہم نے پھر اسے فلم ''دال میں کالا'' میں استعمال کیا۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے شمیم آراء کو بلا جھجک شادی کے لیے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ غالباً ہمارے منہ سے وہ یہ بات سننے کے لیے کافی دنوں سے انتظار کر رہی تھی، شرما کر بولی۔

''نانی اماں جی سے بات کرو۔''

ہم اس کا مطلب سمجھ گئے کہ قدامت پسند ذہن اور متضاد قوتوں کی جنگ میں خود ہی پھنس کر رہ گئے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں ہمارے متعلق سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ایک اخبار میں یہ سرخی لگی کہ ''کمال اور شمیم آراء نے شادی کر لی ہے'' اگلے روز ہمیں اس شادی کی خبر کی تردید کرنی پڑی۔ کیونکہ ایک طرف ہمارے گھر والے تو دوسری طرف شمیم آراء کی نانی ہم سے ناراض ہو گئیں۔ انہوں نے ہم سے دو ٹوک کہہ دیا کہ ''شمیم آراء سے شادی کرنی ہے تو پہلے ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کرو۔'' نانی اماں کی یہ بات ہمیں ناگوار لگی کیونکہ ہم شادی کے مقدس رشتے کو کاروباری ترازو میں تولنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس جملے کی ادائیگی کے بعد ہمارے اور شمیم آراء کے تعلقات ختم ہو گئے۔''

شمیم آراء اپنے وقت کی بہت بڑی فنکارہ تھی۔ اس نے اداکاری، فلم سازی اور ہدایت کاری کے میدانوں میں اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے مگر اسے اپنی نجی زندگی میں وہ خوشیاں نہیں ملیں جو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ صبیحہ خانم، نیر سلطانہ اور زیبا بیگم نے اپنی ازدواجی زندگی جس طرح خوش و خرم انداز میں گزاری تھی اس انداز کی زندگی گزارنے کا شمیم آراء کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ شاید اس کی وجہ اس کی نانی کا وہ کاروباری ذہن تھا وہ جس پیشے اور جس ماحول کی پروردہ تھیں وہاں انسانی جذبات و احساسات سے زیادہ پیسے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ سردار رند اور مجید کریم سے اس کا رشتہ غالباً اسی کاروباری اصول کے تحت کرایا گیا تھا۔ فرید احمد اور دبیر الحسن کا انتخاب شاید شمیم آراء کا اپنا تھا مگر وائے بدنصیبی کہ ان دونوں سے بھی انہیں وہ خوشیاں نہیں مل سکیں جس کی ان سے توقع تھی۔ علی سفیان آفاقی سے بھی اگر ان کی شادی ہو جاتی تو وہ ان کے گھر خوش رہتیں مگر نانی اماں کے لیے ان میں کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ محض ایک صحافی تھے۔ بڑی جدوجہد کے بعد فلم رائٹر بنے اور بہت بعد میں فلم ڈائریکٹر۔ ان کا تعلق اگر الیاس رشیدی سے نہ ہوتا تو شاید نانی اماں انہیں اتنی اہمیت بھی نہ دیتیں۔

آفاقی صاحب پڑھے لکھے باشعور اور بڑے ظرف کے آدمی تھے اس لیے ان کے جذبات اور احساسات کی قدر نہ کیے جانے کے باوجود شمیم آراء اور ان کی نانی اماں سے تعلقات بحال رہے اور اپنی طرف سے جہاں تک ممکن ہوا وہ ان کے کام آئے۔

آفاقی صاحب نے شمیم آراء سے مایوس ہو کر شادی کر لی۔ اس کے بعد بھی شمیم آراء اور آفاقی صاحب کے درمیان دوستانہ مراسم قائم رہے۔ آخر دم تک وہ شمیم آراء کو استادانہ ''گر'' بتاتے رہے مگر گلہ بھی کرتے کہ شمیم آراء ان کی باتیں سنتی تو بغور ہے مگر کرتی اپنے من کی ہے جس کے سبب اسے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑا۔ شادیوں سے لے کر گھروں کی تبدیلی اور خرید و فروخت کے معاملے میں انہوں نے ہمیشہ نقصان اٹھایا۔ بہرحال آفاقی صاحب سے شمیم آراء کے قریبی اور دوستانہ مراسم رہے۔ وہ انہیں قریب سے جانتے بھی تھے اس لیے ان کی زندگی پر بھرپور تبصرہ بھی کرتے تھے۔

آفاقی صاحب سے اس قدر قربت اور دوستی کے باوجود شمیم آراء نے انہیں اپنا جیون ساتھی نہیں بنایا، اس کی کیا وجہ تھی اس کے بارے میں انہوں نے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ آفاقی صاحب نے بھی اشارتاً کنایتاً بھی کبھی کچھ نہیں کہا۔ شاید ان کی کوئی مجبوری رہی ہو مگر فطرتاً وہ نیک دل اور اچھی انسان تھیں۔ جن لوگوں نے ان پر کسی طرح بھی کوئی احسان کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس سلسلے میں الیاس رشیدی اور ان کے حوالے سے علی سفیان آفاقی نے ان کے ابتدائی دنوں میں جو مدد اور معاونت کی تھی آخری دم تک اسے یاد رکھا، نانی کی زندگی میں اور نانی کے بعد بھی وہ الیاس رشیدی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ انہیں اپنا گاڈ فادر تصور کرتی تھیں۔ وہ جب بھی لاہور آتے ان کے اعزاز میں عصرانے یا عشائیے کا اہتمام ضرور کرتیں۔ اپنی گلبرگ والی وسیع و عریض کوٹھی میں انہیں دعوت ضرور دیتیں۔ اس دوران ان سے مختلف قسم کے مشورے اور ہدایات حاصل کرتیں۔ اپنی فلموں کے کاروباری معاملات میں بھی ان سے مشاورت کرتیں۔ فلموں کی کاسٹنگ پر بھی ان کی رائے معلوم کرتیں۔ الیاس صاحب بھی اس کی محبت کے جواب کے طور پر ان کی صحیح رہنمائی کرتے۔ الیاس رشیدی

کے انتقال کی خبر جب شمیم آراء کو ملی تو وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں جیسے ان کے سر سے ان کے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو۔ وہ کراچی گئیں اور ان کے لواحقین سے.... تعزیت کی۔

اسی طرح جب پوکملانی کے بارے میں انہیں اطلاع ملی تھی کہ وہ اسپتال میں زیرِ علاج ہیں اور حلق کے کینسر میں مبتلا ہیں تو انہوں نے خصوصی طور پر کراچی آکر پوکملانی سے ملاقات کی اور ان کے بچوں سے کہا کہ اگر ان کے علاج میں کوئی دشواری ہو تو بلا جھجک بتاؤ۔ مگر انہوں نے کہا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔

پوکملانی اپنے دور کے سینئر صحافیوں میں تھے۔ ڈان گجراتی کے فلم میگزین کے انچارج تھے اور بڑے دبنگ جرنلسٹ تھے۔ ان کے ہمعصر صحافیوں میں اے آر سلوٹ، اے کے شاد، صفدر برلاس، اسد جعفری، اقبال احمد خان اور اے آر ممتاز وغیرہ تھے۔

1970ء کی ابتدائی دہائیوں میں جب میں نگار میں نائب ایڈیٹر تھا تو ان دنوں پوکملانی کراچی کی فلمی سرگرمیاں لکھا کرتے تھے۔ وہ اردو پڑھ تو لیتے تھے مگر لکھ نہیں سکتے تھے۔ اپنی اسکول میں پڑھنے والی ایک بیٹی سے رپورٹ لکھوا کر لاتے تھے جو زبان و بیان کے لحاظ سے بہت کمزور ہوتے تھے۔ لہٰذا میں انہیں اپنے طور پر ری رائٹ کر کے چھاپتا تھا۔ میری اس بات پر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور اکثر مجھے پان پیش کرتے تھے۔ جو میں معذرت کے ساتھ قبول نہیں کرتا تھا۔

”کملانی صاحب! آپ جانتے ہیں میں پان نہیں کھاتا۔“

”یار! تم کیسے صحافی ہو نہ سگریٹ پیتے ہو نہ پان کھاتے ہو۔“

وہ مسکرا کر شکایت کرتے۔ ان کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت کلے میں پان دبا ہوتا تھا۔ وہ تمباکو بھی استعمال کرتے تھے اور اسی تمباکو والے پان نے انہیں حلق کے کینسر میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ اپنی بہت پرانی باتیں اکثر مجھ کو بتایا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بتایا۔

”شمیم آراء کو فلم انڈسٹری سے متعارف کرانے میں میرا بھی بہت بڑا کردار ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ شمیم آراء کی نانی نے شروع میں مجھے ہی پکڑا تھا۔ کہنے لگیں۔ ”کملانی صاحب! میری نواسی کو بھی فلموں میں کام دلاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اپنی نواسی کی کچھ تصویریں مجھے دو۔ میں انہیں فلم والوں کو دکھاؤں گا۔ اپنے طور پر تو میں کوشش کروں گا ہی مگر آپ الیاس رشیدی سے بھی ملیں۔ وہ اگر کسی کے سر پر ہاتھ رکھ دیں تو اس کا بیڑہ پار ہو جاتا ہے۔“

میں نے اپنے طور پر بھی شمیم آراء کی تصویر الیاس بھائی کو دکھائی اور کہا اس لڑکی کو کسی فلم میں چانس دلاؤ۔

پھر اس کی نانی بھی نگار کے دفتر پہنچ کر اپنے طور پر کوشش کرنے لگیں۔ ابھی شمیم آراء اداکارہ نہیں بنی تھی اس کے باوجود میں اس کی تصویر اخباروں میں چھپوانے لگا تھا۔ شمیم آراء جو اس وقت پتلی بائی تھی وہ اور اس کی نانی میرے

اس تعاون کا بہت شکریہ ادا کرتی تھیں۔
پو کملانی کی یہ باتیں مجھے یاد تھیں۔ اس لیے مجھے دوسروں کی طرح حیرت نہیں ہوئی تھی جب وہ اس کے آخری ایام میں خصوصی طور پر لاہور سے کراچی آئی تھیں اور ایئرپورٹ سے سیدھی اسپتال جا کر اپنے محسن سے ملی تھیں۔ اس کی تیمارداری کی تھی۔ آج کے دور میں جب بہت سے لوگ اپنے ماں باپ کے احسانوں کو بھی یاد نہیں رکھتے۔ اپنے وقت کی اتنی بڑی فنکارہ کا یہ کردار، اس کی عظمت اور بڑائی میں چار چاند لگانے کے برابر ہے۔ اس کا یہ اعلیٰ انسانی رویہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اللہ شمیم آراء کو غریق رحمت کرے۔ بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ مگر ایسے نابغۂ روزگار شخصیت کی زمانے نے قدر نہیں کی۔ افسوس، صد افسوس۔

آفاقی صاحب سے انہوں نے شادی نہیں کی لیکن ان کی عزت اور احترام میں کبھی کمی آنے نہیں دی۔ ان دنوں کی بات ہے، جب وہ فالج کے پہلے حملے کا علاج کروا کر واپس آ گئی تھیں اور ان کی کوٹھی میں قبضہ مافیا کا قبضہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی سہیلی بہار بیگم کے گھر رہ رہی تھیں۔ آفاقی صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ان کی تیمارداری کرنے گئے۔ ان دنوں ڈاکٹر نے انہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت ان پر غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر آفاقی صاب کو دیکھا تو خوش ہو گئیں۔ آفاقی صاحب بولے۔ ”شمیم! یہ میرے ساتھ کون ہے؟“

شمیم آراء نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بیگم لگتی ہے۔ میں پہچان رہی ہوں۔“

”شمیم! تمہاری یادداشت بہتر ہو رہی ہے۔ تم زیادہ تر آرام کرو، اپنے فضول مشاغل ترک کر دو، راتوں کو دیر تک جاگنا صحت پر اثر انداز ہوتا ہے۔“

ان دنوں شمیم آراء راتوں کو دیر تک جاگتیں اور تاش کھیلا کرتی تھیں۔ ان کی سہیلیاں نشو، بہار بیگم، عشرت چوہدری اور بعض اہم فلمی اور غیر فلمی شخصیت ان کے اس مشغلے میں حصہ لینے آتے تھے۔ یہ محافل اکثر رات رات بھر جاری رہتی تھیں۔

شمیم آراء نے آفاقی کے مشورے پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کروں اب کرنے کو تو کچھ ہے نہیں، وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ بس تاش کی بازی کے بہانے سہیلیوں کے ساتھ تھوڑا شغل میلہ کر لیتی ہوں۔“

آفاقی صاحب ایک اچھے دوست کی طرح اس برے وقت میں بھی شمیم آراء کی رہنمائی کرتے رہے۔ شمیم آراء نے فالج کے دوسرے حملے سے پہلے تک ان کی عزت اور ان کے احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

عجیب اتفاق ہے کہ شمیم آراء کا انتقال پرملال اسی مہینے ہوا جس مہینے میں ان کے محسن اعظم الیاس رشیدی فوت ہوئے تھے۔ یعنی ماہ اگست، الیاس رشیدی 7 اگست کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تھے جب کہ شمیم آراء کی تاریخ وفات 5 اگست ہے۔

گلوکار رجب علی نے کہا۔ ”شمیم آراء نہایت باصلاحیت اداکارہ اور ہدایت کارہ تھیں۔ وہ ایک سلجھی ہوئی اور پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے فلم انڈسٹری پر راج کیا۔ وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔“

ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سلمان مجید نے اپنی والدہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ عظیم اور پیار کرنے والی ماں تھیں۔ جو بھی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ وہ ہر کسی سے بڑے خلوص اور پیار سے ملتی تھیں۔“

انہوں نے اس موقع پر تمام لوگوں سے اپنی والدہ کی مغفرت کی اپیل کی۔ (ہم نے تو اپنے بڑوں سے سنا ہے جو بندہ جتنے دنوں تک بستر علالت میں ہوتا ہے اس کے اتنے ہی گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ شمیم آراء تو سات سال تک بیمار رہیں۔ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔ اس لیے ان کے تو سارے گناہ دھل گئے ہوں گے)۔

پروڈیوسر انوار الحق اس موقع پر میڈیا سے خفا دکھائی دیے۔ انہوں نے تدفین کے موقع پر پاکستانی میڈیا کی عدم موجودگی پر افسوس کا اظہار کیا۔

تعزیتی پیغامات کا سلسلہ تو اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جس روز افسوسناک خبر شائع اور نشر ہوئی تھی۔

صدر پاکستان ممنون حسین نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ”فن کے حوالے سے شمیم آراء کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔“

وزیراعظم نواز شریف نے کہا۔ ”پاکستان ایک عظیم فنی اثاثے سے محروم ہو گیا ہے۔ فلمی صنعت کے فروغ کے لیے شمیم آراء کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔“

وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات پرویز رشید نے کہا۔ ”شمیم آراء صرف ایک عظیم فنکارہ ہی نہیں تھیں بلکہ نئے آرٹسٹوں کے لیے مشعل راہ بھی تھیں۔“

وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے کہا۔ ”شمیم آراء ایک ورلڈ کلاس فنکارہ تھیں۔ ان کے انتقال سے فن اداکاری کا ایک خوب صورت باب بند ہوگیا۔

شمیم آراء کے انتقال پُرملال پر جن معروف فنکاروں نے فوری طور پر تعزیتی پیغام دیا ان میں سید نور، غلام محی الدین، مصطفیٰ قریشی، صائمہ، بشریٰ انصاری، معمر رانا، بہار بیگم، ریشم، شاہدہ منی، میرا، ریمبو، صاحبہ، پرویز کلیم، فیصل بخاری اور اعجاز کامران کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے تعزیتی پیغامات کا لب لباب یہ تھا کہ شمیم آراء پاکستان فلم انڈسٹری کی پہچان تھیں۔ ان کی گراں قدر خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

اخباروں نے ایڈیٹوریل نوٹ بھی لکھے جب کہ تمام ٹی وی چینل نے تعزیتی خبریں خصوصی طور پر نشر کیں۔ مشہور کالم نگاروں نے شمیم آراء کے سانحۂ ارتحال پر کالم بھی لکھے۔ معروف نگار حسن نثار نے اپنے کالم ”چوراہا“ کے زیرِ عنوان شمیم آراء کی وفات پر ”کئی چاند تھے سرِ آسماں“ جو کالم لکھا اس کے کچھ اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

”وزیراعظم سے متعلق کالم ایک تہائی لکھ چکا تھا کہ ٹی وی اسکرین پر نظر پڑی۔ ”طویل علالت اور کومے کے بعد پاکستان کی مایہ ناز فنکارہ شمیم آراء لندن میں انتقال کرگئیں۔“

میں نے قلم رکھ دیا اور کچھ دیر گم صم خالی پن کی سی کیفیت میں بیٹھا بیک وقت اتنا کچھ سوچتا رہا جسے کاغذ پر منتقل کرنا ممکن ہی نہیں۔“

”شمیم آراء کے ساتھ تعارف ”انارکلی“ سے ہوا۔ جس کا ہر گیت لازوال ہے۔ شہزادہ سلیم کا رول سدھیر صاحب اور انارکلی کا نور جہاں نے نبھایا۔ شمیم آراء نے انارکلی کی بہن کا ثانوی سا کردار کیا تھا مگر اسے بھی یادگار بنا دیا۔ پھر بتدریج وہ برسات کی طرح فلم انڈسٹری پر چھا گئی حالانکہ اس میں بظاہر ہیروئنز والی کوئی بات نہ تھی۔ گلیمر اس کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا لیکن پرفارمر ایسی پرفیکٹ کہ پرفیکشن بھی دیکھ لے تو ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوجائے۔ حیرت انگیز بات تھی کہ ہر قسم کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ۔“

”عام تاثر یہ ہے کہ پاک و ہند کی سنیما کی تاریخ میں مینا کماری کا کوئی مقابلہ نہیں۔ بے شک مینا بہت شاندار پرفارمر تھی لیکن بغیر کسی تعصب کے میری بے حد محتاط رائے ہے کہ شمیم آراء اگر مینا کماری سے برتر نہیں تو بطور آرٹسٹ کم تر بھی ہرگز نہیں۔ جس کردار کو بھی اس نے کیا اسے امر کردیا۔“

”بطور ہدایت کارہ بھی شمیم آراء کی کنٹری بیوشن ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بہت ہی نفیس اور نستعلیق قسم کی خاتون تھی۔“

نامور شاعر، ڈراما نگار اور کالم نگار امجد اسلام امجد نے اپنے کالم ”چشم تماشا“ میں شمیم آراء کے انتقال پر جو کالم لکھا اس کا عنوان ہے۔ ”شمیم بھی چلی گئیں۔“

ان کے اس کالم سے چند اقتباس۔

”شمیم آراء مرحومہ کے ساتھ چند برس قبل ایک ٹی وی کی تقریب پذیرائی میں ملاقات کے دوران میرے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ وہ اس وقت بھی بیمار تھیں اور انہیں بمشکل سہارا دے کر اسٹیج پر لایا گیا تھا جہاں سینئر ہدایت کار اور بہت خوب صورت انسان ایس سلیمان کی بھی پذیرائی کی جارہی تھی۔ دونوں کے لیے چلنا اور بولنا مشکل ہورہا تھا۔ لیکن شمیم آراء کی صورتِ حال اس لیے مختلف تھی کہ ان کے چہرے کے ساتھ گزشتہ صدی کی چھٹی ساتویں اور کسی حد تک آٹھویں دہائی کے اکثر و بیشتر فلم بینوں کے وہ رومانوی جذبات بھی وابستہ تھے جو رسالوں سے ان کی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنی کتابوں اور تکیوں کے نیچے چھپایا اور دوستوں کو دکھایا کرتے تھے۔“

”ان کی پہلی فلم غالباً ”کنواری بیوہ“ تھی لیکن انہیں ملک گیر شہرت ایس ایم یوسف کی فلم ”سہیلی“ سے ملی جس میں ان کی سہیلی مرحومہ نیر سلطانہ تھیں۔“

”شمیم آراء کے حسن میں اس طرح کا گلیمر اور کشش تو نسبتاً کم تھے جو ان کے ہم عصر یا قدرے کچھ سینئر ہیروئنز مثلاً صبیحہ خانم، مسرت نذیر اور زیبا خانم کو حاصل تھے مگر مقبولیت کے حوالے سے وہ کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ بالخصوص گھریلو اور رومانٹک ٹائپ فلموں میں انہیں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک خاص طرح کی گہرائی اور دل کو چھو لینے والی کیفیت تھی جس کی وجہ سے ان کے مکالموں کی ادائیگی کانوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔ ان کی آواز کی یہ خصوصیت متذکرہ تقریب میں بھی قائم تھی۔“

”شمیم آراء کا دور وہ تھا جب ہیروئنز پورے کپڑے پہنا کرتی تھیں اور ان کی ڈانس کی موومنٹس بھی بہت محدود اور متوازن ہوا کرتی تھیں۔ اسکرپٹ عام طور پر زندگی کے حقیقی مسائل پر مبنی ہوتے تھے جن میں ہیروئن کے گلیمر سے زیادہ عورت کی مظلومیت کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ شمیم آراء کا

زیادہ کمال بھی ہلکے پھلکے رومانوی سپنوں اور عورت کی مظلومیت کی عکاسی والی چویشنز میں ہوا۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے بیشتر سپرہٹ اور ہمیشہ یاد رہ جانے والے گیت بھی ان ہی پر فلم بند ہوئے۔ جن میں ایک فیض صاحب کی مشہور نظم ”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“ بھی ہے۔

شمیم آراء کی وفات سے ایک بار پھر اس سوال نے کروٹ لی ہے کہ ہمارا معاشرہ بحیثیت مجموعی اس قدر احسان فراموش، ناقدر شناس اور بے حس کیوں ہے کہ ہم اپنے ان ہنر مند لوگوں کی بھی ٹھیک سے دیکھ بھال اور حفاظت نہیں کر پاتے جنہوں نے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار سے ہمیں امیر اور دنیا میں منہ دکھانے کے قابل بنایا ہے۔

شمیم آراء کی شخصیت اور فنی کارکردگی پر کالمز اور مضامین کے لکھنے اور شائع ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو کو تحریروں میں اجاگر کیا جارہا ہے اداکاری سے فلم سازی اور ہدایت کاری تک ان کی فنی سوجھ بوجھ اور خداداد صلاحیتوں کے ہر گوشے کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہے گا۔ اچھا کام ہمیشہ نیک نام ہوتا ہے۔ سیانوں نے جو کہا ہے ”جو بوؤ گے وہی کاٹو گے“ تو غلط نہیں کہا ہے۔ شمیم آراء نے لو پروفائل گھرانے میں جنم لیا تھا لیکن اپنی محنت، جدوجہد اور خوب سے خوب تر کام کرنے کی لگن نے ان کا ہر قدم کامیابی کی منزل کی طرف بڑھایا۔ پہلے اپنی نانی اور ماموں کی رہنمائی میں اپنا فنی سفر جاری رکھا پھر خود اپنی فہم و فراست کو رہنما کر کے محتاط انداز میں زندگی کا سفر جاری رکھا۔ کبھی کامیابی نصیب ہوئی کبھی ناکامی۔ کبھی سکھ ملا کبھی دکھ لیکن مجموعی طور پر کامیابیوں کا پلہ بھاری رہا۔

پاکستانی فلم انڈسٹری کو جن لوگوں نے بام عروج پر پہنچایا ان میں نمایاں نام شمیم آراء کا بھی ہے وہ اپنی ذات میں ادارے کی حیثیت رکھنے والی اور ہمہ جہت شخصیت کی مالک تھیں۔ فن اداکاری میں انہیں کمال درجہ کی قدرت حاصل تھی۔ تہذیب وشائستگی اور شستہ اردو بولنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ تین دہائیوں تک فلم انڈسٹری کی مقبول ترین ہیروئن رہیں۔ ان کی اداکاری کا جادو لاکھوں فلم بینوں کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ وہ مرد و خواتین میں یکساں مقبول تھیں۔ ان کی گوناں گوں فنی خوبیوں کی وجہ سے پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

موت برحق ہے۔ جو پیدا ہوا ہے ایک دن اسے موت کا مزہ چکھنا ہوگا۔ اس حقیقت کے باوجود بچھڑنے والوں کا دکھ ضرور ہوتا ہے اور جب جانے والا بہت پیارا بہت عزیز ہو تو یہ دکھ برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شمیم آراء کی موت پر بھی جہاں عام لوگوں کو اتنا غم ہوا وہاں سوچنے اور غور و فکر کرنے کی بات ہے کہ مرحومہ کے قریبی عزیزوں دوستوں اور ساتھیوں پر کیا گزری ہوگی۔ ایسے ہی کچھ لوگوں کے جذبات و احساسات کی ایک جھلک دیکھیے۔

ان کے اکلوتے بیٹے سلمان مجید کریم کہتے ہیں۔

میں اپنی ماں کی کن کن خوبیوں کی تعریف کروں۔ وہ بہت ہی اچھی اور عظیم تھیں۔ انہوں نے میری اعلیٰ تعلیم و تربیت میں بھی کوئی کمی آنے نہیں دی۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں۔ ”میرا بیٹا اگر خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔“ امی کہا کرتی تھیں۔ ”افسوس سلمان! مجھے شوہر اچھے نہیں ملے۔ ہر آدمی میری شہرت اور دولت کو دیکھ کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے صرف مجید کریم صاحب ہی مخلص لگے۔“ حقیقت بھی یہی ہے کہ میرے والد ہی امی سے مخلص رہے۔ علیحدگی کے بعد بھی انہوں نے میری تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ہی افسوس کا اظہار کیا۔ ان کی تسلی میرے لیے صبر اور دلاسے کا سبب بنی۔ ملک سے باہر رہ کر بہت سے نوجوان بگڑ جاتے ہیں مگر یہ میری والدہ کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے کسی غلط کام میں دل نہیں لگایا۔ اچھی تعلیم و تربیت، اپنی بیوی کا خیال اور بچوں سے شفقت یہ سب میری عظیم ماں کی وجہ سے ہے۔ ان کا فلموں سے ضرور تعلق تھا مگر وہ مجھ سے کبھی غافل نہیں رہیں۔ جب ٹھیک تھیں تو ہر دوسرے روز مجھے ٹیلی فون کرتی تھیں۔ میں ہمیشہ انہیں لندن آنے کی دعوت دیتا تھا مگر وہ کہتی تھیں۔ ”فلم میری کمزوری ہے۔ فلم والوں میں رہ کر مجھے سکون ملتا ہے۔“ جب ان کا فلمی کام تقریباً ختم ہو گیا تو وہ اداس اداس رہنے لگیں۔ پھر ٹی وی کے لیے پروڈکشن شروع کی۔ ”پرندے“ سیریل کے علاوہ وہ ایک دو اور بھی ٹی وی سیریل کرنا چاہتی تھیں مگر بیمار ہو گئیں بیماری کے دوران بہار آنٹی مسلسل روز آتی رہیں۔ کبھی کبھی بابرہ شریف، فاخرہ شریف اور ریما وغیرہ بھی آتیں۔ پھر جب وہ لندن میں زیر علاج تھیں تو مصطفیٰ قریشی، روبینہ قریشی اور طارق عزیز وغیرہ بھی آئے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں اور اخبار کا بھی

کہ اس نے بیماری کے دوران سب کو باخبر رکھا۔"

بہار بیگم جو شمیم آراء کی بہت عزیز سہیلی تھیں۔ اپنی پیاری دوست کی موت پر ان کے دل و دماغ پر کیا بیتی ہوگی الفاظ میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ اس دکھ کے دوران انہوں نے جو مختصر اظہار عقیدت کیا وہ کچھ یوں ہے۔

"شمیم آراء میری بہن تھیں۔ میری ان سے 1957ء سے دوستی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ کئی فلمیں کیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ نام بھی یاد نہیں کہ کون کون سی فلم میں ساتھ کام کیا۔ شمیم آراء جس قدر عظیم اداکارہ تھیں اس سے کہیں بڑھ کر اچھی خاتون تھیں۔ مجھے آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرے گھر کا کوئی فرد مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ سلمان سے لندن میں ہر ہفتہ بات ہوا کرتی تھی۔ ماں کے انتقال پر اس نے سب سے پہلے مجھے فون کیا اور پھر سارے دن اور ساری رات مجھے تعزیت کے فون آتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شمیم آراء کا انتقال ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔"

ندیم صاحب کہتے ہیں۔ "شمیم آراء صاحبہ مجھ سے بڑی تھیں۔ اس کے باوجود ہم لوگ کئی فلموں میں ہیرو ہیروئن آئے۔ وہ بڑی خوب صورت فنکارہ اور ہدایت کارہ تھیں وہ وقت کی بڑی پابند تھیں۔ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی تھیں۔"

مصطفیٰ قریشی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "شمیم آراء سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ وہ بہت اچھی اداکارہ اور بہت اچھی خاتون تھیں۔ میری پہلی فلم "لاکھوں میں ایک" ان کے ساتھ ہی تھی۔ میں نے اس فلم میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہمیشہ وقت سے پہلے سیٹ پر پہنچا کرتی تھیں۔ گھر سے ان کے لیے لنچ آتا تو سب کو کھلاتی تھیں۔ ذاتی زندگی میں وہ انتہائی سادہ اور نماز روزے کی پابند تھیں۔"

"اپنے وقت کی سپر اسٹار بابرہ شریف جس نے شمیم آراء کی کئی فلموں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ کہتی ہے۔ فلم "پلے بوائے" اور "مس ہانگ کانگ" کو کون بھول سکتا ہے۔ ان فلموں میں، میں نے آپا سے بہت کچھ سیکھا۔ افسوس کہ وہ بہت جلدی بیمار ہوگئیں اور پھر ان کی بیماری نے ہم سے ایک بڑی فنکارہ کو چھین لیا۔ ان کا خلا... کوئی پورا نہیں کرسکتا۔"

مصنف و ہدایت کار سید نور کے تاثرات ملاحظہ فرمایئے۔ "میں نے شمیم آراء صاحبہ کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ جب سیٹ پر آتی تھیں تو اس کی رونق بڑھ جاتی تھی۔ تمام اسٹاف کا حال چال فرداً فرداً معلوم کرتی تھیں۔ ان جیسی محبت کرنے والے فنکار آج کل تلاش کرنے سے بھی نہیں ملیں گے۔ بھول، پلے بوائے اور دیگر فلمیں ان کے ساتھ کیں۔ وہ جتنی بڑی اداکارہ اور ہدایت کارہ تھیں اس سے کہیں بڑی خاتون تھیں۔ فرنگی، سہیلی، آگ کا دریا، صاعقہ، منڈا بگڑا جائے ان کی یادگار فلمیں ہیں۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتیں تو طویل عرصے تک فلموں میں مصروف رہتیں۔"

"اپنے وقت کے خوبرو اداکار اعجاز درانی نے شمیم آراء کے بارے میں کہا۔ ان جیسے آرٹسٹ بہت ہی کم ہوں گے۔ گانے پکچرائز کرانے کا ان کا انداز بڑا جداگانہ تھا۔ میں نے ان کے ساتھ زندگی ایک سفر، فرض اور کئی فلموں میں کام کیا ہے۔ وہ خداداد فنی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔"

اداکار شاہد نے کہا۔ "باجی شمیم آراء کے انتقال کی خبر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ میری پسندیدہ اداکارہ اور ہدایت کارہ تھیں۔ میں ان کو باجی کہا کرتا تھا۔ وہ اس قدر دردمند دل رکھنے والی خاتون تھیں کہ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے ان کی فلمیں آگ کا دریا، فرنگی اور سالگرہ پسند ہیں۔ ان کی بہترین کارکردگی کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

## روس نیٹو مشترکہ کونسل

اس کونسل کا قیام نیٹو کے 19 ممالک اور روس کے مابین ایک سمجھوتے کے تحت 2002ء میں عمل میں آیا۔ اس کونسل نے 1997ء میں قائم ہونے والی اس کونسل کی جگہ لی، جس میں روس نے 1999ء میں کوسوو کے مسئلے پر یوگوسلاویہ کے ساتھ نیٹو کی لڑائی کے خلاف بطور احتجاج ایک سال تک اپنی رکنیت کو معطل رکھا۔

نئے سمجھوتے کے تحت نیٹو تنظیم کسی مسئلے کو اس وقت تک حتمی شکل نہیں دے سکے گی، جب تک اسے روس کی منظوری حاصل نہ ہوگی، تاہم روس ان فیصلوں پر اپنا حق استرداد استعمال نہیں کر سکے گا، جو نیٹو نے اپنے طور پر کیے ہوں گے۔ یہ بھی طے پایا کہ سفیروں کی سطح کا اجلاس ایک ماہ میں کم از کم لازمی طور پر برسلز (بلجیم) میں ہوا کرے گا، علاوہ ازیں ہر سال وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع کے دو اجلاس بھی منعقد ہوا کریں گے۔

مرسلہ: خان شہباز خان، ایبٹ آباد

شمیم آراء کے بارے میں اداکارہ فردوس بیگم نے کہا۔ ”میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی۔ انہیں بس ایک بار غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ میرے گھر آئیں اور میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے ہمیشہ انہیں باجی کہا اور ان کا احترام کیا۔ وہ ایک اچھی اداکارہ اچھی ہدایت کارہ اور اچھی خاتون تھیں۔“

فلم اور ٹی وی کے فنکار طارق عزیز کہتے ہیں۔ ”شمیم آراء اپنے زمانے کی قد آور اداکارہ اور ہدایت کارہ تھیں۔ وہ بہت زیرک ڈائریکٹر اور بہت نرم مزاج ، درد مند خاتون تھیں۔ میرے ساتھ ان کی فلمیں ”سالگرہ“ اور ”ساز“ بہت مقبول ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسی اداکارہ ہمارے پاکستان میں کم کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔“

کیریکٹر اداکار مسعود اختر کا خیال ہے کہ شمیم آراء جیسی مقبول اور بااخلاق خاتون شاید ہی فلمی صنعت میں کوئی اور دیکھی۔ جیو اور جینے دو، خواب اور زندگی اور انگارے میں ہمارا ان کا ساتھ رہا۔ بطور ہدایت کارہ جیو اور جینے دو، منڈا بگڑا جائے، مس ہانگ کانگ ان کی یادگار فلمیں ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات سے بھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی۔

ڈریس ڈیزائنر بی جی کے تاثرات۔ ”میرا اور آپا شمیم آراء کا ساتھ طویل عرصے تک رہا۔ ان کی بے شمار فلموں کے ڈریس میں نے ہی تیار کیے۔ جن پر آپا شمیم آراء مجھے بڑی شاباش بھی دیتی تھیں۔ ان جیسے محبت کرنے والے فنکار اب کہاں ملیں گے۔ اپنی بیماری کے ابتدائی دور میں جب وہ چل پھر سکتی تھیں تو اکثر اسٹیک کے سہارے میرے گھر آجاتی تھیں اور گھنٹوں بات چیت کرتی تھیں۔ جب ان کے مکان پر قبضہ ہو گیا تو وہ بڑی پریشان ہو گئی تھیں۔ حکومت کی بے رخی سے بھی وہ اداس اداس رہتی تھیں۔ سوائے اس وقت کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے کسی نے ان کی مدد نہ کی۔ جب کہ وہ خود کسی سے امداد کے لیے کہتی بھی نہیں تھیں۔ اللہ ان کے بیٹے کو سلامت رکھے اس نے خود ماں کا علاج معالجہ کرایا اور مرتے دم تک ان کی خدمت کی۔“

تقسیم کار ستیش چند آنند نے اظہار عقیدت کچھ یوں کیا۔ ”میرے والد جگدیش چند آنند نے کئی فلمیں ایسی ریلیز کیں جن میں شمیم آراء ہیروئن تھیں مثلاً آگ کا دریا، سہیلی اور دلہن وغیرہ اور ان کی ذاتی فلموں میں مس کولمبو، مس ہانگ کانگ شامل ہیں۔ ”آگ کا دریا“ اور ”سہیلی“ مجھے پسند ہیں شمیم آراء کا خلا کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ وہ جتنی اچھی فنکارہ تھیں اتنی ہی اچھی انسان بھی تھیں۔ ان کے بات کرنے کا دھیما لہجہ ان کی شخصیت کی پہچان تھا۔“

شہزاد گل، سجاد گل کے تاثرات۔ ”شمیم آراء سے ہمارے والد آغا جی اے گل کی بڑی دوستی تھی۔ ان کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ وہ اچھی فنکارہ اور اچھی ہدایت کارہ تھیں۔ ہمارے گھر اکثر راتوں کے کھانوں پر جس طرح علی زیب، درپن صاحب اور نیر سلطانہ صاحبہ آتی تھیں اسی طرح شمیم آراء صاحبہ بھی آتی تھیں ان کی فلم ”نائلہ“ کے فلم ساز میرے والد صاحب تھے اور بھی کئی فلموں کے لیے والد صاحب نے شمیم آراء صاحبہ کا نام ہدایت کاروں کو دیا کہ شمیم آراء کو اس فلم میں لیں۔ کمال کی آرٹسٹ تھیں۔“

ہدایت کار ایس سلیمان کے احساسات۔ ”میرے شمیم آراء سے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ انہوں نے میرے بھائیوں سنتوش کمار اور درپن کے ساتھ کافی فلموں میں کام کیا تھا جن میں نائلہ، چنگاری وغیرہ بڑی مقبول ہوئی تھیں۔ میری ذاتی فلم ”بے وفا“ میں بھی انہوں نے کام کیا تھا۔ اس فلم میں وحید مراد ہیرو تھے۔ افسوس کہ یہ دونوں فنکار جلد ہی ہم سے جدا ہو گئے۔“

شمیم آراء بہت عظیم اداکارہ، ہدایت کارہ اور انسان تھیں۔ اس بات کا اعتراف ان کے دورِ عروج میں بھی کیا جاتا تھا اور اب ان کی موت کے بعد بھی انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے مگر ہمارے ملک اور معاشرے کی اس بے حسی کو کیا کہا جائے۔ کیا نام دیا جائے کہ جب ہمارے فنکار اور شعبہ ہائے زندگی کی دیگر اہم شخصیات خراب و خستہ حالت میں ہوں۔ زوال آمادہ حالات کے شکار ہوں تو ان کے حال پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ وہ لوگ بھی جنہوں نے ان کی وجہ سے اپنی دولت میں اضافہ کیا۔ ان کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ ان کے اچھے دنوں کا احسان ادا نہیں کرتے۔ اسی طرح سرکاری سطح پر بھی ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ شمیم آراء کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا۔

خواجہ خورشید انور کی ایک فلم ”ہمراز“ کا ایک گیت شمیم آراء پر فلمایا گیا تھا۔ سہیلیو! کہاں ہو تم آواز دو۔ تڑپ رہی ہوں میں یہاں، کبھی تو مجھ سے آملو۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے“ شمیم آراء کی آخری زندگی جیسے اس گانے کی بازگشت ہو۔

# ٹیس

سلمیٰ اعوان

کچھ یادیں نیزے کی انی بن کر دل میں کُھب جاتی ہیں اور رِستے ناسور کی طرح ٹیس دیتی رہتی ہیں۔ مسلمانانِ عالم جس وقت دستر خوان پر بیٹھے انواع واقسام کے کھانے کھا کم اور برباد زیادہ کررہے ہوتے ہیں اسی وقت غزہ کے برادر ایمانی کھنڈر ہوتے شہر کے کونے کھدروں میں بیٹھے زندگی بچانے کے نام پر مٹھی دو مٹھی اجناس پھانک رہے ہوتے ہیں۔ غزہ کے یہ مظلومین کس طرح اپنی بقا کے لیے کوشاں ہیں اس کی ایک ہلکی سی جھلک۔

**دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی لہورنگ تحریر**

دن جمعے کا تھا۔ جگہ شہر دمشق کی قدیم ترین دمشق اسٹیڈیل تھی۔ جہاں اس اموی خلیفہ ولید بن عبدالمالک کا شاہکار امیہ مسجد ہے۔ عین سامنے جس کے وہ ساحتہ المسکیہ کا میدان قدامت کی فسوں خیزی لیے قلب ونظر کو حیرت زدہ کرتا ہے۔ آج تیسرا دن تھا۔ میں ہر روز دمشق کے محلوں، عجائب گھر اور اس کے کوچہ بازاروں میں گھومتی پھرتی یہاں آجاتی۔

پہلے دن ہی اس کی سحر انگیزی نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ کینا کے درخت تلے بیٹھی خوشگوار ہواؤں سے لطف اندوز ہوتی کبھی

اپنے دائیں ہاتھ نوادرات کی دکان کے چوبارے کی آبنوسی کھڑکیوں کو دیکھتی جن کی چوبی کندہ کاری ایسی تھی کہ نگاہیں ان میں پھنس پھنس جاتیں۔ سامنے دمشق کے مشہور حمیدیہ بازار کے اختتامیہ حصے پر بنے حداد (Hadad) ٹمپل کے کالم ٹوٹ پھوٹ اور خستگی کا شکار ہونے کے باوجود نظروں کو لبھاتے تھے۔ پشت پر امیہ مسجد کا پندرہ سولہ فٹ اونچا دروازہ، بلند و بالا دیواریں اور اس کے تین مختلف اسٹائل کے بنے مینار اس کی عظمت کے گواہ تھے۔

اس جمعے کے دن میری نگاہیں پتھر کے فرش سے پھسلتی کھجور کے صدیوں پرانے درخت کی جھالروں سے آنکھ مٹکا کرتی، پھڑپھڑاتے کبوتروں کی اڑان میں الجھتی، اس لڑکی سے جا ٹکرائی تھیں جو خوبصورت تو ضرور تھی پر ایسی نہیں جیسا شامی حسن ہوتا ہے کہ بندے کو جکڑ لیتا ہے۔

سادے سے سفید سوتی اسکارف سے ڈھانپے سر کے نیچے چہرہ دھوپ میں تمتما سا رہا تھا۔ لونگ اسکرٹ ٹخنوں کو چھوتا تھا۔ جس نوجوان لڑکے کا ہاتھ پکڑے اسے گھسیٹ سی رہی تھی وہ سو فیصد یورپی نظر آتا تھا۔

جمعہ کی پہلی اذان ہو چکی تھی۔ چبوترے سے اتر کر میں میدان میں مسجد کے دروازے کی سمت رواں تھی جب اس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔ ”مردوں کے لیے مسجد جانے کا کون سا راستہ ہے؟“

”یہی جو تمہارے سامنے ہے۔“

جب وہ دونوں باب بریدہ سے گزر رہے تھے میں ان کے پیچھے تھی۔ لڑکا مردانے حصے کی طرف بڑھنے لگا تو لڑکی نے انگریزی میں اس سے کہا تھا۔ ”نماز کے بعد ایک دو گھنٹے آرام کر لینا۔“

”اب وہ وضو کے لیے کدھر جاتا ہے؟“ جیسا سوال کرتی میرے ساتھ ہو لی۔

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے میری نظروں کا بھٹکاؤ تو بس لمحوں کا ہی تھا۔ میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے بائیں ہاتھ کی بلند و بالا دیواروں پر آرٹ کے فطرت سے متعلق صدیوں قدیمی شاہکاروں پر نظریں ڈالے بغیر آگے بڑھ جاتی۔ دارالخزانہ جیسے شاہکار سے آنکھیں چرا کر اپنا راستہ ناپتی۔ سچی بات ہے یہ تو سراسر اس کی توہین تھی اور صحن میں بنا چوکور مینار بھی ہرگز دیکھے بغیر گزر جانے والا نہ تھا۔

بھئی سچی بات ہے میں بھی اپنی بھوک اور حریصانہ نظروں کے ہاتھوں مجبور ہوں جو اس آنکھ مٹکے سے باز رہ ہی نہیں سکتیں۔ جب گردن سیدھی کی لڑکی غائب تھی۔

”ارے۔“

بھونچکی سی ہو کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ چکر کھا کر پشت اور سامنے نگاہ کی۔ لڑکی تو کہیں نہیں تھی۔ آنکھوں کو ٹمٹماتے میں نے تاسف سے پھر اردگرد کا یوں جائزہ لیا کہ جیسے وہ لڑکی تو نہیں سوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ میں پہنی بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی گر گئی ہے۔

لڑکی ایک وہ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے راستہ پوچھتی تھی وہ سو فیصد یورپین تھا۔ جھلاتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔ کیسی بے حس لڑکی تھی۔ پہلی بار اس نادر تاریخی ورثے میں داخل ہوئی اور پل بھر کے لیے رک کر کسی چیز پر نظر نہیں ڈالی۔ کچھ سوچا بھی نہیں کہ جہاں سجدہ کرنے آئی ہے وہ زمانوں قرنوں سے جائے عبادت تھی آرمینائیوں، رومیوں، عیسائیوں اور اب مسلمانوں کی۔ یہ تاریخ کے کتنے بے شمار باب کھولتی ہے۔ اس نے کسی کو بھی کھولنے یا پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

چشمہ کا حوض تو ابھی بھی سامنے موجود تھا۔

اب افسوس اور جھلاہٹ کا فائدہ۔ کہانی تو مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔ سست قدموں سے وضو والے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں بھی دھیان وضو میں کم اور لڑکی میں زیادہ رہا۔

ابھی تو خطبہ جاری تھا۔ سامنے والے حصے کی طرف بڑھنے لگی کہ چلو وہاں سجدہ بھی ہوگا اور نظارہ بھی۔ مسجد کا وسیع و عریض پختہ صحن تنور بنا ہوا تھا۔ چھاؤں والے حصوں میں عورتیں پھسکڑے مارے بیٹھی تھیں۔ ذرا ان سے بچتے دھیان سے آگے بڑھتی تھی کہ کسی کا ہاتھ کسی کی انگلی پاؤں کے نیچے آگئی تو سیاپا پڑ جائے گا۔ تبھی کسی نے عبا کھینچی۔ پلٹ کر دیکھا تو بند دروازے کے آگے بنے پوڈے پر لڑکی بیٹھی تھی۔

خوشی سے نہال ہو جانے والا معاملہ ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہی اسے اپنی کیفیات سے آگاہ کیا۔

سوری۔ دراصل ایک خاتون پر مجھے سلفیٹ (فلسطین کی اپنی ہمسائی) کا گمان گزرا تھا۔ بھاگی تھی کہ اسے پکڑ لوں کہیں ہجوم میں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ پر وائے حسرت وہ تو کوئی لبنانی نکلی۔

تو وہ فلسطینی ہے۔ اور وہ لڑکا کون تھا۔ میں نے سوچا۔

اندیشے سر سر کرتے لہجے میں دوڑتے چلے آئے تھے۔

لڑکی تو بڑی میٹھی سی اور بڑی بی بی سی دکھتی ہے۔ ہائے اللہ کوئی رولے نولے والا چکر تو نہیں۔

"بس کر... وڈی مولویانی۔"

اس پھٹکار کے باوجود پوچھ ہی لیا۔ "لڑکا کون تھا؟"

"میرا شوہر ہے۔" چلو اطمینان تو ہوا۔ پر سوال پھر ہوگیا کہ وہ تو یورپین لگتا ہے۔

"ہاں نا۔ برٹش ہے۔ اسلام قبول کیا ہے اس نے۔"

اس کے ہاتھ کو بے اختیار ہی تھام کر چوم لیا۔ دھان پان سی لڑکی نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اوپر سے ترقی پسندی کی جتنی بھی ڈینگیں ماروں اندر سے مسلمانیت پھر بھی ہلّہ مار جاتی ہے۔

نماز کے لیے عورتیں صف بندی میں مصروف ہوئیں تو میں اس کا ہاتھ تھام کر باب جیرون میں داخل ہوئی۔ یہیں قریب ہی مشہد الحسین ہے۔ روایت ہے کہ امام عالی مقام حضرت حسینؓ کا سر مبارک یہاں دفن ہے۔

لڑکی نے چلتے چلتے رک کر پوچھا تھا۔ "سنا ہے حضرت یحییٰ علیہ اسلام کا روضۂ مبارک بھی یہیں ہے۔"

"ہاں محراب کے پاس ہی ہے۔ پچی کاری کا بڑا خوبصورت کام ہے اس پر۔"

فرش خوبصورت دبیز قالینوں سے ڈھکے ہوئے تھے جن پر ساتھ ساتھ ہم کھڑے ہوگئے۔ کسری فرض پڑھ کر میں نے پشت دیوار سے ٹکا کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا سارا وجود اوپر والے کے قدموں میں کسی طلب کے لیے گویا مجسم تھا۔ چہرہ جیسے حزن و یاس کی بارش میں بھیگ رہا تھا۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔ میرا دل تڑپ سا گیا۔ اس دید میں اپنائیت اور محبت تھی۔ میں نے اسے بانہوں کے کلاوے میں بھر کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چاہا کہ وہ میرے سامنے کھل جائے۔

پرس کھول کر اس نے ایک پوسٹ کارڈ نکالا۔ میرے سامنے کیا۔ میں نے دیکھا تھا۔ سفید اور سبز رنگوں میں چند لکیریں جن کی بظاہر صورت کسی راکٹ جیسی جو زمین کے سینے کو چھیدنے جا رہی ہو۔

"غور سے دیکھیے" جیسی بات پر اوپر لکھا ہوا پڑھا تو معلوم ہوا فلسطین کا نقشہ ہے۔ 1946ء سے جب برطانیہ اور اس کے حواریوں نے اس پورے علاقے کی بندر بانٹ کی۔ بائیس ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ ان ٹکڑوں کو نئے ملکوں کے نام دیئے۔ اور باقی بچے والے اس ٹوٹے کو اپنے پاس رکھا اور

**A land without a people for a people without a land**

کا راگ الاپنے والوں کو یہ تحفہ دیا۔

1946ء میں فلسطینیوں کی اس سرزمین میں بنی اسرائیل کی یہ نا ہنجار اولاد محدود تھی۔ مغربی اور مشرقی کناروں کے تھوڑے سے حصے پر چاولوں کے دانوں کی طرح بکھری ہوئی۔ آخری نقشہ 2005ء کا تھا۔ ایک ہزار سال سے اس زمین کے باسی ان کی جگہ لے بیٹھے تھے۔

فلسطین ایک المیہ۔ ایک گہرا دکھ۔ عربوں کے سینوں میں پلتا ہوا ایک ناسور۔

کارڈ میرے ہاتھوں میں تھا۔ یونہی اس کی پشت کو دیکھ بیٹھی۔ بڑی موہ لینے والی لکھائی تھی۔ انگریزی میں لکھے گئے یہ اشعار کیسے دل چیر گئے تھے۔

**If only our enemies**
**would read our letters**
**twice or three times,**
**apologize to the butterfly**
**for their game of fire**

اس نے سرک کر میری طرح اپنی پشت دیوار سے لگائی۔ ایک لمبی سانس نکالی اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرے دادا کا گھر حیفہ میں تھا۔ حجاز ریلوے اسٹیشن کے پاس۔ حیفہ بحیرہ روم کے شمالی کنارے پر صدیوں پرانا تاریخی شہر ہے۔ یہاں سے ٹرین ہمارے مقدس شہروں مکہ اور مدینہ کو براستہ دمشق جاتی تھی۔ زائرین کے لیے عثمانیوں کا بنایا ہوا ریلوے اسٹیشن۔ اب تو حکمرانوں نے اس کا نام ہی بدل دیا ہے' حیفہ مشرقی اسٹیشن رکھ کر میوزیم بنا دیا ہے۔

میرے بچپن اور جوانی کی یادیں سلفیٹ Salfit شہر کی قصباتی جگہ حارث کے گلی کوچوں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے والد ڈاکٹر ابو موسیٰ بزاز بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ' جن کا بچپن اور جوانی حیفہ میں گزری تھی۔ یہ وہ دن تھے جب غریب فلسطینیوں سے بنجر زمین خریدی جاتی یا ان کے شکستہ حال گھروں کا مہنگے داموں سودا کیا جاتا۔ غریب لوگ پیسے زیادہ ملنے پر خوش ہوتے۔ اس کے پیچھے جو مقاصد کام کر رہے تھے اس کا تو انہیں شعور اور ادراک ہی نہیں تھا۔ کہیں کہیں زور زبردستی ہوتی' یوں بڑی بڑی خوبصورت کالونیاں بنتی جاتیں اور باہر سے یہودیوں کو لا کر بسایا جاتا۔ باہر کی دنیا اس صیہونی پروپیگنڈے کے شور و غل سے متاثر تھی

کہ فلسطین کی سرزمین ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے۔ جو وہاں جتنی زمین چاہے خرید لے۔ رہے عرب، نرے کھوتے کے کھوتے۔ جاہل، اجڈ اور بے شعوری قوم۔

میرے والد کی کلاس فیلو یائل یہودی ہونے کے باوجود ان باتوں پر بہت جلتی کڑھتی تھی۔ یائل جرمن نژاد تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ حیفہ کی جرمن کالونی میں رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے شہروں کو غریب فلسطینیوں سے پاک کرنے کا عمل زور پکڑ گیا۔ مہاجروں کے کیمپوں میں روز افزوں اضافہ، ان کی زمینوں پر شاندار پلازے، کوٹھیاں اور صنعتی یونٹ تعمیر ہوتے گئے۔ فلسطینیوں کی جھونپڑیوں میں خوفناک پھیلاؤ آگیا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب میرے والد کو حیفہ چھوڑ کر جارٹ آنا پڑا۔ پر کہیں ایک دکھ کی لہر ان کے اندر سے اٹھتی تھی۔ انہیں اپنا باغ یاد آتا۔ اس میں اگے سنگتروں کے پیڑ یاد آتے۔ بحیرہ روم کا ساحل، اپنا گھر، اس کی گلیاں، بہت وقت وہ مضطرب رہے۔

میری دادی کے لیے حیفہ چھوڑنا گویا موت کو گلے لگانے جیسا تجربہ تھا۔ اس نے رک کر سوال کیا۔ "کبھی ہجرت کا زہر بھرا گھونٹ بھرا ہے؟"

میں نے دہل کر اسے دیکھا۔ میں خود تو اس تجربے سے نہیں گزری تھی کہ تقسیم ہند پر بہت کم سن تھی۔ مگر آنے والے بہت سالوں اس عملی مشاہدے سے گزری کہ میری دادی ہمہ وقت تیار ہی بیٹھی رہتی تھیں کہ بس دیس واپس جانا ہے۔ کمروں کو انہوں نے تالے کب لگائے تھے۔ وہ تو بہ امر مجبوری لوگوں کے اصرار پر باہر نکلی تھیں۔

"لوگ تو باؤلے ہو گئے ہیں۔ کوئی اپنا گھر بھی یوں چھوڑتا ہے۔ چلو دو چار دن بعد آ جائیں گے۔"

میری ماں چولہے کے پاس بیٹھی راکھ پھرولتے ہوئے مدتوں دیس اور اس کی گلیوں کو یاد کرتی اور دیس کے ناسٹلجیا سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

سابق مشرقی پاکستان میں شمالی ہند سے ہجرت کر کے آنے والی میری بہت سی دوستوں کے والدین اور خود وہ 1971 کے المناک حادثے کے بعد جس ٹوٹ پھوٹ کا ذہنی شکار ہوئیں ان کی تو میں خود چشم دید گواہ تھی۔

تو مجھے اس کی دادی کے جذبات سمجھ آتے تھے۔ اس کے گھر کا آنگن بہت کشادہ تھا۔ دمشق، حلب اور فلسطین کے معززین کے گھروں جیسا جن کی دیواروں پر چڑھی انگور کی بیلوں پر ٹنوں پھل لگتا تھا۔ سنگترے کے بوٹے جب منوں وزنی بوجھ سے جھک جھک پڑتے تو اس کی آنکھیں انہیں دیکھ دیکھ کر ہیروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتیں۔ صحن کے عین درمیان میں کنواں تھا۔ بڑے بھاری شہتیروں والے کمرے تھے جن شہتیروں پر اس نے میرے دادا سے ضد کر کے گل کاری کروائی تھی اور جو بہت خوبصورت لگتے تھے۔ وہ باؤلی سی آنکھوں میں آنسوؤں کے کٹورے بھرے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتی تھی۔ لمبی لمبی محرابی جھروکوں والی بالکونیاں دیکھتی تھی۔

"دیکھو تو اس کمرے میں میرا چچا مفتی فلسطین امین الحسینی ٹھہرتا ہے۔ یہ کمرا تو اس کے لیے مخصوص ہے۔"

اسے اپنی زمین پر زیتون کے باغوں کی فکر تھی۔ وہ بھیڑ بکریوں کے لیے ہلکان ہو جاتی تھی۔

وہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی پر اپنے چچا کے گھر آنے پر معززین حیفہ کے ساتھ بیٹھک میں ان کی جو نشستیں جمتیں اور وہ شوق و محبت سے کھانے اور قہوے کی سروس خود بھاگ بھاگ کر کرتی تو ایسے میں ان کی باتیں سنتے سنتے وہ بہت بالغ ہو گئی تھی۔

ترکوں کے فجیجے کرتی۔ مسلمان تھے پر کیسے مسلمان؟ ہمیں اپنی محکوم رعایا بنا کر رکھا اور ہمیشہ نظر انداز کیا۔ آخری عثمانی سلطان کے لتے لیتی کہ جس نے اس مردود بیرن ایڈمنڈ رتھس چائیلڈ کو فلسطین میں ایک یہودی آبادی کی آبادکاری کی اجازت دی تھی۔ سارا معاملہ تو یہیں گڑبڑ ہو گیا تھا۔ تم مجھے سر اندر کرنے دو۔ بیٹھنے اور لیٹنے کی جگہ میں خود بنا لوں گا۔ وہ اونٹ اور خیمے کی کہانی سنانا شروع ہو جاتی۔

تب دھیرے سے میرے والد انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہجرت کا عمل صدیوں قرنوں سے ہے۔ ایک مسلک ایک عقیدے کے لوگ پرائی جگہوں پر اپنی آبادیاں بھی بنا لیتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ غلط ہے کہ آپ اس حد تک چلے جائیں کہ مالکوں کو نکال باہر پھینکیں۔ پھر ان کی زمینیں چھین لیں اور انہیں اپنی ہی سرزمین پر قیدی بنا دیں۔

تب لعن طعن کے گولے برطانیہ اور اس کے حواریوں پر برسنے لگتے۔ شریف مکہ پر طوفانی یلغار ہوتی۔

میرے والد چپ چاپ ان کی باتیں سنتے رہتے۔ وہ

ان کے جذبات کچلتے رہتے پر انہیں مزید دکھ سے بچانے کے لیے ہونٹوں کو سیئے رکھتے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کے دل کی ہر دھڑکن نزار قبانی کے شعروں کے ساتھ دھڑکتی اور ان کے خون کی گردش تیز اور تیز تر ہوتی جاتی۔

"میں دہشت گردی کا حامی ہوں
اگر یہ مجھے روس، رومانیہ، پولینڈ
اور ہنگری لے آئے مہاجروں سے بچا سکے
یہ مہاجر فلسطین میں آ بسے
انہوں نے القدس کے مینار اقصیٰ کے
دروازے اور محرابیں چرالیں
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
جب تک نیو ورلڈ آرڈر میرے بچوں کا
خون کرتا رہے گا
ان کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
میں دہشت گردی کا حامی ہوں"

تب ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ دائیں ہاتھ کی پوروں سے انہیں صاف کرتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ جاتے۔

اور گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ حیفہ کی زمین پر بس فلسطینیوں کا خال خال کوئی گھر رہ گیا اور یہی وہ دن تھے جب میرا باپ حیفہ چھوڑنے کو کہتا تھا اور میری دادی کو ہول اٹھتے تھے۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ بشیت اور ہیتی میں آپ کے کتنے رشتے دار اور دوسرے لوگ تھے۔ کیا ہوا؟ سارا علاقہ مسمار کر دیا گیا۔ عالیشان گھر بنے اور یورپ کے ملکوں سے اسرائیلی آئے اور قابض ہو گئے۔ مہربانی کریں ابھی گھر کے دام مل رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اس سے بھی جائیں۔"

وہ چھم چھم روتی تھی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آتا تھا اور روندھے گلے سے کہتی تھی۔ کہاں جانا ہے؟ اچھا تو چلو نظارت میں جا بستے ہیں۔

ان کی ایک بیٹی نظارت کے پرانے شہر میں العبید مسجد کے پاس مارکیٹ والے علاقے میں رہتی تھی۔

میرے والد چپ تھے۔ فیصلہ کرنے میں بہت سوچ و بچار کے بعد قدم اٹھانے والے۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر یہ سمجھتے تھے کہ گرجاؤں مناسٹریوں اور شنتی گاگوں سے سجا یہ قدیم شہر آنے والے وقتوں میں اسرائیل کی ظالمانہ گرفت میں ہوگا۔

"تو پھر عکا چلتے ہیں۔" میری دادی نے آہ بھری تھی۔

> **رفعت حسن، ڈاکٹر**
>
> بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور۔ وہ اس وقت امریکا میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کے حقوق کے لیے بھرپور انداز میں کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کے فلسفے اور تصانیف پر مقابلہ تحریر کر کے انگلستان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ 1976ء سے یونیورسٹی آف لوئیز ویل (کینٹکی) سے بطور پروفیسر مذہبی علوم وابستہ ہیں۔ امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ اسلامی اقدار سے متعلق کورس کی ایک کتاب بھی لکھی۔
>
> مرسلہ: شجاعت حسن، اونٹاریو

عکا کے لیے میرے والد رضامند تھے۔ پانچ ہزار سال کے تہذیبی ورثے کا مالک، بہت خوبصورت عکا۔ مغرب اور مشرق کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی شہر میں دیکھنے کو ملے جیسا یہاں تھا۔ آرٹ اور مذہب کے امتزاج سے گندھا ہوا۔ دنیا کی بہت ساری تہذیبوں اور ثقافتوں کی باقیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔ قلعوں، گرجاؤں، مسجدوں، مندروں سے بھرا ہوا شہر جو اپنے قدیم جنگجوؤں، اپنے معماروں اور اپنی گزشتہ شان و شوکت کی کہانیاں سناتا ہے۔

مگر پتا نہیں کیوں انہوں نے سالفیٹ Sulfit کو ترجیح دی۔

وہ ڈاکٹر تھے۔ ہمدرد اور غم گسار سے۔ نہ یہ دیکھتے کہ ان کا مریض عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان۔

نئی جگہ بسنے کا واویلا تو اپنی جگہ تھا۔ پر وہ حادثہ تو جیسے ان کی جان پر گزر گیا۔ جون کے تپتے دنوں کا حادثہ۔ جائے نماز پر ہی بیٹھے بیٹھے آنسوؤں کی مالا پروتی جاتیں، کبھی شدید غصے سے لرزتی آواز اور کبھی غم میں ڈوبے لہجے میں میرے والد کو آواز دیتے ہوئے کہتی چلی جاتیں۔

"سنتے ہو ابو موسیٰ ان مصریوں کو چوڑیاں کیوں نہیں دے آتے۔ ارے ایسے بزدل۔ انہوں نے بٹہ لگا دیا عربوں

# ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L۔5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کی روایات کو۔ بھاگنے میں گھوڑوں کو بھی مات دے دی۔ نہر سویز تک سارا سینائی دے دیا۔ کس آرام سے ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ شام اور اس اردن کو بھی ڈوب مرنا چاہیے۔ آج گولان کی پہاڑیاں چھینی ہیں۔ کل دمشق پر ہاتھ ڈالیں گے۔ یروشلم تو گیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات کے رکھوالے بھی وہ ہوئے۔ ارے ابھی پتا نہیں کیا کیا دیکھنا ہے؟"

پھر آہ وزاری بڑھ جاتی۔ جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے کہیں آنسوؤں کے دھاروں میں بہتی آوازیں دیتیں۔

"ابو موسیٰ کہاں ہو؟ ارے جاؤ نکلو۔ دیکھو تو جنہیں دیس نکالا دیا ہے وہ کس حال میں ہیں؟ جیتے ہیں یا مر گئے ہیں۔ ان ظالموں نے بڑی گولہ باری کی ہوگی۔ توپ بندوقوں نے ان کے کلیجے چھلنی کر دیے ہوں گے۔ ارے ڈاکٹر ہو تم۔ جاؤ ان کے زخموں پر مرہم رکھو۔ ارے ابو موسیٰ اب اللہ کی مصلحتوں کو میں کیا نام دوں۔ تجھے ان دو لڑکیوں کی جگہ دو بیٹے دے دیتا تو کیا تھا۔ میں ان کے ہاتھوں میں بندوقیں نہ سہی پتھر پکڑا دیتی۔ ارے ایک دو کے ہی سر پھوڑ دیتے۔"

ہماری والدہ اس وقت ان کے قریب ہی کہیں موجود ہوتیں۔ میری بڑی دونوں بہنیں چھوٹی چھوٹی سی ان کے جائے نماز پر آگے پیچھے دادی کی باتوں کی کاٹ سے بے نیاز چکر کاٹتی رہتیں۔

ایسے دکھ بھرے، بہت سے لمحوں میں انہیں قطعی یاد نہ رہتا کہ ان کا بڑا سعادت مند بیٹا انہیں بتا کر ہی اردن کے کیمپوں میں گیا ہے۔

تاریخ کا کتنا بڑا جبر۔ ہزاروں فلسطینی بے گھر ہو گئے۔ ان کی بڑی تعداد شام اور اردن کے مہاجر کیمپوں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔

اب فلسطین کا ہر گھر ماتم کدہ ہے، ہوا کرے۔ عرب اور مغربی دنیا کو اس سے کیا۔

اور ایسے ہی دنوں میں میرے بڑے ماموں ہمارے گھر آئے اور ہماری دادی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے نزار قبانی کی وہ نظم انہیں سنائی تھی جو شاعر کے ہونٹوں سے نکلتے ہی تند و تیز ہواؤں کے جھکڑوں کی طرح عرب دنیا میں پھیل گئی تھی۔ میری بہنیں مجھے بتایا کرتی تھیں کہ وہ نظم دادی کے ساتھ ساتھ انہیں بھی زبانی یاد ہو گئی تھی۔

کوئی ایک بار تھوڑی میری دادی بار بار ان اشعار کا ورد مقدس آیات کی طرح کرتیں۔

"جان کی امان پاسکتا تو سلطان سے کہتا۔
سلطان آپ دو جنگیں ہار چکے ہیں۔
آپ نسل نو سے کٹ چکے ہیں۔
دشمن ہمارے خون سے ہولی کھیل گیا۔
عرب بچو۔ مستقبل کو بتا دو
تم ہماری زنجیریں توڑ دو
عرب بچو۔ ساون کے قطرو۔ تم ہی وہ نسل ہو جو شکست پر غالب آئے گی۔
غزہ کے بچو اپنی جنگ جاری رکھو۔
ہم مردہ اور بے گور ہیں۔
ان اطفال سنگ نے ہماری عباؤں پر
سیاہی انڈیل دی ہے۔
او غزہ کے دیوانو۔"

وہ جب یہ اشعار پڑھتیں تو میری بہنوں کی طرف دیکھتیں۔

"کاش یہ لڑکے ہوتے۔"

میرے والد مہینوں بعد آئے کمزور، نڈھال، شکستہ، ٹوٹے پھوٹے سے۔ کیمپوں کی حالت زار، اسپتالوں میں نیپام بموں سے جھلسے ہوئے بے کس و لاچار فلسطینی۔ متاثرین تک پہنچنے کی راہوں میں حائل رکاوٹیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کا اغوا ان کا اور عام لوگوں کا قتل عام۔

فلسطینیوں کو اپنی یہ لڑائی خود لڑنی ہے۔ کوئی عرب ملک ان کی امید نہیں۔ کوئی ان کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔ سب اپنے اپنے مفادات کے لیے بکے ہوئے ہیں۔

بستر مرگ پر بھی میری دادی فلسطین کے لیے معجزوں کی منتظر رہیں۔ کسی صلاح الدین ایوبی کے اٹھ کھڑے ہونے کی دعائیں کرتی کرتی قبر میں اتر گئیں۔

بیٹا تو میرے باپ کے شاید مقدر میں نہ تھا۔ تیسری لڑکی میری صورت میں گھر آگئی۔ گھر تین لڑکیوں سے بھر گیا۔ جب ہوش سنبھالا میری بڑی بہنیں قاہرہ پڑھنے جا چکی تھیں۔ بیروت تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

اپنی بہنوں کے ساتھ میں دیر بعد شامل ہوئی تھی۔

وقت کے ساتھ وہ ذلیلانہ حربوں پر اتر رہے تھے۔ ہمیں اس کا احساس ہر پھیرے پر ہوتا تھا۔ ہم تینوں بہنیں جب بھی گھر آتیں۔ جگہ جگہ ہماری گاڑی روکی جاتی۔ جا بجا چیک پوسٹوں پر ہمارے کاغذات چیک ہوتے۔ میری بڑی بہنیں

جز بز ہوتیں۔ اس کی چوٹوں پر پڑے بل آج سمجھ آتے ہیں۔ فوجیوں کی نگاہوں کا گرسنہ انداز کا مفہوم تب نہیں آج میرا خون کھولاتا ہے۔

مار دھاڑ، بے دخلی اور ہماری زندگی اجیرن کرنے کا ہر حربہ اپنایا جا رہا تھا۔ کنکریٹ کی دیواریں، برقی باڑھیں، آبزرویشن ٹاور، خندقیں، سرنگیں اور پرمٹ سسٹم کیا کیا نہیں ہمارے لیے کیا گیا۔

وہ باغ وہ زمینیں جو کبھی فلسطینیوں کی تھیں اب ان پر وہ قابض تھے۔ بیچارے فلسطینی پھل ان سے خریدتے اور سڑکوں کے کناروں پر کھڑے ہو کر انہیں بیچتے۔ ان کی Settlements پر دہاڑی دار مزدور بن کر کام کرتے۔ مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے پر جانے کے لیے سویرے سویرے لائنوں میں کھڑے ہوجاتے۔ پرمٹ سسٹم جیسے تکلیف دہ مرحلوں سے گزرتے۔

وہ دن بھی میں اپنی یادداشتوں سے کبھی نہیں نکال سکتی۔ میں اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ غزہ کے جنوب مشرقی علاقے ''زیتون'' میں رہنے والی ان کی بے حد پیاری پھوپی کی بیٹی اسرائیلی بمباری سے شہید ہوگئی تھی۔ اسرائیلی طیاروں نے بمباری کی تھی۔ میزائل ان کے گھر گرا تھا۔ ان کے دو کمسن پوتے اور وہ خود شہید ہوگئی تھیں۔

تعزیت کے لیے بھی بہت دنوں بعد جاسکے کہ محاصرہ طول پکڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر ابو موسیٰ بزاز دو بیٹیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ سب سے بڑی ڈاکٹر لائیلا انگلینڈ میں تھی، نمبر 2 یسرا میری پھوپی کے گھر نظارت میں، تیسری میں یعنی آرینا اب اس مرحلے سے گزر رہی تھی۔ میری زندگی میں ڈاکٹر یشار البشر کا آنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر یشار البشر فلسطینی تھا۔ مگر پرائمری کے بعد آئرلینڈ اپنے چچا کے پاس چلا گیا تھا۔ وہیں اس نے میڈیکل کیا۔

گو وہ باہر رہا مگر فلسطین اس کے وجود کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا تھا۔ وہ جب بھی آتا حالات کے تیور دیکھ کر کڑھتا، پیچ و تاب کھاتا اور اپنا خون جلاتا اور پھر دور نزدیک جگہ جگہ پھرتا۔ لوگوں کو دیکھتا، انہیں چیک کرتا، دوائیاں دیتا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے اس اجڑے پجڑے محکوم و مجبور وطن آگیا۔ مسیحائی کا تحفہ اسے قدرت نے انعام کی صورت دیا تھا۔ عجیب سی بات تھی وہ قرونِ وسطیٰ کے طبیبوں کی طرح مریض کو لٹا کر اس کا سر سے پاؤں تک معائنہ کرتا۔ اور یہ کیسی حیران کن ناقابلِ یقین بات تھی کہ جونہی اس کے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں بیمار کے اعضاء چیک کرتے کرتے اس کے پاؤں کی انگلیوں تک پہنچتیں، مرض ہاتھ جوڑے اس کے سامنے مجسم ہوجاتا۔ نہ کوئی ایکس رے نہ کوئی رپورٹ نہ کوئی ٹیسٹ۔

اس کی اس عجیب و غریب سی خوبی نے اسے قرب و جوار میں خاصا مشہور کردیا تھا۔

ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔

میں سو کر اٹھی۔ میرے سر اور گردن میں ایسا شدید درد تھا کہ چیخیں نکلتی تھیں۔ نہ صرف میرے والد بلکہ چند دوسرے ڈاکٹروں نے بھی چیک کیا۔ ابھی ٹیسٹوں کا مرحلہ جاری تھا جب اتفاق سے یشار البشر حارث میرے والد سے ملنے آگئے۔ انہوں نے صرف پانچ سے چھ منٹ کے معائنے میں بتادیا کہ اسے مینجائٹس ہوگیا ہے۔ فوری تشخیص اور علاج نے مجھے نئی زندگی دی تھی اور میں ڈاکٹر کی عاشق ہوگئی تھی۔

میری اس وابستگی کا اظہار میرے والد کی زبان سے ہوا اور یشار کی عنایت کہ اس نے اسے پذیرائی دی۔

گھر کی آخری اور بے حد لاڈلی بیٹی کی شادی جس انداز میں ہوئی وہ داستان بھی دل ہلانے والی تھی۔

اندرون وطن عزیزوں کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی رشتے کے چاچے، ماموں بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا اکٹھ ہوا پڑا تھا۔ اس رنگ رنگیلی فضا کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ جب مغربی کنارے کی شمالی پہاڑیوں کے دامن میں اسرائیلیوں کی Itamar نامی Settlement میں Fogel فیملی کے پانچ افراد کو ان کی خوابگاہوں میں چاقوؤں سے قتل ہوجانے کی خبر آئی۔

اسرائیلی ملٹری اور سیکیورٹی سروسز نے بغیر تحقیق کے ملحقہ فلسطینی گاؤں Awarta پر چڑھائی کردی۔ نوجوان لڑکوں کی گرفتاریاں، گھروں کی تلاشی، سامان کی توڑ پھوڑ چند گھنٹوں میں حشر نشر ہوگیا۔

یشار کا بڑا بھائی اور اس کے تین بیٹے بھی اسی چکر میں دھر لیے گئے۔ وہ شادی میں شرکت کے لیے تیاریوں میں تھے جب یہ قیامت ٹوٹی۔ نابلوس میں کرفیو لگ گیا تھا۔ برأت کیسے آتی۔ آنسو میرے گالوں پر بہتے تھے۔

اور میں اپنی بہنوں سے کہتی تھی۔ میری شادی پر ہی یہ سب ہونا تھا۔

اپا کے اسرائیلی دوستوں سے رابطے، بھاگ دوڑ، فلسطینی میئر اور سب سے بڑھ کر انکل یوری اونری سابق ممبر اسرائیلی پارلیمنٹ کی کاوشیں رنگ لائیں۔ انکل یوری اونری اسرائیل میں رہتے ہوئے، سیاست دان ہوتے ہوئے، حق سچ کا علم اٹھائے رکھتے ہیں۔ ظلم و جبر پر بولتے اور لکھتے رہتے ہیں اور فلسطینیوں کے حقوق اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کی حمایت میں ہمیشہ آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

لڑکے برأت میں پھر بھی شامل نہ ہوسکے کہ وہ تو زیرِ حراست تھے۔ بیچاروں کے کہیں فنگر پرنٹ، کہیں ڈی این اے ٹیسٹ ہورہے تھے۔

یہ شادی نہیں تھی فرض کی ادائیگی تھی۔ میں نے میک اپ نہیں کیا۔ کپڑے نہیں پہنے۔ بس اسی حالت میں گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

مہینوں میں اس دکھ سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ یشار مجھے سمجھاتا اور دلداری کرتا نہ تھکتا تھا اور میں کہتی تھی۔ ”کمزور ہونا کتنا بڑا جرم ہے۔“

یشار نابلوس کے رفیدیہ اسپتال سے منسلک تھا۔ ایک دن کوئی دو بجے گھر آیا۔ میرے ہاں دوسرا بچہ متوقع تھا۔ کھانا تیار نہیں تھا۔

”کچھ کھانے کو ہے؟“ اس کے انداز میں ہمیشہ دھیما پن ہوتا۔

میں نے ذرا سے تامل ذرا سے تاسف سے اپنی خرابیٔ طبیعت کا بتایا۔

”چلو چھوڑو۔ زاطر تو ہے نا۔ اسے ہی لے آؤ۔“

میں نے میز پر خبز، زیتون اور زاطر سجا دیا۔

زاطر ہمارے مڈل ایسٹ میں بہت کھایا جاتا ہے۔ ہربل اور نمکوں کا آمیزہ جسے زیتون سے ملا کر روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

ابھی اس نے نوالے کو زیتون میں ڈبو کر اسے زاطر میں لتھیڑنے کے لیے نکالا ہی تھا کہ باہر کسی جیپ کے رکنے اور پھر بیل بجنے کی آواز آئی۔

میں دوسرے کمرے میں چلی آئی۔

خادمہ نے مجھے بتایا کہ اسرائیلی فوجی ہیں۔

میرا دل دھک سے ہوا۔ اسی سے پتا چلا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔

اندر کیا ہو رہا تھا؟ میرا دل سینے میں پھڑپھڑاتا تھا۔ کافی دیر بعد دروازہ کھلا۔ آنے والے جیپ میں بیٹھے اور چلے گئے۔ یشار اندر آیا۔ مجھے فق بیٹھے دیکھا۔ سینے سے لگایا اور بولا۔

”حد ہوگئی ہے۔ نارمل ہو جاؤ۔ لگتا ہے تمہارا دل جیسے ابھی اندر توڑ کر باہر آجائے گا۔“

اور جب میں نے کچھ جاننے کی کوشش کی اس نے رسان سے کہا۔ ”میں ڈاکٹر ہوں۔“

میرا اصرار حد سے بڑھا۔ اس نے کہا۔ ”مریض اگر اپنی بیماری کو راز میں رکھنے کا متمنی ہے تو ڈاکٹر کو اختیار نہیں کہ وہ اس کا پردہ فاش کرے۔“

پر میری حد سے بڑھی ضد پر بالآخر اسے بتانا پڑا۔

آنے والوں میں سے ایک اسرائیلی فضائیہ کا پائلٹ مسٹر پیری یاتم تھا۔ دوسرا اس کا دوست۔ اس پائلٹ کے ساتھ ایک گھمبیر مسئلہ ہوگیا۔ جونہی وہ کسی مشن پر جانے کے لیے جہاز اڑا کر فضا میں لاتا اس کے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ وہ اپنی بیماری ملٹری اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میڈیکل گراؤنڈ پر فوراً ایکشن ہو کر سارا کیریئر داؤ پر لگ جاتا تھا۔ یشار کے بارے میں سنا تھا۔ علاج کے لیے آیا تھا۔

اس کی پریشان کن بیماری نے صحت یاب ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں لیا تھا۔ یشار کا معتقد ہوگیا۔ اسرائیلی افسروں میں اس کی مسیحائی کا اچھا خاصا پرچار ہوا۔

یشار بے باک تھا۔ سچی بات کہنے سے اس کے منہ کو کوئی مصلحت روک نہیں سکتی تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار وہ اسرائیلیوں اور لیبر پارٹی کے ارکان سے الجھا تھا کہ وہ پرشیائی بن گئے ہیں۔ کل جوان کے ساتھ ہوا تھا وہی وہ فلسطینیوں کو لوٹا رہے ہیں۔ اس کا انجام جانتے ہو بہت خوفناک ہوگا۔ مت بھولو یہ سب جو بظاہر نظر آتا ہے اور جو تمہارے غلبے اور اقتدار کا شو آف ہے ایک دن تمہیں پاتال میں پھینک دے گا۔

ابھی بھی وقت ہے۔ کیا یہاں ایسی دو فلسطینی ریاستیں نہیں بن سکتی ہیں جو امن اور آشتی سے رہ سکیں۔

کچھ لوگ اگر اس کی ایسی باتوں پر خار کھاتے تھے تو وہیں چند ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔

مگر یہ ٹھیک سمجھنے والے تو آٹے میں نمک برابر تھے اور جو اس سے نفرت کرتے تھے بالآخر وہ اسے زمین کا رزق بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ تو ذرا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی معقول بہانے کی بھی

ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر میں کراچی میں تھی۔ یشار چھت پر تھا۔

موسم میں کچھ خنکی تھی۔ پتا نہیں میرا دل کیوں گھبرایا۔ میں نے ٹی وی کھولا۔ دو تین چینل بدلے۔ فلسطین کی بہت سریلی گلوکارہ خاتم السحر محمود درویش کی امر ہو جانے والی نظم گا رہی تھی۔

جیل بہت خوبصورت ہیں
باہر کی دنیا کے باغوں سے۔
ہم سے ہمارا وطن ہے اور وطن سے ہم ہیں۔
ہماری جنم بھومی، ہمارے اجداد کی
ہمارے بچوں کی، ہماری جنت۔
آؤ کہ ہم اپنے دشمنوں کو کبوتر کی غٹرغوں سنائیں۔
اگر وہ سننا چاہیں۔
آؤ کہ انہیں سپاہیوں کے ہیلمٹوں
پر پھول اگانا سکھائیں۔
اگر وہ سیکھنا چاہیں۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ روتے روتے جانے کب سوگئی۔ بس شور و غوغا سے آنکھ کھل گئی تھی۔ ساتھ کی چھت پر سوتا سارا خاندان ان کی وحشت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ یشار خون میں نہایا ہوا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں کا کہنا تھا کہ چند شرپسندوں نے ان پر گولیاں چلائی تھیں۔ ان کے تعاقب اور فائرنگ پر جوابی کارروائی میں یہ سب ہو گیا۔ اور جب وہ پائلٹ یاتم تعزیت کے لیے آیا میں نے کہا تھا۔

"مجھے بتاؤ میرے بچے بڑے ہو کر تم لوگوں سے انتقام نہیں لیں گے۔ ان کی پور پور میں جس نفرت کے بیج آج تم لوگ بو رہے ہو یہ کل فصل کی صورت میں پروان چڑھیں گے۔"

یاتم نے شرمندگی سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ میری طرف دیکھا اور بولا۔ "شاید آپ نہیں جانتیں۔ میں اسرائیلی ہوتے ہوئے بھی دوسرے درجے کا شہری ہوں کیونکہ میرا تعلق Sephardic Jews سے ہے۔ جو اگرچہ عبرانی جانتے ہیں مگر ہسپانوی النسل ہیں جو کیتھولک عیسائیوں کے اسپین پر قبضے کے بعد ان کے ظلم و ستم اور اپنا مذہب نہ تبدیل کرنے کے جرم میں ہجرتوں کے مسافر بنا دیے گئے۔ جائے پناہ ملی تو کہاں؟ مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں عراق تک اور بلغاریہ سے لے کر جنوب میں سوڈان تک۔ مسلم دنیا ہمارا ٹھکانہ بنی۔

اس کے اندر سے دکھ اور یاس میں لپٹی بڑی لمبی آہ نکلی تھی۔ ان کا تکبر، ان کا غرور اور ان کا ظلم انہیں ایک دن لے ڈوبے گا۔

اس نے سر جھکا لیا تھا۔

نظارت میں رہنے والی اپنی بہن کی جھولی میں اپنے دونوں بیٹے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا۔ "اپنے بیٹوں کے ساتھ انہیں بھی پال لینا۔ میں باہر جاتی ہوں تاکہ ان کے لیے بندوقوں اور پستولوں کا بندوبست کرسکوں۔"

"دیکھو یاد رکھنا اگر بندوقیں نہ ملیں تو پتھر اور ڈنڈے ضرور پکڑا دینا۔ مزاحمت کی تاریخ تو ضرور مرتب ہوگی۔"

رہا یہ ٹونی کلف جواب ابراہیم ہے، یہ تو یونہی پیچھے پڑ گیا تھا۔ محبت کرنے لگ گیا تھا۔ میرے پاس کیا تھا؟ اسلام سے متاثر تھا۔ میرے پیار میں الجھا تو سرتاپا اس چلن میں ڈوب گیا۔ شادی کے لیے جب اصرار بڑھا میں نے شرط رکھ دی کہ اگر تم سے میرے لڑکے ہوئے تو میں انہیں فلسطین بھیج دوں گی۔ اسے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔

دو بیٹے ہیں۔ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

وہ رک گئی تھی۔ چند لمحوں تک خلا میں دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں جذبات کا طوفان امنڈا ہوا تھا۔

"ابھی تھوڑی دیر قبل میں صلاح الدین ایوبی کے مزار پر تھی۔"

دنیا کے تہذیبی تصادم کے بھی کتنے جبر ہیں جو تاریخ کے سینے میں درج ہیں۔ ایک اس او چھے فرانسیسی جرنیل ہنری گورو کا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر مال غنیمت کے طور پر فرانس کو ملنے والے ملک شام کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے دمشق میں داخلے پر سب سے پہلا کام اس کا یہاں صلاح الدین کے مزار پر آنے، قبر پر کھڑے ہونے اور اپنی آواز کی پوری شدت سے چلا کر کہنے کا تھا۔

"صلاح الدین سنتے ہو۔ ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔ دیکھو، ہم نے سبز ہلالی پرچم کو سرنگوں کر دیا ہے۔ صلیب ایک بار پھر اپنے عروج پر ہے۔"

آنسو بہاتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

"تم نے یہ سب سنا اور چپ رہے۔ صلاح الدین بہت آرام کر لیا ہے تم نے، اب اٹھ جاؤ، صدی بیت گئی ہے۔ فلسطین کے بیٹے اور بیٹیاں بہت بے آبرو ہو گئی ہیں۔"

اپنی جان دے کر شکست کو فتح میں بدل دینے والے ایک باز کا قصہ

# آخری اڑان

شفقت محمود ساجد

میدانِ جنگ کا ایک عبرت اثر لیکن انوکھا قصہ جب ایک معمولی سے باز نے جس سے پوری پلٹن نفرت کرتی تھی مگر اس نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جاپانیوں کو اس طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا اور اتحادیوں کی فتح کا باعث ایک معمولی سا پرندہ بنے گا۔

---

سورج طلوع ہونے والا تھا۔ سارجنٹ او برائن عرشے پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ اس ساحل کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں انھیں جمع ہونا تھا۔ اچانک اسے ریلنگ پر پیٹر جھکا ہوا دکھائی دیا۔ سارجنٹ او برائن اس کے پاس گیا اور آہستگی سے کہا۔

''سنو...... لڑکے! اس شکرے کو تم پھر ساتھ لے آئے ہو ہم پکنک پر نہیں جا رہے ہیں۔ جنگ کا میدان سجانے جا رہے ہیں اس لیے یہ شوق بھلا دو۔ تم ہر وقت

اسے اپنے ہاتھ پر بجائے رکھتے ہو اور یہ بے وقوف چڑیا سر اونچا کیے بے تعلق سی بیٹھی رہتی ہے۔ اس کا یہاں موجود ہونا ناقابل برداشت ہے۔"

"ٹھیک ہے...... جناب!" پیٹر نے آہستگی سے کہا۔

"تم ہر بار یہی کہتے ہو۔"

پیٹر نے انگلی سے شکرے کی سیاہی مائل گردن کو سہلایا، وہ اس کی انگلی کا لمس محسوس کر کے پیٹر کے بائیں ہاتھ پر آ بیٹھا، جس پر پیٹر نے دستانہ پہن رکھا تھا۔

"دیکھیے جناب! اگر میں نے اسے چھوڑ دیا، تو یہ بھوکا مر جائے گا، شکرا ہمیشہ اپنے مالک کے ہاتھ ہی سے کھاتا ہے۔"

"بس چپ رہو!" سارجنٹ او برائن کو غصہ آ گیا۔ "تم پہلے بھی یہ سب کچھ کہہ چکے ہو۔ میں اس سے تنگ ہوں، ہر شخص اس سے تنگ ہے...... مجھے پتا ہے کہ پرندوں میں انسانوں کا دل موہ کر انہیں بے وقوف بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے، لیکن کوئی پرندہ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ تم اس مصیبت سے پیچھا چھڑا لو۔"

سارجنٹ او برائن اور اس کے ساتھیوں کا کام اس جزیرے پر موجود جاپانیوں کے ایئر بیس پر قبضہ کرنا تھا، جہاں اب وہ موجود تھے۔ سارجنٹ او برائن نے چند ساتھیوں کو جزیرے میں موجود درختوں کے جھنڈ سے کچھ پہلے خندقیں کھودنے کے کام پر لگا دیا اور خود کچھ ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھ کر اس ایئر بیس کے نقشے کا تفصیلی جائزہ بھی لے لیا تھا۔ سارجنٹ او برائن نے اپنے ساتھیوں کو اس طریقے سے پھیلا دیا تھا کہ جاپانی یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ وہ تعداد میں کتنے ہیں۔ اس حملے میں ان کی مدد B-25 بمبار طیارے بھی کرتے۔ سارجنٹ او برائن کے ذمے سب سے اہم کام یہ تھا کہ ان کے حملہ کرنے سے قبل جنگل میں چھپے ہوئے جاپانی کسی بھی طرح ایئر بیس تک اپنا کوئی پیغام نہ پہنچا سکیں۔

اس کام کے لیے اس نے اپنے تین جان باز ساتھیوں کو جنگل میں موجود دشمن کی اس چوکی کو تباہ کرنے کے لیے بھیج دیا تھا، جہاں سے وہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے سے ایئر بیس کو خبردار کر سکتے تھے۔ سب لوگ اپنے ان تین ساتھیوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک شاخ ٹوٹنے اور پنچے کچلنے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ تمام رائفلوں کا رخ ادھر ہو گیا، جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔

"جلدی نہ کرو...... ہم اپنے کسی نوجوان کا مرنا پسند نہیں کریں گے۔" سارجنٹ او برائن نے کہا۔

قدموں کی آہٹیں نزدیک آ رہی تھیں۔ اچانک ایک طرف موجود جھاڑیوں کے پیچھے سے لڑکھڑاتا ہوا پیٹر نکلا۔ سارجنٹ اور اس کے ساتھیوں نے بڑی مشکل سے اپنے قہقہوں پر قابو پایا۔ پیٹر کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے، اس کا لباس کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ بھی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی، بایاں ہاتھ پیٹر کے جسم کا وہ واحد حصہ تھا، جو کیچڑ سے محفوظ تھا اور بائیں ہاتھ کی مٹھی پر صاف ستھرا شکرا باوقار انداز میں بیٹھا تھا۔

"میرے خدا! اسے فوجی کہا جا سکتا ہے...... رائفل بھیگ جائے، لیکن شکرا نہ بھیگے۔" سارجنٹ او برائن بولا۔

"اور ہاں! باقی ساتھی کہاں ہیں؟" سارجنٹ او برائن نے پوچھا۔

"جناب! وہ بھی خیریت سے واپس آ رہے ہیں...... ہم نے آسانی سے چوکی میں پہنچ کر وہاں موجود دو فوجیوں کا کام تمام کر دیا اور ان کا ٹرانسمیٹر ناکارہ بنا دیا اب وہ اس لائق نہیں رہے کہ ایئر بیس تک کوئی پیغام بھیج سکیں۔" پیٹر بولا۔

"ٹھیک ہے، مگر تم اپنا حلیہ درست کرو۔"

"بہت اچھا...... جناب!" پیٹر بولا۔

اتنے میں سارجنٹ او برائن کو اپنے دو اور ساتھی دکھائی دے گئے۔

پیٹر نے شکرے کو ایک قریبی ٹہنی پر بٹھایا اور بولا۔ "جناب! رائفل کے متعلق میں شرمندہ ہوں، میں کیچڑ میں گر گیا تھا اور دونوں ہاتھ اوپر نہیں رکھ سکتا تھا۔"

"لیکن تم نے اس نامعقول پرندے کو بھیگنے نہیں دیا۔"

"جی ہاں...... جناب! پانی بڑا گندا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اسے یہ بات پسند نہ آتی۔"

پیٹر کی بات سن کر اس کے ساتھیوں اور سارجنٹ

## ضلعی حکومتوں کا نظام

چیف ایگزیکٹو اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ملک میں اختیار کی نچلی سطح پر منتقلی، حقیقی جمہوریت کے قیام اور عوام کو زیادہ سے زیادہ بااختیار بنانے کے لیے 14 اگست 2000ء کو ضلعی حکومتوں کے نئے نظام کا اعلان کیا اس نظام کے اہم نکات یہ ہیں۔

1۔ ضلعی حکومتوں کے نظام کے قیام کے لیے بلدیاتی انتخاب غیر جماعتی بنیادوں اور جداگانہ طرز پر کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

2۔ یونین، تحصیل اور ضلع کی سطح پر کونسل کا قیام تین سال کے لیے عمل میں لایا جائے گا۔

3۔ کونسلوں کے ناظم اور نائب ناظمین کے لیے تعلیم کی حد میٹرک مقرر کی گئی۔

4۔ یونین ناظم کے خلاف کوئی ممبر مواخذہ کی تحریک پیش نہ کر سکے، اگر یہ تحریک ناکام ہوگئی تو تحریک پیش کرنے والا رکن اپنی نشست کھو بیٹھے گا۔

5۔ مقامی حکومت میں خواتین کی نمائندگی 33 فیصد مقرر کی گئی۔ 5 فیصد نشستیں کسانوں اور مزدوروں کے لیے اور 5 فیصد اقلیتوں کے لیے مختص کی گئیں۔

6۔ یونین کونسلوں کے ارکان کے انتخابات براہ راست ہوں گے۔

7۔ خالی نشستوں پر ہر سال ضمنی انتخابات ہوں گے۔

8۔ وفاقی اور صوبائی دار الحکومتوں میں سٹی ڈسٹرکٹ نظام قائم کیا جائے گا۔

9۔ بلدیاتی انتخابات میں ووٹر کی عمر کی حد 18 سال مقرر کی گئی۔

اوبرائن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆......☆

سارجنٹ اوبرائن اس وقت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خندق میں موجود تھا۔ اس کی نظر بار بار اپنی گھڑی پر پڑ رہی تھی۔ منٹ گھسٹ گھسٹ کر گزر رہے تھے۔ سب کی نظروں کا مرکز آسمان بنا ہوا تھا۔ وہ B-25 بمبار طیاروں کا انتظار کر رہے تھے۔ جنگل میں نقل و حرکت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاپانی ابھی تک ائیر بیس سے کوئی رابطہ نہ قائم کر سکے تھے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے آسمان پر اڑتا ہوا کبوتر دیکھا۔ سارجنٹ نے دوربین سے جائزہ لیا اور چونک گیا۔ کبوتر کے پنجے میں چھلا تھا جس سے ظاہر تھا کہ وہ قاصد کبوتر ہے۔ وہ اپنے سفید پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ رہا تھا۔ وہ رائفلوں کی فائرنگ سے بڑا اونچا اڑ رہا تھا۔ اس حقیر قاصد کبوتر کی وجہ سے ان کی پوری مہم ناکام ہو سکتی تھی۔ اگر یہ کبوتر ائیر بیس تک پہنچ جاتا، تو ان کی تباہی یقینی تھی۔

''ارے! اسے کسی طرح روکو۔'' سارجنٹ نے کہا، تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

اچانک پیٹر ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر خندق سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے شکرے کی چونچ سے بڑ ہٹایا اور پھر پوری قوت سے اس طرف اچھال دیا، جہاں جاپانی قاصد کبوتر اڑ رہا تھا۔ پھر ان سب نے ایک منظر دیکھا۔ شکرے کے پر ہوا میں پھیلے اور ان کی امیدوں سے زیادہ رفتار سے آسمان کی طرف اڑتا رہا۔ چند لمحوں میں ہی وہ قاصد کبوتر کے بالکل اوپر پہنچ گیا تھا۔ تمام لوگ بہت بے چینی کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ کبوتر نے شکرے کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔ اس نے شکرے سے بچنے کے لیے سیدھی اڑان کے بجائے دائیں بائیں اڑنا شروع کر دیا اور کافی نیچے آ گیا۔ شکرے کا انداز پُر اعتماد تھا۔ وہ دائرہ کی صورت میں اڑتا ہوا کبوتر کے گرد حلقہ تنگ کر رہا تھا۔ دونوں پرندے ایک ساتھ اڑ رہے تھے۔ اچانک شکرے نے اپنی چونچ کا رخ زمین کی جانب کرتے ہوئے عمودی اڑان شروع کر دی۔ اس کے نوکیلے پنجے حملے کی حالت میں آ گئے۔ وہ تیزی سے اپنے ہدف کی طرف جھپٹا۔ اس کے

10۔ بلدیاتی انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار کے لیے عمر کی حد 25 سال رکھی گئی۔

11۔ تحصیل اور ضلع کونسلوں کے ناظم اور نائب ناظم کو پچاس فیصد ووٹ حاصل کرنے ہوں گے، اگر انتخابی عمل میں کوئی اُمیدوار پچاس فیصد نہ لے سکا، تو وہاں دوبارہ انتخاب کرائے جائیں گے۔

12۔ امیدوار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے کردار کا مالک ہو اور اسے اسلامی تعلیمات سے آگاہی ہو۔

حکومت پاکستان نے اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کے لیے 14 اگست 2001ء سے ملک بھر میں کمشنریوں کا نظام ختم کر کے ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے نظام کو رواج دیا۔ نئے نظام کے تحت ضلعی حکومت، ضلع ناظم اور ضلعی انتظامیہ پر مشتمل ہے۔ اسے کوئی بھی جائداد حاصل کرنے، اسے اپنے پاس رکھنے اور اسے منتقل کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ خواہ وہ جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ اور وہ اس بارے میں معاہدے کرنے کی اہل ہے اور وہ ضلعی رابطہ آفیسر (D.C.O) کے ذریعے دعویٰ دائر کرنے کی بھی اہل ہے اور اس پر بھی دعویٰ دائر کیا جاسکتا ہے۔

2001ء میں حکومت پنجاب نے جو آرڈی نینس جاری کیا اس کے تحت (1) حکومتی دفاتر کے انتظامی اور مالی اختیارات ان اضلاع کو ہو جائیں گے، جن کا ذکر جدول اول کے حصہ اے میں مخصوص کیے گئے ہیں اور ان کی مرکزیت ضلعی حکومت کو ہو جائے گی، مگر شرط یہ ہے کہ جہاں جدول اول کے حصہ اے میں تصریح کردہ دفاتر میں سے حکومت کا کوئی دفتر نہ ہو اور حکومت اپنا دفتر قائم کرتی ہے تو ایسا دفتر بھی اسی تاریخ سے ضلعی حکومت کو منتقل ہو جائے گا۔ (2) جب کسی ضلع میں ایسا کوئی دفتر موجود نہ ہو جس کا ذکر جدول اول کے حصہ ۲ میں کیا گیا ہے تو حکومت ایسے دفاتر قائم کرے گی اور اس میں افسران اور اسٹاف کا تقرر کیا جائے گا۔ آرڈی نینس ہذا کے تحت 31 محکمے ضلعی حکومتوں کے ماتحت ہوں گے۔ یہ براہِ راست ضلعی حکومت کے زیرِ نگرانی کام کریں گے، جب کہ 16 محکموں کے کچھ حصے ضلعی حکومتوں کے ماتحت ہوں گے۔

مرسلہ: سیاحت خان

پنجے شکار کے جسم میں اتر گئے۔ پھر شکرے نے فتح مندانہ انداز میں اپنے پر پھڑ پھڑائے اور نیچے اترنے لگا۔ خندقوں میں بیٹھے ہوئے فوجیوں کے نعروں کی گونج آسمان تک جا پہنچی۔

سارجنٹ او برائن نے اپنے ماتھے سے بہتا ہوا پسینا پونچھا اور بولا۔ ''لڑکے! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، یہ بلبل ہرگز نہیں۔''

لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ایک اور قاصد کبوتر دیکھا، جو جنگل سے فضا میں بلند ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر پیٹر نے دوبارہ سیٹی بجائی، لیکن اس کی سیٹی میں صاف تھرتھراہٹ موجود تھی۔ نیچے کی طرف اڑتے ہوئے شکرے نے سیٹی کی آواز سن کر اپنی اوڑان روک لی۔ اس کے پروں نے تیز ہوا کو کاٹا اور اپنے شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ فضا میں اوپر اٹھ گیا۔

''میرا خیال تھا کہ انھیں صرف ایک بار اڑایا جاتا ہے۔'' سارجنٹ او برائن نے کہا۔

''بالکل...... جناب!'' پیٹر نے آہستگی سے کہا۔

''اب مقابلہ ایک تھکے ہوئے شکرے اور تازہ دم کبوتر کے بیچ ہے...... امکانات کم ہیں کہ وہ اسے شکار کر سکے۔'' پیٹر کا لہجہ ٹوٹ گیا تھا۔

خندقوں میں لیٹے ہوئے تمام فوجی، جن میں ایسے بھی تھے، جنھیں پیٹر اور شکرے کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا، یہ غیر متوازن مقابلہ دیکھ رہے تھے، لیکن انھیں پتا تھا کہ شکرا ان کا حلیف ہے۔ پیٹر کا شکرا اپنے متوقع شکار کے بالکل اوپر بلندی پر پہنچ گیا۔ اس کے پر آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ آخری حملے کے لیے توانائی بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ شکرے کی یہ اڑان توانائی اور تیزی سے خالی تھی۔ وہ اس لمحے کے انتظار میں اپنی توانائیوں کو محفوظ رکھ رہا تھا، جب وہ اپنے شکار پر فیصلہ کن حملہ کرنے کی حالت میں آئے گا۔

دھیرے دھیرے اس نے کبوتر اور اپنے بیچ افقی فاصلہ کم کیا اور دائرے کی صورت میں اڑان شروع کر دی۔ تازہ دم کبوتر دائیں بائیں جھکائی دیتے ہوئے اڑ رہا تھا۔ شکرے کا بھی رفتار بڑھانا،

بھی کم کرنا اور جھپٹنے میں ہچکچاہٹ صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی کہ اس کی توانائیاں دم توڑ رہی ہیں اور اس کے دل پر ناقابل برداشت دباؤ پڑ رہا ہے، تاہم اس نے کبوتر کو نہ صرف آگے بڑھنے سے روک دیا، بلکہ پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ خندقوں میں لیٹے ہوئے سپاہیوں کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ یہ ان سب کے لیے زندگی اور موت کی جنگ تھی، جو اوپر فضا میں دو پرندوں کے بیچ ہو رہی تھی۔ ان کے دل بھی اس شکرے کی طرح ڈوبے جا رہے تھے، جو تیز ترین انداز میں جھپٹنا چاہتا تھا۔

اچانک نیلے آسمان سے ایک سایا سا لپکا۔ اس کی پرواز نیچے کی جانب عمودی تھی۔ اس کے پنجے حملے کی حالت میں آ چکے تھے۔ وہ اپنی انتہائی رفتار سے جھپٹ رہا تھا۔ کبوتر نے اچانک اپنی رفتار کم کر دی۔ وہ ٹھہر سا گیا۔ شکرا اپنے زور میں نیچے اور نیچے گرتا چلا گیا۔ اسے اپنا ہدف نہیں مل سکا تھا۔ شکرے نے سنبھلنے کی کوشش کی تاکہ نیچے جانے کے بجائے اپنی اڑان جاری رکھ سکے۔ اس کی قوتیں جواب دے رہی تھیں۔ کچھ دور سے B-25 بمبار طیاروں کی چنگھاڑ منصوبے کے مطابق اپنی آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔

سارجنٹ او برائن چیخا۔

”پیٹر! اسے واپس بلالو...... طیارے آ چکے ہیں۔“

”اس تک میری آواز نہیں جا سکتی اور اگر چلی بھی گئی، تو وہ واپس نہیں آئے گا...... احکامات کی تعمیل کرنا اس کی فطرت ہے۔“ پیٹر بولا۔

دل پر بڑھتے ہوئے شدید دباؤ کے باوجود شکرا ایک بار پھر بلند ہوا اور ضدی انداز میں دائروں کی صورت میں اڑتا رہا۔ آخر کار وہ تازہ دم کبوتر کے اوپر پہنچ گیا۔ نیچے لیٹے ہوئے نوجوانوں کے سینے شکرے کے دم توڑتے اور حرارت سے محروم ہوتے دل کے بوجھ سے چیخنے لگے۔ وہ سب جانتے تھے کہ اس بار کی ناکامی سے وہ سنبھل نہیں پائے گا۔

اتنے میں بمبار طیارے بھی دکھائی دینے لگے، مگر سب شکرے کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ شکرا ایک بار پھر پوری توانائی سے کبوتر پر جھپٹا۔ کبوتر نے پھر وہی چال چلی۔ خود کو ناکام ہوتا دیکھ کر مایوسی کے عالم میں عمودی انداز میں ہوتے ہوئے اس نے پنجوں کو حرکت دی اور اس کے پنجے کبوتر کی پشت میں اتر گئے۔

خندق میں لیٹے ہوئے فوجیوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

سارجنٹ او برائن چیخا۔ ”جیت گیا...... اس نے شکار کر لیا۔“

لیکن پیٹر کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہ ہو۔ اسے شکرا اپنے قیدی شکار کے ہمراہ بے بسی سے گرتا دکھائی دیا۔ پیٹر بے تابی سے جنگل کی سمت بڑھا، اسے جنگل میں موجود جاپانیوں کا بھی ڈر نہ رہا۔

تھوڑی دیر بعد ان سب نے اسے زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھے دیکھا۔ وہ بڑی نرمی اور محبت سے مردہ شکرے سے باتیں کر رہا تھا۔

سارجنٹ او برائن بھی گھٹنے ٹیک کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا۔ ”جوان! تمہارا پرندہ شیر دل تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک حقیقی اور عظیم جنگجو ثابت کیا ہے۔“

B-25 بمبار طیاروں نے جاپانی مورچوں کو ختم کر دیا تھا۔ اتحادی منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا۔ جزیرے پر اب ان کا قبضہ تھا۔

”پیٹر!“ سارجنٹ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اگر تم اجازت دو، تو کمپنی کے جوان تمھیں اپنا نشان شکرا پیش کریں گے۔ تمہارے شکرے نے ہمیں لڑنے کے چند انداز سکھا دیے ہیں، ہم انھیں بھولنا پسند نہیں کریں گے۔“

پیٹر کچھ نہ سمجھ سکا۔

سارجنٹ او برائن نے اس کے بازو تھپ تھپاتے ہوئے دل گداز لہجے میں کہا۔ ”کاش! میں وقت آنے پر اس پرندے کے مقابلے میں نصف بہادری بھی دکھا سکوں، تو وہ بھی بڑا کارنامہ ہوگا۔“

اچانک پیٹر کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ اس نے مردہ پرندے کو تھپ تھپایا اور بولا۔ ”سنا تم نے شاہین!“

پھر اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر پرندے کے پروں میں جذب ہو گئے۔

# شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا ساتواں حصہ

میں نے کمپیوٹر اسکرین پر جھک کر دیکھا لیکن اسکرین پر وہی کچھ آ رہا تھا جسے حقیقت کہہ سکتے ہیں۔ میں نے پھر نمبر انٹر کیا مگر دوسرے مرحلے میں بھی ناک آوٹ ہو گیا کیونکہ میرا یہاں کینیڈا میں کوئی کریڈٹ ہی نہ تھا اور میں کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے کا اہل ہی نہ تھا۔ یہ سب جانچ کر اس نے عزت سے ہمیں چلتا کیا۔ ہم اسٹور سے شرمندہ شرمندہ سے باہر نکل آئے۔

اپارٹمنٹ تک دس منٹ کی واک تھی اور وہی یخ جکڑ

چل رہے تھے کہ ہواؤں اب سردی اور ٹھنڈک کا احساس نہ تھا۔

ہم سر جھکائے خیالوں میں کھوئے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ قدم اٹھ رہے ہوں تو منزل آ ہی جاتی ہے۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی ہم بستر پر گر پڑے۔

سحری کے لیے اٹھا تو دیکھا کہ سرجی نے سحری کا بندوبست کر رکھا ہے اور وہ اب دستر خوان لگا رہے تھے۔ اب تو پاکستانی ٹی وی چینل پورے نارتھ امریکا میں دیکھے جاتے ہیں۔ سحری کا وقت ہر چینل متواتر بتا تا رہتا ہے اور ساتھ رنگ و نور کی محفلیں دیکھی جا رہی ہوتی ہیں۔ ان دنوں یہ رونقیں نہ تھیں۔ ہم ایک علیحدہ اور خاموش ماحول میں سحری کرتے تھے۔ خاموش اور اداس بیٹھے یہ فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ اس روز تو سرجی نے اپنی بھرپور توانیاں سرف کر دی تھیں۔ ہمیں آملیٹ، دہی اور دودھ پیش کیا تھا۔

خان قیصر کی فیملی آ چکی تھی۔ وہ لوگ چودھری قدوس کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ چودھری صاحب کا ذکر پہلے بھی ہو چکا تھا۔ ان کو سب چودھری کے نام سے پکارتے ہیں۔ خان کا سارا سامان جو دس پندرہ کارٹن پر مشتمل تھا، وہ ہمارے کمرے میں پڑا تھا۔ صرف میٹرس کی جگہ بچ گئی تھی۔ یہ سامان ہمیں خان کے اپارٹمنٹ پہنچانا تھا۔ شہباز نے میرے کان میں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں اس سیاپے میں نہیں پڑوں گا۔ اسی لیے وہ آج ماموں کے گھر فرار ہونے والا تھا۔ سحری کے وقت ہم تین ہی اس اپارٹمنٹ میں تھے۔ سرجی بار بار ڈور وال کے پردوں میں منہ ڈال کر باہر جھانک لیتے کیونکہ رات سے متواتر برف گر رہی تھی۔

آج کا دن اپارٹمنٹ میں ہی گزارنا تھا۔ میرا سیکیورٹی کا پرمٹ بننے کے لیے ویکن ہٹ والوں نے بھیج دیا تھا اور کہتے تھے کہ جلد بن کر آ جائے گا۔ جب یہ کارڈ آ جاتا تو کمپنی مجھے کسی بھی جگہ گارڈ کی جاب کے لیے بھیج سکتی تھی۔ سیکیورٹی کمپنی کے کلائنٹ یا ان کی سروس سے مستفید ہونے والے، زیادہ تر اپارٹمنٹ بلڈنگز، بینک، لائبریری، ائیرپورٹ، امیگریشن ہولڈنگ سینٹر جہاں غیر قانونی تارکین وطن کو رکھا جاتا ہے، تھے۔ ہولڈنگ سینٹر ایک قسم کا معیاری قید خانہ ہوتا ہے۔ یہاں رکھے گئے لوگوں کو یا تو ٹھہرنے کی اجازت مل جاتی ہے یا پھر واپس ان کے ملکوں کو ڈی پورٹ کر دیا جاتا ہے۔ سیکیورٹی گارڈ کی جاب کے لیے سب سے اہم اور ترغیب آمیز جگہ یہی ہولڈنگ سینٹر ہوتی ہے۔ ایک تو یہاں تنخواہ اچھی ملتی ہے اور دوسرا آنے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ کام کوئی خاص نہیں ہوتا۔ بس آپ کو ان قیدی تارکین وطن پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔ وہ لنچ روم میں بیٹھے ہیں تو آپ آرام سے بیٹھ کر ان کو دیکھتے رہیں۔ ایک آدھ گھنٹے کے لیے انہیں گراؤنڈ میں لے جائیں، جہاں وہ کسی قسم کی جسمانی ورزش کر سکتے ہیں۔

مجھے شدت سے انتظار تھا کہ کب میرا پرمٹ بن کر آتا ہے۔ شہباز اپنے ماموں کے گھر کھسک گیا تھا۔ خان کے گھر کا سامان جو ہمارے اپارٹمنٹ میں پڑا تھا، شہباز خان کے اپارٹمنٹ کو منتقل کرنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ میں اور سرجی نے روزے کی حالت میں وہ بھاری ڈبے خان کے اپارٹمنٹ میں شفٹ کیے اس بیگار میں تین گھنٹے لگ گئے۔ جسم درد اور تھکن سے ٹوٹنے لگا لیکن سرجی نے کوئی آہ و بکاہ نہ کی۔ ایک آدھ بار زیر لب میرے پاس آ کر منمنائے۔ ”سرجی! تھوڑی سی تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ اگر رات کو گرم دودھ جلیبیاں مل جائیں تو یہ بھی دور ہو سکتی ہے۔“

میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ہم اپنے اپارٹمنٹ سے سامان اٹھا کر شدید ہواؤں میں باہر نکلتے اور سامنے والی بلڈنگ کو جانے کے لیے برف سے ڈھکا لان عبور کر کے لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر اپارٹمنٹ کے دروازے تک چھوڑ آتے۔ میں پسینے پسینے ہو گیا تھا اور سرجی کہتے تھے کہ ذرا سی تھکاوٹ ہو گئی ہے۔ دراصل انہیں کبھی کسی بھی بات سے شکایت نہ ہوتی تھی۔ میری حالت دیکھ کر کہنے لگے۔ ”رات کو اگر آپ بھی دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھائیں گے تو یہ تھکاوٹ ختم ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”سنا ہے کہ ان کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور اس تاثیر کو کم کرنے کے لیے بھی کوئی جلیبی چاہیے۔“ فرمانے لگے۔ ”اگر آپ کوئی خلاف شریعت بات نہیں کر رہے تو یہ بتا دوں کہ اتنی گرم تاثیر نہیں ہوتی جتنا مشہور ہو گیا ہے۔“ میں ہنس پڑا تو پھر سے فرمایا۔ ”میں قسم اٹھا سکتا ہوں۔“

ہمیں اس بیگار سے نجات ملی تو بستر پر ڈھے سے گئے۔ ابھی ہم اس بیگار سے نڈھال ہو کر بے سدھ پڑے تھے کہ فون ایک دم چنگھاڑا۔ سرجی نے لپک کر اٹھایا اور پھر کچھ سن کر مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ ”کسی اشوک کمار کا فون ہے۔ کہہ رہا ہے کہ میں کیمن سنٹر سے بات کر رہا ہوں۔“

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اس نے انہی دنوں فون کرنے کا کہا تھا۔ ہمیں کینیڈا کا نظام سمجھنے، یہاں انٹرویو دینے کی

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تربیت اور Rasume بنانے کے لیے ٹریننگ کی خاص ضرورت تھی اور یہ سارا کام یہ لوگ بلا معاوضہ کرتے تھے۔ اشوک سلیس اردو میں کہہ رہا تھا۔ ”ندیم بھائی! کل آپ لوگ آجائیں۔ آپ کی انگلش کا ٹیسٹ ہوگا اور اگر آپ پاس کر جاتے ہیں تو اگلے ماہ دس جنوری سے کلاسیں شروع ہوجائیں گی۔“

اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ فراغت اور ڈپریشن کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ مصروفیت اور بھاگ دوڑ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ اصل امتحان اب میرے سامنے آکھڑا تھا کہ کس طرح میں اس کٹھن وقت سے گزرتا ہوں۔ مجھے اللہ کی مدد پر پورا بھروسا تھا اور میں نے اسی بھروسے پر اپنی کمر کسنے کی تیاری کرلی تھی۔

ٹورنٹو میں پاکستان کے بارے میں آگاہی صرف ان اردو اخبارات سے ملتی تھی جو ہر ہفتے چھپتے اور ہر حلال گوشت کی دکان یا کسی دیسی گروسری شاپ پر پڑے ملتے جو مفت میں بانٹے جاتے تھے۔ ہفتے میں ایک دن کسی ویگن میں اخبار ڈالے، پاکستانی ہر اسٹور پر مطلوبہ تعداد میں اخبار رکھ جایا کرتے تھے۔ ہم جب گروسری کے لیے جاتے تو اپنے لیے یا کسی دوست کے لیے بھی اخبار اٹھا لاتے۔ اس اخبار کا مواد پاکستان کے اخباروں کے کالم، مضامین اور شہ سرخیوں پر مشتمل ہوتا۔ صفحے بہت زیادہ ہوتے اور ہم میں سے ہر کوئی اسے چاٹ چاٹ کر پڑھتا۔ ان کی مقبولیت کی وجہ سے اس کو مقامی اشتہار بھی ملا کرتے۔ ان دنوں ایک ہی اخبار آتا تھا جو ”پاکیزہ“ کے نام سے مشہور تھا۔ میں حیران ہوتا کہ اخبار والے اپنے ڈالر لگا کر اور اتنی محنت کر کے اخبار مفت میں کیسے بانٹ دیتے ہیں۔ بعد میں کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ کینیڈا کی حکومت ہر ملک کے تارکین وطن کو سہولتیں دینے کی خاطر ایسے اخباروں کی حوصلہ افزائی کے لیے اچھا خاصا فنڈ دیتی ہے اور کچھ پیسے اشتہاروں سے بن جاتے ہیں۔ اس طرح یہ کاروبار ایسے پھولا کہ آج کل ایسے کئی اخبار نکلنا شروع ہوگئے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنا یہ کاروبار شروع کیا، وہ آجکل سینئر صحافی کہلائے جاتے ہیں اور اکثر ٹی وی پر تبصرے کرتے بھی پائے جارہے ہیں۔ کئی ایک نے ریڈیو کے ایف-ایم چینل کھول رکھے ہیں، فنڈنگ حکومت سے مل جاتی ہے۔ صحافت ایک اچھا پیشہ ہے جو اب دھندا بن چکا ہے۔ سب نہیں مگر بہت سے لوگوں نے گھناؤنے چہروں پر صحافی کے لیبل لگا لیے ہیں اور خوب پیسے بناتے ہیں۔ میں اس پر کیا لکھوں۔ کیونکہ اب عوام سوشل میڈیا کے ذریعے ان کے اصلی روپ دیکھ چکے ہیں۔

خیر جناب اس وقت بھی اخبار ہمارے لیے پاکستانی خبروں کے حوالے سے اہم تھے۔ اس لیے ہم بھی یہی اخبار اٹھا لاتے تھے اور آج میں فارغ تھا اور اسی اخبار کو کھنگال رہا تھا۔ اچانک ایک اشتہار پر نظر پڑی جس میں لکھا تھا کہ ہم آپ کو اپنے مطلب اور اہلیت کی جاب دلانے میں مدد کریں گے اور جاب دلانے کی ایک ماہ کی گارنٹی دیتے ہیں۔ اپنے تئیں میں اہل تو سب سے زیادہ تھا اور جاب بھی میرے پاس نہ تھی اسی لیے دیے گئے نمبر پر فون ملایا، ایک بھاری بھرکم آواز میں کوئی انگریزی زبان میں بات کررہا تھا۔

کمپنی کا نام راجر (Rajor) تھا۔ میں نے اپنی تعلیم اور تجربہ بتایا اور اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ایک ماہ کے اندر تمہارے پاس اپنے مطلب کی جاب ہوگی اور تو اور اس نے پیشگی مبارکباد بھی دے دی جو میں نے دل کی انتہا گہرائیوں سے قبول کرلی۔ اس نے مجھ سے انٹرویو کا وقت مانگا، جو مروجہ اصولوں کے مطابق مجھے مانگنا چاہیے تھا۔ کل صبح ہمیں کین والوں کے پاس اپنی کلاسز کا انٹرویو دینا تھا اور میں نے کل شام ہی ملنے کا بتادیا۔ اس نے پہلے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر مجھے ڈاؤن ٹاؤن کا ایک پتا لکھوایا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح ایک اچھی جاب بھی مل جائے گی اور پہلی بار ٹورنٹو کا ڈاؤن ٹاؤن بھی دیکھ لوں گا۔

شہباز فخری ماموں کے گھر سے ابھی واپس آیا تھا اور اپنے والد جمیل فخری کے انداز میں کمرے میں کھڑا کمر پر ہاتھ رکھے معائنہ کرنے کے انداز میں نظریں اِدھر اُدھر گھما رہا تھا۔ اس کے لوٹ آنے کی وجہ وہ کال تھی جو میں نے اس کے ماموں کے گھر کی تھی۔ فون پر اسے بتایا تھا کہ خان کا سارا سامان شفٹ ہوگیا ہے۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ باہر جھکڑ چل رہے تھے اور گرتے برف کے گالے ہواؤں کے ساتھ فضا میں تیر رہے تھے۔ ایسے موسم میں سرجی سے جو توقع تھی وہ وہی کررہے تھے۔ وہ ڈور وال کا پردہ کھسکا کر اپنی ذہنی نشست پر براجمان تھے۔ باہر کے موسم سے اندر بیٹھے لطف اندوز ہورہے تھے۔

شہباز نے پوچھا۔ ”سرجی! پھر باہر کیا دیکھ رہے ہیں؟“

وہ بولے۔ ”بڑی چنچل ہوا چل رہی ہے۔“

”تیرا بیڑہ تر جائے سرجی۔ باہر کا درجۂ حرارت اب منفی تیس ہے۔ ونڈ چل (Wind Chill) سے سڑکیں ویران

ہیں۔ کوئی آدھا منٹ باہر کھڑا ہو جائے تو کھولتے پانی میں بھی ڈال لو تو خون نہیں پگھلے گا اور آپ کی نظر میں چنچل ہوا چل رہی ہے؟" شہباز کا چہرہ کرب سے زرد تھا کیونکہ وہ ابھی باہر کی منجمد سردی سے ہو کر اندر آیا تھا اور اس کی جیکٹ برف سے سفید ہو رہی تھی۔

سرجی پھر گویا ہوئے۔ "اگر اتنی سردی ہے تو آپ کو پسینا کیوں آ رہا ہے؟"

"مجھے تو بیماری ہے مگر آپ کو کیا عارضہ لاحق ہے۔"

شہباز اب غصے میں اور زیادہ زرد ہو رہا تھا۔

اپنی بقا کی جنگ...... اپنا مستقبل بنانے کی جدوجہد۔ ہم مختلف قسم کی ذہنی حالتوں سے گزر رہے تھے۔ ہر وقت ذہنی دباؤ کی حالت میں رہتے تھے۔ کبھی کبھار کسی اُمید پر خوش ہو جایا کرتے تھے۔ تو کبھی غضب ناک مگر سرجی ایک ہی ذہنی حالت میں رہتے تھے اور ان کی حالت کسی پرسکوں سمندر کی مانند تھی کوئی کسی کے اندر جھانک نہیں سکتا اس لیے ہمیں بھی معلوم نہ تھا کہ اس پرسکون سمندر کی تہہ میں کیا کیا مدوجزر ابھر رہے ہیں۔

میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ جب بھی شہباز کسی صدمے سے دوچار ہوتا یا غصے میں جلتا ہوتا تو اس کا چہرہ سرخ ہونے کے بجائے زرد پڑ جاتا تھا...... اور سرجی اس کو ایک دوبار یہ مشورہ دے کر اسے زیادہ زرد کر چکے تھے کہ دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھائیں تو بہت افاقہ ہوگا۔ یہی مشورہ سرجی نے اسے پھر دیا تو شہباز پنجابی میں شروع ہو گیا۔ کھل کر بولا اور جو بولا وہ غیر پارلیمانی الفاظ تھے جو لکھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی گالیاں سرجی کو نہیں بلکہ ان جھکڑوں کو تھیں جنہوں نے باہر اودھم مچایا ہوا تھا مگر سرجی خاموش نہ رہ سکے کراہ کر پھر بولے۔ "آپ ناشائستہ زبان ادا کر رہے ہیں۔" شہباز کے کلمات سرجی کے لیے نہیں بلکہ باہر سرپٹختے جھکڑوں کو تھے جنہوں نے باہر اودھم مچایا ہوا تھا مگر سرجی شکایت بھرے لہجے میں پھر بولے۔ "کہوں بیٹی کو اور سناؤں بہو کو۔"

شہباز بے بسی سے اپنے آپ کو کوستا ہوا کارپٹ پر ہمیشہ کی طرح پھر سے ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے دن میں اور شہباز کین کے دفتر جانے کے لیے نکلے۔ صبح صبح نکلے تھے۔ رات کی شدید برف باری نے پورے علاقے کا حشر نشر کر دیا تھا۔ برف کے ڈھیر لگے تھے۔ سحری کے وقت برف باری رک گئی تھی اور برف کے ہٹانے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر پڑی برف کو ہٹا کر سائیڈ کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ برف کے پہاڑ کھڑے تھے۔ شام تک کئی سنو مین بنا دیے گئے تھے۔ ہم نے بس پکڑی جس نے ہمیں کپلنگ اسٹیشن پر اتار دیا۔ وہاں سے ہمیں جنوب کی طرف اونٹاریو لیک کو جاتی ایک اور بس لی جس نے ہمیں کین کے دفتر کے آس پاس اتارا تھا۔ ہم ٹھٹھرتے، کانپتے جب کین کے دفتر کا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر گرم ماحول میں داخل ہوئے تو اشوک استقبالیہ کاؤنٹر کے پیچھے اداس کھڑا تھا۔ ہمیں تپاک سے مسکرا کر ملا اور پھر دوبارہ سے اداسی کی چادر اوڑھ لی۔

میں نے پوچھا۔ "اشوک بھائی! خیریت تو ہے؟ یہ آج اداسی کیسی طاری کر رکھی ہے۔"

میرے پوچھنے پر وہ پھٹ پڑا۔ "یار مجھے واپس انڈیا جانا ہے۔ یہ ملک ہمارے لیے نہیں ہے۔ بچے کہنا نہیں مانتے۔ کچھ کہو تو پولیس بلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ کوئی عزت نہیں ہے یہاں۔" یہ کہتے ہوئے ایک نمی سی اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔

شہباز یہ سب سن کر بول پڑا۔ "یہی تو میں بھی ندیم سے کہتا ہوں...... برا پھنسایا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔ واپس چلتے ہیں۔" جملے کو روک کر اس نے سانس لی اور بولا۔ "مگر یہ کہتا ہے کہ بڑی بے عزتی ہوگی۔" پھر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے تو کم ہوگی جتنی اشوک بھائی کی ہو رہی ہے۔"

اشوک نے اس کی بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر ہمیں الزبتھ کے سپرد کر دیا، جو ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

اب ہم اس کے سامنے بیٹھے۔ مسکراتی الزبتھ کو دیکھ رہے تھے۔ چالیس سے قریب لگی، پرکشش الزبتھ ہمارا انٹرویو کر رہی تھی۔ اسکرٹ اور اسی رنگ کی براؤن شرٹ میں ملبوس الزبتھ نے اپنے بھورے بال شانوں تک کٹوا رکھے تھے۔ وہ ہمیں دلاسہ دیتی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور ہم اسے الفت کی نگاہوں سے جانچ رہے تھے۔ وہ ہماری انگریزی بولنے کا معیار پرکھتی تھی اور ہم اس کی چمکتی آنکھوں، دمکتے چہرے اور مسکراتے لبوں سے نکلتے شعلوں سے جھلستے تھے۔ ہم لہر میں آ کر فر فر انگریزی بولنے لگے تھے۔ وہ بولی کہ آپ لوگوں کی انگریزی بہت اچھی ہے تو پھر آپ یہاں کی کلاس کیوں لینا چاہتے ہیں؟ پھر معلوم ہوا کہ جتنی خراب انگریزی ہوگی اتنا ہی منتخب ہونے کا امکان زیادہ ہوگا۔ اور پھر ہم غلط سلط بولنے لگے اور منتخب کر لیے گئے۔ اس نے کہا کہ دو ہفتے بعد دس جنوری سے کلاسیں شروع ہوں گی۔ آپ کا Resume بنوایا جائے

گا۔ کینیڈا میں کیا چلتا ہے اور کیا رد کیا جاتا ہے اس بارے میں آپ کو بتایا جائے گا۔ آپ نے انٹرویو اگر کہیں دینا ہے تو کس طرح سے اپنے آپ کو پیش کریں گے۔ آپ کے کیا حقوق ہیں اور کیا فرائض ہیں، ان کے بارے میں بتایا جائے گا۔ اور بھی وہ بہت کچھ فرماتی رہی اور جب یہ کہا کہ وہ ہماری ٹیچر بھی ہوں گی تو ہم نے اس خبر کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا اور دل میں اللہ کے بھی بہت شکر گزار ہوئے۔

البرٹھ کے دربار سے کامیاب و کامران نکلے تو ہمارے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ اشوک نے وجہ پوچھی تو شہباز بولا۔ ''بس کام ہو گیا۔''

اشوک حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا کہ کیسا کام ہو گیا ہے، جس پر یہ دونوں پردیسی پھولے نہیں سما رہے۔ خوش ہونے کی کوئی وجہ ہمارے پاس بھی نہ تھی۔ بس ایک خوبصورت محفل کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

وہاں سے باہر نکلے تو اندر کی البرٹھ سے قربت کی حدت ایک دم سے ہوا ہوگئی اور باہر جمی برفیلی ہوا نے ہمیں ایک بار پھر سے دبوچ لیا۔ ہم پھر سے کانپنے پر غور کرنے لگے۔ لیکن وقت کم تھا سردی سے لڑنے کے پروگرام کو کسی اور وقت پر اٹھا رکھا اور آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنے لگے۔ بالآخر اس فیصلے پر پہنچ گئے کہ آج ہیلتھ کارڈ کے لیے بھی فارم جمع کروا دیتے ہیں۔ فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرد و تند ہوا اور برف کے ذروں سے لڑنے کے لیے کمر بستہ ہو کر بس اسٹاپ کو چل دیے ہم باہر نکل آئے تو ہماری کمر ''بستہ'' ہونے کی بجائے دوہری ہوگئی۔ منفی 25 کی سرد ہوا نے مزاج پوچھا مگر ہم ڈرنے والے نہ تھے۔ سینہ سپر ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ مفلر سے چہرے کو چھپا لیا تاکہ ہوا پہچان کر مزید ستم نہ ڈھائے۔ ہم ٹھہرے گرم میدانی علاقوں کے لوگ اس لیے بھی برفانی ہوا کو اپنا چہرہ دکھانے سے ڈر گئے تھے۔ شہباز نے سردی سے سکڑتے ہوئے کہا۔ ''یار! ایک غلطی ہوگئی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس موسم میں سرجی کو کھینچ لاتے اور کھلی سڑک پر کھڑا کر کے کہتے دیکھیں خوب دیکھیں، برف باری دیکھیں۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی میں ہنسی روک نہ سکا۔ پھر بولا۔

''کچھ بھی کہو اپنے سرجی مجسم معصومیت کے پیکر ہیں۔''

''نرا سیاپا ہے۔'' کہہ کر شہباز نے قدم تیز کر دیے اور بس اسٹینڈ کے شیڈ تلے پہنچ کر ہی رکا۔ پھر بسیں بدل بدل کر ہم کلیریکا بلڈنگ پہنچے۔ جہاں مین پاور والوں کا دفتر تھا، ہم پہلے آ چکے تھے۔ انہوں نے فون کر کے ہمیں پھر دوبارہ بلایا بھی تھا۔ میں نے شہباز سے کہا کہ یہاں تک آ چکے ہیں۔ ہیلتھ کارڈ کا بھی کام ہو گیا ہے تو کیوں نہ مین پاور والوں کے پاس بھی چکر لگا لیں۔

شہباز کہنے لگا۔ ''میں نہیں جاتا...... اب البرٹھ ہی کچھ کرے گی۔ اور وہی میری امیدوں کا اب مرکز ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے زرد چہرے پر ایک لمحے کے لیے سرخی سی لہرا گئی۔

شام اترنے میں کچھ وقت رہتا تھا۔ مجھے ڈاؤن ٹاؤن راجر والوں کے پاس بھی جانا تھا جو مجھے میری اپنی فیلڈ میں اچھی جاب کی گارنٹی دے رہے تھے۔ شہباز اس پر متفق نہ تھا کہ کوئی ایجنسی اتنی بڑی گارنٹی دے سکتی ہے۔ شک تو مجھے بھی تھا مگر میں کوئی موقع کھونا نہیں چاہتا تھا جس پر بعد میں پچھتاوا ہو۔ اس کے علاوہ میں ڈاؤن ٹاؤن بھی دیکھنا چاہتا تھا جہاں راجر والوں کا دفتر تھا۔ ہم سب۔وے پر آئے۔ شہباز ڈوبتا ہوا واپس مشرقی سمت چلا گیا اور میں خالی ذہن، ایک ٹرین پر بیٹھا مغربی سمت کو چلا آیا۔

بلور سب۔وے سے جنوبی سمت میں ڈاؤن ٹاؤن شروع ہوتا ہے۔ بلور پر سب وے کئی منزلہ ہے۔ آپ کو جنوبی سمت میں جانے کے لیے کسی اور منزل پر آنا پڑتا ہے۔ ایک بھاگ دوڑ اور دھکم پیل کا سماں ہوتا ہے۔ ہر کوئی تیزی سے زینے چڑھ رہا ہے یا اتر رہا ہے۔ ایک ہی خیال رہتا ہے کہ جو ٹرین پلیٹ فارم پر موجود ہے یا آنے والی ہے، اسی کو پکڑ لیا جائے۔ میں نے یونین اسٹیشن کو جانے والی ٹرین پکڑی تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ایک دھکم پیل تھی اور ہر کوئی دوسرے کو روندنے پر تلا تھا۔ گرم کوٹوں اور ٹوپیوں میں ملبوس عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے چپک کر کھڑے تھے۔ ایک صاحب نے جب اپنی سیٹ چھوڑی تو پھر میں براجمان ہو گیا۔

اجنبی راستوں پر چلتے ہوئے۔ اجنبی موسموں اور اجنبی لوگوں کی اجنبی بولیوں کا سامنا کرنا اور ان میں اپنے راستے تلاش کرنا ایک ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے والا عمل ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں جو ان مراحل سے گزرتے ہیں۔ کئی ایک منزل پا لیتے ہیں اور کچھ لوگ بھٹکتے رہتے ہیں۔ زندگی تو ویسے ہی جہد مسلسل ہے اور خاص کر جو لوگ اپنے وطن سے دور نکل کر نئی منزلوں کی تلاش میں ہوتے ہیں وہ کئی قسم کے ذہنی اور جسمانی کرب سے گزرتے ہیں۔ نارتھ امریکا اور یورپ آنے والے تارکین وطن کی مختلف اقسام ہیں۔ ایک میری طرح کے

جو محدود رقم لے کر آتے ہیں اور اپنے قدم جمانے کی جگہ ... میں پستے رہتے ہیں۔ کچھ کو اپنے رشتہ دار اسپانسر کرتے ہیں اور وہ آتے ہی ایک بنے بنائے ماحول میں بس جاتے ہیں اور آہستگی سے اپنی جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں۔ کئی ایک بڑی رقم منی لانڈرنگ کر کے یہاں پہنچ جاتے ہیں اور بنی بنائی بنیادوں پر اپنے محلات کی دیواریں اٹھا لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں فوجی حکمران آچکے تھے اور کئی ایک کرپٹ سیاستدان اپنے پیسے لے کر ٹورنٹو پہنچ گئے۔ ایک صوبائی وزیر ملے اور مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس مسند پر براجمان رہے ہیں۔ میں انھیں اپنی کلاس کا سمجھ بیٹھا تھا اور تسلی دیتا تھا کہ کچھ دھکے ہیں اور پھر زندگی معمول میں آجاتی ہے۔ وہ مسکرا کر گویا ہوئے کہ میں بیس کروڑ اپنے ساتھ لایا ہوں۔ مجھے نوکری کی کوئی فکر نہیں۔ پھر تعارف ہوا تو میں انہیں پہچان گیا۔ آجکل میں انھیں سن رہا ہوں جس میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ ہمارا احتساب ہو چکا ہے۔ ہم کو سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس ملک کو ہم نے چلانا ہے...... معلوم نہیں کب زخمی عوام کا آہنی ہاتھ ان کی گردن پر پڑے گا؟

میں سب وے پر اترا آیا۔ اس کے باہر ایک عمارت میں راجر والوں کا دفتر تھا اور تین بجے میری ملاقات تھی۔ شیشے کی طرح چمکتی ٹرین اسٹیشن اور آتے جاتے بھاگتے ہوئے لوگ، اسٹیشن کی دیواروں سے ٹیک لگائے گٹار بجاتے فنکار، اسپیکر سے ٹرینوں کی آمد کا اعلان کرتی آوازیں۔ یہ سب صرف مغربی ماحول میں نظر آتے اور سنائی دیتے ہیں۔ پہلے میں سب چیزوں کا بغور جائزہ لیتا تھا اور جب سے عادت بن گئی تو سر جھکائے نکل جاتا تھا۔ اسٹیشن سے باہر آیا تو آسمانوں کو چھوتیں شاندار عمارتیں سردی سے ٹھٹھر رہی تھیں۔ کوئی بھی آرام اور سکون سے نہ چلتا تھا۔ ہر ایک کو تیزی اس لیے بھی تھی کہ اس سردی میں کچھ دیر کے لیے رکنا بھی ہمیشہ کے لیے رکنے کے مترادف تھا۔ میرے پاس راجر کمپنی والوں کا ایڈریس تھا اور میں ڈھونڈتا ہوا ایک نہایت ہی شاندار اور کثیر منزل عمارت کے سامنے آرکا۔ سیاہ شیشوں کے پیچھے روشنیوں کا سیلاب جگمگا رہا تھا اور میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ تو بہت بڑی کمپنی ہوگی، جس کا دفتر اس عمارت میں ہے۔

میں اس پر شکوہ بلڈنگ میں داخل ہوا اور اپنے آپ کو ایک دمکتی لابی میں پایا۔ فرش پر دبیز قالین بچھے تھے۔ سامنے ہی متعدد دروازے چمکتے تھے جو عمارت کی لفٹیں تھیں۔ وہ شاید چالیس منزلہ عمارت تھی مگر مجھے بیسویں منزل پر پہنچنا تھا۔ لفٹ نے چند ہی سیکنڈ میں مجھے مطلوبہ فلور پر لا کھڑا کیا۔ ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی بندہ اور نہ بندے کی ذات۔ ڈھونڈتا ڈھونڈتا میں فلور کی لابی میں آیا تو وہاں ایک سیکیورٹی گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے استفسار کیا اور میرے جواب پر مجھے انتظار کرنے کا کہا اور بولا کہ باس کسی اور کلائنٹ کے ساتھ ہیں، ابھی فارغ ہوتے ہیں۔ میں مرعوب ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں لابی کی تیز روشنیوں میں سمٹا بیٹھا رہا اور پھر مجھے گارڈ نے مجھے باس کے پاس اندر آفس میں بھیج دیا۔

اندر ایک بڑی کرسی پر باس ایک ڈھیر کی مانند پڑا تھا۔ موٹائی کی حدیں پار کرتا باس، بمشکل اٹھا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ میرے کوائف پوچھے اور سر ہلاتا رہا۔ میری دانست میں مجھے اس نے آج ہی کوئی خوش خبری دے دینی تھی۔

کہنے لگا۔ ”مسٹر ندیم! جو آپ کی تعلیم اور تجربہ ہے۔ میرے خیال میں آپ کو جاب ایک ماہ سے پہلے ہی مل جائے گی۔“

میں مسرور ہو کر اپنی کرسی پر ذرا آگے کھسک آیا۔ ”سر! مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

اس سفید ہاتھی نے جواب میں کہا۔ ”آپ کو ساڑھے تین سو ڈالر کی فیس دینی ہوگی اور ہم آپ کے لیے ایسا Resume بنائیں گے کہ آپ جس کمپنی کو بھی بھیجیں گے وہ فوراً آپ کو انٹرویو کے لیے کال کر دیں گے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ انٹرویو کے لیے جب بلالیں تو ستر فیصد جاب ہو جاتی ہے اور بقایا تیس فیصد آپ نے اپنے آپ کو انٹرویو میں اہل ثابت کرنا ہوگا۔“

تو میں اب کہانی سمجھنے لگا۔ یہ مجھ سے Resume بنانے کے ساڑھے تین سو ڈالر مانگ رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے یہ جگہ تین گھنٹوں کے لیے کرایے پر لی تھی کہ وہ ہم جیسے لوگوں پر اپنا رعب ڈال سکے۔ یہ آفس اس کا اپنا نہیں تھا کیونکہ باہر ایک بینر پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ راجر ایمپلائمنٹ۔ اس کو جب بھی کلائنٹ ملتے تو یہ اپنا بینر لے کر یہیں پہنچ جاتا۔ ایک بھی مرغا پھنس گیا تو یہ کرائے کے ڈیڑھ سو نکال کر دو سو کی دہاڑی لگا لیتا تھا۔ جب وہاں سے جاتا تو وہی بینر بغل میں لپیٹ کر خوش و خرم نکل جاتا تھا۔ اب میں اس کے چنگل سے نکلنے کے جتن کر رہا تھا اور وہ مجھے نکلنے نہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے متواتر سمجھائے چلے جا رہا تھا کہ میں اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دوں اور میں مسلسل اس موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ لوں۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اس سنسان عمارت میں اس

کے اور اس کے ہمارے علاوہ کوئی اور ہے بھی نہیں اور مجھے اپنی جان کا خوف علیحدہ تھا۔

ادھر افطاری کا وقت قریب ہو رہا تھا اور میں اس کے شکنجے میں تھا۔ آخر میں نے کہا کہ میرا دوست نیچے انتظار کر رہا ہے اور میں فون کر کے بتا دوں گا۔ یہ سن کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی کرسی کی پشت سے جا لگا۔ میں نے یہ مناسب لمحہ جانا اور باہر کو دوڑ لگا دی۔ میں نے سانس تب لی جب میں سب وے اسٹیشن کے اندر ایک کھوکھے والے سے مونگ پھلی کا پیکٹ افطاری کے لیے خرید رہا تھا۔ افطار میں نے مونگ پھلی اور پانی سے کیا اور جب اپارٹمنٹ پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔

پورے دن کا تھکا ہارا اور بھوک سے نڈھال جب میں اپارٹمنٹ کے باہر پہنچا تو دیکھا بلڈنگ کے سامنے لان میں سنو مین بنے کھڑے ہیں۔ آنکھوں اور ناک کی جگہ درختوں کی چھوٹی ٹہنیاں پیوست ہیں۔ برف باری رک چکی تھی اور موسم قدرے بہتر ہو رہا تھا۔ بہتر سے مقصد یہ ہے کہ منفی پانچ یا چھ کے قریب تھا۔ میں نے سحری کے بعد کچھ نہ کھایا تھا۔ افطار کا وقت گزرے بھی ایک گھنٹا سے زائد ہو چکا تھا۔ میں اپارٹمنٹ میں لاغر سا داخل ہوا تو اندر خاموشی چھائی تھی۔ سرجی منقی کے میٹرس پر کمبل لپیٹے کراہ رہے تھے اور شہباز دیوار سے ٹیک لگائے اور سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ آج باہر کے پردے بھی بند تھے اور اداسی سی چھائی تھی۔ میرے سلام کرنے پر صرف خاموش نگاہوں سے مجھے ٹٹولا گیا۔ میں نے کندھے سے بیگ کا بوجھ نیچے اتارا تو شہباز نے کہا۔ ”سرجی کو تیز بخار ہے اور حرارت سے تپ رہے ہیں۔“

میں اپنی تھکاوٹ بھول گیا کیونکہ پردیس کی بیماری افسردگی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ماتھا حرارت سے نہیں، لاچارگی سے تپتا ہے۔ پیشانی کسی مہربان ہاتھ کے لمس کو ترستی ہے۔ میں نے سرجی کے چہرے سے کمبل ہٹایا تو آنکھیں نم تھیں۔ آنکھیں سرخ اور ماتھا حرارت سے تپ رہا تھا۔ میں نے ماتھے پر اپنی ہتھیلی رکھی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برسنے لگی۔ پوچھا کہ یہ بخار کب اور کیسے ہو گیا تو خاموش رہے۔

شہباز بولا۔ ”یہ صاحب آج باہر کی یخ بستہ سردی میں سنو مین بناتے رہے اور تو اور سامنے لان کے علاوہ گلائی کے ساتھ پارک میں بھی کوئی ایک دو بنا آئے ہیں۔“ میں نے سرجی کو دیکھا تو انہوں نے اپنا چہرہ اپنے بازو سے چھپا لیا تھا۔

میں خاموش ہو رہا۔ پھر شہباز سے پوچھا کہ کچھ کھایا ہے انہوں نے تو وہ بولا۔ ”میں ان کے لیے آج جلیبیاں ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ ابھی دودھ میں ڈال کر دیتا ہوں۔ شاید افاقہ ہو جائے۔“

میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ میرا دل گرفتہ تھا۔ وہ دونوں اسی خیال سے خاموش تھے کہ میں کچھ کہوں گا۔ میں بے زبان ہو گیا۔ مجھے شاید سرجی کی معصومیت پر ترس آ رہا تھا۔ ان کے ساتھ فیض صاحب نے جو ہاتھ کیا تھا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اس وار کو سہہ گئے تھے مگر اندر سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ پورا دن برف باری دیکھنے کے شوق میں کھڑکی سے لگے بیٹھے رہتے۔ فضا میں برف کے گالے دیکھ کر خوش ہوتے۔ آج برف رکی تو باہر سنو مین بنانے نکل گئے حالانکہ ان کو میں نے منع کیا تھا کہ یہ سردی ہماری تفریح کے لیے نہیں بلکہ ایک عذاب کی صورت اترتی ہے۔ مگر وہ کیا کرتے۔ پورا دن اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ SIN کارڈ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب تک یہ کارڈ نہیں ملتا ہے تو وہ کہیں آ جا بھی نہیں سکتے کہ انہیں کوئی جاب ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتی اس کے لیے انتظار کرنا تھا۔ آج مجھے ان پر ترس آ رہا تھا اور میں اپنی کوفت بھول گیا تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے میں آیا۔ ان کو سہارا دے کر بٹھایا۔ جو کھانا بنا تھا وہ ان کو زبردستی کھلایا۔ میرے پاس میڈیسن تھیں جو ان کو دیں۔ تسلی دی۔ پھر شہباز نے دودھ میں جلیبیاں ڈال کر ان کو دیں۔ وہ خاموش بیٹھے چمچ سے کھاتے رہے۔ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ کچھ دیر میں ان کا بخار مدھم پڑا تو کہنے لگے۔ ”میں پورا دن اندر بیٹھا اکتا گیا تھا۔ برف تھمی تو باہر نکل آیا۔ کچھ لڑکے سنو مین بنا رہے تھے تو میں بھی بنانے لگا۔ پھر ٹہلتا ہو گلائی اسٹور گیا اور وہاں پارک میں بھی لوگ جمع تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا اور سنو مین بنانے لگا۔ سوچا کہ آج پاکستان فون کر کے بچوں کو بتاؤں گا کہ تمھارے بابا نے بف (برف) باری میں سنو مین بھی بنایا ہے۔“

میں خاموشی سے ان کو سنتا رہا۔ وہ چپ ہوئے اور اب میرے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

سرجی ابھی تک فیض صاحب کے برتاؤ کے صدمے سے نہیں نکلے تھے۔ وہ اپنا ایک ذہن بنا کر آئے تھے کہ آتے ہی نیو یارک جا کر ایک کاروبار میں شریک ہو جائیں گے۔ نہ ایسا ہونا تھا اور نہ ایسا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر ٹورنٹو میں ہم آہنگ بھی نہ کر پا رہے تھے۔ اور سونے پر سہاگا یہ تھا

کہ وہ انتہائی شریف النفس انسان واقع ہوئے تھے۔ ان کو اب ساری جدوجہد خود کرنی تھی۔ خود ہی آگے بڑھ کر کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اور یہ بات ان کو سمجھنی تھی۔

میں نے کہا۔ "شاہد صاحب! آپ باہر اتنی سردی میں نکل گئے اور بہت دیر تک برف سے کھیلتے بھی رہے۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کو فراسٹ بائیٹ بھی ہوسکتا تھا اور آپ مفلوج بھی ہوسکتے تھے۔ آپ پر تین بچوں کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے سنومین بنانے پر وہ کتنے خوش ہوجاتے؟ جس کی قیمت خدانخواستہ آپ مفلوج ہوکر دے سکتے تھے؟ اب آپ کو یہاں رہ کر جدوجہد کرنی ہے یہ خودغرض معاشرہ ہے۔ کوئی آپ کی انگلی پکڑ کر آپ کو نہیں چلائے گا اور ہر کام صرف آپ ہی نے کرنا ہے۔ اب آپ خود سوچیں کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ نیویارک جانے کی اسٹوری کا باب بند ہوگیا ہے اور آپ ذہنی طور پر اسے قبول کرلیں۔"

وہ غور سے میری باتیں سنتے رہے۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ میری باتوں کا بھرپور اثر ہورہا ہے۔ شہباز اس دوران خاموش رہا۔ میں نے بات ختم کی اور کچھ دیر ماحول میں خاموشی کا اثر قائم رہا۔ ایک افسردگی ماحول میں تیرتی رہی۔

مجھے افسوس ہورہا تھا کہ شاید میں سرجی کو کچھ زیادہ سنا گیا ہوں کیونکہ وہ مغموم سے بیٹھے تھے۔ شہباز بھی ذرا اداس ہوگیا تھا اور نظروں نظروں میں مجھے کوس رہا تھا۔ پھر سرجی نے اپنی مغموم نظریں اٹھائیں اور شہباز کی طرف دیکھ کر بولے۔ "کچھ اور جلیبیاں پڑی ہیں؟ بہت مزے کی تھیں۔"

یہ سن کر میں اور شہباز حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے تھے۔

کل چوبیس دسمبر ہے۔ اور پھر اگلے دن کرسمس کا دن...... یعنی اگلے دو دن کچھ کام نہیں اور صرف آرام، جو میں اپنے طور پر پچھلے ایک ماہ سے کرتا چلا آرہا تھا۔ یہ مجھے ابھی تک معلوم نہ ہوسکا کہ کرسچین اپنا کرسمس کا دن کیسے مناتے ہیں۔ ہم عید مناتے ہیں تو پورا شہر ہمارے ساتھ ساتھ عید منا رہا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ کرسمس مناتے ہیں مگر پورا شہر سویا ہوتا ہے۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ سناٹے میں ڈوبا شہر ایسا کہ ہول اٹھتے ہیں۔ گھروں کے باہر کرسمس کی رات کو گاڑیوں کی قطاریں اور اندر کوئی پارٹی چل رہی ہوتی ہے۔ بہن بھائی، امی ابو، خالہ پھوپیاں۔ یہ سب سال میں ایک دن اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھیکے کھانے اور ساتھ میں وائن لیتے ہیں پھر اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ صبح چرچ جاکر دعا مانگتے ہیں بلکہ منتے ہیں۔ اس سے تو پاکستان کے کرسچین بھائی زیادہ رونق سے کرسمس مناتے ہیں۔ یہاں یہ دن پہلے سے منانا شروع ہوجاتا ہے۔ گھروں میں کرسمس کے مصنوعی درخت اور ان پر جگمگاتے قمقمے لگائے جاتے ہیں۔ سڑکوں پر لگے درختوں میں مسکراتے بلبوں کی رنگ برنگی روشنیاں اور اسٹوروں پر لوٹ مار سیل لگتی ہے۔ یہ سلسلہ ایک ماہ چلتا ہے اور کرسمس کی رات، ایک سوگ کی مانند دم توڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ پورا سال کام کرتے ہیں اور دسمبر میں سست پڑتے جاتے ہیں۔ ہم عید مبارک کہتے ہیں تو ان کو کرسمس مبارک تو کہنا ہی چاہیے مگر یہ چھٹیاں مبارک کہتے ہیں Happy Holidays لگتا ہے کہ ان کو خوشی تب تک رہتی ہے جب تک کرسمس کا دن نہیں آجاتا۔

عید کے آنے کی خوشی تھی تو دل مغموم بھی تھا۔ میں نے غم کی چادر کو اتار پھینکنے کے لیے ماضی میں جھانکنا بہتر سمجھا اور پھر یکایک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔ مجھے نارڈ صاحب کے ساتھ گزرا لمحہ یاد آیا۔ یہاں آنے سے پہلے جس ٹریننگ پر گیا تھا اس میں نارڈ صاحب کے ساتھ بقا صاحب بھی تھے۔ جو سرجی جتنے نہ سہی مگر معصوم تھے۔ ہر بات پر یقین کرلینے والے۔ ایک روز وہ میرے ساتھ ہوٹل کے باہر گارڈن میں بیٹھے تھے۔ ہم وہاں بچھی کرسیوں پر بیٹھے آس پاس کا نظارہ کررہے تھے کہ انہوں نے کہا۔ "آپ نے بھی یہاں عید میلے میں شرکت کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ سنا ہے لیکن شرکت کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہ بولے بڑی گہما گہمی ہوتی ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں، یہاں دو خوشیوں کے تہوار بڑے پیمانے پر مناتے ہیں۔ ایک عید دوسرا نوروز۔ نوروز کے میلے میں تو ایک انوکھا مقابلہ ہوتا ہے۔ لوگ گھروں سے انڈے رنگ کرلاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے انڈے پر انڈا مارتے ہیں۔ جس کا انڈا ٹوٹ جاتا ہے وہ شکست یافتہ کہلاتا ہے۔ میں نے کہا۔ ہر علاقے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ بنگال میں عید کے روز ہاتھ سے بنائی ہوئی نسبتاً موٹی موٹی سویاں جس میں نمک شامل ہوتا ہے مہمانوں کو ضرور پیش کریں گے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" بقا بولے۔ "سوئیوں کا اصل مزہ شیرینی میں ہے۔ نمکین سوئیوں کی کیا تک ہے؟"

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے اپنی گھڑی ہوئی تاویل پیش کی۔ نمکین سوئیوں کا چلن اس وقت سے شروع ہوا جب میر جعفر نے رشتے داری کا پاس نہ رکھا اور نواب سراج الدولہ سے غداری کی، تب سے لوگوں نے نمک کا استعمال بڑھا

دیا تا کہ کوئی نمک حرامی نہ کرے۔"

"آں!" کہتے ہوئے بچا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ جھوٹ یہاں بیٹھے بیٹھے یاد آیا تو ہنسی آ گئی۔

میری پردیس کی عید بھی آنے والی تھی۔ آج میں کینیڈا کی کرسمس کا استقبال دیکھ کر اپنی بچپن میں گزری عیدوں کا حساب کتاب کر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں عید ایک بھرپور طریقے سے آتی تھی۔ پورے سال میں یہی واحد خوشی اترتی اور پورے شہر کو لپیٹ میں لے لیتی۔ عید کی خوشی گھروں سے نکل کر محلے اور پھر پورے شہر میں پھیل جاتی۔ عید کی فضا اور اس فضا کی خوشبو کچھ ایسی انوکھی ہوتی کہ پھر پورا سال وہ لمس محسوس ہوتا رہتا ہے۔

آج بھی ایک پھیکا دن تھا ہمارے لیے معلوم نہ تھا کہ خوشیاں کہاں کہاں اتر رہی ہیں۔ ہمارے چار سو ایک افسردگی تھی۔ گھر فون کیا تو قندیل سے بات ہوئی۔ اس کو میں نے تاکید کی، بابا کے لیے دعا کرنا کہ ان کو جلد نوکری مل جائے اور اس نے ایک ہی رٹ لگائی تھی کہ بابا آپ کو مکان مل گیا ہے؟ ہمیں کب بلوائیں گے؟

میرا دعاؤں پر بہت اعتقاد ہے۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے کہ مجھ تک پہنچنے کے لیے وسیلے ڈھونڈو۔ اللہ کی صفات، آپ کے نیک اعمال کے علاوہ لوگوں کی بے لوث دعائیں بھی ایک وسیلہ ہیں۔ میں اپنے خاندان کے بچوں، بہنوں اور بھائیوں سے یہی کہتا کہ دعا کرو۔ میری بھانجیاں اور بھتیجیاں جانماز سنبھال کر بیٹھ جاتیں۔ قندیل اور سمیہ نے تو ہر وقت کرنی ہی تھی۔ آج بھی میں سب کو فون کر کے دعاؤں کا کہتا ہوں۔

برف باری تھمی ہوئی تھی سرجی لم لیٹے چھت تک رہے تھے۔ ورنہ ان کی نظریں ہمیشہ گرتی برف پر رہتی تھیں۔ کمرے سے دھونکنی کی آواز آئی، تو معلوم ہوا کہ شہباز ٹھنڈی سانسیں لے رہا ہے اور شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ کبھی کبھی اس کے بولنے کی آواز اندر سے آ جاتی۔ ایک بار جھانک کر دیکھا تو وہ اپنے آپ سے بڑبڑا رہا تھا اور خود لعنتیں بھیج رہا تھا۔

سرجی نے کہا۔ "مسلمان کے لیے لعنت بھیجنا ناجائز ہے۔"

شہباز نے بھنا کر پوچھا۔ "اپنے پر بھیجیں تو جائز ہے۔"

شام اتری اور ہم بھی اپنی جگہوں سے اترے۔ میں نے بھنا قیمہ بنایا۔ سرجی نے دہی کا رائتہ تیار کیا۔ شہباز نے شیشے کے جگ میں دودھ سوڈا بنایا اور ہم کھجوریں سنبھال کر دسترخوان کے گرد افطار کے لیے خاموش بیٹھ گئے۔ اچانک کمرے کی چھت سے چپٹا سموک الارم کان کے پردے پھاڑتا چیخ پڑا اور بجتا ہی چلا گیا۔ سرجی اٹھ کر کپکپا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ "دروازے پر پولیس آ گئی ہے؟" پھر خود ہی کہنے لگے۔ "مگر ہم تو سرکاری کاغذوں پر کینیڈا آئے ہیں۔"

مجھے معلوم نہ تھا کہ سموک الارم کیا ہوتا ہے۔ میں اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا تھا۔ ایک گول ڈبیا جو چھت سے چھپکلی کی طرح چپٹی تھی اور اپنے وجود سے کئی ہزار گنا آواز میں بجتی چلی جا رہی تھی۔ شہباز کو معلوم تھا کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ اپنے ماموں کے گھر میں دیکھ آیا تھا۔ اس نے پھرتی سے اپنی واحد بنیان اتاری اور اس ڈبیا کو بنیان سے ہوا دینے لگا۔

الارم نے رونا بند نہ کیا۔ ہم افطاری بھول کر چھت کی جانب تکے جا رہے تھے۔ پھر برآمدوں میں لگے اسپیکروں سے اعلان ہونے لگا کہ عمارت میں آگ لگ گئی ہے اور خطرے کے پیش نظر آپ سب لوگ اپنے اپارٹمنٹس کو خالی کر دیں۔ ہم سب باہر تیزی سے نکلے کہ اس سے پہلے کہیں آگ کے شعلے اپارٹمنٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

باہر لان میں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ ہم جتنے حواس باختہ تھے، ہمیں ہم سا کوئی اور نظر نہ آ رہا تھا۔ باقی سب ٹہلتے ٹہلتے باہر آ رہے تھے۔ شہباز نے تو جوتی بھی نہ پہنی تھی اور ایسے ہی باہر آ گیا تھا۔ ہم حیران و پریشان تھے مگر جب سب کو چین سے دیکھا تو ایک کونے کو تھکے کہیں ہم ماموں تو نہیں بن گئے۔ الارم پوری عمارت میں بجے چلے جا رہے تھے۔ سرجی اس شور میں بولے۔ "الارم کی آواز سیدھی کانوں میں آ رہی ہے۔"

شہباز جس نے اپنی بنیان پھر سے چڑھا لی تھی، وہ جھنجلا اٹھا۔ "کانوں میں نہیں جائے گی تو کہاں جائے گی۔"

دیکھتے دیکھتے کئی فائر بریگیڈ کی گاڑیاں سائرن بجاتی بلڈنگ کے سامنے آ رکیں۔ عملہ ایک لائن سے بلڈنگ میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ کچھ نے جا کر سائرن بند کیا۔ ایک اصول تھا کہ جب بھی فائر الارم بجتا ہے تو اس الارم کو صرف فائر فورس کا عملہ ہی بند کر سکتا ہے۔ کچھ دیر یہ تماشا لگا رہا اور آخر میں اس "بھیانک" آگ کی وجہ یہ دریافت ہوئی کہ ساتویں منزل پر ایک اپارٹمنٹ میں کرسمس کی پارٹی تھی۔ بالکونی میں باربی کیو کا انتظام تھا۔ کوئی گرم سیخوں پر لگے دھواں اڑاتے تکے بالکونی سے اپارٹمنٹ میں لے آیا اور اس دھویں سے اپارٹمنٹ کا الارم بج اٹھا اور پھر یہ "دہشت" پوری بلڈنگ میں پھیل گئی۔ اس طرح فائر بریگیڈ کی چار گاڑیوں نے

آگرا ہیں۔" [illegible] پر قابو پایا۔ بعد میں اپنے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ لوگ کیوں ٹہلتے ہوئے باہر نکل رہے تھے کیونکہ یہ معمول کی ورزش تھی جو مہینے میں ایک یا دو بار دہرائی جاتی ہے۔ الارم بجتے ہیں، فائر بریگیڈ آتی ہے اور پھر خالی ہاتھ واپس چلی جاتی ہے۔ ایک بار سرجی کو پراٹھے بنانے کو سوجی اور گرم توے پر گھی انڈیلا تو الارم بج اٹھے۔ پھر ہم سب ایک روزمرہ کے معمول کی طرح آرام سے باہر نکلے، ایک آدھ گھنٹا باہر گزارا، سب واپس گئے تو ہم بھی اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آئے اور پھر پراٹھے کھائے۔

ہم واپس اپارٹمنٹ میں آئے تو ہمارا دسترخواں ابھی سجا پڑا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے ہم نے کھجوریں اٹھالی تھیں۔ افطار ہو گیا تھا اور اب بیٹھے چین سے کھانا کھا رہے تھے۔ اتنے میں واجد آگیا۔ میں واجد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ملتان یونیورسٹی میں ہم اکٹھے تھے۔ وہ مجھ سے جونیئر تھا۔ وہ سعودی عرب چلا گیا تھا اور مجھ سے چند ماہ پہلے اپنے بچوں سمیت ٹورنٹو آیا تھا۔ طبیعت میں سرجی اور وہ ہم مزاج تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر گھل مل گئے۔ سرجی کافی بنا لائے۔ گرم کافی کی بجائے میں نے اپنے لیے چائے بنائی۔ سرجی اور واجد شیر و شکر ہو کر راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ شہباز ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر، کہنیاں کارپٹ پر ٹکائے خوں خوں کی آوازیں نکالتا کوئی آہ و بکا کر رہا تھا۔ کچن میں کچرے کے کئی بیگ بھر چکے تھے اور سرجی واجد کو لے کر انہیں باہر کنٹینرز میں ڈالنے چلے گئے۔ واپس آئے تو دونوں کے ہاتھ خالی نہ تھے۔ سرجی نے ایک وی سی آر اٹھایا ہوا تھا اور واجد کے ہاتھوں میں ایک میکرو ویو تھا۔ بتایا کہ یہ نوادرات باہر کنٹینرز کے ساتھ پڑے تھے۔ میکرو ویو کے اندر کی پلیٹ نہ تھی اور وی سی آر میں کیا خرابی تھی اس کا ہمیں معلوم نہ تھا۔ حالت دونوں کی نئی تھی۔ میں خود حیران تھا کہ یا تو کوئی بھول گیا ہے یا کوئی چور بھاگتے بھاگتے باہر ہی پھینک گیا ہے۔ سرجی الیکٹریکل انجینئر تھے اور وہ اپنا حساب کھول کر بیٹھ گئے۔ سرجی بضد تھے کہ کوئی ہلکی سی خرابی ہوگی اور انہوں نے ٹھیک کروانے کی بجائے انہیں باہر پھینک دیا ہوگا۔

شہباز کہنے لگا۔ "اگر کوئی معمولی خرابی تھی تو کسی مستری سے ٹھیک کروالیتے۔"

سرجی نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ "ایک تو ان کے پاس انہیں ٹھیک کروانے کے لیے ٹائم نہیں ہوگا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے انہیں ٹھیک نہ کروا سکتے ہوں گے۔"

شہباز کو بات سمجھ میں آگئی اور وہ خاموش ہو گیا مگر میں الجھ گیا کہ ان دونوں وجوہات میں فرق کیا ہے؟

ویکن ہٹ سیکیورٹی کمپنی کو میں روزانہ فون کرتا تھا کہ میرا سیکیورٹی گارڈ کا پرمٹ آگیا ہے؟ تو ایک ہی جواب ملتا کہ کرسمس کی چھٹیوں کی وجہ سے کام بند ہے کارڈ جلد آجائے گا۔ فون کرنے کے بعد ایک فراغت سی دوبارہ نصیب ہو جاتی۔ یہ فراغت ایسی نہ تھی جس میں ہم تصور جاناں میں بیٹھے رہتے۔ دیواروں سے باتیں کرنے کی بجائے ان سے سر پھوڑنے کو دل کرتا تھا۔ ایک ہی شخص جو مطمئن تھا وہ شاہد صاحب (سرجی) تھے جو ہر وقت اپنی جاب کی جستجو سے بے نیاز اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے کارپٹ پر بیٹھے ملتے۔ جس حالت میں چھوڑ کر جاتا تو واپسی پر اسی حالت میں پاتا۔ کچھ پوچھتا تو کہتے اللہ مالک ہے وہ کوئی سبب کر دے گا۔ ان کا توکل دیکھ کر میں اپنے آپ پر شرمندہ ہو جاتا۔

پچھلے ایک ماہ سے مجھے کہیں جانا ہوتا تو دو ڈالر کی ٹکٹ خریدتا رہا تھا۔ دو ڈالر بچانے کے چکروں میں کئی بار جاب کی تلاش کا کام بھی سست پڑ گیا تھا۔ مائیکرو سکل سنٹر تو میں پیدل چلا جاتا تھا۔ میں نے مہینے کا پاس لینے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ اسی ڈالر میں لامحدود سفر آپ پورے مہینے کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے ایک شناختی کارڈ بنوانا پڑتا ہے۔ یہ کارڈ پہلے لازمی نہ تھا مگر جب دیسیوں نے اپنے قدم یہاں رکھنا شروع کیے تو ایک بندہ اپنا کارڈ دوسرے کو دے دیتا تھا۔ وہ اپنا کام نمٹا کر مالک کو پاس لوٹا دیتا۔ حکومت نے اس کا توڑ یہ نکالا کہ پاس لینے والے کو پہلے یہ شناختی کارڈ بنوانا پڑتا، جس پر اس کا نام اور تصویر چسپاں ہوتیں۔ پاس دکھانے پر ڈرائیور یا سب وے کا گیٹ کیپر شناختی کارڈ مانگ لیتا۔ اگر پاس اور کارڈ پر نام مختلف ہوتا تو بے عزتی اور شرمندگی کا سامنا ہوتا۔ مجھے اپنا کارڈ بنوانا تھا اور کسی نے ایک سب وے اسٹیشن کا بتایا کہ یہ کارڈ وہاں بنتا ہے۔ شاہد صاحب سے کہا کہ آپ بھی ساتھ چلیں تو بولے۔ "میں آج ذرا آرام کرتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

شہباز لیٹا تھا تنک کر بولا۔ "کون سا کام کرتے ہیں جو تھک چکے ہیں آپ۔"

شاہد صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔ "کل پورا دن سوچتا رہا، اسی لیے تھکا ہوا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ اب یہاں بحث چھڑ جائے گی اس بحث میں پڑنے سے بہتر ہے کہ فرار کی راہ لی جائے اور میں

اپنے تمام گرم ملبوسات پہنے باہر نکل آیا۔
آج سورج چمک تو رہا تھا مگر کوئی تپش نہ تھی۔ چہار جانب برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ہلکی ہوا چلتی تو درختوں کے پتوں سے برف آہستگی سے گرتی اور زمین بوس ہو جاتی۔ ایک شاندار منظر تھا مگر میرے لیے اس میں کوئی چاشنی نہ تھی اس لیے کہ ہر منظر کا حسن دل کے اطمینان میں ہے۔ دل میں خوشی ہے تو ہر منظر سہانا ہوتا ہے۔
میں بس سے کپلنگ سب وے آیا اور ٹرین پر متعلقہ سب وے پر پہنچنے کے لیے سوار ہو گیا تا کہ وہاں پہنچ کر پاس بنوا سکوں۔
متعلقہ دفتر پہنچا تو باہر تختی لگی تھی کہ بارہ بجے دفتر کھلے گا۔ ابھی دس بج رہے تھے۔ پہلے سوچا کہ جمال کے پاس چلا جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ سب وے سے باہر نکلا تو دو ڈالر ضائع ہو جائیں گے۔ پھر ٹرین پکڑی اور مشرقی سمت کے آخری سب وے سکاربرو پہنچ گیا۔ پھر وہی ٹرین دوبارہ سے پکڑی اور ایک گھنٹا سوچوں اور پریشانیوں میں گھرا دوبارہ کپلنگ سب وے پر کھڑا تھا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون آئیں اور بولیں۔ "کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، کچھ پیسے مل سکتے ہیں؟"
میں نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ کے اور کارڈ بنوانے کے علاوہ جو کچھ تھا نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور پھر ٹرین لے کر کارڈ بنوانے اسی مخصوص سب وے پر دفتر کے باہر کھڑا تھا۔ فوٹو بنوائی اور اپنی جانب سے بھرپور مسکراہٹ بھی دی مگر آنکھوں میں چھپا درد پھر بھی تصویر میں آ گیا۔ وہ کارڈ اس وقت بھی میرے سامنے رکھا ہے اور مجھے اس وقت کی یاد دلا رہا ہے جب سب وے کے اندر بھی سردی کی وجہ سے کپکپاہٹ تھی اور آنکھیں نم تھیں۔
سوچا واپس اپارٹمنٹ جا کر کیا کروں گا...... اس دن میں وحشیوں کی طرح پورا دن ٹرین پر سفر کرتا رہا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک معلوم نہیں کتنے چکر لگا لیے۔ ڈبے کے ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ دماغ کے شور کو دبا دیتی۔ ایک ماہ ہو گیا تھا اور فراغت نے میرا ستیاناس کیا ہوا تھا۔ اس کوفت سے نجات کی یہی راہ سوجھی تھی۔
واپس اپارٹمنٹ پہنچا تو تھکاوٹ اور افسردگی سے گھائل تھا اور افطار کا وقت قریب ہو چلا تھا۔ سرجی اسی حالت میں بیٹھے ملے جس حالت میں صبح چھوڑ گیا تھا۔ گرم پانی سے آدھا گھنٹے تک غسل کرتا رہا تو اکڑا ہوا جسم نرم پڑ گیا۔

کسی نے بتایا کہ یہاں سے "تو تا" کال بھی ہوتی ہے۔ میرے لیے یہ انوکھی بات تھی۔ میں دس ڈالر کا کالنگ کارڈ لاتا تھا جس میں دس منٹ بمشکل پاکستان بات ہوتی تھی۔ یہ تو تا کال تیس ڈالر میں آپ کو کوئی انجانی شخصیت کروانی تھی۔ آپ کو اس کے اکاؤنٹ میں تیس ڈالر جمع کروانے ہوتے تھے۔ پھر وہ آپ کو لائن پر لے کر پاکستان کا نمبر ملا دیتا تھا اور آپ چاہیں تو دس گھنٹے بھی بات کر لیں۔
رات کو اس نے مجھے فون کیا اور اپنا اکاؤنٹ نمبر دیا۔ میں نے کل پیسے اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروانے کا وعدہ کیا اور اس نے پاکستان کا نمبر ملا دیا۔ سمیہ اپنی ماں کے گھر قندیل کو لے کر گئی ہوئی تھی۔ پھر وہاں کا نمبر ملایا اور جب بات شروع ہوئی تو وہ صاحب درمیان سے نکل گئے۔
ہمارا رات کا وقت تھا اور پاکستان میں دن شروع ہو چکا تھا۔ پھر وہاں دوپہر ہو گئی اور یہاں سحری کا وقت ہونے لگا اور میں باتیں کر رہا تھا۔ میرے جبڑے بول بول کر چٹخنے لگے۔ دماغ سن ہو گیا۔ زبان تھک گئی اور مفت کال کی ہوس نے مجھے جکڑے رکھا۔ سمیہ فون قندیل کو پکڑا دیتی اور قندیل اپنی توتلی زبان سے فریاد کرتی کہ بابا اب میں تھک چکی ہوں اب تو فون بند کر دیں اور تو اور اس دن میں نے ساس سے بھی لمبی گفتگو کر ڈالی تھی۔ سسر گھر سے کھسک گئے۔ سالا صاحب کہیں فرار ہو گئے۔ جب کوئی اور بات کرنے کو نہ ہوتی تو میں سب سے التجا کرنے لگتا کہ میرے لیے دعا تو کریں۔ وہ وضو کر کے مصلے پر بیٹھ جاتے اور میں ہولڈ کیے بیٹھا رہتا۔ ان پر یہ عذاب تب ٹلا جب سرجی سحری کا سامان لگا کر مجھے دور سے اس گھڑی کا ٹائم دکھانے لگے..... جو وہ دیوار سے اتار کر اپنے ہاتھوں میں لیے میرے سامنے کھڑے تھے۔
فون بند ہوا تو دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شہباز کو سرجی اور سرجی کو شہباز کہہ رہا تھا۔ جانا واش روم میں تھا لیکن کچن میں گھس گیا۔ پھر مجھے اس طرح پکڑ کر دسترخوان پر بٹھایا گیا جیسے کسی نابینا شخص کو بٹھاتے ہیں۔ سرجی نے حسب عادت ڈور وال کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا تو دیکھا برف پھر سے گر رہی تھی۔ سرجی اطلاع دے رہے تھے کہ ساری رات موسم سہانا رہا اور برف گرتی رہی۔
شہباز کے چہرے کی رنگت بگڑ گئی اس نے غصے میں اپنا سر ہلایا مگر کچھ بولا نہیں۔
سحری کر کے سویا ہی تھا کہ دو بجے کے قریب مجھے اٹھا دیا۔ میں نے تفصیلی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا تو ان کی

منمناتی آواز کانوں میں آئی۔ "سر جی! آپ کا بار بار فون آرہا ہے۔" اور پھر افسردہ لہجے میں بولے۔ "بف باری بھی رک چکی ہے۔"

مجھے ان کی بف (برف) باری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں نے جا کر فون اٹھایا، ویکن ہٹ سیکیورٹی والے بتلا رہے تھے کہ آپ کا پرمٹ آچکا ہے اور ابھی آکر گارڈ کی وردی لے جائیں اور کل رات کو آپ کی جاب بھی ہے۔

میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا کہ فوراً نکل جاؤں تاکہ افطاری سے پہلے واپس بھی آسکوں۔ آج خان قیصر کے گھر ہم سب کی افطاری تھی۔ ویکن ہٹ کا آفس ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے سر جی کو کہا کہ آپ بھی چلیں تاکہ ان کی جاب کا کچھ انتظام ہو جائے۔ پہلے تو انہوں نے پس وپیش سے کام لیا کہ اللہ تعالیٰ بعد میں کوئی سبب بنا دے گا مگر جب میں نے ذرا سختی سے کہا تو بادل نخواستہ راضی ہو گئے۔

شہباز ایک بار فیل ہونے کے بعد دوبارہ جا کر اپنا ٹیسٹ پاس کر آیا تھا اور اس کا پرمٹ بھی آنے والا تھا اور وہ اب انتظار کے لمحات سے گزر رہا تھا۔ ہم باہر نکل رہے تھے تو اس کی پرسوز آواز میں کینیڈا پر لعنتیں شروع ہو چکی تھیں۔ درمیان میں وہ اپنے آپ کو بھی کوس رہا تھا۔

باہر نکلے تو رات سے شروع ہوئی برف باری تھم چکی تھی اور پھیکا سورج صرف اپنی کرنوں سے برف کو زیادہ منور کر رہا تھا۔ ٹھنڈ زیادہ نہ تھی اور ہم آرام سے کپلنگ سب وے سے وکٹوریہ اسٹیشن پر اتر آئے۔ یہاں سے بس پر سوار ہو کر ہمیں شمال کی جانب ویکن ہٹ کے آفس آنا تھا۔ ایک بس آئی اور ہم اس میں سوار ہوئے۔ ہمارے ساتھ اور مسافر بھی بس میں داخل ہوئے تھے۔ ایک لڑکی نے بڑھ کر ڈرائیور کا بوسہ لیا تو ڈرائیور نے بھی کنجوسی سے کام نہ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خاصا جانتے تھے کیونکہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ سر جی نے سرگوشی کی، ان کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے لڑکی یا ڈرائیور اردو جانتے ہوں، وہ بولے۔ "بے حیائی بہت ہے۔ اگر روزہ نہ ہوتا تو یہ لڑکی زیادہ اچھی لگتی۔"

میں نے کہا۔ "شاہد صاحب! ذرا سنبھل کر۔ ان چیزوں کو ایسے لیں جیسے آپ کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔"

سر جی اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "فلمیں بھی تو بھی دیکھنے کے لیے دیکھتے ہیں۔" پھر تاسف سے بولے۔ "ان کو روزہ داروں کا احساس ہی نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ اس مہینے میں یہ بے ہودہ حرکتیں نہ کیا کریں۔"

میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ "انہیں کیا معلوم کہ آپ روزے سے ہیں اور روزوں میں کیا کیا ممنوع ہے، اسے کیا پتا۔"

وہ بولے۔ "انہیں شکل سے نہیں لگتا کہ ہم مسلمان ہیں۔ انہیں تو ہمارے جذبات کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے۔"

"میں نے کہا کہ کیا مسلمان کی شکل پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ مسلمان ہے اور کوئی بری حرکت نہ کرے اور جب وہ ہمارے معاملات میں نہیں بولتے تو آپ بھی نظر انداز کر دیں۔"

سر جی ہار ماننے والے کہاں تھے۔ تڑسے بولے۔ "کیا انہیں ہماری مونچھیں، رنگت اور غربت دیکھ کر اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہم مسلمان ہیں۔"

سر جی کی اس منطق اور استدلال پر میں جھنجلا سا گیا اور شکر ہے کہ ہم ویکن ہٹ کے آفس کے سامنے پہنچ چکے تھے ورنہ میں بھی خود پر قابو کھو بیٹھتا۔ اس لیے کہ بیکاری اور اکتاہٹ نے میری فطرت پر نقب لگانا شروع کر دیا تھا۔

کاؤنٹر پر پہنچے تو سامنے شمالی کھڑی مسکرائے جارہی تھی۔ اس نے میری جاب کا فارم پُر کیا۔ سارے کوائف دوبارہ سے ڈالے۔ پرمٹ میرے حوالے کیا جس پر میری تصویر چسپاں تھی۔ نیک خواہشات کا اظہار کیا، پھر سے مسکرائی تو جواباً ہم دونوں نے بھی دانت نکال دیے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائی جہاں ہر سائز کی پتلون، کوٹ، شرٹس اور جیکٹس مختلف خانوں میں ترتیب سے رکھی تھیں۔ سر جی حیرت سے کہنے لگے۔ "یہ کپڑے بھی بیچتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں، مفت میں بانٹتے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "دیکھا! اسے تو معلوم ہو گیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔" پھر کہنے لگے۔ "سر جی! جب مسکراتی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔"

میں نے پوچھا کہ "اگر نہ مسکرائے تو؟"

وہ بولے۔ "تب بھی اچھی لگتی ہو گی اور دیکھیں ماشاء اللہ کتنی خوبصورت ہے۔ اللہ نظر بد سے اسے بچائے۔"

میں نے کہا۔ "تو آپ بدنظر نہ ڈالیں ناں۔"

سر جی کسی صورت سے بخشنے پر تیار نہ تھے، فرمانے لگے۔ "نظریں تو خود بخود اٹھ جاتی ہیں۔ اس میں دیکھنے والے کا کیا قصور ہے۔"

مجھے تیس نمبر کی پینٹ فٹ بیٹھتی تھی مگر وہاں کم سے کم چھتیس نمبر کی رہ گئی تھیں۔ میں نے وہی اٹھا لی۔ اس کی لمبائی بہت زیادہ تھی جو بعد میں جا کر میں نے نیچے سے بل دے کر سٹیپل (Staple) کرالی تھی۔ میری جیکٹ کا سائز میڈیم

تھا غلطی سے میں نے ایکسٹرا لارج سائز کی اٹھالی کیونکہ یہی بازیاب تھی۔ تانی اور شرٹ مشال نے شیلف سے اٹھا کر مجھے تھما دی اور پھر مجھے جیک کے حوالے کر دیا جو سیکیورٹی گارڈز کو مختلف مقامات پر شفٹ دیتا تھا، یعنی جہاں جہاں کلائنٹس کو ضرورت ہوتی۔

وہ ایک کمرے میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے وائرلس اور مختلف فون پڑے تھے۔ تین کمپیوٹر کی اسکرین نصب تھیں۔ وہ پورا نظام کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے جس رفتار اور مشکل لہجے میں مجھ سے بات کی وہ میرے پلے نہ پڑی۔ پھر اپنا وقت بچانے کے لیے اس نے ایک کاغذ پر مجھے کوئی پتا لکھ کر دیا کہ یہاں تمہاری کل رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک ڈیوٹی ہے۔ میں نے اس کاغذ کو کسی مقدس تعویذ کی طرح تہہ کر کے سنبھال کر اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔

دوبارہ مشال کے پاس آکر سرجی کی نوکری کی بات کی کہ انہیں بھی سیکیورٹی گارڈ بھرتی کر لیں۔ اس نے سر سے نیچے تک ان کا جائزہ لیا۔ سرجی ہونقوں کی طرح منہ کھولے مشال کو دیکھے جا رہے تھے۔ مشال نے ایک فارم سرجی سے پُر کروایا اور بنیادی ٹیسٹ لیا جو وہ اپنے فضل سے فیل کر بیٹھے۔ میں نے ذرا منت وسماجت کی تو اس نے دوبارہ وہی ٹیسٹ انہیں دیا اور خود کھسک گئی۔ ہم دونوں نے مل کر وہ ٹیسٹ پاس کر لیا۔ اب اگلی سنیچر کو سرجی کی کلاس تھی، جس میں پورا دن خوار ہو کر ایک ٹیسٹ پاس کرنا تھا۔ ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد میں سرجی سے ایک طرح سے مطمئن ہو چکا تھا کہ یہ بھی جلد اسی جاب میں اپنے گل کھلانے والے ہیں......

ہم باہر نکلے تو افطاری کا وقت ہونے والا تھا۔ سرجی کہنے لگے۔ ”بخسم سے بہت بھوک لگی ہے۔ آج سحری کے بعد سے کچھ نہیں کھایا۔“

ہمیں خان قیصر کے گھر افطاری کے لیے پہنچنا تھا مگر لگ یہ رہا تھا کہ ہم وقت پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ سوچا آج ٹرین سے نہیں بلکہ بسیں بدل کر جاتے ہیں اور پھر ہم نے یہ غلطی کر ڈالی کہ ٹرین کی بجائے بسوں کو ترجیح دے ڈالی۔ ٹورنٹو کی عمارتیں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ اتنی روشنیاں عمارتوں سے پھوٹ رہی تھیں کہ آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔ آج بس سے بہتر نظارہ کر رہے تھے۔ ایک اسٹاپ پر اترے اور دوسری بس کا انتظار کرنے لگے۔ ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سرجی بھاگ کر ایک اسٹور میں گھسے اور واپسی پر گرم پیٹیز اور پانی کی بوتلیں لیے نکلے۔ افطار ہم نے بس اسٹاپ پر کیا۔ جذبات اور احساسات موسم کی مانند سرد تھے اور اس لیے غریب الوطنی کا رونا بھی نہ رویا۔ چپ چاپ افطار کیا اور اگلی بس کا انتظار کرنے لگے۔ گارڈ کی وردی کا تھیلا میرے ہاتھوں میں تھا اور سرجی کے ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔

دو گھنٹے بعد بسوں کے سفر نے ہمیں اپارٹمنٹ کے آگے اتارا تو رات کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ سرجی مطمئن تھے کیونکہ اپنی درخواست وہ کین ہٹ میں ڈال آئے تھے۔ ہم نے سڑک کراس کی تو سرجی کہنے لگے کہ سیدھا خان قیصر کے گھر جاتے ہیں۔ ممکن ہے ہمارا کھانا انہوں نے بچا رکھا ہو۔ آئیڈیا اچھا تھا اور میں نے بھی ہامی بھر لی۔ جیسے ہی میں اپنے اپارٹمنٹ کے قریب پہنچا تو ایک ایسا نظارہ میرا منتظر تھا جو میں آج تک نہیں بھول سکا۔

ہماری بلڈنگ اور خان قیصر کی بلڈنگ کے بیچ ایک بڑا لان تھا۔ جہاں چیڑ کے درخت تھے۔ وہاں زمین پر برف کی چادر بچھی تھی اور برف نے درختوں کی ٹہنیوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ عام سی بات تھی۔ خاص اس میں یہ تھا کہ اس برف کی چادر سے نور کی مانند روشنی پھوٹ رہی تھی اور آسمان کی جانب پرواز کر رہی تھی۔ پورا ماحول ایک سفید روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ رات گہری تھی مگر دن کا تصور ہوتا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی اور فضا منجمد تھی۔ دن میں برف پر نظریں جب پڑتیں تو آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں مگر اب آنکھوں میں ٹھنڈک اور سکون کا احساس تھا۔ اس منظر سے نظریں نہ ہٹتی تھیں۔ سرجی کو میں نے اپارٹمنٹ میں یہ کہہ کر بھیج دیا تھا کہ وہ میری یونیفارم رکھ آئے۔ اس نے میری حالت دیکھی تو جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ شفق کی روشن کرنیں آسمان سے پھوٹتی ہیں اور یہاں زمین سے آسمان تک ایک اجالا پھیل رہا تھا۔ میرے علاوہ اس منظر میں کوئی حائل نہ تھا۔ سب اپنے گھروں میں دبکے تھے اور یہ منظر اللہ پاک نے میرے لیے ہی تخلیق کیا تھا۔ لیمپ پوسٹوں کی روشنی پھیکی پڑ کر شرمندہ سی لگ رہی تھی۔ صاف وشفاف آسمان یہ منظر حیرت سے تک رہا تھا۔ میں ایک سنگی مجسمے کی مانند بنا، اس منظر کا گواہ بنا، ایک بے یقینی کی حالت میں تھا۔ سفیدی کا پُراسرار سکوت رات کی خاموشی میں عیاں تھا۔ پہلی بار ٹورنٹو کا حسن مجھے جکڑے کھڑا تھا۔

آج تک میں اپنے ذہنی دباؤ میں رہا تھا مگر آج یہ دباؤ ایک دھماکے سے ریزہ ریزہ ہو کر کہیں بکھرا پڑا تھا اور میں ہلکا ہو کر اس نور کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

مجھے معلوم نہ پڑا کہ سرجی واپس آکر میرے ساتھ

کھڑے ہیں۔ میں تب چونکا جب وہ بولے۔ "ہم نیف (برف) دیکھیں تو سب کو اعتراض ہوتا ہے اور دوسرے بہت دیر سے دیکھے چلے جارہے ہیں۔"

ان کے شکایتی لہجے نے مجھے چونکا دیا اور میرا خواب ٹوٹ گیا، میں واپس زمین پر آ کھڑا ہوا اور پھر ہم دونوں خان قیصر کے گھر کی جانب اپنا پیٹ بھرنے چل پڑے۔

وہاں دوستوں کا رش لگا تھا۔ سب کھانا کھا کر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ہم پہنچے تو خان قیصر نے دیر سے آنے کا گلہ کیا اور جب جاب ملنے اور ساتھ ہی کل کی شفٹ ملنے کی خبر پھیلی تو ہر طرف سے مبارک باد کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ میں حیران ہوا کہ ایک سیکیورٹی گارڈ کی جاب جس کے لیے ہم ایک بار گئے اور رکھ لیے گئے، یہ کیسے اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ سب بڑھ چڑھ کر مبارک باد دے رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جتنے دوست وہاں موجود ہیں، سب نے گارڈ کی جاب لینے کی کوشش کی تھی۔ ویکن ہٹ تو بہت بڑی کمپنی ہے، انہوں نے دوسری چھوٹی کمپنیوں میں بھی کوشش کی تھی مگر کسی کو نہ مل سکی۔ خان قیصر کے علاوہ سب ہی مختلف فیکٹریوں میں لیبر جاب کر رہے تھے اور جب ان کو میری ویکن ہٹ میں جاب ملنے کا معلوم ہوا تو بھی حیران ہوئے تھے اور خوش بھی۔

شہباز نے انکشاف کرنے والے انداز کہا۔ "رات یہ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا کہ بابا کے لیے دعا کرو کہ اسے جاب مل جائے۔"

سب نے تائید میں سر ہلایا۔ انہیں بھی یہ یقین تھا کہ پاکستان فون کر کے میں سب سے کہتا ہوں کہ دعا کرو، یہ جاب انہی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ تبھی ایک جانب سے آواز آئی کہ ویکن ہٹ کا کنٹریکٹ امیگریشن ہولڈنگ سنٹر میں بھی ہے۔ اگر وہاں تمہیں کام مل جاتا ہے تو وارے نیارے ہیں کیونکہ وہاں ایک تو تنخواہ دو ڈالر فی گھنٹہ زیادہ ہے اور دوسرا پورا دن کرسی پر بیٹھنا پڑتا ہے اور کوئی جسمانی کام نہیں ہے۔ امیگریشن ہولڈنگ سنٹر کے بارے میں مطیع اللہ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا اور وہ خود اسی کوشش میں چار ماہ سے ہے کہ کسی طرح اسے بھی وہاں مستقل شفٹ مل جائے۔ ایک تو ہولڈنگ سنٹر ہمارے اپارٹمنٹ سے دور بھی نہیں تھا اور دوسرا کمپنی کی گاڑی آپ کو ایک مقام سے لے بھی جاتی اور واپس بھی چھوڑ جاتی تھی۔ اسی وقت کسی اور نے کہا کہ نئی صدی کے آغاز پر بہت سی جگہوں پر سیکیورٹی گارڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ندیم کی اتنی جلدی جاب ہوگئی۔ وہیں مجھے معلوم ہوا کہ کل رات کو میری پہلی شفٹ ہے اور وہی رات نئی صدی کا آغاز بھی ہے۔

نئے سال کا آغاز بھی میں اہتمام سے کرتا تھا۔ چاولوں کی دیگ بنواتا اور پورے محلے میں بانٹتا تھا اور یہ نئی صدی...... بیسویں سے اکیسویں صدی، میرے لیے بہت اہم تھی اور اللہ کا کرم تھا کہ اس صدی کے آغاز پر میں اپنی کینیڈا میں جاب شروع کر رہا تھا۔ خان قیصر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب اپنی فیملی کو بھی اسپانسر کرلو۔"

اتنے میں اس کی بیوی نے میرے اور سرجی کے لیے کھانا میز پر سجا دیا۔ میں نے جواب میں کہا۔ "ابھی میں اپنا خرچا بھی نہیں اٹھا سکتا اور معلوم نہیں کمپنی والے مجھے ایک ہفتے میں کتنے گھنٹے کام دیتے ہیں۔ نہیں ابھی نہیں، جب تک میں بچوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہوجاؤں، انھیں نہیں بلوا سکتا۔"

میری بات کا خان قیصر نے ایسا جواب دیا جس نے میرے دن رات، خیالات اور احساسات تک بدل ڈالے۔ میں ایک نئی جگہ پر آ کھڑا ہوا۔ میرا یقین اس لمحے نے ایسا بدلا کہ میں کسی اندرونی طاقت کے احساس میں توانا ہوتا چلا گیا۔

اس بات کو کئی سال بیت گئے اور میں یہ بات دسیوں مرتبہ کئی لوگوں کو سنا چکا ہوں۔ خان نے جھنک کر کہا تھا۔ "رازق تو ہے یا وہ اللہ کی ذات جو تجھے بھی دے رہا ہے اور تمہاری فیملی بھی آئے تو انہیں بھی دے گا۔ اور کیا معلوم ان کے دم سے تیرا رزق بھی کھلتا چلا جائے۔"

وہ یہ بات کر کے دوسروں سے گپ شپ میں مشغول ہوگیا اور میں سب گپ شپ بھول کر اس کے الفاظوں کے سحر میں کھو کر رہ گیا۔ میں کھانا بھی بھول چکا تھا۔ سرجی مجھے پکڑ کر میز تک لائے۔ کیا کھانا بنا تھا اور میں نے کیا کھایا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ صرف خان کے الفاظ بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ رازق تو ہے یا اللہ کی ذات ہے۔

میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہوا کے دوش پر...... باہر پھیلے برف سے اٹھتے نور کے پر تیرتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ آیا۔ نیند آنکھوں سے غائب تھی اور آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔ کیا میں اپنے آپ کو رازق سمجھ بیٹھا تھا؟ کیا میرا یقین اتنا کمزور تھا کہ اپنے بچوں کے رزق کا ذریعہ اپنے آپ کو سمجھ بیٹھا تھا؟ کیا جو کچھ میں کما رہا تھا، اس کا سبب میں تھا؟ اسی طرح کے کئی سوالات میرے ذہن میں اٹھتے اور مجھے جھنجوڑ دیتے تھے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا یا مجھ سے کسی اور نے کروایا کہ اپنی فیملی کو جلد سے جلد اسپانسر کرادوں۔ میرے اکاؤنٹ

میں ڈھائی ہزار ڈالر رہ گئے تھے۔ اسپانسر پر سترہ سو ڈالر خرچ ہوتے تھے۔ بعد میں فیملی کی ٹکٹ، علیحدہ اپارٹمنٹ، اس کا دو ماہ کا ایڈوانس اور ماہانہ کرایہ اور گھر کا خرچ۔ یہ ذمہ داری میں نے اپنے کندھے سے اتار کر اللہ کے حوالے کردی۔ اپنے آپ کو ان جھنجٹ سے آزاد کردیا تو سکون میں آتا چلا گیا۔

آپ لوگ یقین کریں کہ چھ ماہ میں میرے بچے میرے پاس کینیڈا میں تھے، اپارٹمنٹ بھی مل گیا اور دو ماہ کا ایڈوانس بھی دے دیا، ان کی ٹکٹیں بھی ہوگئی تھیں۔ گھر میں پورا فرنیچر بھی تھا اور ان کے آنے سے ایک دن پہلے میں نے اور خان قیصر نے سامان سے فریج بھر دیا تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں دس ہزار ڈالر بھی تھے۔ یہ کہانی بعد میں سناؤں گا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا کیونکہ اسے میں معجزہ سے تشبیہ دیتا ہوں۔ میں نے صرف یہ کیا کہ اللہ کا کام اس کے سپرد کر کے اپنے کام میں جت گیا۔ مجھے اس کے کام میں ٹانگ اڑانے کی جرأت بھی نہ ہوئی......

عشق کی ایک ہی جست نے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

میں سحری کے انتظار میں جاگتا رہا اور جیسے ہی سحری کا وقت ہوا تو میں باہر یخ بستہ ہواؤں میں نکل آیا۔ برفیں اڑ رہی تھیں اور ہواؤں کا شور سماعت شکن تھا۔ فضا دھواں دھار تھی اور برف کی برچھیاں بدن میں پیوست ہو رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا کسی ان دیکھی روشنی سے منور تھا۔ میں خان قیصر کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ بوکھلایا ہوا اٹھا اور مجھے دیکھ کر اور زیادہ بوکھلا گیا۔ "خیریت تو ہے۔ سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ "مجھے بچوں کو اسپانسر کرنا ہے...... مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

میری بات سن کر وہ ہمیشہ کی طرح کھی کھی ہنسنے لگا۔ مجھے بٹھایا۔ سحری کروائی اور اسی دوران مجھے معلومات دیتا گیا کہ پہلے امیگریشن کو فون کر کے فارم منگوانے ہیں، انھیں پُر کرنا ہے، کچھ حلف نامے دینے ہیں کہ بیوی کے لیے حکومتی امداد دس سال تک نہیں لوں گا۔ پھر امیگریشن والے میرا کیس دیکھ کر منظوری دیں گے اور وہ ایک کاپی پاکستان میں کینیڈا کے قونصل خانے کو بھیجیں گے اور تمہاری فیملی کا انٹرویو ہوگا اور پھر کاغذات انھیں مل جائیں گے۔

میں نے یہ مختصر کر کے لکھا ہے ورنہ میں نے تمام سوالات عرق ریزی سے پوچھے تھے اور جوابات نوٹ کرتا رہا تھا۔ انہی سرد ہواؤں میں واپس اپنے اپارٹمنٹ آیا۔ اللہ کو سجدہ کیا اور اس کی رحمت کو وسیلہ بنایا اور پھر چین سے سو گیا۔

کل سے نئی صدی کا آغاز تھا اور میری زندگی بھی ایک نئے موڑ میں داخل ہونے والی تھی۔ بہت سال گزر گئے اور میں ان لمحات کا لمس آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ وقت گزر جاتا ہے مگر یادیں ساتھ بہا کر نہیں لے جاتا، انھیں پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ وقت دریا کے پانی کی مانند ہے جو خود آگے بڑھتا رہتا ہے مگر یادوں کی مٹی اپنے راستے میں جماتا جاتا ہے۔ آج نیند سے بیدار ہوا تو وقت بتا رہا تھا کہ دوپہر ہو چکی ہے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو سحری کی ہوا تھک کر آرام کر رہی تھی۔ سورج کی کرنوں سے زمین، چھتوں اور درختوں پر

### شاہد کریم اللہ

پاک بحریہ کے سربراہ۔ تقرری 2002ء میں ہوئی، صدر مملکت نے اسی روز وائس ایڈمرل کے عہدے سے ترقی دے کر ایڈمرل کے عہدے پر فائز کردیا۔ انہوں نے پاکستان نیوی میں 1965 میں کمیشن حاصل کیا۔ امریکا کے وار کالج اور نیشنل ڈیفنس کالج سے گریجویشن کی۔ وہ ساحل سمندر پر اور بحری بیڑوں پر متعدد عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے دو تباہ کن بیڑوں (25 تباہ کن اسکواڈرن اور فلیٹ) کی قیادت کی۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں گن بوٹ پر بطور کمانڈر خدمات انجام دیں۔ اس دوران شدید زخمی بھی ہوئے اور غیر معمولی جرأت اور نمایاں خدمات کے اعتراف پر حکومت نے انہیں ستارۂ جرأت سے نوازا۔

وہ وزارت دفاع میں ایڈیشنل سیکریٹری ڈپٹی چیف آف نیول اسٹاف (آپریشن) اور نیول ہیڈ کوارٹرز میں ڈائریکٹر سگنل بھی رہے۔ نیز کمانڈر پاکستان فلیٹ کے چیف آف اسٹاف آفیسر اور نیشنل ڈیفنس کالج ڈائریکٹنگ اسٹاف کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ تقرری سے قبل وہ وائس ایڈمرل کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں ستارہ جرأت کے علاوہ ستارہ امتیاز (ملٹری) اور ہلال امتیاز (ملٹری) بھی مل چکا ہے۔

مرسلہ: احمد ہلال پاشا، کراچی

پڑی برف چمک رہی تھی۔ سرجی اور شہباز لیونگ روم میں بیٹھے لیڈو کھیل رہے تھے اور اپنے سرجی لیڈو کے گیٹ پر چھکے پر چھکا مار رہے تھے۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک دوست یاد آ گیا، جو ہر وقت باپ سے پٹا کرتا تھا۔ باپ کہتا تھا کہ ہر وقت گھر میں کرکٹ کھیل کر کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیتا ہے اور جب گراؤنڈ میں کھیلنے جاتا ہے تو پہلی بال پر آؤٹ ہو کر تماشائیوں میں گم صم بیٹھا نظر آتا ہے۔

میں نے شاور لیا اور فون لے کر بیٹھ گیا۔ امیگریشن کو فون کیا تو ایک خاتون سے بات ہوئی۔ میں نے پہلے اپنا لینڈنگ نمبر دیا اور پھر اپنا مقصد بیان کیا کہ میرے بچے میرے بغیر اداس ہیں اور میں انھیں کینیڈا بلانا چاہتا ہوں۔ بچوں کے معاملے میں یہ لوگ بہت حساس ہو جاتے ہیں اور بقول خان کے تم نے بچوں کی اداسی کو مرکزی نقطہ بتانا ہے۔ وہ دوسری جانب فون پر بچوں کی اداسی پر مجھ سے افسوس کرنے لگی۔ پھر بولی۔ ”میں تمھیں فارم بھیجتی ہوں۔ اس کو پُر کر کے ہمیں میل کر دو۔ ہم اس کی جانچ پڑتال کر کے اسلام آباد قونصل خانے کو بھیج دیں گے۔“

میں نے کہا کہ چھ ماہ کے بعد ان کے میڈیکل کی میعاد ختم ہو جائے گی اور میں چاہتا ہوں کہ وہ اس سے پہلے یہاں آ جائیں۔

وہ تائید کر کے کہنے لگی۔ ”تم نے کچھ فارم اپنی بیوی کو بھی بھیجنے ہوں گے جس میں وہ یہ حلف دے گی کہ دس سال تک وہ حکومت سے بیروزگاری کا وظیفہ نہیں لے گی اور وہ یہی فارم قونصل خانے کو بھیج دے گی۔ اور پھر ان کا انٹرویو ہوگا۔ اس کے بعد اگر ہر چیز صحیح ہوگی تو انھیں لینڈنگ پیپرز دے دیے جائیں گے۔“

میں نے فون رکھا تو شہباز اور سرجی اپنی لیڈو چھوڑ کر میرے گرد آ بیٹھے تھے۔ شہباز کہنے لگا۔ ”یہ پٹی تمھیں خان پڑھا رہا ہے۔ سوچ سمجھ کر فیملی بلانے کا پنگا لینا۔“

سرجی شہباز سے بولے۔ ”تمھاری فیملی نہیں ہے۔ اس لیے تم کو اس درد کا اندازہ نہیں جو باپ اپنے بچوں سے دور رہ کر سہتا ہے۔“ پھر مجھے مخاطب کر کے بولے۔ ”میں بھی جلد از جلد بچوں کو بلوالوں گا۔“

شہباز کہنے لگا آپ دونوں مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ جب بھی میرا دل کرے گا میں کھانا کھانے آپ لوگوں کے گھر میں کبھی بھی آسکوں گا۔

میں نے ہنس کر وعدہ کر لیا اور سرجی خاموش ہو لیے۔

امیگریشن کو فون کرنے کے بعد میں ایک نئی منزل کی جانب اپنے قدم بڑھا چکا تھا۔ میری سوچ اپنی فیملی پر آ ٹھہری تھی۔ ذہنی دباؤ جو میں کینیڈا آ کر محسوس کر رہا تھا، وہ بھاپ بن کر اڑ چکا تھا۔ زندگی کو با مقصد بنانے کے لیے آپ کو کسی راستے پر پہلا قدم رکھنا پڑتا ہے اور جو میں نے رکھ لیا تھا۔ امید کی ڈور میں نے باندھ لی تھی اور اب یہی ڈور تھامے میں خود کو توانا محسوس کر رہا تھا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ ہمیں تیار ہو کر نماز پڑھنے جانا تھا۔ باتھ روم میں شہباز زور زور سے گانا گا رہا تھا۔ ”تیری گلیوں میں نہ رکھیں گے قدم آج کے بعد......“

سرجی مجھے بتلا رہے تھے۔ ”شہباز کی آواز میں بلا کا درد ہے...... یہ درد پہلے سے ہے یا ابھی پیدا ہوا ہے؟“

میں جھلا کر بولا۔ ”آپ کی باتوں میں جو اتنی گہرائی ہے کیا وہ کینیڈا آنے سے آئی ہے یا پہلے سے تھی۔“

انہوں نے برا منائے بغیر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے ہی سے ہے۔“

اگر یہ نوک جھوک نہیں ہوتی تو معلوم نہیں میرا وقت کیسے کٹتا؟ ہم تیار ہو کر باوضو باہر نکلے تو سردی ایسی تھی جیسے ہونی چاہیے۔ ہم نے اپنے آپ کو گرم کپڑوں سے مکمل ڈھانپ رکھا تھا۔ سرجی کا دل برف کو دیکھ دیکھ کر للچانے لگا تھا مگر ہماری وجہ سے وہ تابعدار بچوں کی طرح خاموش چل رہے تھے۔ ہم IMO مسجد آئے تو شیشے کے بڑے دروازے پر ایک بینر آویزاں تھا۔ ”عید مبارک۔“

سرجی کہنے لگے۔ ”ٹورنٹو میں کیا عید مناتے ہیں؟“

شہباز اپنی اداس نگاہیں بینر پر ٹکا کر بولا۔ ”عید تو تب ہوتی ہے جب ماں کی ہاتھ سے بنی سوئیاں کھانے کو ملیں۔ ورنہ کہاں کی عید؟“

سرجی نے کہا۔ ”عید تو تب ہی ہوتی ہے جب تک بیوی آپ کے لیے عید کا سوٹ استری نہ کرے۔“ پھر دونوں میرا جواب سننے کے لیے میری جانب متوجہ ہوئے۔ میں بولا۔ ”جلدی کرو۔ اذان ہو رہی ہے اور کہیں نماز نہ نکل جائے۔“

نماز پڑھ کر باہر نکلے تو سرجی نے کہا۔ ”مجھے سامنے دیسی اسٹور سے کچھ لینا ہے۔ میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اسٹور کی جانب چلے گئے۔ شہباز کہنے لگا کہ اسے کالنگ کارڈ لینا ہوگا۔ باہر نکلے تو ان کے ہاتھ میں دو پلاسٹک کے بیگ تھے۔ ایک میں پیاز اور دوسرے میں جلیبیاں تھیں اور سرجی کا چہرہ مکمل طور پر مطمئن تھا۔

افطاری کے بعد میں اپنی سیکیورٹی کی پہلی جاب کے پہلے دن کے لیے ایسے تیار ہونے لگا جیسے دولہا تیار ہوتا ہے۔ میں خوش اس لیے بھی کچھ زیادہ تھا کہ اتنی ساری مبارک بادیں مل چکی تھیں جس سے میں نے یہ تاثر لے لیا تھا کہ مجھ سے کوئی معرکہ سرانجام پا گیا ہے۔ مجھے خوش ہونا چاہیے تھا اور میں خوش و پُرجوش تھا۔ نہایا اور اپنی سائز سے چھ انچ کھلی گرے رنگ کی پتلون پہنی۔ سفید شرٹ پہن کر نیلی ٹائی لگائی۔ نیلا کوٹ اور پھر، کالی جرابیں اور سیاہ چمکتے بوٹ اور ان سب پر ایکسٹرا ایکسٹرا لارج جیکٹ جس کے کندھے میری کہنیوں کے اوپر تھے اور نیچے وہ گھٹنوں کو ٹچ کر رہی تھی۔ پتلون تو میں نے بیلٹ سے سنبھال لی مگر جیکٹ ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ جیکٹ پر بڑا بڑا سیکیورٹی لکھا تھا جو میرے حلیے سے بالکل مطابقت نہ رکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا سیاہ بیگ کندھے سے لٹکایا تو سرجی نے ایک شاپر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولے۔ ”یہ سحری کا سامان ہے کہ وہاں کہاں سحری کرو گے؟“

”ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس میں کچھ سلائس ڈبل روٹی ہے اور فرائی انڈا ہے اور ساتھ میں دو عدد جلیبیاں بھی رکھ دی ہیں۔“ وہ بولے۔

میری جاب دس بجے رات سے صبح چھ بجے تک تھی۔ مجھے بھی بتایا گیا تھا کہ رات کی سیکیورٹی کی جاب میں جا کر صرف آپ کو سونا ہوتا ہے۔ کوئی کام نہیں ہوتا اور صرف وہاں وقت گزارنے کے پیسے ملتے ہیں۔

میں سات بجے اپارٹمنٹ سے باہر نکلا تو آسمان صاف تھا مگر سردی بلا کی تھی۔ ایک گہما گہمی سی نظر آرہی تھی کیونکہ سب نئی صدی کا استقبال کرنے والے تھے۔ ہر ایک اپنے انداز میں پُرجوش تھا۔ میں سب وے جانے کے لیے بس سٹاپ پر آیا تو وہاں خان قیصر بھی سیکیورٹی کی وردی میں ملبوس اپنی جاب پر جانے کے لیے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھی کھی ہنسنے لگا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا کہ اتنے میں اسٹاپ پر بس آرکی۔ اس وقت بس عموماً خالی ہوتی ہیں مگر آج بھری ہوئی تھی۔ جتنے لوگ سیٹوں پر بیٹھے تھے ان سے زیادہ کھڑے تھے۔ میں بھی کہیں فٹ ہو گیا۔ سب وے میں بھی بے انتہا رش تھا۔ لوگ جوق در جوق ڈاؤن ٹاؤن آتش بازی دیکھنے جا رہے تھے۔ خواتین اور حضرات اپنے چمکتے دمکتے چہروں کے ساتھ بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔ ٹرین میں بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور اسی لیے کھڑے ہو کر جانا پڑا۔ ٹرین اپنے اسٹاپ پر رکتی تو اترنے والا کوئی نہ ہوتا بلکہ سوار ہونے والے بے شمار ہوتے۔ لوگ ایک دوسرے سے لگ کر کھڑے تھے اور کچھ اپنی مرضی سے چپک کر نئی صدی کا آغاز کر رہے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ نیا ماحول، نئے موسم اور نئے اطوار تھے۔ کچھ بھی ہم جیسا نہ تھا۔ ان کی خوشیاں، غم، ضرورتیں، عادتیں، رنگ ڈھنگ، لباس، ہنسنا، مسکرانا سب ہم سے مختلف تھا۔ ہم ان کو اجنبی نظروں سے دیکھتے ہیں اور وہ ہمیں۔ وہ ہم سے مسکرا کر ملتے ہیں اور ہم بھی ان کی نقل میں ان جیسے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ لوگ بہت امیر و کبیر ہوتے ہیں۔ ہمارے اکاؤنٹ تو بچت سے بھرے رہتے ہیں اور ان کے اکاؤنٹ میں اگلی تنخواہ سے پہلے شاید چند ڈالر بھی نہ ہوں مگر لگتے وہ ہم سے امیر ہیں۔ بچت کا تصور ان میں تو سرے سے ہے ہی نہیں اور نہ انہیں اپنے پیچھے کسی کو پیسے بھیجنے ہوتے ہیں اور نہ بچوں کے لیے سنبھال کر رکھنے کا رواج ہے اور نہ بچوں کو یہ کہنے کا رواج ہے کہ دیکھو ہم نے تم لوگوں کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دی اور معاوضے کے طور پر ہماری پسند سے شادی ہی کر لو۔ یہ لین دین ان کے ہاں نہیں چلتا۔ میں پہلے یہ سمجھتا تھا کہ یہ اپنے بچوں کا خیال نہیں رکھتے ہوں گے مگر جب دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہ ہم سے زیادہ ان کی نگہداشت کرتے ہیں۔ انھیں پھولوں کی طرح رکھتے ہیں۔ ان کو وقت دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ پارکوں میں کھیلتے ہیں۔ کیمپنگ، فشنگ، بوٹنگ پر ان کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ان کے بچے روتے چنگھاڑتے کیوں نہیں۔ اس لیے کہ جب بچہ کوئی انوکھا ردِعمل دے تو یہ پہلے معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہیں کہ وجہ کیا ہے اور پھر وہ اس کا سدِباب کرتے ہیں۔ ہم تو بچے کے رونے پر اگر تھپڑ رسید نہ کریں تو پھر بھی پہلے بری طرح ڈانٹتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ رونا تو اس کی عادت ہے۔ مشرق اور مغرب کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ میرا آج کے دن تک کا دعویٰ ہے۔ گو بہت سی باتیں ہم میں بہت اچھی ہیں جیسے ایک خاندان کا تصور، بڑوں کا لحاظ اور ان کے مرتبے کی قدر و قیمت مگر آپ لوگ زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں کہ ہماری یہ چیزیں قائم و دائم ہیں یا کہ فنا ہو رہی ہیں۔

میں ایک سب وے پر اترا تو وہاں بڑی بڑی ٹی وی کی اسکرینیں لگی تھیں اور یورپ و آسٹریلیا۔ جہاں جہاں نئی صدی شروع ہو چکی تھی، وہاں کے شہروں میں آتش بازی کے مظاہرے دکھلائے جا رہے تھے۔ لوگ ان کے سامنے کچھ دیر کو ٹھہرتے اور پھر قہقہہ لگاتے آگے بڑھ جاتے۔ میں سب وے سے باہر آیا تو آسمان رنگ برنگی پھلجھڑیوں سے جگمگا رہا تھا۔

یہاں آتش بازی زوروں پر تھی۔ لوگوں کا شور شرابہ تھا جس میں کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ میں ان کے درمیان ایسے تھا جیسے کسی پرائی شادی میں آگھسا ہوں۔ ایک بات کا کریڈٹ میں اپنے آپ کو آج دینا چاہتا ہوں کہ میں کبھی ان کی زبان، لباس اور حرکات سے متاثر نہ ہوا۔ یہ نہیں کہ میں یہاں شلوار قمیص میں گھومتا رہا یا میں نے انگریزی بولنا نہ سیکھی۔ لیکن میں ان کے آگے مؤدب نہ ہوا۔ عزت ان کی کی جنہوں نے عزت دی۔ یہ نہیں کہ سب یہاں فرشتوں جیسے اخلاق رکھتے ہیں۔ بہت سے مہا کمینے اور سازشی بھی ملے۔ میں کبھی ان کے رنگ و نسل سے مرعوب نہ ہوا اور جہاں زیادتی میرے ساتھ ہوئی تو منہ توڑ جواب دیا اگر موقع ملا۔ اکثریت سچ بولتی ہے اور انسانوں کی قدر کرتی ہے۔

میں ایک بس کے سفر کے بعد دس پندرہ منٹ پیدل چل کر سولہ منزلہ ایک سلیٹی رنگ کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے کھڑا، بالکونیوں سے جھانکتے چہرے دیکھ رہا تھا جن کی نگاہیں آسمان میں ہوتی آتش بازی پر تھیں۔ ارد گرد اسی طرح کی دوسری عمارتوں کا جال تھا اور سب روشنیوں میں نہائی ہوئی تھیں۔ ایک گہما گہمی اور چہل پہل چہار جانب پھیلی تھی۔ مجھے حیرت کا جھٹکا تب لگا جب یہ محسوس ہوا کہ اکثریت دیسیوں کی ہے۔ ان میں بہت سے پاکستانی خاندان مقیم ہیں۔

یہاں بلڈنگ کا انچارج سپرینڈنٹ ہوتا ہے، جس کو یہاں سپر کہتے ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر اس کا دفتر ہوتا ہے اور اس کو ایک اپارٹمنٹ بھی مفت میں ملتا ہے۔ لیکن بیچارہ گدھوں کی طرح کام کرتا ہے۔ اور اگر رہائشی دیسی ہوں تو ایک عذاب میں گھرا رہتا ہے۔ میں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ اس نے پہلے میرا بھرپور جائزہ لیا اور پھر میں نے اس کا جائزہ لیا۔ یہ کام ختم ہوا تو پھر تعارف ہوا۔ میں نے پوچھا کہ یہاں کوئی خطرہ ہے کیا؟

"خطرہ تو نہیں، صرف رات میں نئی صدی کے آغاز پر کچھ منچلے الکوحل سے اوور لوڈ ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے آج سیکیورٹی منگوائی ہے۔"

میں جواب میں بولا کہ وہ تو ٹھیک ہے مگر سیکیورٹی گارڈ کے چھپنے کی کون سی جگہ ہے۔ اگر ایسا کوئی ہنگامہ ہو جاتا ہے تو مجھے کہاں چھپ کر اپنی جان بچانی ہو گی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا دفتر کھول کر میرے حوالے کر دیا اور چابیاں مجھے دے دیں۔ پھر کہنے لگا۔ "تم اپنے آپ کو اس کمرے میں بند کر لینا مگر پولیس کو 911 پر کال ضرور کر لینا۔"

میں نے پکا وعدہ کر لیا۔ پھر اپنی عادت کے مطابق پوچھا۔ "تم کہاں سے ہو اور کب کینیڈا آئے تھے۔"

وہ عمر رسیدہ سپر میرا سوال سن کر دہائیوں کا دکھ بانٹنے اپنے آفس میں میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "چھوٹا تھا 1943 میں کیوبا سے اپنے والد کے ساتھ چھپ چھپا کر یہاں پہنچا تھا۔ مزدوریاں کرتے کرتے یہاں کا سپر بن گیا اور پچھلے کئی سالوں سے ایک ڈگر پر زندگی کو گھسیٹ رہا ہوں۔" وہ بولا تو بہت مگر میری سمجھ میں یہی باتیں آئیں۔

آفس کے ساتھ واش روم تھا۔ چھت میں اسپیکر لگے تھے اور تیز موسیقی کی آواز اس میں بج رہی تھیں اور مجھے بے چین کرتی تھیں۔ میں کبھی کبھار باہر لابی کا چکر لگا آتا۔ لابی میں چار لفٹیں لگی تھیں جہاں سے لوگوں کا آنا جانا لگا تھا۔ دیسی زیادہ تھے جو ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈال کر نکل جاتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ میں کام کون سا کروں اور یہ کون سی جاب ہے جس میں میں گھوم پھر رہا ہوں۔ ابھی نئی صدی میں آدھ گھنٹا رہتا تھا۔ میں اپنی ڈائری کھول کر لکھنے بیٹھ گیا۔ میں ہر سال کے آغاز پر ڈائری لکھتا ہوں۔ پچھلے سال جب لکھ رہا تھا تو ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا کہ اگلے سال کی آمد پر یہ ڈائری ٹورنٹو میں ایک بلڈنگ کے دفتر میں بیٹھ کر اور گارڈ کی وردی میں ملبوس ہو کر لکھوں گا۔ زندگی مجھے کہاں سے کہاں اڑائے پھر رہی ہے؟ میں یہی سوچ رہا تھا۔ میں پاکستان میں اپنی فیملی کے ساتھ ایک قرینے کی زندگی چھوڑ کر کہاں اور کیوں آ بیٹھا ہوں۔ زندگی میں مختلف تجربات کرنے کی دھن میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوں۔ میں یہی کچھ لکھ رہا تھا کہ باہر شور و غوغا اٹھا۔ آفس سے باہر نکلا تو پورا آسمان رنگ برنگی روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ زمین سے روشنیاں دھماکوں سے پھٹتیں اور آسمان کی وسعتوں میں پھیل جاتیں۔ نئی صدی شروع ہو رہی تھی۔ اس پاس کی عمارتوں کی بالکونیوں سے جھانکتے چہرے شور کر رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر کو ٹھنڈ کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ یہ تماشا کچھ دیر جاری رہا۔ شور سرگوشیوں میں بدلے اور سرگوشیاں دبے دبے قہقہوں میں۔ میں نے اپنی ساری دعائیں پھر سے دہرائیں اور بار بار دہرائیں...... بہت سی چیزیں اللہ سے مانگیں اور پھر مطمئن ہو کر آفس میں آ بیٹھا، جہاں تیز موسیقی میرے کان پھاڑ رہی تھی۔

ایسے آرام سے بیٹھنا میرے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ رات سردی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ میں راؤنڈ لگانے پھر باہر آ گیا

تھا۔ مجھے کسی مجرم پر تو نظر رکھنی تھی۔ صرف مشاہدہ کرنا تھا کہ نئے سال اور خاص کر نئی صدی کا استقبال گورے لوگ کیسے کرتے ہیں مگر یہاں گورے بہت ہی کم اور پاکستانی زیادہ تھے۔ بعد میں اس علاقے میں میرا آنا جانا بہت رہا۔ اس علاقے میں جتنی اپارٹمنٹ بلڈنگ تھیں اس میں پاکستانی خاندان رہائش پذیر تھے۔ میرے ایک دوست کی رہائش بھی یہاں تھی اور میں اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔ یہ علاقہ بیگم پورہ کہلاتا تھا۔ مڈل ایسٹ میں جو پاکستانی اچھی نوکریوں پر فائز تھے، انہوں نے کینیڈا کی امیگریشن لی ہوئی تھی۔ فیملی یہاں کینیڈا میں رکھتے تھے اور خود مڈل ایسٹ میں جاب کرتے تھے۔ یہاں کا خرچ اٹھانا کوئی ان کے لیے مشکل نہ تھا اور حکومت بھی کچھ الاؤنس دے دیتی تھی۔ وہ خود سال میں ایک ماہ یہاں ٹورنٹو آجاتے تھے۔ یہاں اسکول، میڈیکل سب مفت تھا۔ امن بھی تھا۔ بیگمات یہاں رہتی تھیں اور اس لیے منچلے اس علاقے کو بیگم پورہ کہتے تھے۔ عورتیں گھرداری کرتی تھیں۔ بھرپور دیسی ماحول بنا ہوا تھا۔ بچے جواب بڑے ہو گئے تھے ان میں کچھ زیادہ دیسی نہ رہے تھے۔ میں باہر کھڑا تھا کہ ایک گاڑی میں کچھ نوجوان تیز موسیقی پر پنجابی دھنیں سن رہے تھے اور ہلا گلہ چل رہا تھا۔ ایک نوجوان میرے ساتھ کھڑا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ایک نوجوان نے کچھ بہکے لہجے میں میرے ساتھ کھڑے لڑکے سے کہا۔ ڈاؤن ٹاؤن چلو گے تو اس نے انکار کر دیا۔ یہ گفتگو اردو میں تھی۔ میں دلچسپی سے سننے لگا۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا اور یہاں سے وہی جواب گیا اور پھر وہ گاڑی فراٹے بھرتی چلی گئی۔ اس کا نام زاہد تھا۔ عمر کوئی بائیس کے قریب ہو گی۔ چہرے پر مایوسی اور افسردگی تھی۔ وہ بتانے لگا کہ میں یہاں بالکل خوش نہیں ہوں۔ ہم چار سال پہلے یہاں آئے تھے۔ میرا دل یہاں نہیں لگتا۔ نہ روزوں کا پتا ہوتا ہے اور نہ عید کی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ پاکستانی لڑکے شراب بھی پیتے ہیں اور فحاشی میں بھی پڑے ہیں۔ پھر بتانے لگا کہ جو میرے دوست ابھی ڈاؤن ٹاؤن گئے ہیں وہ سب نشے میں دھت ہیں۔ وہاں کسی کلب میں رات کالی کریں گے حالانکہ رمضان شریف کا مہینا ہے اور کوئی شرم نہیں ان میں۔ میں نے پوچھا کیا سب لڑکے ان چکروں میں پڑے ہیں تو جواب دیا۔ نہیں! تمام نہیں صرف چند ایک ہیں، جن کو اپنے گھر اور مذہب کا ادراک بھی نہیں۔

مجھے اس کے خیالات سے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اگر کسی کو گھر میں بہتر ماحول ملے اور خود بھی سمجھا ہوا ہو تو ذہن میں ایسے ہی خیالات پلتے ہیں۔

میں بھی دفتر میں بیٹھتا اور جب تیز انگریزی دھنوں سے کان پک جاتے تو باہر نکل آتا۔ باہر روشنیاں تو تھیں مگر زندگی میں جان نہ تھی۔ ماحول وقت کے ساتھ تھکنا شروع ہوا۔ اور پھر سست پڑ کر لیٹتا چلا گیا۔ مجھے نیند کے جھٹکے لگنا شروع ہو ہوئے جو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ زاہد چائے بنا لایا اور بولا امی کہتی ہیں کہ سحری بھی ہماری جانب سے ہو گی۔ اس خلوص میں اپنا پاکستانی پیار اور محبت تھی۔ افطار اور سحر کے وقت ہم اپنے چھوٹے شہر ڈیرہ میں اسی طرح آس پاس کا خیال رکھتے تھے اور یہاں ٹورنٹو میں ایک پاکستانی بہن اس سیکورٹی گارڈ کی سحری کا دھیان رکھ رہی تھی۔ میرے پاس سرجی کا دیا ہوا سحری کا لفافہ تھا مگر زاہد کے الفاظوں سے میرا سر خود اعتمادی سے اٹھتا چلا گیا۔

میں نے چائے پی زاہد چلا گیا۔ وقت رینگتا رہا اور میں نیند سے لڑتا رہا۔ سحری تک اس لڑائی میں میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے تو سو جانا تھا مگر سپر کے دفتر میں بے ہنگم موسیقی، مجھے ذہن سے بیٹھنے تک نہ دیتی تھی تو سونے کیا دیتی۔ پھر مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کچھ دیر قبل مجھ سے ملنے والا زاہد میرے ساتھ کچھ ایسا کرے گا کہ اس کی یاد تا عمر مجھے رہ رہ کر بتاتی رہے گی کہ گل سے ہی زندگی بنتی ہے۔

سحری کے وقت وہ معصوم سا نوجوان زاہد ایک ٹرے اٹھا لایا جو ایک بڑے رومال سے ڈھانپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سحری بھی لے آیا تھا۔ ہم دونوں نے آفس میں بیٹھ کر سحری کی۔ بہت دنوں بعد پراٹھے، قورمہ اور دہی نصیب ہوا اور ہم دونوں نے سیر ہو کر پیٹ بھرا۔ اس نے جاء نماز لا کر دی اور میں نے لابی میں نماز ادا کی۔ چھ بجے تک زاہد میرے ہمراہ رہا اور پھر مجھے گلے لگا کر رخصت کیا۔ معلوم نہیں وہ اب کہاں ہو گا۔ بس اس کے لیے اب بھی دل سے دعا نکلتی ہے۔ اس کی یاد اب بھی آتی ہے تو دل سے اس کے والدین کے لیے دعا نکلتی ہے کہ انہوں نے خوب تربیت کی ہے۔

چھ بجے تو میری فراغت ختم ہوئی۔ میں نے چابیاں سپر کے میل باکس میں ڈالیں اور باہر آ گیا۔ اِکا دُکا ٹیکسیاں چلتی تھیں۔ بس اسٹاپ پندرہ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ میں بلند اور روشن جگمگاتی ہوئی عمارتوں کے بیچ سڑک پر چلتا اسٹاپ پر آیا۔ درختوں پر کرسمس اور نئے سال کی آمد کی خوشی میں رنگ برنگی قمقمے جلتے تھے۔ آج ویک اینڈ تھا اور کچھ دیر انتظار کے بعد ایک بس اسٹاپ پر آ رکی۔ مجھے اٹھایا اور Pape سب وے پر

جا اتارا۔ سب وے اسٹیشن کا گیٹ بند تھا اور باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی لائن لگی تھی۔ نڈھال، تھکے ہارے اور پژمردہ چہرے ایک دوسرے کے سہارے انتظار کی لائن میں کھڑے تھے۔ لمبے کوٹ، سروں پر اونی ٹوپیاں اور گلوں میں مفلر اور ہاتھ دوسروں کی کمر کے گرد لپٹے تھے، نقاہت سب پر طاری تھی۔ نشے ٹوٹ چکے تھے اور حقیقت کی بے رحم دنیا ان کے سامنے دروازے بند کیے کھڑی تھی اور ماحول میں قدرے اجالا اور کچھ تاریکی چھائی تھی۔

صرف ایک کیفے کھلا تھا۔ رت جگے اور بھاری بھرکم سحری سے میں بھی نیند کے جھونکوں میں کھڑا تھا اور لائن میں انتظار کرنے کی بجائے میں کیفے میں آبیٹھا۔ ایک دھواں دھار ماحول میں گرم بھاپ اڑاتی کافی کے مگ میزوں پر دھرے تھے اور سگریٹ کا دھواں کیفے کی فضا میں معلق تھا۔ باتیں کم اور کہانیاں زیادہ تھیں جو چہروں پر لکھی تھیں، ہر ایک کھلی کتاب کی مانند تھا۔ میں ان پر لکھی کچھ کہانیاں پڑھنے لگا تو کسی نے اعلان کیا کہ سب وے تو آج نو بجے کھلے گا۔ یہ سن کر کرسیوں پر پڑے جسم کچھ کسمسائے۔ ایک ہلچل سی پیدا ہوئی اور میں بھی بہت سوں کے ساتھ بس اسٹاپ کی طرف دوڑا کہ کوئی پہلی بس مجھے کہیں اپنے اپارٹمنٹ کے قریب ہی اتار دے۔ کچھ بسیں آئیں مگر یہ سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کس جانب جا رہی ہیں۔ ایک بس مغربی سمت کی جانب منہ کیے کھڑی تھی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ آج میرا ٹرانسپورٹ کا ماہانہ پاس چلنا شروع ہو گیا تھا جو میں نے کل شاپرڈرگ مارٹ سے خریدا تھا۔ بس چلی اور میں باہر جھانکتا تھا کہ کہیں مانوس سی جگہ نظر آ جائے اور میں وہیں اتر جاؤں۔ سب مقامات اجنبی تھے۔ سب چہرے اور رویے تک اجنبی تھے۔ بس بہت دیر تک چلتی اور پھر رکتی اور آخر کار ایک مقام پر ٹھہر گئی۔ سب کے ہمراہ میں بھی باہر اتر آیا۔ نیند اور تھکاوٹ سے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور اب کہاں جاؤں۔ بے بسی اور لاچارگی کا احساس ابھر آیا اور اس سے پہلے یہ احساس مجھے لاغر کر کے گرا دیتا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا۔ بارہ ڈالر میں دس منٹ کے اندر اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے آ اترا۔ اندر دونوں دوست بے ہوشی میں پڑے تھے اور ساتھ اپنے میٹرس پر میں بھی گر گیا۔ مجھے اپنی جیکٹ اتارنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

دوپہر میں نیند سے بیدار ہوا۔ سرجی اور شہباز پھر سے لیونگ روم میں لڈو کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا تو دونوں بیک وقت رات کا احوال پوچھنے لگے۔ میں نے مختصر کر کے ان کو بتایا۔ شہباز ایک لمبی کراہ لے کر بولا۔ "میرا پرمٹ کب آئے گا؟ ڈیپریشن کا سیاپا بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ہائے اللہ کہاں آ پھنسا۔" سرجی سریلے لہجے میں چہکے۔ "پھنس کیسے گئے؟ اتنا شاندار موسم ہے، برف پڑ رہی ہیں اور ماشاءاللہ کوئی کام بھی نہیں۔ بس آرام ہی آرام ہے۔ بندے کو اللہ کا شکر گزار بھی ہونا چاہیے۔"

شہباز بھنا کر اٹھ بیٹھا۔ "تیرا بیڑہ تر جائے سرجی۔ پتا نہیں! آپ کو اتنا چین کیوں ہے۔ ہماری تو......" سرجی بھاری بھاری گالیوں کا وزن سہار نہ سکے اور کانوں کو ہاتھ لگاتے بولے۔ "رمضان شریف میں گالیاں بکنا گناہ ہے۔"

اچھا ہوا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور سرجی نے لپک کر فون اٹھایا۔ شاہد اسپیکنگ۔

دوسری جانب ویکن ہٹ کا سپروائزر تھا۔ سرجی نے فاقٹ فون مجھے تھما دیا۔ دوسری جانب سے مجھے کہا گیا کہ آج رات مجھے ویسٹ مال میں ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جاب پر جانا ہے۔ رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک کی جاب تھی۔ ایڈرس لکھوایا۔ نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

ویسٹ مال گھر سے بس پر صرف دس منٹ کی دوری پر تھا۔ آنے جانے کی کوئی مشکل نہ تھی۔ اللہ کا شکر بجا لایا کہ دوسرے دن کی جاب بھی مل گئی تھی۔ شہباز اپنے پرمٹ کا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے شہباز کو فون دے دیا۔ آگے سے اسے کچھ دیر ہولڈ پر رکھا گیا اور پھر یہ خوش خبری جیسے اسے ملی کہ اس کا پرمٹ آ گیا ہے تو فون رکھ کر وہ شادمانی سے ناچنے لگا۔ ساتھ میں سرجی کو بھی اٹھا لیا۔ سرجی جب تھک ہار کر بیٹھے تو بولے۔ "ماشاءاللہ۔ شہباز تم ڈانس اچھا کر لیتے ہو۔"

شہباز یہ خوش خبری خود سنانے ماموں کے گھر چلا گیا۔ میں واش روم میں جا گھسا اور سرجی افطاری کے بندوبست کے لیے کچن میں جا ٹھہرے۔

میری تھکاوٹ ابھی اتری نہ تھی، میں دوبارہ اپنے کمرے میں میٹرس پر دراز ہو گیا۔ کمرا تندور بنا ہوا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تو میں نے کمرے کی ڈور وال کو کھول کر ذرا سا سرکایا تو تند ہوائیں سیٹیاں بجاتی اندر گھسنے کے لیے شیشے کے دروازے سے سر پٹخنے لگیں۔ کمرے کی ڈور وال کے باہر جھاڑیاں تھیں جس کی ٹہنیاں ہواؤں کے زور سے زمین کو چھو رہی تھیں۔ یہی جھاڑیاں میری تنہائی کی ساتھی تھیں۔ میں اکیلا ہوتا تو انہیں دیکھا کرتا تھا۔ انہیں بہار میں شاداب ہو جاتا تھا۔ رنگ برنگے پھول اس پر کھلتے تھے مگر آج وہ کملائی ہوئی خشک شاخیں تھیں

جو ہواؤں سے دوہری ہو رہی تھیں۔

نیند تھکاوٹ کی وجہ سے نہ آئی۔ میں نے اپنے دماغ کو باہر کی سوچوں سے آزاد کرنے کی سعی کی تو کچھ ہلکا پھلکا ہو گیا...... گرم پانی کے تیز شاور سے تازہ دم ہوا تو جسم ہلکا ہو گیا۔ بے انتہا سردی سے جسم کے پٹھے اکڑ جاتے ہیں یا شدید تھکاوٹ سے بدن بے آرام ہوتا ہے تو واحد حل گرم پانی کے زوردار شاور کے نیچے دس پندرہ منٹ کھڑے ہونا کسلمندی، نقاہت اور ڈپریشن دور کر دیتا ہے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ باہر سرجی نے افطار کا دسترخوان سجایا تھا اور اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھے تھے اور معلوم نہیں کتنے دیر سے بیٹھے تھے۔ پوچھا تو بتانے لگے۔ دل بہت اداس سا ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا آج انہیں بھی اپنے بچوں اور پاکستان کی یاد ستا رہی ہوگی۔ سرجی بچوں کے بارے میں بہت کم بات کرتے تھے۔ میں نے سوچا آج ان پر بھی ڈپریشن کا دورہ پڑا ہے۔ میں ساتھ جا بیٹھا اور ہمدردی سے پوچھا۔ ”بچے یاد آ رہے ہوں گے۔ کوئی بات نہیں، انشاءاللہ وہ بھی جلد آ جائیں گے۔ یہ کڑا وقت سب پر گزرتا ہے مگر ہمیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔“

وہ کہنے لگے۔ ”نہیں آج پورا دن اپارٹمنٹ سے باہر ٹھنڈی ہواؤں میں نہیں نکلا اس لیے دل اداس ہو رہا ہے۔“ پھر ایک حسرت بھری نظر باہر ڈالتے ہوئے بولے۔ ”افطاری کر کے ذرا گلاٹی کا چکر نہ لگا آئیں؟“ پھر باہر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں موسم کتنا شاندار سہانا ہو رہا ہے۔“

میں نے ہامی بھر لی اور وہ اپنی اونی ٹوپی اور جیکٹ پہن کر افطاری کے لیے آ بیٹھے۔ افطاری کی اور نماز پڑھی۔ میرے سلام پھیرنے سے پہلے ہی وہ اپارٹمنٹ کی چابی اٹھائے دروازے پر تیار کھڑے تھے۔ میں نے کہا پہلے چائے پی لیتے ہیں تو ملتجیانہ انداز سے بولے واپسی پر پی لیں گے۔ میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

باہر موسم وہی تھا جو پندرہ دن سے چلا آ رہا تھا۔ سرجی جیسے کسی قید سے باہر آ نکلے ہوں۔ پہلے فضاؤں میں کچھ سونگھا اور پھر چین سے گہرے گہرے سانس لیے اور شانت ہوتے چلے گئے۔

ہم مارٹن گروو روڈ کی بجائے بیچ کی گلیوں سے ہو کر گلاٹی اسٹور جا رہے تھے۔ سردی منفی دس سے کم ہو تو ستاتی ہے۔ آج منفی دس کے آس پاس ہی بھٹک رہی تھی۔ گلیوں میں ارد گرد چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانات تھے جن پر کرسمس کی روشنیاں ابھی تک جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ سناٹا طاری تھا۔

مکین گھروں میں دبکے تھے۔ گھروں کے باہر مکینوں نے اپنا فالتو سامان اپنی مخصوص جگہوں پر رکھا ہوا تھا جس کو کوڑے کے ٹرک نے اٹھا کر لے جانا تھا یہاں بہت سے لوگ نیا سامان خریدتے ہیں اور پرانا سامان جو انتہائی اچھی حالت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس سے اپنی جان چھڑوا لیتے ہیں۔ میزیں، کرسیاں، صوفہ سیٹ، میٹرس کے علاوہ بھی بہت سا سامان بے مول پڑا تھا۔ سرجی کو ایک میٹرس پسند آ گیا اور وہ تھا بھی بہت اچھی حالت میں۔ کہنے لگے اس کو لے چلتے ہیں مگر وہ اتنا بھاری تھا کہ ان سے ہلایا بھی نہ گیا۔ بہت سا سامان ترتیب سے گھروں کے سامنے رکھا تھا اور یہ ایک طرح کا اشارہ تھا کہ اس میں کوئی خرابی یا نقص نہیں ہے اور کوئی بھی اللہ کا بندہ اسے اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ ہمارے ایک جاننے والے انہی مقامات سے ویکیوم کلینرز اور ایئر کنڈیشنر اٹھا کر لوگوں میں بیچا کرتے تھے۔ اس نے تو اس کو کاروبار بنایا ہوا تھا۔ اگر کسی کو کوئی خاص چیز کی ضرورت ہوتی تو ان کو فون کر دیا جاتا تھا۔ وہ ویک اینڈ پر اپنے کنبے کے ہمراہ علاقے کی تلاشی پر نکلتے اور وہی چیز برآمد کر لاتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ کینیڈا میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک لٹنے والے اور دوسرے لوٹنے والے اور وہ برملا کہتے تھے کہ میرا تعلق دوسری طرح کے لوگوں سے ہے۔ اگر کسی دن پچاس سو ڈالر بنا لیتے تو مجھے فون پر اس معرکہ سر کرنے کی اطلاع دیتے اور پھر کہتے۔ ”تم نے جاب کر کے ایک دن میں کیا بنایا ہے جو میں نے ایک گھنٹے میں بنا لیا۔“

بات ہو رہی تھی سرجی کی، جو کوشش کے باوجود وہ میٹرس ہلا تک نہ سکے اور پھر تھک کر اداس کھڑے ہو گئے تھے۔

ہم گلیوں میں گھومتے ہوئے گلاٹی سپر مارکیٹ کی طرف آ نکلے یہاں سناٹا تھا۔ دکانیں بند تھیں اور ہو کا عالم تھا۔ مجھے جلدی واپس اپارٹمنٹ کو پہنچنا تھا کیونکہ آج رات ویسٹ مال پر کسی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں میری جاب تھی۔

میں نو بجے اپنی وردی پہن کر تیار ہوا اور ایک ہی بس سے ویسٹ مال دس منٹ میں پہنچ گیا۔ دس منٹ پیدل چل کر میں ایک بیس منزلہ عظیم الشان بلڈنگ کے باہر کھڑا اس کا حجم ناپ رہا تھا۔ اپنے گرد و نواح میں تنہا کھڑی اس عمارت میں دوسری عمارتوں سے تین گنا زیادہ اپارٹمنٹس تھے جیسے تین بلڈنگز کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ باہر خاموشی ایسی تھی کہ کوئی سوئی بھی گرے تو اس کی آواز بھی سنائی دے۔ عمارت کے آگے اور پیچھے پارکنگ تھی، جس میں

روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں اور کسی خوف کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ حالانکہ ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی مگر میں دہل رہا تھا کہ اس جیسی عمارت جن کی حفاظت کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر آ پڑی ہے۔

کچھ دیر پتھر بنا سوچتا رہا اور پھر بھاری قدم اٹھاتا اس کے شیشوں سے بنے خاموش گیٹ میں داخل ہو گیا۔ اندر حدت تو تھی مگر باہر سے زیادہ خاموشی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ شہر خموشاں کی تمثیل ہے۔ سب مکین کسی خوف سے پوری عمارت ویران کر گئے ہیں۔ جب کہ لابی کی آرائش سے معلوم ہوتا تھا کہ ان اپارٹمنٹس کے مالکان مالی طور پر بہت مستحکم ہیں۔

چند لمحوں بعد میں نے کال پر پیر سے رابطہ کیا اس نے انتظار کرنے کا کہا۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میرے پیچھے مرکزی دروازہ تھا سامنے لفٹ کا دروازہ اور ہر طرف گہری خاموشی کا راج تھا۔ ایسی خاموشی تھی کہ اپنے تنفس کی آواز بھی شور محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد لفٹ کا دروازہ کھلا اور ایک پریشان زدہ چہرہ اس سے برآمد ہوا۔ چہرہ بالکل بے تاثر تھا، لگتا تھا کہ کوئی ذومبی ہو۔ میری یونیفارم دیکھی پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم آدھ گھنٹا جلدی آ گئے ہو مگر پیے دس بجے سے شروع ہوں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو مجھے لابی میں ایک کاؤنٹر پر لے گیا۔ وہاں وہ اسکرین لگی تھیں جہاں سے عمارت کے آگے پیچھے کے مناظر دکھتے تھے وہاں کھڑے ہو کر کہا کہ میں ان اسکرینوں پر نظر رکھنی ہے اور اگر کوئی مشتبہ حرکت دیکھو تو۔

میں نے کہا۔ ”تو پھر کیا کرنا ہو گا؟“

”بس دیکھتے رہنا ہے۔“ میں نے سوال کے بعد دوسرا سوال کر ڈالا۔

میرے سوال کو اس نے نظر انداز کر دیا۔ اور بولا۔ ”ہاں! کچھ نہیں کرنا لیکن مجھے نہ جگانا۔“

”کچھ نہیں۔ لیکن مجھے نہ جگانا۔ پھر وہ مجھے دو منزلہ بیسمنٹ میں لے گیا اور کہا کہ یہاں بھی کیمرے لگے ہیں اور تم نے یہاں آ کر وقفے وقفے سے راؤنڈ لگانا ہے۔

بیسمنٹ (Basemnet) میں سینکڑوں گاڑیاں پارک تھیں اور سناٹا اور بھرپور خوف کا سایہ پھیلا تھا۔ چند بلب جلتے تھے اور ان کی مدھم روشنی بیسمنٹ کے لیے ناکافی تھی۔ عجیب سی پُراسراریت پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے نیچے والی بیسمنٹ پہلے والی سے زیادہ ڈراؤنی تھی، جہاں گاڑیاں بھی پارک تھیں اور پائپوں سے بھاپ کا دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ یہاں بھی کیمرے نصب تھے۔ پیر نے بتایا کہ ان کیمروں سے چوبیس گھنٹے DVR پر ریکارڈنگ ہوتی رہتی ہے اور پھر میری جانب گھورتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں..... یہاں بھی وقفے وقفے سے راؤنڈ لگانا ہے ہر کونے میں جا کر دیکھنا ہے کہ کوئی مشتبہ......“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس تہہ خانوں کو دیکھ کر میرے ذہن کی اسکرین پر انگلش کی ڈراؤنی فلمیں چلنے لگیں جس میں تہہ خانے کے مناظر خصوصی طور پر شامل کیے جاتے ہیں اور انگریز بھوت ہمیشہ تہہ خانوں میں ہی نظر آتے ہیں اسی لیے انگریزی فلموں کے تہہ خانوں میں ہر وقت کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے کہ مجھے یہاں وقفے وقفے سے آنا بھی تھا کیونکہ اس زندہ لاش نے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ یہاں ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ میں سمجھا کہ یہ دن میں میری تمام حرکات دوبارہ سے چلا کر دیکھیں گے۔ اگر یہ خیال میرے ذہن میں نہ آتا تو میں کبھی ان آسیب زدہ سے تہہ خانوں کا رخ نہ کرتا۔

میں اس کی گفتگو سن رہا تھا وہ بولتے ہوئے دوبارہ لابی میں آ کھڑا ہوا جہاں کے فرش، در و دیوار تک چمک رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا لاک کھولا اور دروازے کو اندر کی طرف دھکیل دیا۔ ایک صوفہ پڑا تھا اور فریج کی گھر گھر کرتی کریہہ آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ کہنے لگا کہ ”تم یہاں بھی بیٹھ سکتے ہو۔“

میں یہ ویرانگی، تنہائی اور خاموشی دیکھ کر خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ملایا اور وہ چلا گیا۔ میں خوف کم کرنے کے لیے لابی میں کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ایک کرسی پر آ بیٹھا۔ میرا شولڈر بیگ ابھی تک میرے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔

مانیٹر اسکرینوں پر باہر کی تنہائی اور ویرانگی بھرپور انداز میں نظر آ رہی تھی۔ ایک عجیب سا سکوت اور ڈر تھا جو چل کر اندر آتا محسوس ہو رہا تھا۔ اتنے میں باہر کا دروازہ کھلا غور سے جب دیکھا جیسے کوئی چیز لڑھکتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں اپنی سیٹ سے تقریباً اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ غور سے دیکھا وہ کوئی چیز نہ تھی بلکہ ایک زندہ انسان تھا جو اپنے دونوں پاؤں پر متواتر اچھل رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ قد چھ فٹ کے قریب، ٹھوڑی پر سفید داڑھی، بکھرے بال اور آنکھوں میں ایک وحشت چھائی تھی۔

پہلے تو میں ڈر سا گیا مگر پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہیلو ینگ مین!“

میرا حوصلہ بڑھا اور میں اپنی جاب کی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔ اس دوران اس کا اچھلنا اور کودنا جاری تھا۔

خود ہی بتانے لگا کہ وہ ڈیوڈ ہے اور اسی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ وہ ایک لمحے کو بھی ٹک کر نہ کھڑا ہوا تھا۔

میں شدید الجھن میں پھنسا تھا کہ متواتر اچھل کیوں رہا ہے۔ وہ میری حالت کا خود ہی اندازہ لگا کر بولا کہ میری ریڑھ کی ہڈی ایک حادثے میں ٹوٹ گئی تھی اور اس کے بعد میں زمین پر ٹک کر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اب حکومت وظیفہ دیتی ہے۔ یہاں ایک اپارٹمنٹ بھی دیا ہوا ہے۔ اس لیے مزے سے زندگی گزر رہی ہے۔

میری الجھن اچانک تمام ہو کر ایک شدید ہمدردی میں بدل گئی۔ وہ پچھلے کئی سال سے اس صورتِ حال میں مبتلا تھا۔ مجھ سے پوچھا۔ کہاں کے ہو۔

جواب دیا۔ ”پاکستان۔“

کہنے لگا۔ ”روزے کیسے جا رہے ہیں؟“

میں بولا۔ ”بہت اچھے ہیں اور بارہ گھنٹے کا روزہ رکھنا بہت آسان ہے لیکن تم کو کیسے معلوم ہوا کہ ہمارے روزے ہیں۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں یہودی ہوں اور ہم لوگ بھی روزے رکھتے ہیں۔“

میں کسی یہودی سے پہلی بار مل رہا تھا۔ خدشات میرے ذہن میں آرہے تھے کہ یہ تو مسلمانوں کا نام سن کر بھڑک جاتے ہوں گے مگر یہاں ایسی کوئی بات مجھے محسوس نہ ہوئی۔

وہ کہنے لگا۔ ”چلو باہر پارکنگ میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔“ پھر شیشے کے دروازوں سے باہر جھانکتے ہوئے بولا۔ ”موسم بھی زیادہ شدید نہیں ہے۔“

میں باہر نکلا اور وہ میرے پیچھے اچھلتا کودتا چلا آیا۔ باہر آکر میں نے سگریٹ سلگائی اور کش لگایا اور وہ ہنوز باسکٹ بال کی طرح ٹپا کھا رہا تھا۔

ڈیوڈ کو شاید بہت عرصے بعد کوئی سننے والا ملا تھا اور اسی وجہ سے وہ بے تکان بولے جا رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے سن رہا تھا۔ مجھے بھی کوئی باتیں کرنے والا چاہیے تھا جو میرے اندر پھیلے انجانے خوف کو دور کر سکے جو پچھلے ایک گھنٹے سے مجھ پر طاری تھا۔ وہ مجھ سے سوال کرنے لگا کہ طالبان کون لوگ ہیں، پاکستان میں تاریخی عمارتیں کون کون سی ہیں، تاج محل دیکھا ہے، سبزیوں کے نرخ کیا ہیں؟

اسی دوران ایک اور آدمی بیچ میں آ مخل ہوا۔ وہ ڈینی تھا ڈیوڈ کا بھائی۔ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ”یہ ڈیوڈ نفسیاتی کیس ہے۔ تمہارا دماغ چاٹ جائے گا۔“ پھر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا۔ ”چلو میں تمہیں اپنی گاڑی دکھاتا ہوں۔“

میں دوبارہ جان کنی میں پھنس گیا کہ ایک اجنبی کو وہ کیوں اپنے بھائی کے بارے میں یہ سب بتلا رہا ہے۔

مجھ سے بات کر کے وہ پارکنگ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا اور میں شش و پنج میں اس کے پیچھے ہولیا۔ میرے پیچھے ڈیوڈ بھی کودتا چلا آرہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیوں اتنے بے تکلف ہو رہے ہیں؟

گاڑی کھٹارا سی تھی اور وہ اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا۔ پہلے گاڑی کا انجن دکھایا۔ ”دیکھو کتنا بہترین اور صاف انجن ہے۔“ پھر ڈکی کھولی اور کہا۔ ”دیکھو کتنی بڑی ہے اور اس میں کافی سامان سما سکتا ہے۔“ پھر گاڑی کا ریڈیو آن کر دیا اور کہا۔ ”غور سے ساؤنڈ کو سنو۔“

میں نے تمام تر توجہ سے ریڈیو پر خبریں سننے کی کوشش کی مگر کچھ پلے نہ پڑا تو سیدھا ہو گیا۔ پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر دکھایا کہ ”دیکھو کتنی بڑی سیٹ ہے اور یہاں میں اپنی دو دو گرل فرینڈز بٹھاتا ہوں۔“

ڈیوڈ اسی دوران بھی میرے آگے پیچھے کودتا رہا۔ سردی بہت تھی اور اب میں کپکپا رہا تھا۔ میں نے ڈینی سے پوچھا کہ تم کرتے کیا ہو تو وہ بولا۔ ”میرا دماغی علاج چل رہا ہے۔“ پھر ڈیوڈ کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ ”اس کا بھی چل رہا ہے اور ہمارا ڈاکٹر ایک ہی ہے۔“

ڈیوڈ میرے قریب آ کر اچھلتا ہوا بولا۔ ”میں اب ٹھیک ہوں مگر ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے۔“

میں اب باقاعدہ گھبرا گیا تھا کہ اس ویرانگی، تنہائی اور رات کی سیاہی میں، میں کہاں پھنسا ہوں۔ مجھے شک گزرا کہ اس بلڈنگ میں کہیں تمام دماغی مریض نہ رہتے ہوں۔ میں نے ڈینی سے پوچھا کہ اس عمارت میں کون لوگ رہتے ہیں تو وہ بولا۔ ”یہاں کے تمام مکیں زیرِ علاج ہیں مگر ٹھیک ہیں اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔“

اب میں نے جان لیا تھا کہ میں نفسیاتی مریضوں کا چوکیدار ہوں۔ مجھے اپنے اندر کے ایک انجانے خوف کا ادراک ہو گیا تھا کہ یہ جگہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ اس دیو جیسی

عمارت پر کوئی سایہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس عمارت کے ہر اپارٹمنٹ میں ایک زومبی یعنی زندہ لاش ہے۔ جو کسی وقت بھی باہر نکل کر لابی میں آسکتی ہے۔ میں ان دونوں سے جان چھڑا کر اندر بھاگا اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھنے کی بجائے میں اس کمرے میں جا گھسا جس کی چابی مجھے سپر نے دی تھی۔ دروازے کی کنڈی لگالی اور اندر بیٹھا تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ اب سپر کی بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ اگر کوئی انہونی چیز دیکھنا تو مجھے مت جگانا۔

میں صوفے پر بیٹھا کچھ دیر اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑا سا حواس میں آیا تو دروازے پر کان لگا لیے کہ کوئی باہر تو نہیں ہے۔ میں اپنے ساتھ ایک ٹائم پیس بھی لایا تھا اور ارادہ تھا کہ رات کو الارم لگا کر سو جاؤں گا اور منہ اندھیرے اٹھ کر باہر بیٹھ جاؤں گا۔ اس ٹائم پیس کی ٹک ٹک سے ایسا محسوس ہوتا کہ ڈیوڈ باہر کھڑا اچھل رہا ہے کمرے کا جائزہ لیا تو کچھ صفائی کا سامان پڑا تھا۔ صوفے اور فریج کے علاوہ ایک چھوٹی میز تھی جس پر کچھ رسائل بکھرے تھے۔ اس کے علاوہ اس چھوٹے سے کمرے میں ہلنے کی جگہ ہی نہ تھی۔ میں نے رسائل پلٹے تو وہ ننگی تصویروں سے مزین تھے۔ میں نے لاحول بار بار پڑھا۔ ایک تو رمضان شریف اور دوسرا میں ان دنوں شریف زادہ بنا ہوتھا۔ مجھے اپنی فیملی کی یاد ستاتی تھی اور اس ذہنی حالت میں کچھ بھی ذہن قبول نہ کرتا تھا۔ فریج شراب کی رنگ برنگی بوتلوں سے بھرا تھا۔ میں نے اپنا شولڈر بیگ میز کے اوپر رسالوں پر رکھا اور صوفے پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بے سدھ پڑا رہا۔ ایک اور پریشانی کا سامنا اب تھا کہ مجھے وقفے وقفے سے تہہ خانوں اور باہر پارکنگ لاٹ کے راؤنڈ بھی لگانے تھے۔ میری دانست میں کیمروں سے میری نگرانی ہوتی تھی کہ میں کہیں سوتا تو نہیں رہ گیا اور راؤنڈ لگا رہا ہوں کہ نہیں؟

ہمت باندھی، بار بار آیۃ الکرسی کا ورد کیا، اپنے آپ کو تسلیاں دیں اور پھر ہلکا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ برآمدے اور لابی میں خاموشی چھائی تھی جیسے سب خوف سے دبکے کہیں چھپے پڑے ہوں۔ باہر آہستگی سے نکلا اور بھاگ کر تہہ خانے میں لفٹ کے ذریعے پہنچا۔ وہاں میرے اندر کا خوف کئی گنا بڑھ کر باہر ہر جانب پھیل گیا۔ تہ خانہ مجھے کسی قبر کی مانند لگنے لگا۔ لائنوں میں سینکڑوں گاڑیاں پارک تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بھی ڈر کی وجہ سے ساکن ہو گئی ہیں۔ اندر سے نامانوس سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں بھاگ بھاگ کر ایک ایک کیمرے کے سامنے گیا جا کر ایک مسکراہٹ دی پھر دوڑتا ہوا دوبارہ لفٹ کے ذریعے نیچے والے تہہ خانے میں آیا اور مسکراہٹیں ڈال کر دوبارہ لفٹ سے اوپر لابی میں آیا اور سیدھا کمرے میں جا کر اپنے آپ کو بند کر لیا۔

اس دن میں جتنا خوفزدہ ہوا تھا شاید زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو کسی نادیدہ عفریت، جن بھوت کا خوف تھا پھر جب ڈیوڈ سے مل کر یہ پتا چلا کہ یہاں صرف نفسیاتی مریض ہیں تو خوف نے ایک نئی شکل اختیار کرلی۔ اسی لیے بھاگم بھاگ آکر کمرے میں بند ہو گیا تھا۔

کمرے میں آکر آدھے گھنٹے کا الارم لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد الارم بجا تو اٹھ کر تہہ خانے میں لپک کر پہنچا، کیمروں پر مسکراہٹیں ڈالیں اور پلٹ کر واپس بھاگتا ہوا کمرے میں آگیا۔ باہر پارکنگ میں کیمرے تھے یا نہ تھے مگر میں نے ایک آہنی ارادہ کرلیا تھا کہ باہر تو اب میں نہیں نکلوں گا اور اس لیے باہر جانے کا تردد بھی نہ کیا۔ ایک بار میں جب لفٹ سے تہہ خانوں کا چکر لگا کر لابی میں کھڑا سکون کی سانسیں لے رہا تھا کہ لفٹ کا دروازہ ایک دم کھلا اور ایک خوب بنی ٹھنی گوری اور بوڑھی میم لفٹ سے نکل کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں گنگ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دماغ ماؤف تھا اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا مگر میرے پیر میرا ساتھ دینے سے انکاری تھے۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کا رنگ قدرے لاش کی طرح نیلا نیلا تھا۔ وہ کڑک کر بولی۔ "واچ مین۔ کیا تم نے میرا ڈاگ دیکھا ہے؟" پھر خود ہی بولی۔ "ابھی میرے ساتھ کمرے میں تھا اور اچانک غائب ہو گیا ہے۔"

میں خوف سے بے ہوش ہونے والا تھا۔ میں نے یہ یقین کرلیا تھا کہ یہ تو سو فیصد زومبی ہے۔

وہ کچھ دیر لابی میں جھانکتی رہی اور پھر لفٹ کا بٹن دبایا اور اندر جا کر اپنے پیچھے خاموشی اور خوف چھوڑ کر غائب ہو گئی۔

میں نے اللہ سے فریاد کی کہ کسی طرح صبح ہو اور میں یہاں سے سرپٹ بھاگ لوں۔ وہ چلی گئی تو میں کمرے میں بند بیٹھا تادیر اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا کہ ویسے ہی بوڑھوں کو نیند کم آتی ہے اور یہ تو بیچارے سب نفسیاتی مریض ہیں، اسی لیے وہ بے خیالی میں نیچے چلی آئی ہوگی۔

میں نے تہہ خانوں میں بھاگ دوڑ جاری رکھی، کیونکہ میں اپنی کمپنی سے اپنے بارے میں کوئی شکایت سننا نہیں چاہتا

تھا، کہ صبح کے پانچ بج گئے۔ اب تہہ خانوں پر سے میرا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔ رات ابھی سیاہ تھی اور میں نے سلائس اور انڈے سے سحری بھی کر لی تھی۔ میں پھر راؤنڈ پر گیا۔ پہلے لیول سے ہو کر نیچے گیا۔ اب تھوڑا سا ڈر بھی ہو گیا تھا کیونکہ صبح ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔ نچلے تہہ خانے میں پہنچ کر آرام سے ٹہل رہا تھا۔ دور کونوں میں بھی جا کر گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں تھے کہ ایک گاڑی پر کچھ شبہ ہوا کہ کوئی اندر بیٹھا ہے۔ پہلے اسے اپنا وہم سمجھا۔ پھر غور سے ذرا قریب ہو کر دیکھا تو وہاں ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔ وہ خاموش اور مکمل ساکن بیٹھا تھا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر آواز گلے میں پھنس گئی۔ میں نے دوڑنا چاہا مگر پاؤں منوں وزنی ہو کر زمین میں گڑھ گئے۔ میری آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں اور شاید رنگت بھی خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔ میں نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا اور اس پاس میری مدد کو کوئی بھی نہ تھا۔ میں تہہ خانے میں پھنسا کھڑا تھا۔ پھر نجانے کہاں سے ہمت آئی اور میں دہشت سے چیختا ہوا اوپر پہنچا۔ میں لابی میں کھڑا خوف کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اب سپر کو جگانا لازمی تھا۔ اگر باہر بسیں بھی چل رہی ہوتیں تو میں اپنی نوکری کی پرواہ کیے بغیر بھاگ چکا ہوتا۔ میں تنہا ایک دو گھنٹے اس قبر میں نہیں گزار سکتا تھا۔ میں نے سپر کی کال بیل پر اپنا انگلی رکھے رکھی جب تک اسپیکر سے اس کی کرخت آواز نہ سنائی دی۔ میں نے کہا کہ جلد سے جلد لابی میں پہنچو۔

میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ آیا اور میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کو پورا واقعہ سنایا تو اس کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کیا اپنے حواس میں تو ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "سو فیصد نیچے کوئی بھوت ہے اور گاڑی میں ساکت بیٹھا ہے۔"

سپر تا دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر مجھ سے بولا کہ کمرا کھولو۔

میں نے یہ سمجھ کر کھولا کہ شاید کسی عامل کو فون کرے گا۔ اس نے پہلے کمرے میں جا کر فریج کھولا۔ شراب کی ایک ایک بوتل کو اٹھا کر اس کی مقدار چیک کی۔ پھر بہانے سے میرا منہ سونگھا تو مجھے غصہ آ گیا۔ "کتے کی طرح سونگھو مت اور کسی کو مدد کے لیے کال کرو۔"

اس نے ٹارچ لی اور تہہ خانے کو جانے کے لیے لفٹ کا بٹن دبایا۔ اس کے چہرے پر خوف کی جگہ فکر مندی زیادہ تھی اور میں تہہ خانے میں دوبارہ نہیں جانا چاہتا تھا مگر وہ بضد کہ تمہارا جانا ضروری ہے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کس کار میں تم نے بھوت دیکھا ہے۔

بھوت کے لفظ پر وہ زور دیتے ہوئے مجھے بے اختیاری سے گھور رہا تھا۔ میں نے وہ قرآن پڑھنا شروع کیا جو مجھے زبانی یاد تھا اور لفٹ میں کانپتی ٹانگوں سے سوار ہو گیا۔

آگے آگے سپر تھا اور میں اس کے پیچھے دبکتا ہوا خوف کی حالت میں چل رہا تھا۔ میں نے بھوت نگر میں اتر کر اسے وہ کونا دور سے دکھایا جہاں وہ کار کھڑی تھی۔

میں رک گیا اور سپر آگے بڑھ گیا۔ میں لفٹ کے پاس رکا رہا کہ اگر بھاگنا پڑ جائے تو میں سب سے پہلے دوڑ پڑوں۔ سپر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کار پر لائٹ ماری۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پہلے اس نے ساکت بھوت کو کسی نام سے پکارا۔ مجھے اپنے قریب بلایا تو میں خود بخود وہاں چلا آیا۔ میں اب حیران تھا کہ یہ کسی بھوت کے قریب جا کر اس سے باتیں کر رہا ہے۔ میرا خوف اب کم ہو کر کسی ممکنہ حادثے کی جانب اپنا رخ اختیار کر گیا تھا۔ میں قریب پہنچا تو سپر اس کا کندھا ہلا رہا تھا ابھی وہ میرے سامنے ایک جانب لڑھک گیا۔

سپر نے اسے دوبارہ سے سیدھا بٹھایا، گاڑی کا دروازہ بند کیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا کہ مائیک لگتا ہے مر چکا ہے۔

وہ پریشان تھا اور تشویش اس کی نگاہوں سے جھلک رہی تھی۔ ایمبولنس بلائی گئی۔ معلوم ہوا کہ مائیک رات کو معلوم نہیں کب واپس آیا۔ اپنی گاڑی پارک کی اور وہیں اس کی روح قبض ہو گئی اور وہ اپنی سیٹ پر جہاں فانی سے رخصت ہو گیا۔

میں اس واقعہ پر بوکھلا چکا تھا۔ پھر پولیس آئی۔ میں لابی میں کاؤنٹر کے پیچھے سیٹ پر بیٹھا سب کو آتا جاتا دیکھ رہا تھا۔ یہ خبر بلڈنگ میں پھیلی تو سب لابی میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ میرا سرسری بیان لیا گیا اور پھر میرا ایڈریس لے کر مجھے پولیس نے فارغ کر دیا۔ میں نے بھوت بھوت کا واویلا کر کے اپنے آپ کو زیادہ سوالات سے بچا لیا اور اب سپر پہلا گواہ بن چکا تھا جس نے کار کا دروازہ کھولا تھا۔ چھ بجے میری شفٹ ختم ہوتی تھی مگر میں سات بجے وہاں سے نکل پایا۔

واپس پہنچا تو شہباز ماموں کے گھر سے نہیں آیا تھا۔ سرجی کمبل میں لپٹے گہری نیند میں تھے۔ میں بے چین تھا کہ کس طرح انہیں رات کا احوال سناؤں مگر میں بھی نیند سے بے

ڈول ہورہا تھا اس لیے کپڑے تبدیل کر کے سو گیا۔

لیونگ روم میں برپا کسی شور سے میں بیدار ہوا تھا۔ نیند ابھی پوری نہ ہوئی تھی اور سخت کوفت میں مبتلا تھا۔ باہر آیا تو شہباز خوشی سے زرد ہو رہا تھا۔ سرجی نے انکشاف کیا۔ "سرجی! شہباز کا سیکیورٹی گارڈ کا پرمٹ آگیا ہے۔ بڑا مزہ آئے گا۔"

شہباز پرمٹ کا کارڈ ایک ہاتھ میں اور دوسرے ہاتھ میں وردی کا تھیلا لیے کھڑا تھا۔ مجھے کارڈ دکھایا تو میں نے کہا کہ تیرا یہ سیاپا تو ختم ہوا اور پھر سرجی سے مخاطب ہوا۔ "آپ کو کس چیز کا مزہ آئے گا۔"

جواب میں ذرا گنگنا کر وہ بولا۔ "خوشی میں جلیبیاں بھی لے آیا ہے۔"

شہباز بولا۔ "سرجی آپ سوچ لیں۔ جتنی جلیبیاں آپ کھاتے ہیں، اس سے شوگر کا ہونا تو جائز بنتا ہے۔"

سرجی کو اس بات کی پروا تھی کہ کیا جائز ہے یا ناجائز۔ بولے۔ "شوگر اگر جلیبیوں سے ہو تو جزاک اللہ۔"

سرجی بولے کہ کل ان کی بھی ویکن ہٹ میں کلاس اور ٹیسٹ ہے۔ ہم دونوں نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ پھر مجھ سے بولے۔ "رات جاب کیسی رہی۔"

جب میں نے رات والی کہانی تھوڑے مرچ مصالے لگا کر بیان کی تو وہ دونوں سنگی مجسمے بنے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر پریشانی میں خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو شہباز بولا۔ "ہم کون سے بینک منیجر لگنے جارہے ہیں اور ایسی جاب ہی تو ہمیں بھی کرنی ہے..... اگر ایسا کوئی حادثہ میرے ساتھ ہو گیا تو......؟" پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ "میں تو سمجھا تھا کہ میرا سیاپا ختم ہو گیا..... مگر اس کارڈ نے تو ایک نیا سیاپا شروع کر دیا ہے۔" اور پھر یہ کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔ "بہت خراب حالات ہیں......"

سرجی حیران تھے کہ کینیڈا میں بھی جن بھوت ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ بھوت نہیں...... لاش تھی تو جواب میں قسم اٹھا کر بولے۔ "ہو ہی نہیں سکتا کہ لاش گاڑی میں پڑی رہے اور اس کا بھوت وہاں نہ منڈلاتا ہو؟"

سرجی کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ضروری نہیں۔ سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آئے۔" مگر وہ ماننے والے کہاں تھے اور کہے چلے جارہے تھے۔

"اگر یہاں جن بھوت ہیں تو پاکستان کا کیا قصور......" میں جھنجلا اٹھا کہ یہ اس معاملے میں پاکستان کو کہاں سے لے آیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ جتنا وہ جلیبیوں کو پسند کرتے ہیں، اتنا ہی جن بھوت پریت سے ڈرتے ہیں۔

ہم بیٹھے بات کر رہے تھے کہ ویکن ہٹ سے میرے لیے فون آگیا۔ سرجی نے ریسیور اٹھا کر مجھے تھما دیا۔ وہاں سے کہا گیا کہ کل صبح مجھے امیگریشن ہولڈنگ سنٹر (IHC) صبح سات سے شام تین بجے تک جاب کے لیے جانا ہے۔

شہباز بھی فون کی بیل سن کر بنیان چڑھائے آپہنچا۔ جب یہ سنا کہ مجھے ہولڈنگ سنٹر میں جاب کے لیے بلایا ہے تو کہنے لگا۔ "تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ تم کو دی گئیں سب دعائیں رنگ لا رہی ہیں۔"

سرجی بھی اسی قسم کے خیالات بیان کر رہے تھے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایک تو یہاں تنخواہ زیادہ تھی اور بہت سے گارڈ ایک ساتھ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ اس لیے کوئی بور بت نہیں ہوتی۔ اور ڈیوٹی دینے والا آرام سے ایک کرسی پر براجمان بیٹھا اخبار پڑھتے ہوئے، گانے گنگناتے ہوئے وقت گزار دیتا ہے۔ مطیع اللہ کافی مہینوں سے یہاں جاب کے لیے کوشش کر رہا تھا مگر اللہ کا کرم تھا کہ مجھے تیسرے ہی دن یہاں بلوا لیا گیا۔ میں خوش تو بہت تھا مگر اظہار نہ کرتا تھا کہ کہیں شہباز اداس نہ ہو جائے۔ جس کو پرمٹ تو مل گیا تھا مگر ابھی کوئی شفٹ نہیں ملی تھی۔

صبح میری سات بجے شفٹ تھی مگر جب سحری کے بعد بیدار ہوا تو آٹھ بج رہے تھے۔ مجھے سات بجے ہولڈنگ سنٹر پہنچنا تھا اور اب آٹھ بج رہے تھے۔ پہلے دن ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ نہ معلوم ویکن ہٹ والے کیا سوچ رہے ہوں گے؟ کہیں وہ مجھے لائن پر ہی نہ لگا لیں؟ یہ سوچ سوچ کر میں فکرمند ہو رہا تھا۔

سرجی کہنے لگے کہ اچھی انگریزی میں بات کر لو تو کچھ نہیں کہیں گے مگر شہباز کا خیال تھا کہ کوئی فون نہ کرو اور ایسے وہ بھی بھول بھلا جائیں گے۔ میں نے اپنے دماغ سے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جو بھی بات ہو صاف صاف بیان کر دو۔ سچ اور صاف گوئی سے جو بھی نتیجہ نکلے، وہ بہرحال برا نہیں ہو گا۔

میں نے فون کیا اور معذرت کی کہ میں وقت پر اٹھ نہیں سکا۔ جواب ملا کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ سپروائزر کہنے لگا کہ کئی بار وہ خود بھی وقت پر بیدار نہیں ہو سکا تھا۔ اور پھر کہنے لگا کہ اگلی شفٹ کے لیے پھر کال کرے گا۔ اچھے دن کی نوید سنائی اور فون بند۔ میں حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔ نہ کوئی ڈانٹ اور نہ ڈپٹ۔ بلکہ خود کو بھی اس کوتاہی میں ڈال دیا۔ یہ

ایک اور سبق تھا جو مجھے آج ملا تھا۔ کسی کو اس کی غلطی پر جھڑکنا نہیں بلکہ اسے انسانی غلطی سمجھ کر ٹال دینا...... بعد میں جب بھی مجھ سے کسی جاب پر بھی کوئی انجانے سے غلطی ہوئی تو اسے Human Error کہہ کر جان چھڑوالی اور آگے والے نے بھی دل سے اس غلطی یا کوتاہی کو کھرچ ڈالا۔

سرجی کو آج ویکن ہٹ ٹیسٹ پر جانا تھا اور مجھے اپنی تمبو سائز کی وردی کو اپنے ناپ کے مطابق تبدیل کروانا تھا۔ سرجی جلدی جلدی سے تیار ہونے لگا۔ میں نے بھی دیر نہ لگائی۔ قسمت سے آج کا دن میں نے اپنی کاہلی سے چھٹی میں بدل دیا تھا اور نوّے ڈالر کی مزدوری سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اس وقت کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں شہباز سے بولا۔ ”اب تیرا سیاپا ختم ہوا ہے۔ اس لیے تم بھی ساتھ چلو اور ان سے شفٹ کا شیڈول لے لو۔“

وہ شہباز جو پہلے ہر وقت یہ گردان لگائے رکھتا تھا کہ بڑا سیاپا ہے، حالات بہت خراب ہیں اور آج کام چور بنا ڈھیر کی مانند پڑا کہہ رہا تھا۔ ”ابھی بہت تھکا ہوا ہوں۔ ان کو بعد میں فون کرلوں گا۔“

سرجی بولے۔ ”ابھی تو سو کر اٹھے ہو۔ کیا خواب میں ہل چلاتے رہے ہو؟“

جواب آیا۔ ”پہلے تم اپنا ٹیسٹ تو پاس کرلو، پھر بات کرنا۔“

سرجی شکایتی لہجے میں میری جانب مڑکر بولے۔ ”سرجی! یہ اب مجھ سے تو تراخ کرنے لگا ہے۔“

یہ بحث اس سے پہلے کوئی طول اختیار کرتی، میں سرجی کو بازو سے پکڑتا ہوا باہر آگیا۔ مجھے برفانی اور یخ بستہ ہوا کا ایک زبردست چانٹا پڑا اور پھر میرا دماغ گھومنے لگا جب سرجی سرگوشی میں میرے قریب آکر منمنائے۔ ”آج موسم پھر سہانا ہورہا ہے۔“

بس، ٹرین اور ایک دوسری بس سے ہم ویکن ہٹ کے سامنے اترے۔ سرجی کی کلاس شروع ہورہی تھی اور وہ جیسے ہوا کے دوش پر اطمینان سے چلتے اپنی کلاس کو چل دیے۔ ان کو یہاں پورا دن لگانا تھا اور میں نے مشال سے اپنی وردی تبدیل کروائی۔ میرے سائز کی جیکٹ ان کے اسٹاک میں موجود نہ تھی اور مجھے اس بڑی سائز پر ابھی گزارا کرنا تھا۔ میں سیدھا شیڈول دینے والے سپروائزر کے چھوٹے سے کمرے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ کئی ریڈیو، کمپیوٹر کے اسکرینوں اور فونز پر مسلسل مصروف تھا۔ پورے ٹورنٹو کو یہاں سے کنٹرول کررہا تھا۔ مجھے دیکھا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ کمپنی والے کل کی میری جاب سے بہت خوش تھے جب میں نے کار سے ایک لاش برآمد کی تھی۔ اور پھر میری سمجھ میں یہ آیا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ایک دو اور لاشیں دریافت کرلو تو تمہاری جاب مستقل کردی جائے گی۔

میں نے جواب دیا جو اس کی سمجھ میں بالکل نہ آیا اور وہ پھر سے مصروف ہوگیا۔ پھر میں نے دوبارہ اسے اپنی جانب متوجہ کیا کہ مجھے اب کوئی اور شفٹ چاہیے تو اس نے کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اب وہ لگاتار مجھ سے کوئی بات پوچھتا تھا اور میں اس کی جناتی انگریزی کو سمجھنے کی بھرپور اور ناکام کوشش کرتا رہا تھا۔ یہ سوال و جواب کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ میں پریشان ہوگیا اور جب یہ دیکھا کہ وہ اب باقاعدہ طور پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اور میز پر دونوں کہنیاں ٹکائے بے بس اور لاچار بیٹھا ہے تو میں اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور وہ اس بات پر برہم تھا کہ مجھ سے بات کس زبان میں کرے۔ آخرکار اس نے کاغذ پر کچھ لکھا اور مجھے وہ پرزہ ... تھما دیا۔ میں نے پڑھا تو لکھا تھا کہ رہتے کہاں ہو؟

میں اتنا کوڑ ذہن تو نہیں تھا کہ جواب بھی لکھ کر دیتا۔ میں نے ہجے کرکے اسے مارٹن گرو کا نام بتایا۔ اس نے خاموشی سے کمپیوٹر میں کچھ دیکھا اور پھر میرے ہاتھ میں ایک اور کاغذ تھما دیا۔ میں نے اس ورق کو پکڑا اور پھرتی سے دروازے کے باہر نکل کر گہرے گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کرتا تھا جو میں اپنی انگریزی سے کھو چکا تھا۔ میں نے حواس بحال کیے اور مشال کی جانب مسکرا کر دیکھا اور شانت ہوگیا۔

میرا رکنا اب یہاں بے کار تھا۔ سرجی کو تو یہاں شام ہونی تھی اور وہ اب راستہ بھی جانتے تھے۔ انھیں مطلع کرنے کے لیے میں کلاس کی جانب گیا۔ دروازے سے اندر جھانکا تو وہی ہمارے والی موٹی انسٹرکٹر اپنی کرخت آواز میں ان سب کو جیسے ڈانٹ رہی تھی۔ سرجی سہمے اس کی چھاؤں میں بیٹھے لرز رہے تھے۔ مجھے دروازے پر کھڑے دیکھا تو مجھے بھی ڈانٹ دیا۔ ”تم دروازے پر کیا کررہے ہو؟ یہ کیا کلاس میں آنے کا وقت ہے؟“

”وہ غالباً میرا چہرہ بھول چکی تھی کہ میں دو ہفتے پہلے ہی اس کے عتاب سے گزر چکا ہوں۔ میں نے اس کی بدتمیزی کو نظرانداز کرتے ہوئے سرجی کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اشارے

سے انسٹرکٹر کی جانب اشارہ کیا کہ کیسے آؤں۔ اسی دوران وہ ہم دونوں کے اشاروں کو دیکھ کر لال پیلی ہو رہی تھی۔ اس نے سرجی کو میری جانب آنے کی اجازت اس طرح دی کہ جیسے پیچھے سے لات مار کر نکال رہی ہو۔ وہ میرے پاس آتے ہی بولے۔ ”ماشاءاللہ بہت حسین ہے۔“

میں نے تڑپ کر کہا۔ ”کون؟“

وہ بولے۔ ”یہ انسٹرکٹر۔“

پہلے میں سمجھا کہ کوئی بیہودہ مذاق کر رہے ہیں مگر جب دیکھا تو ان کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی ہے اور ان کی مونچھیں تک مسکرا رہی ہیں تو میں بھڑکنے کو تھا مگر اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھال لیا۔ وہ جہنمی جیسی انسٹرکٹر اسی دوران خونخوار نظروں سے ہم دونوں کو لگاتار گھور رہی تھی۔ سرجی اس ماحول میں بھی نہ تھمے اور گویا ہوئے۔ ”دل پر گھاؤ لگ رہے ہیں۔“

اب میرا یہاں رکنا پہلے سے بھی زیادہ بے کار ہو چکا تھا۔ میں نے صرف یہ کہا کہ میں تو جا رہا ہوں اور جب آپ کے گھاؤ بھر جائیں تو آجائیے گا۔

میں باہر نکلا اور نحیف و نازک سرجی کا تقابل اس ڈائنو سار سے کیا تو ایک مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیلتی چلی گئی۔

پردیس میں رہنے والے جب بھی اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہیں تو پہلی نظر اپنے پاؤں کے آگے پڑتی ہے کہ شاید آج کوئی خط آیا ہو۔ یہی آج بھی ہوا۔ میں نے دروازے کے لاک میں چابی گھمائی اور میرے قدموں کے آگے ایک بھاری لفافہ پڑا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ فیملی کے اسپانسر کے کاغذات اس میں بند تھے۔ میرے لیے ایک طمانیت بھرا لمحہ تھا۔ ایک موڑ تھا جو مجھے بچوں سے ملا رہا تھا۔ شہباز کہیں غائب تھا اور میں سکون سے کاغذات دیکھنے لگا۔ جاب پر مجھے رات کو جانا تھا اور میرے پاس ٹائم بہت تھا۔ بہت سے فارم تھے...... میں نے انہیں پڑھ کر کے بمعہ فیس امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو بھیجنا تھا۔ ان میں ایک فارم یہ بھی تھا کہ میری بیوی دس سال تک سوشل سیکیورٹی نہیں لے سکے گی۔ اس پر سمیہ نے بھی میرے ساتھ دستخط کرنے تھے۔ اگر آپ اپنی فیملی کو اسپانسر کرتے ہیں تو ان کے نان نفقے کے ذمہ دار آپ ہوتے ہیں نہ کہ کینیڈا کی حکومت...... نہ تو بیوی کو کوئی قرضہ مل سکتا ہے کہ وہ اپنی پڑھائی کرے اور نہ کسی اور قسم کا مالی فائدہ۔ مجھے اس سے واقعی کوئی غرض نہ تھی۔ میرا ذہن تو خان قیصر نے یہ بنا ڈالا تھا کہ وہ اپنا رزق خود لیں گے اور ہو سکتا ہے کہ تمہارا رزق بھی ان سے جڑا ہو۔

میں کاغذات بکھیرے بیٹھا تھا کہ شہباز دھڑام سے آ دھمکا۔ کاغذات دیکھ کر واویلا کرنے لگا کہ تمہاری فیملی بھی آجائے گی تو تم بھی یہاں سے چلے جاؤ گے اور پیچھے میرے لیے تو صرف مفتی کا سیاپا رہ جائے گا۔

میں نے کہا۔ ”صرف مفتی کا نہیں...... سرجی بھی تو ہیں۔“

کہنے لگا کہ میں ان کو روزانہ جلیبیاں نہیں کھلا سکتا۔ ”سرجی جب بھی شہباز کو فارغ بیٹھے دیکھتے تو فوراً فرمائش کا ورد کرنے لگتے۔ ”شہباز جب آنا تو جلیبیاں لے آنا۔“ ایک بار تو شہباز بھڑک اٹھا تھا کہ ایک تو میں اپنے سیاپے لے کر بیٹھا ہوں اور آپ کو لاڈ سوجھ رہے ہیں کہ میں جاؤں گا تو جلیبیاں لے آؤں گا۔ پر میں تو جا بھی کہیں نہیں رہا۔ اور واقعی اس دن شہباز کہیں نہیں جا رہا تھا۔ سرجی شہباز کی جھاگ اڑاتی گفتگو سن کر صرف اتنا بولے تھے۔ ”اس میں خفا ہونے کی تو کوئی بات نہ تھی، نہیں لانی تو نہ لائیں مگر جلیبیوں کی توہین تو نہ کریں۔“

اور پھر شہباز بے بسی سے میرا منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ اب شہباز میرے اسپانسر کے کاغذات پر نظریں گاڑھے ایک پتے کی بات مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ”مفتی چند دنوں میں آنے والا ہے۔ سرجی کا کہیں انتظام کرو ورنہ وہ انہیں دیکھ کر کہیں بھڑک نہ جائے۔“

میں نے کچھ دیر اس مسئلے پر سوچ کر کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ سرجی بھی یہیں رہیں گے اور مفتی بھی نہیں بھڑکے گا اور یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔“ یہ سب کہہ کر میرے ذہن نے اس پر کچھ اور سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اب سرجی کو میں کسی اور کے ساتھ فٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ سادہ لوح اور نہایت ہی عاجز سے انسان تھے۔ یہاں ایک سے ایک بڑا شکرا پڑا تھا۔ میرے ذہن میں پہلے کچھ اصحاب آئے، جن کے ہاں گنجائش بنتی تھی اور وہ میرے کہنے پر سرجی کو چھت مہیا کر بھی دیتے مگر مجھے یقین کی حد تک اندیشہ تھا کہ سرجی ان کے گھر کے باورچی قسم کی چیز بن کر رہ جائیں گے۔ سارا کام ان سے کروایا جائے گا اور یہ اپنا آپ بھول کر ان کو ہر وقت چائے بنا کر کپ ان کے ہاتھوں میں پکڑاتے رہیں گے۔ یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ مفتی کے آنے میں کچھ دن پڑے تھے اور میں ابھی اسپانسر کے کاغذات میں الجھا تھا۔

شہباز سے کہا کہ ذرا خان قیصر کو فون کرو۔ اگر موجود ہے تو اس سے کہو کہ کاغذات آچکے ہیں اور اب تمہاری مدد کی

ضرورت ہے۔" شہباز دور کارپٹ پر پڑا تھا اور فون میرے قریب رکھا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے گھورتا رہا پھر اپنے آپ کو گالیاں دینے لگا اور پھر کھسکتا ہوا آیا اور فون اٹھا کر کہنے لگا۔ "اب یہ نہ کہنا کہ چائے بھی بنادو۔"

میں نے نظریں کاغذات پر رکھیں اور کہا۔ "جب خان آئے تو پھر بنادینا۔ پہلے اسے فون تو لگاؤ۔"

اس کے بعد میں نے کان اپنے ہاتھوں سے دبا لیے، کیونکہ میں وہ سب کچھ نہ سننا چاہتا تھا جو اس کے دھانے سے بہہ رہا تھا حالانکہ ہم سب روزے سے تھے اور چائے بنانے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ یہ سب باتیں ایک ہلکے ماحول میں ہو رہی تھیں اور ہم اس طرح کی باتیں کر کے اپنا من ہلکا کرتے تھے۔

کچھ دیر بعد خان نازل ہو گیا اور آتے ہی شہباز سے بولا۔ "مجھ سے کبھی بچت نہیں ہو سکتی۔"

شہباز بولا۔ "پھر گیراج سیل سے کوئی چیز خرید لی ہے۔"

وہ جواب میں کہنے لگا۔ "رات کو دو مرغ روسٹ لے آیا تھا۔"

"تو پھر؟"

شہباز بولا۔ "پھر کیا۔ ایک میں نے کھالی اور ایک تمہاری بھائی نے.....کل دل کھول کر خرچا کر ڈالا۔"

میں نے کہا۔ "پھر اس دریا دلی کا معاوضہ کیا ملا؟"

جواب میں شہباز کا ایکدم قہقہہ نکلا جو اپارٹمنٹ کی چھتیں تک پھاڑ گیا..... خان تلملایا اور کہنے لگا۔ "کنواروں کو کوئی حق نہیں کہ ایسے مذاق پر منہ پھاڑ کر ہنسیں۔" اور پھر اپنے آپ پر گہری سنجیدگی اور متانت طاری کر کے میری جانب متوجہ ہو کر کاغذات پر بات کرنے لگا۔ بہت کچھ سمجھا کر اسی سنجیدگی کا بوجھ اٹھائے رخصت ہوا، اور اس کے جاتے ہی شہباز کا وہی قہقہہ ایک بار پھر بلند ہو کر میرے کان پھاڑنے لگا۔

میں اسپانسر کے فارم اور دوسرے کاغذات پر عرق ریزی سے فارغ ہوا ہی تھا کہ سرجی چہچہاتے ہوئے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور ہاتھ میں ایک لفافہ بھی تھا۔ پہلے لفافے کو نہایت ہی احتیاط سے میز پر رکھا اور پھر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے پرمسرت ہو کر اعلان کرنے لگے۔ "میں ٹیسٹ میں پاس ہو گیا۔ میں ٹیسٹ میں پاس ہو گیا۔" پھر دوبارہ احتیاط سے وہی لفافہ اٹھایا اور کچن میں چلے گئے اور کچن کی کھڑکی سے

جھانک کر بولے۔ "میں جلیبیاں بھی لایا ہوں۔"

ہم دل سے ان کی کامیابی پر خوش تھے۔ ہمارے خیال میں جس اطمینان سے وہ گھر پر بیٹھے تھے، کہیں یہی اطمینان وبال جان نہ بن جائے؟ یہاں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے زیادہ دیر تک پاکستان سے لائے گئے ڈالر خرچ نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے کوئی نہ کوئی روزگار ڈھونڈنا نہایت ہی ضروری ہوتا ہے۔ سرجی کی یہی کامیابی میری اپنی کامیابی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "اس موٹی انسٹرکٹر نے آپ کو پاس کیسے کر دیا۔"

اس پر اپنا ننھا سا سینہ پھلا کر بولے۔ "آپ نے اپنے بھائی کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ اپنا رعب ہی ایسا تھا کہ اسے پاس کرنا ہی پڑا۔"

افطاری کر کے فارغ ہوئے تو میں نے آج اپنی شفٹ کا ایڈریس دیکھا۔ وہ کیپلنگ سب وے کے جنوب میں ٹورنٹو لیک سے پہلے کسی انڈسٹریل ایریا میں کوئی مکینیکل فیکٹری تھی جہاں مجھے رات میں سیکیورٹی گارڈ کی جاب کرنی تھی۔ سب ملا کر آدھے گھنٹے سے کچھ زائد کا بس سے فاصلہ تھا۔ میں پھر سے تیار ہوا۔ وردی چڑھائی۔ اپنے قد سے بڑی ویکن ہٹ سیکیورٹی والی جیکٹ پہنی۔ سحری کے لیے کچھ سینڈوچ بنائے اور سب کی دعاؤں سے باہر ٹھٹھرتے سمندر میں اتر گیا۔

آج رات کو درجہ حرارت منفی تیس تھا۔ ایک ہنگامہ تھا جو سرد ہواؤں نے اٹھا رکھا تھا۔ زمین اور درختوں پر پڑی برفیں ہواؤں کے زور سے اڑتی پھرتی تھیں۔ ہوا مجھے پوری قوت سے روکتی اور میں اپنی طاقت استعمال کرتے آگے کی جانب قدم اٹھاتا تھا۔ ہوا میری جیکٹ میں گھس رہی تھی اور میرا خون جمنے لگا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے جیکٹ کو کس کر اپنے بدن پر لپیٹا اور بس اسٹاپ پر کھڑا اس اندھیرے میں آتی بس کا انتظار کرنے لگا۔

دو تین بسیں تبدیل کر کے میں ایک انڈسٹریل ایریا میں جا اترا۔ فیکٹریاں بند تھیں اور ہو کا عالم تھا۔ میں ماحول اور موسم کی شدت سے خائف، کسی سہمے پرندے کی طرح اپنے اردگرد دیکھتا تھا۔ چار جانب برفیں اڑتی پھرتی تھیں۔ ہواؤں کا زور تھا جو ذرا سے توقف کے بعد دہاڑنے لگتا تھا۔ میں اپنے چہرے پر پڑتی برفوں کو صاف کرتا کھلی سڑکوں پر اردگرد خاموش زدہ فیکٹریوں کی عمارتوں کے نمبر قریب سے جا کر دیکھ رہا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ نہ کوئی انسان نظر آتا تھا اور نہ کوئی گاڑی آتی جاتی دکھتی تھی۔ طوفان مجھے کہیں دور پھینکنے کے لیے اپنا زور

لگا رہا تھا اور میں ہواؤں سے منہ موڑے آہستگی سے ایک ایک بورڈ کو پڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے گیٹ کے سامنے میں کھڑا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مجھے آج اور اگلی دو راتوں میں ڈیوٹی سرانجام دینی تھی۔ میں کچھ دیر میں سائیڈ کا چھوٹا دروازہ کھولے اندر کھڑا تھا جہاں اندھیرا چھایا تھا اور دور ایک راستے کے ساتھ دائیں جانب فیکٹری کے ایک حصے سے کسی کمرے کے شیشوں سے اندر کی روشنی باہر پڑ رہی تھی۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کوئی اندر سے باہر نکلا اور مجھے تیزی سے اندر آنے کا اشارہ کیا اور پھر خود کسی دروازے سے اندر غائب ہو گیا۔ باہر کی ہوائیں کسی کو بھی ٹکنے نہ دیتی تھیں۔ میں بھی ایک دروازے سے اندر داخل ہوا اور ایک سکون اور طمانیت کی کیفیت میں آتا چلا گیا۔ اندر حرارت سے وہ دفتر گرم ہو رہا تھا اور تیز روشنیوں والے بلب چھت سے پورے ہال کو روشن کر رہے تھے۔ کئی میزیں اور ان کے پیچھے کرسیاں لگی تھیں۔ ایک شیشے کی دیوار باہر کے طوفان کو اپنے سینے پر روکتی تھی اور میں باہر اندھیرے میں اڑتی برفوں کو شیشوں پر حملہ آور ہوتے دیکھتا تھا۔ میزوں پر فائلیں اور کمپیوٹر رکھے تھے۔ ایک بڑا حال نما کمرا تھا جس میں سیکیورٹی گارڈ ”مسٹر را“ میرا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور مسٹر را اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ٹائم پر آئے ہو۔“

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

پھر مجھے فیکٹری کے وہ حصے دکھائے جہاں مجھے پٹرولنگ کرنا تھی۔ یہاں آرام سے سونے کا کوئی انتظام نہ تھا کیونکہ مجھے ہر گھنٹے بعد ان حصوں میں جا کر ایک کارڈ پنچ کرنا تھا جس سے اس کارڈ پر ٹائم اور تاریخ ثبت ہو جاتی تھی۔ وہ کارڈ بعد میں چیک ہوتا اور میری پٹرولنگ کا ثبوت ہوتا۔ فیکٹری کیا تھی، لامحدود قسم کے بڑے بڑے ہال تھے جہاں کرینیں کھڑی تھیں، انجن بکھرے پڑے تھے۔ مختلف مشینیں خاموش کھڑی تھیں۔ پوری دن کی مشقت کے بعد یہ سب مشینیں اب آرام کر رہی تھیں۔ مکمل خاموشی میں صرف ہمارے قدموں کی اور بولنے کی آوازیں تھیں۔ کبھی کبھی کسی بوائلر یا کسی جنریٹر سے اچانک دہلا دینے والی آواز اٹھتی اور پھر وہی مکمل خاموشی چھا جاتی۔ مسٹر را کوئی کورین نسل کا کرخت آدمی تھا جو مجھ سے قدرے حاکمانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ مجھے سیروں وزنی چابیوں کا گچھا دیتے ہوئے بولا کہ سپروائزر صبح سات بجے پہنچ جائے گا اور وہ ان چابیوں سے فیکٹری سے باہر اور اندر کے سب دروازے کھولے گا اور الارم سسٹم کو ڈی آرم کرے گا۔ اس نے مجھے سپروائزر کا نام اور فون نمبر بھی دے دیا۔

کچھ ٹریلر کھڑے تھے۔ میری جانب گھوم کر بولا۔ ”ہر ٹریلر میں سامان کی قیمت دس ملین ڈالر ہے اور یہ ٹریلر کلائنٹ کے حوالے کرنے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کون کرے گا؟“ کہنے لگا کہ ایک فون آئے گا اور تم کو فون کرنے والا ایک کوڈ دے گا۔ سپروائزر کو فون کرنا ہوگا اور جب تم اس کو کوڈ بتاؤ گے تو جواب میں وہ تمہیں ایک اور کوڈ دے گا۔“

میں اب اپنے آپ کو زیرو زیرو سیون سمجھانے لگا تھا۔ میں نے پوچھا کہ پھر کیا کرنا ہوگا۔

وہ بتانے لگا۔ ”تمہیں پھر ایک فون آئے گا اور تم اس سے سپروائزر والا کوڈ مانگو گے اور اگر وہ صحیح کوڈ دے تو تمہیں اس چابی سے گیٹ کھولنا ہوگا۔“ وہ ایک اور چابی مجھے تھماتے ہوئے بولا۔ اب میں الجھنا شروع ہو گیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اب کی بار بھی کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو گا۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ یہ سب میں نہ کر سکوں گا۔ برفانی رات میں ایک وحشت ناک فیکٹری جس کی حدیں بھی مجھے اندھیرے میں دکھلائی نہ دیتی تھیں، میں اس کو سنبھالوں گا یا اس خفیہ مشن کو سرانجام دوں گا۔ میں سخت مخمصے میں تھا۔ اب کوئی فرار کا راستہ بھی نہ تھا۔

اتنے میں صفائی کرنے والے آ گئے۔ گیٹ مجھ سے دو فرلانگ دور ہوگا جہاں سے وہ اندر آ رہے تھے۔ اس فاصلے سے فیکٹری کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے دو گھنٹوں میں برق رفتاری سے صفائی کا کام شروع کر دیا۔ مسٹر را ان کو ہدایتیں دیتا رہا۔ میں خاموش کھڑا ان کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جو کام ان چار بندوں نے دو گھنٹوں میں نمٹایا، وہ ہم دس آدمی چھ گھنٹوں میں بھی نہ نمٹا سکتے تھے۔ بارہ بجے مسٹر را ان چاروں کو گیٹ سے باہر دھکیل کر خود بھی میری جانب ترحم بھری نظروں سے دیکھتا ہوا غائب ہو گیا۔ اب میں اکیلا باہر کھڑا سنسناتی ہواؤں کے شور کو سن رہا تھا۔ اب میں تھا اور تنہائی تھی۔ اس سرد رات میں اتنی بڑی فیکٹری میں اکیلا بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گی۔ تو کیا ہوگا۔ جتنے پراسرار انداز میں مجھے ہدایت دی گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ کوئی بڑا چکر ہے۔

(باقی آئندہ)

ابراھیم جمالی / الطاف شیخ

آسمان کی چادر میں ٹکے ہوئے، قدرت کی صناعی کا شہکار یہ چاند تارے اس عالم بے کراں کی خوبصورتی میں تو اضافہ کرتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ ہماری دنیا کی بقاو سلامتی کے لیے بھی بہت کچھ کر رہے ہیں ۔ ان کی افادیت پر مختصر مگر جامع تحریر ایک جہازی کی معلومات کے مطابق ۔

**خوش ذوق قارئین کے لیے معلوماتی تحریر**

آسمان پر چمکنے والے اربوں ستاروں میں سے تقریباً 100 اہم ستارے ایسے ہیں جو ہمیں روزمرہ کی نیوی گیشن، یعنی سمندر میں راستہ تلاش کرنے اور تعلیم کے دوران کام آتے ہیں۔ ان میں سے نصف سے زیادہ ایسے ستارے ہیں جن کے نام عربی زبان کے ہیں۔ یعنی ان ستاروں کو عربوں نے دنیا میں متعارف کرایا۔ یہ بات دیگر ہے کہ یہ عربی نام انگریزوں سے یونانیوں کے ہاں یا یونانیوں، رومیوں اور جرمنوں سے ہوتے ہوئے جب انگریزوں تک پہنچے تو خاصی

حد تک مختلف ہو چکے تھے حتیٰ کہ ہم ایشین اور عرب بھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ نام عربی الفاظ کی بگڑی صورت ہیں۔

ایسے ہی ستاروں میں سے ایک کا نام Achernar ہے جو آسمان پر زیادہ چمکنے والے ستاروں میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ میں نے قصداً اس ستارے کی انگریزی اسپیلنگ لکھی ہے جو ہماری ایسٹرانومی کی کتابوں میں درج ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کا نام دیکھ کر پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ انگریزی کا نام ہے لیکن اس نام کے تلفظ کی ادائیگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ ''آچرنار'' یا ''آخرنار'' ضرور ہماری کسی ایشیائی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ''آخرنار'' ستارہ عربی زبان کا ''آخرالنہر'' یعنی ''ندی کا انتہائی سرا'' ہے۔ اس کی اصل اسپیلنگ اس طرح تھی Akhir an nahr جو بعد میں Achernar ہو گئی۔

یہ ستارہ ''آخرالنہر'' ہمارے سورج سے سات گنا بڑا ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ وہ کس قدر بڑا ہوگا اور آسمان کی وسعتوں میں تیر رہا ہے لیکن ہم سے زیادہ فاصلے پر ہونے کے سبب وہ ہمیں سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے۔ ذرا یہ بھی تصور کیجیے کہ یہ ستارہ ہم سے کتنے فاصلے پر ہو سکتا ہے؟ سورج ہم سے اتنے فاصلے پر ہے کہ اس کی روشنی ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ آخرالنہر ستارہ ہم سے 144 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ اب آپ یہ سمجھ چکے ہوں گے کہ نوری سال کا صرف ایک سیکنڈ 300,000 کلومیٹر کے برابر ہے۔ اس حساب سے آپ خود سوچیے کہ 144 نوری سال کا فاصلہ کس قدر طویل ہوگا۔

میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ تقریباً تمام ستارے اور سیارے کسی نہ کسی چیز کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح چاند، زمین کا طواف کرتا ہے اور زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ سورج اپنے تمام سیاروں کے ساتھ اپنی کہکشاں کے مرکز کے گرد گردش کرتا رہتا ہے۔ کئی سیارے اور ستارے اپنے محور پر بھی گردش کرتے رہتے ہیں۔ چند سیارے چاند کی طرح چھوٹے ہیں جو اپنے مدار میں گردش نہیں کرتے۔ دیگر سیارے مختلف رفتار کے ساتھ محو گردش رہتے ہیں۔ ہماری زمین لٹو کی طرح 1000 میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومتی رہتی ہے اور اس طرح گول گھومنے کے سبب اس کا وسطی، یعنی خطِ استوا والا حصہ قطبین (Poles) سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا ہے جو سیارہ اور ستارہ جس قدر زیادہ رفتار سے اپنے گرد گول گھومتا رہے گا اسی حساب سے اس کا وسطی حصہ باہر نکلے گا یعنی جسامت میں بڑا ہو جائے گا۔

اس حساب سے آخرالنہر (Achernar) ستارہ جو ہمارے سورج سے تقریباً آٹھ گنا بڑا ہے اور ہم سے 144 نوری سال کے فاصلے پر موجود ہے اور سورج سے 3000 گنا زیادہ روشن ہے۔ وہ اس قدر تیز رفتار سے اپنے گرد گھومتا رہتا ہے کہ اس کا خط استوائی نظر (Equitorial Diameter) قطبی قطر (Polar Diameter) سے دگنا ہو گیا ہے۔

اگر ان ستاروں کی رفتار، وزن، سائز، بھڑکتی ہوئی آگ (جس کے ساتھ وہ گول اور آگے دوڑتے رہتے ہیں) کے بارے میں صرف سوچا جائے تو دماغ چکرا کر رہ جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک گورا یورپین، انگریز یا امریکن جسے ہم خواہ کافر کہیں لیکن اگر اسے سائنس اور علم فلکیات کے موضوعات پر معلومات حاصل ہیں تو وہ قرآن کو ہم سے بہتر سمجھ سکتا ہے اور اگر وہ اسلام قبول کر لیتا ہے تو وہ مزید پختہ ایمان اور یقین کے ساتھ اس کائنات کے خالق کی عبادت کرتا ہے۔

اوپر بیان کیے گئے آخرالنہر (Achernar) ستارے کی طرح ایک اور اس سے بھی زیادہ اہم اور روشن ستارہ سیرس (Sirius) ہے۔ اس ستارے کو آخرالنہر ستارے کی طرح بغیر دوربین کے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ انتہائی روشن اور چمکدار ستارہ ہے۔ یہ آخرالنہر کے مقابلے میں ہم سے کم فاصلے پر موجود ہے۔ یعنی یہ ستارہ ہم سے صرف ساڑھے آٹھ نوری سال کے فاصلے پر ہے جب کہ آخرالنہر کا فاصلہ ہماری زمین سے 144 نوری سال ہے۔ اس لحاظ سے سیرس جیسے ستاروں کو ہم ''پڑوسی ستارے'' کہتے ہیں۔

دورِ جاہلیت میں عربوں کے ہاں یہ ستارہ دیوتا کا مقام رکھتا تھا۔ اس ستارے کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔ یہ ستارہ سورج سے 25 گنا زیادہ روشن ہے لیکن آسمان پر کینوپس اور آتشیں ستاروں سے کچھ کم چمکتا ہے۔ اس سیرس ستارے کو Dog Star بھی کہا جاتا ہے۔ پیسفک سمندر میں راستہ تلاش کرنے کے سلسلے میں یہ ستارہ جہازیوں کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ ستارہ مصر اور یونان میں خاصے قدیم زمانے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ دریائے نیل میں آنے والے سیلاب سیرس پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح قدیم یونانی اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ ملک میں گرمی اور خشک موسم اس ستارے کے ظاہر ہونے پر آتے

ہیں۔ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اس ستارے کے نمودار ہونے پر چند ہفتوں کے لیے سرسبز علاقے خشک ہو جاتے ہیں اور کئی مرد کمزور ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کے جذبات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان معاملات سے ہم جہازیوں کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ آسمان بدلیوں، دھند، کہر اور آلودگی سے پاک صاف ہو اور سیرس جیسے چمکتے ہوئے ستارے نظر آتے رہیں جنہیں دیکھ کر ہم راستے کا درست تعین کر سکیں۔ ظاہر ہے دوسری صورت میں بھٹکا ہوا مسافر خوف کی زندگی گزارتا ہے۔

یہ سیرس ستارہ ایسا ہے جس کے حوالے سے کئی روایات اور کہانیاں مشہور ہیں۔ اپریل کے آخری دنوں میں جب یہ ستارہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو کئی قومیں مختلف طریقے سے خوشی اور عقیدت کا اظہار کرتی ہیں۔ رومن ہر سال 25 اپریل کے دن ایک کتے کو اس ستارے پر قربان کرتے تھے۔ وہ کتے کو ذبح کر کے اس کا گوشت اگر بتیاں اور شراب لا کر روبیگو دیوی کے سامنے رکھتے تھے تاکہ گندم کی فصل کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔ پیسفک سمندر دنیا کا وسیع ترین سمندر ہے۔ جہاں پیسفک سمندر میں سینکڑوں میل تک زمین کا کوئی ٹکڑا یا جزیرہ نظر نہیں آتا۔ وہیں کئی مقامات پر جزیروں کے مجموعے ہیں۔ جہاں جہاں یہ جزیرے موجود ہیں وہاں دس بیس نہیں بلکہ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں۔ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک آمدورفت کا ذریعہ کشتیاں اور جہاز ہیں۔ پیسفک سمندر میں ان جزیروں پر آتے جاتے کشتیوں کے ناخدارات کی تاریکی اور چاروں طرف اتھاہ سمندر میں جن واضح اور زیادہ چمکدار ستاروں کی مدد سے راستہ تلاش کرتے ہیں ان میں سیرس ستارہ بھی شامل ہے۔ ان ستاروں کے ذریعے دنیا کے عرض البلد کی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

علم فلکیات کے طلباء اور جہاز چلانے والے نیوی گیٹرز کے لیے یہاں یہ بھی لکھتا چلوں کہ اس ستارے سیرس کی Declination فجی جزیرے کے عرض البلد کے ساتھ 17 ڈگری جنوب میں بالکل میچ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ستارہ ہر رات فجی جزیرے کے اوپر سے گزرتا ہے۔

سیرس آسمان پر سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ ہے۔ اس کی چمک کینوپس ستارے سے بھی زیادہ ہے۔ اگر میں آسمان پر موجود اس ستارے کی طرف اشارہ کر کے کہوں گا کہ یہ سب سے روشن ستارہ ہے تو آپ یقیناً دوسرے ستاروں کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ اس سے زیادہ یہ دوسرے ستارے روشن نظر آ رہے ہیں۔

جی ہاں آپ کا اشارہ زہرہ اور مشتری کی جانب ہوگا۔ دراصل یہ ستارے نہیں بلکہ سیارے (Planets) ہیں جو سیرس ستارے سے تو کیا ہمارے روشن ستارے (سورج) سے بھی بہت چھوٹے ہیں لیکن ہمارے بہت قریب ہیں۔ ان کی اپنی روشنی نہیں ہے۔ یعنی یہ سورج، سیرس، آخر النہر، کینوپس اور بیت الجوس ستاروں کی طرح ہیلیم اور ہائیڈروجن گیس کے بال نہیں ہیں جس طرح سورج کی روشنی چاند پر پڑتی ہے تو وہ روشن اور چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح مشتری اور زہرہ بھی سیارے ہیں۔ یہاں تک کہ عطارد (Mercury) اور مریخ (Mars) بھی زیادہ واضح نظر آتے ہیں لیکن یہ بھی ستارے نہیں بلکہ سیارے ہیں۔

Sirius کا اصل نام لاطینی زبان میں ہے۔ لیکن دنیا بھر میں مشہور ہونے اور قدیم زمانے سے استعمال میں آنے کے سبب دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تقریباً پچاس نام ہیں۔ عربی میں اس کا نام الشعریٰ یعنی رہنما ہے۔ سنسکرت میں اسے مرگا ویادھا اور لبدھا کہا جاتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کے معنی ایک ہیں یعنی ہرن کا شکاری۔ سویڈن، ناروے اور ڈنمارک کے اطراف میں اس ستارے کو Lokabrenna کہا جاتا ہے۔ جاپانی اسے Aboshi (بلواسٹار) کہتے ہیں۔

اسلام سے قبل یہ ستارہ الشعریٰ علم نجوم، جادو اور ٹونے ٹوٹکے کے لیے بھی کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ قدیم مصر کے باشندے اس ستارے کی پوجا کرتے تھے کیوں کہ اس کے ظاہر یا طلوع ہونے کے ایام میں دریائے نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا۔ اس لیے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب اس ستارے الشعریٰ کے ظاہر ہونے کا فیضان ہے۔ دورِ جاہلیت میں عربوں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارہ انسان کی قسمت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر یہ ستارہ عربوں کے معبودوں میں شامل تھا۔ خاص طور پر قریش کے قریبی قبیلے خزاعہ کے ہاں یہ ستارہ پوجا کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ قرآن پاک کی سورہ النجم کی آیت نمبر 49 ہے۔ مفہوم: اور یہی شعریٰ کا رب ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری قسمتیں شعریٰ ستارہ نہیں بناتا بلکہ اس کا رب بناتا ہے۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ مختلف زبانوں اور ملکوں میں اس ستارے کے کئی مختلف نام ہیں۔ حتیٰ کہ عرب ملکوں میں بھی الشعریٰ کے

علاوہ اس کے کچھ دوسرے عربی نام ہیں۔ مثلاً جرزوم الجوزا، الکلب الاکبر، الکلب الجبار، الشعریٰ، العبور وغیرہ وغیرہ۔

Sirius کئی سائنس فکشن میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ انگلینڈ نیوی کے سات جہازوں کا نام HMS Sirius رہا ہے۔ امریکا کے ایک جنگی جہاز کا نام بھی اس ستارے پر ہے۔ لاک ہیڈ والوں کے ایک ہوائی جہاز کا نام بھی لاک ہیڈ سیرس ہے۔ جاپان کی مٹسوبشی موٹرز کمپنی نے 1980ء میں اپنے ایک انجن کا نام مٹسوبشی سیرس رکھا تھا۔ نارتھ امریکا کی ایک ریڈیو کمپنی کا نام سیرس سیٹلائٹ ریڈیو ہے۔ ہیری پوٹر کی کتابوں اور فلموں میں ہیری پوٹر کے دادا کا نام سیرس ہے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اپنی دھرتی سے جو سب سے زیادہ روشن ستارہ نظر آتا ہے وہ یہی الشعریٰ یعنی Sirius ہے۔ صبح کے وقت ایک بے حد روشن ستارہ نظر آتا ہے جو اس قدر روشن ہوتا ہے کہ فجر کی نماز کے بعد بھی جب کوئی دوسرا ستارہ نظر نہیں آتا اور ہر طرف صبح کا اجالا چھایا ہوتا ہے اس وقت بھی یہ ستارہ صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ سندھ میں اسے دیاؤ تارا کہا جاتا ہے۔

سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک جہازی طالب علم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ سب سے زیادہ روشن نظر آنے والا ستارہ Sirius کہیں دیاؤ تارا تو نہیں؟

دراصل تعلیمی ایام میں جب چٹاگانگ میں کمانڈر اسرار اللہ (بعد میں کیڈٹ کالج پٹارو کے پرنسپل بنے) Astronomy کے پریڈ میں الشعریٰ ستارے کے متعلق پڑھاتے تھے تو میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ چٹاگانگ میں ہر وقت بادل اور بارش ہونے کے سبب رات کی آؤٹ ڈور کلاسز میں آسمان پر ستاروں کی ترتیب کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا لیکن بعد میں جہاز پر جا کر معلوم ہوا کہ الشعریٰ کو درست طریقے سے دیکھنے کا مقام دنیا کا جنوبی نصف گول ہے۔ جہاں نجی، آسٹریلیا میں آسمان کے بلند ترین مقام پر وہ صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں شمالی نصف گول میں یہ ستارہ پاکستان، مصر حتیٰ کہ ترکی اور یونان میں بھی نظر آتا ہے لیکن بہت نیچے کی جانب جنوب میں افق کے بالکل قریب دکھائی دیتا ہے بلکہ دھرتی کے ہمارے نصف گول میں سب سے واضح اور روشن Arcturus ستارہ ہے جو چوتھے نمبر پر ہے۔ اوّل، دوم اور سوم بالترتیب اس طرح ہیں سیرس، کینوپس اور Alpha centouri۔ یہ ستارے کراچی، ممبئی سے جنوب کے زمینی حصوں میں صاف نظر آتے ہیں۔ اس لیے شمالی ملکوں میں رہنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ آرکٹورس ستارہ سب میں زیادہ روشن ہے جب کہ آرکٹورس کا درجہ چوتھے نمبر پر ہے۔

ہم ستاروں کی روشنی کے متعلق تفصیل اس حوالے سے بیان کررہے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ سورج کے علاوہ دیگر ستارے کون سے ہیں جو ہمیں زمین سے صاف اور واضح نظر آتے ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ زمین سے ہمیں واضح اور صاف طور پر نظر آنے والا بیس نمبر ستارہ ہو اور اس میں سب سے زیادہ آگ روشن ہو۔ وہ سب سے بڑا ہو۔ سب سے زیادہ روشن ہو لیکن زمین سے زیادہ فاصلے پر موجود ہونے کے سبب ہم تک اس کی زیادہ روشنی نہیں پہنچتی ہو جتنا کہ وہ روشن ہے۔

مثلاً آخر النہر (Achernar) ستارے کا موازنہ ہمارے روشن ستارے (سورج) سے کیا جائے تو سورج نمایاں رہے گا۔ اس کی روشنی بہت زیادہ ہے دیگر ستاروں میں بھی آخر النہر آٹھویں نمبر پر روشن ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخر النہر ستارہ سورج سے 3000 گنا زیادہ روشن ہے۔ یعنی اس میں بہت زیادہ آگ روشن ہے۔ یہ سائز اور وزن کے لحاظ سے بھی سورج سے آٹھ گنا زیادہ ہے۔ دراصل یہ ہم سے بہت زیادہ فاصلے پر ہے۔ سورج کی روشنی ہم تک ساڑھے آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے جب کہ آخر النہر ستارہ ہم سے 144 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ اس فاصلے کو ذہن میں رکھ کر قدرت کی اس بے انت کائنات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو انسانی سوچ سے بعید ترین ہے اگر سورج اچانک غائب ہو جائے (مثال کے طور پر فرض کرلیجیے) تو اس کی روشنی ساڑھے آٹھ منٹ تک موجود رہے گی۔ کیونکہ اس میں سے نکلنے والی روشنی کی آخری شعاع کو زمین تک پہنچنے میں اتنا وقت لگے گا اور اگر آخر النہر ستارہ یکایک غائب ہو جائے یا بجھ جائے تب بھی وہ ہمیں 144 برس تک نظر آتا رہے گا۔ یعنی یہ ستارہ موجود نہ ہونے کے باوجود 144 برس تک اسے ہمارے پوتے، پڑپوتے دیکھتے رہیں گے۔

اب غور کیجیے کہ ہمارا روشن ستارہ (سورج) موسم گرما میں جیکب آباد کے لوگوں کو جھلسا کر رکھ دیتا ہے اور یہ آخر النہر جیسے ستاروں کے مقابلے میں کچھ بھی گرم اور روشن نہیں ہے۔ اگر سورج، آخر النہر ستارے کی طرح 144 نوری سال کے فاصلے پر ہوتا بلکہ ایک نوری سال کے فاصلے پر بھی ہوتا تو

ہمیں محض ایک ٹمٹماتے ہوئے ستارے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ آخر النہر ستارہ بھی قدرت کے کارخانے میں کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ دوسرے ستارے اس سے بھی زیادہ فاصلے پر ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ یہ کائنات کس قدر وسیع ہے اور اس میں موجود کروڑوں، اربوں ستاروں اور سیاروں کا سائز اور ان کی رفتار کس قدر ہے۔ یہ تمام ستارے اور سیارے لٹو کی طرح گھوم رہے ہیں اور اپنے محور پر انتہائی تیز رفتار سے گردش بھی کررہے ہیں۔ قدرت کا ایک زبردست اور اٹل ضابطہ ہے۔ جس کے یہ عظیم الشان سورج، چاند، ستارے اور سیارے پابند ہیں۔ انسان انہی سے وقت، ایام، تاریخوں، فصلوں اور موسموں کا حساب رکھتا ہے۔ کیونکہ رب پاک نے سورج کے طلوع وغروب اور اس کے مختلف منزلوں سے گزرنے کا ایک قاعدہ مقرر کیا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ انتہائی بڑے سائز کے ہونے کے باوجود یہ کس قدر تیز رفتار سے گردش کرتے رہتے ہیں اور کس قدر فاصلہ طے کرتے ہیں۔ سورۂ رحمٰن کی آیت نمبر 5 میں خالقِ کائنات رب اللعالمین نے ارشاد فرمایا ہے۔ یعنی سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں اور ان کے علاوہ دیگر ستارے شجر وغیرہ سب سجدہ ریز ہیں۔ یعنی حکم کے پابند ہیں۔ سورہ النجم میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں۔ ان کے لیے جو ضابطہ طے کیا گیا ہے یہ اس سے ذرہ بھی اوپر نیچے نہیں ہوتے۔

ہم صبح کے وقت نظر آنے والے ستارے کا ذکر کررہے تھے۔ جسے سندھ میں وہاؤ تارا کہتے ہیں۔ دراصل یہ ستارہ نہیں بلکہ زہرہ (Venus) سیارہ ہے۔ سیارے کی شناخت یہ ہے کہ وہ ستارے کی طرح Twinkle (جگمگاتا) نہیں ہے۔ سورج کی طرح اس کی اپنی روشنی نہیں ہے جو ہمیں نظر آئے۔ وہ آئینے کی طرح سورج کی روشنی کو منعکس کرکے ہم تک پہنچاتا ہے۔ جس طرح چاند کوئلے کی طرح سیاہ ہے اور اس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو وہ ہمیں چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کے جتنے حصے پر روشنی پڑتی ہے وہ حصہ ہمیں روشن نظر آتا ہے۔ اس کا باقی حصہ سیاہ رہتا ہے۔ ہر مہینے کے تین دن ایسے ہوتے ہیں جب چاند کی پشت ہماری طرف ہوتی ہے اور وہ ایسی صورت میں ہمیں بالکل نظر نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں سورج بھی ایک ستارہ ہے لیکن اس کی اپنی روشنی ہے اور اس پر ہر وقت آگ بھڑکتی رہتی ہے۔

### جھارکھنڈ

بھارت کی 28ویں ریاست۔ اس قیام 2000ء میں عمل میں آیا۔ اس کے شمال میں بہار مشرق میں مغربی بنگال، جنوب میں اڑیسہ اور مغرب میں چھتیس گڑھ کی ریاست واقع ہیں۔ ریاست کا رقبہ 74677 مربع کلومیٹر اور 2001ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی 32 ملین ہے۔ صدر مقام رانچی ہے۔ یہ ریاست معدنی اعتبار سے مالا مال ہے، یہاں کوئلہ، تانبا، لوہا، چونے کا پتھر، عماراتی سامان اور مینگانیز کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔

مرسلہ: واحد خان، لاہور

اگر ہم جہازیوں سے پوچھا جائے کہ سمندر میں راستہ تلاش کرنے اور اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ستاروں کی مدد لینا بہتر ہے یا سیاروں کی تو ہم میں سے سب یہی کہیں گے کہ السعد الذابح ستارے (Dabin) ذنب الدجاجہ ستارے (Deneb) کلب الراعی ستارے (Celbalrai) اور آخر النہر ستارے (Achernar) سے بہتر اور آسان زہرہ، مشتری، عطارد اور سرطان سیاروں کی Signt لینا ہے۔ خاص طور پر Calculation Work میں۔

زہرہ (Venus) سیارہ کچھ عرصے کے لیے شام کے وقت نظر آتا ہے لیکن بعد میں سورج کے گرد، گردش کرنے کے دوران ایسی پوزیشن میں آجاتا ہے کہ ہمیں وہاؤ تارے کی شکل میں صبح کے وقت نظر آتا ہے۔ شام کے وقت ایک اور روشن سیارہ مشتری نظر آنے لگتا ہے۔ یہ مشتری سیارہ اپنے سفر کے دوران ہمیں چاند کے بالکل قریب ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہاں زہرہ اور مشتری کے متعلق چند سطریں لکھنا بے محل نہ ہوگا۔ یہ سیارے ہمارے نظام شمسی کا حصہ ہیں اور ہماری زمین کی طرح لٹو کی طرح گھومنے کے ساتھ ساتھ سورج کے گرد بھی گردش کرتے رہتے ہیں۔ زہرہ سیارے کو ہماری زمین کی بہن کہا جاتا ہے کیونکہ زمین اور زہرہ سیارہ تقریباً ایک جتنے ہیں۔ زمین کا قطر 13000 کلومیٹر اور زہرہ کا 12000 کلومیٹر ہے۔ زہرہ وزن میں بھی لگ بھگ زمین کے برابر ہیں۔ زہرہ پر موجود علاقے بھی زمین سے خاصی مشابہت رکھتے ہیں۔ یعنی سنگلاخ پہاڑی علاقے

ہیں حیرت ہوتی ہے کہ وہاں بعض صورت ایسی ہیں کہ اس کی فضا میں کسی جاندار کا رہنا مشکل ہے۔ ہمارے ہاں ہوا میں آکسیجن اور اسے ہلکا کرنے والی گیس نائٹروجن موجود ہے جب کہ زہرہ سیارے پر 95 فی صد کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے۔ ہمارے ہاں جیکب آباد اور سبی جیسے علاقوں میں موسم گرما میں چند ماہ 42 ڈگری سے کچھ زیادہ گرمی پڑتی ہے۔ اس صورتِ حال میں گرمی سے لوگوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور زہرہ سیارے پر ہر وقت 500 ڈگری ٹمپریچر رہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ درجہ حرارت بہت زیادہ ہے۔ 100 ڈگری ٹمپریچر پر پانی بھاپ بن جاتا ہے اور زہرہ کی فضا میں پیدا ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ کا دباؤ زمین کے فضائی دباؤ سے 92 فیصد زیادہ ہے۔ یعنی زہرہ پر انسان یا جانور اس قدر دباؤ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جسم میں موجود خون اور رقیق مادہ باہر نکل آتا ہے۔

وینس (زہرہ) سیارہ ہماری زمین سے تقریباً 42 ملین کلومیٹر دور اور سورج کے خاصا قریب ہے۔ سورج کے سب سے قریب عطارد سیارہ ہے۔ اس کے بعد زہرہ اور اس کے بعد ہماری زمین ہے۔

زہرہ (وینس) سیارہ زمین سے زیادہ سورج کے قریب ہونے کے سبب سورج کے گرد ہمارے 225 دن میں اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ یہی ایک چکر ہماری زمین 365 دنوں میں مکمل کرتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ زہرہ سیارہ کی اپنی محوری گردش کی رفتار انتہائی کم ہے۔ اس قدر کم کہ وہ ایک چکر (یعنی دن اور رات) ہمارے 243 دنوں میں مکمل کرتا ہے۔ یعنی اگر زہرہ سیارے سے طلوع آفتاب کا نظارہ کیا جائے تو وہاں دوسری مرتبہ 243 ضرب 24 گھنٹے کے بعد سورج طلوع ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ زہرہ سیارہ مخالف سمت میں گردش کرتا ہے۔ اس لیے وہاں سورج مغرب سے طلوع ہو کر مشرق میں غروب ہوتا ہے۔ انگلینڈ اور یورپ کی اطراف میں اس سیارے کو مارننگ اسٹار اور ایوننگ اسٹار کہا جاتا ہے کیونکہ وہاں یہ شام کے وقت نظر آتا ہے یا صبح کے وقت۔

ہندو جوتش میں اس سیارے کو "شکرا" کہا جاتا ہے۔

ٹیلی اسکوپ کی ایجاد سے قبل مغرب میں اسے Wandering Star (آوارہ ستارہ) بھی کہا جاتا تھا۔

ہمارے روشن ستارے جسے ہم سورج کہتے ہیں۔ اس کے گرد زمین سمیت جو سیارے گردش کرتے ہیں اور ہمارے سورج کے شمسی نظام کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی دو اقسام ہیں۔ ایک میں ہماری زمین، عطارد (Mercury) زہرہ (Venus) اور مریخ (Mars) شامل ہیں۔ ان سیاروں کی زمین ہماری دھرتی کی طرح سنگلاخ اور سخت ٹھوس پتھروں کی شکل میں ہے۔ دوسری قسم کے سیارے مثلاً مشتری (Jupiter) سرطان، نیپچون اور یورانس دراصل مختلف گیسوں کے بال ہیں اگر وہاں پتھر اور لوہا موجود بھی ہے تو نہایت قلیل مقدار میں ہے۔ باقی گیس ہی گیس ہے۔

مشتری سیارہ سورج سے فاصلے کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے۔ یعنی عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ کے بعد مشتری ہے۔ مشتری سیارہ سورج کے گرد ایک چکر مکمل کرنے میں تقریباً بارہ سال لگاتا ہے۔ دیگر سیاروں کے وزن سے مشتری کا وزن ڈھائی سو فی صد زیادہ ہے۔ رات کے وقت آسمان پر چاند اور زہرہ کے بعد سب سے زیادہ چمکتا ہوا سیارہ بھی مشتری ہے۔ روشنی اور چمکنے کے لحاظ سے یہ تیسرے نمبر پر ہے یعنی اوّل چاند، دوم زہرہ، سوم مشتری! البتہ یہ بات دیگر ہے کہ سال کے چند دن یہ ایسی پوزیشن میں آجاتا ہے کہ مریخ سیارہ اس سے زیادہ روشن اور چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ معمولی مقدار میں ہیلیم گیس اور پتھروں کے علاوہ مشتری سیاہ ہائیڈروجن گیس کا حامل ہے۔ اس کا قطر 143000 کلو میٹر ہے۔ یعنی یہ ہماری زمین سے گیارہ گنا بڑا ہے۔ یہ اپنے محور کے گرد لٹو کی طرح گردش کرتا ہے اور ہمارے شمسی نظام کا تیز ترین Rotat کرنے والا سیارہ ہے۔ یہ اپنا ایک چکر دس گھنٹے میں مکمل کرتا ہے۔ یعنی مشتری سیارے پر پانچ گھنٹے کا دن اور پانچ گھنٹے کی رات ہوتی ہے۔

مریخ سیارے کا قطر ہماری زمین کے نصف کے برابر ہے اور یہ وزن میں زمین کے دسویں حصے کے برابر ہے۔ مریخ، سورج سے زیادہ فاصلے پر ہونے کے سبب اسے سورج کے گرد اپنی گردش مکمل کرنے میں دو سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ لہٰذا مریخ پر گو کہ چار موسم ہوتے ہیں لیکن وہ تین تین مہینوں کے بجائے ہر موسم چھ مہینے کا ہوتا ہے۔ موسم سرما انتہائی سرد ہوتا ہے اور وہاں منفی 140 ڈگری سردی رہتی ہے۔ موسم گرما میں درجہ حرارت 20 ڈگری رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سیارہ سورج سے کچھ زیادہ فاصلے پر ہے اور دوسری بات یہ کہ اس سیارے کے گرد فضا ایسی ہے۔ جو سورج کی تپش کو Store نہیں کر سکتی۔

▲▼▲

# اکتوبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کیلنڈر کے دسویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

قارئین، ماہ اکتوبر شروع ہو چکا ہے۔ کیلنڈر کے حساب سے یہ دسواں مہینا ہے۔ اب 2017 فقط دو ماہ دور ہے۔ پرانی رومی تقویم میں اکتوبر آٹھواں مہینا ہوا کرتا تھا۔ اکتو (octo) یونانی زبان میں آٹھ کو کہا جاتا ہے۔ اس ماہ دنیا کے بڑے حصے میں خزاں کا موسم ہوتا ہے۔ پاک و ہند کی کئی ممتاز شخصیات کی یادیں اس ماہ سے جڑی ہیں۔ پہلا قابلِ احترام نام جناب لیاقت علی خان کا ہے، جو یکم اکتوبر 1895 کو مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ وہ تحریک پاکستان کے مرکزی رہنما تھے۔ انہیں قائد اعظم کا دست راست کہا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پہلے وزیر اعظم بنے۔ اس عظیم شخص کو 16 اکتوبر 1951 کو راولپنڈی میں شہید کیا گیا۔ ان کے قتل سے کئی سازشی نظریات جڑی ہیں۔

اگلا نام ہے پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کا۔ لیاقت علی خان کی وفات کے بعد انھوں نے ہی وزیر اعظم کا منصب سنبھالا۔ وہ 19 جولائی 1894 کو ڈھاکا میں پیدا ہوئے۔ بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ 22 اکتوبر 1964 کو 70 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ جمہوریت کے لیے لازوال جدوجہد کرنے والی نصرت بھٹو کی برسی بھی ہر سال 23 اکتوبر کو منائی جاتی ہے۔ طویل علالت کے بعد سن 2011 میں دبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ اپنی زندگی میں انھوں نے بے تحاشہ غم دیکھے۔ شوہر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی، پھر تحریک بحالی جمہوریت کے دوران قید و بند کی صعوبتیں۔ دونوں بیٹوں (شاہنواز بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو) اور بیٹی بے نظیر بھٹو کے قتل کا کرب بھی انہیں سہنا پڑا۔

ایک اور عظیم پاکستانی حکیم محمد سعید کو بھی 17 اکتوبر 1998 کو کراچی میں قتل کیا گیا۔ وہ ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ شعبۂ حکمت اور پاکستان کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ 200 سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ہمدرد پاکستان اور ہمدرد یونیورسٹی جیسے ادارے قائم کیے۔ بچوں کے ادب کے لیے بھی ان کی بڑی کاوشیں تھیں۔ گورنر سندھ بھی رہے۔ انہیں اپنے مطب کے باہر شہید کیا گیا تھا۔ پاکستان کے سابق صدر اور انتہائی باا ثر بیوروکریٹ غلام اسحاق خان کا تعلق بھی ماہ اکتوبر سے ہے۔ وہ 22 فروری 1915 کو بنوں کے ایک گاؤں اسماعیل خیل میں پیدا ہوئے۔ 1940 میں انڈین سول سروس کا حصہ بنے۔ 1988 میں ضیاالحق کا طیارہ گرنے کے بعد ملک کے صدر ہوگئے۔ اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے انھوں نے بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی حکومتوں کو برطرف کیا۔ 1993 میں بگڑتے

حالات کی وجہ سے انہیں عہدہ چھوڑنا پڑا۔ 27 اکتوبر 2006 کو 91 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ پشتو کے ممتاز اداکار بدر منیر کا سن وفات بھی 11 اکتوبر 2008 ہے۔ 1940 میں پیدا ہونے والے اس اداکار نے اپنے کیریر میں چار سو سے زاید فلمیں کیں۔ انہیں پشتو فلموں کا سلطان راہی کہا جاتا تھا۔

یہ اُن شخصیات کا مختصر سا تعارف تھا، جن کا ذکر پہلے بھی ان صفحات میں آچکا ہے۔ اب ہم ماہ اکتوبر کی دیگر معروف شخصیات پر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں۔

## ☆معراج محمد خان

ان کا تعلق اس قبیلے سے تھا جو پاکستانی سیاست میں کمیاب ہی نہیں، نایاب ہے۔ ایسے ستھرے نکھرے، سچے، اصول پسند لوگ اب کہاں جو مقصد کو اقتدار پر مقدم سمجھتے ہوں، نظریات کے لیے جان لڑا دیں، تشدد اور صعوبتیں سہیں مگر ہار نہ مانیں۔

معراج محمد خان کی کہانی ایک معنوں میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کی داستان ہے۔ اس میں اس زمانے کی بھی جھلک ملتی ہے، جب آمریت کے خلاف روشن خیال طلبا ایک پلیٹ فورم پر اکھٹے ہوئے اور ایک ملک گیر تحریک چلائی۔ انہوں نے سیاست میں قدم رکھا اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے پی پی کو مستحکم کیا مگر جب اصولوں پر آنچ آئی تو بلا خوف و خطر سرکاری عہدہ چھوڑا اور بھٹو سے الگ ہوگئے۔ بعد میں ضیا آمریت میں ہم نے انہیں متحرک دیکھا۔ یہاں تک کہ وکلا تحریک کے زمانے میں بھی جب وہ بہت ضعیف ہو گئے تھے، انہوں نے سچائی کا ساتھ دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ معراج محمد خان اپنی مثال آپ تھے۔ ان جیسا کوئی نہیں۔ ان کی برابری تو فقط ان کے قابل احترام بھائی، جناب منہاج برنا کر سکتے ہیں جنھوں نے میدان صحافت میں سچائی، اصول پسندی اور قربانی کا وہ پرچم بلند رکھا جو معراج محمد خان نے میدان سیاست میں اٹھا رکھا تھا۔

انہوں نے 19 اکتوبر 1938 کو ناگ پور، ہندوستان میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد تاج محمد خان طبیب تھے۔ فٹ بال کے وہ شائق ہوا کرتے تھے۔ بچپن آبائی گاؤں قائم گنج، ضلع فرخ آباد میں گزرا۔ میونسپلٹی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر جامعہ ملیہ دہلی کا رخ کیا۔ تقسیم ہند کے وقت ان کے والد کوئٹہ میں تھے۔ سن 49ء میں ہندوستانی حکومت نے ان کی زمین اور مکان ضبط کرلیا تو باقی خاندان لاہور پہنچا۔ وہاں سے بہ ذریعہ ٹرین کوئٹہ چلے گئے۔ وہاں سینڈیمن اسکول، کوئٹہ میں زیر تعلیم رہے۔ 56ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ پھر ایس ایم آرٹس کالج، کراچی میں داخلہ لیا۔ گھر کے روشن خیال اور علمی و ادبی ماحول نے تربیت کی۔ کالج میں وہ بہ طور مقرر مشہور تھے۔ 57ء میں وہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رکن بنے۔ 58ء میں امریکی صدر، آئزن ہاور کی پاکستان آمد کے موقع پر احتجاج کا منصوبہ بنایا تو پہلی گرفتاری عمل میں آئی۔ کراچی میں "انٹر کالجیٹ باڈی" بنائی گئی، تو نوجوان معراج محمد خان اس کے نائب صدر چنے گئے۔ باڈی کی "کال" پر ایوب خان کے خلاف ہزاروں طلبا سڑکوں پر نکل آئے۔ تصادم ہوا۔ مارشل لا کورٹ نے انہیں ایک سال کی سزا سنائی۔

62ء میں ان سمیت سات طلبا کو ملک دشمنی کے الزامات کے تحت شہر بدر کردیا گیا۔ ایک برس کوئٹہ میں خاموشی سے گزرا۔ واپسی کے بعد تین سالہ ڈگری، تین سالہ لا کورس اور یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ پولو گراؤنڈ کراچی میں کونشن مسلم لیگ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا، تو سخت سیکیورٹی کے باوجود طلبا معراج محمد خان کی قیادت میں وہاں پہنچ گئے اور اسٹیج پر چڑھ گئے۔ اس روز اسٹیج پر بھٹو بھی موجود تھے۔ اس واقعے کے بعد وہ ملک گیر لیڈر بن گئے۔ واقعے کے بعد ان کا پیغام ملک کے کونے کونے تک پہنچ گیا۔ ایک بار پھر معراج صاحب کو شہر بدری کی سزا سنائی گئی مگر تحریک اب رکنے والی نہیں تھی۔ آخر شدید احتجاج نے حکومت کو مجبور کردیا۔ طلبا کے وفد اور نواب آف کالا باغ کے درمیان مذاکرات ہوئے اور ان کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔

64ء میں صدارتی انتخابات ہوئے، تو انہوں نے آمریت کے خلاف از سر نو تحریک شروع کی۔ وہ فاطمہ جناح کے ساتھ تھے مگر ایک سازش کے تحت این ایس ایف میں دراڑ ڈال دی گئی۔ دراصل اسے چلانے والی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان دو حصوں (چینی نواز اور روس نواز) میں تقسیم ہو گئی تھی۔ 66ء میں انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو این ایس ایف

کے کنونشن میں مدعو کیا، جوایوب کابینہ سے الگ ہو چکے تھے۔
ان کے ذہن میں یہ خیال اجاگر ہونے لگا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ وہ اپنی جدوجہد کو مزید موثر بنا سکتے ہیں۔ نومبر 67ء میں وہ باقاعدہ پیپلز پارٹی کا حصہ بن گئے۔ معراج محمد خان کی جامع و مربوط پالیسیوں، طلبا کے جذبے اور بھٹو کی کرشماتی شخصیت کے طفیل پیپلز پارٹی منظم و مضبوط ہوتی گئی، اگر اس نے مغربی پاکستان میں کامیابی حاصل کی، تو اس کا ایک سبب معراج محمد خان کی قیادت بھی تھی۔ اسی زمانے میں بھٹو صاحب نے معراج محمد خان کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اعلان کیا۔ جب مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہوا تو معراج محمد خان نے اس کے خلاف اسٹینڈ لیا اور آواز بلند کی۔

پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی، تو پہلے وہ مشیر مقرر ہوئے۔ پھر وزیر برائے پبلک افیئرز بنائے گئے، مگر نیپ کی حکومت کے خاتمے اور بلوچستان میں آپریشن کے بعد ان کے اور بھٹو صاحب کے اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ بالآخر انھوں نے 72ء میں استعفیٰ دے دیا۔ وہ پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دینے والے پہلے رکن تھے، جس پر بھٹو صاحب خاصے ناراض ہوئے۔ دونوں کی راہیں جدا ہوئیں۔

74ء میں انھوں نے ایک جماعت "قومی محاذ آزادی" کی بنیاد رکھی، مگر ایک ماہ بعد ہی انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں "سندھ ٹریبونل" کی جانب سے چار سال کی سزا سنائی گئی۔ مبصرین کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کی ان ہی پالیسیوں کی وجہ سے 77ء کے انتخابات میں جمہوری پارٹیوں کو "پاکستانی قومی محاذ" میں مذہبی جماعتوں کے ساتھ الحاق کرنا پڑا، جس کا نتیجہ مارشل لا پر منتج ہوا۔ اپنے ایک انٹرویو میں معراج محمد خان نے انکشاف کیا تھا کہ مارشل لا نافذ کرنے کے بعد ضیا الحق نے انھیں جیل سے بلوایا، پیشکش کی کہ وہ کراچی میں مہاجروں کی ایک جماعت بنائیں، عوام میں بھٹو کے خلاف بات کریں مگر انھوں نے صاف کہہ دیا، جناب میں کرائے پر کام نہیں کرتا!

ان کٹھن حالات میں انھوں نے ایم آر ڈی کے پلیٹ فارم سے بحالی جمہوریت کے لیے آواز اٹھائی۔ ایک بار پھر گرفتار ہوئے۔ 88ء کے انتخابات میں وہ لانڈھی کی نشست سے کھڑے ہوئے، مگر حالات سازگار نہیں تھے۔ الیکشن سے ایک روز قبل ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ بعد کے زمانے میں ان کی جماعت کا لیفٹ کی دیگر سیاسی جماعتوں سے اتحاد بنا، لیکن معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا کہ اب انتخابی سیاست کا مزاج بدل گیا تھا۔

98ء میں ان کی جماعت کا عمران خان کی پارٹی "تحریک انصاف" سے الحاق ہو گیا۔ معراج صاحب تحریک انصاف کے سیکریٹری جنرل ہو گئے مگر 2003 میں ان کی اور عمران خان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ دونوں کی سوچ مختلف تھی۔ عمران خان کی طرز سیاست سے وہ متفق نہیں تھے۔ گو وہ نوجوانوں کے لیے ایک اور جنگ لڑنا چاہتے تھے، مگر اب بیماریوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ 21 جولائی 2016 کو 77 سال کی عمر میں یہ سچا، کھرا اور اصول پسند سیاست دان انتقال کر گیا۔

## ☆ طارق علی

کیسا المیہ ہے... آج نہ تو ہمیں اپنے فکری قائدین کی خبر، نہ ہی حقیقی دانشور کی پہچان۔ ٹی وی چینلوں پر چار لوگوں کو اکٹھا کر کے چیخنے چلانے والے، پیشگوئیاں کرنے والے حضرات ہمارے ہاں رائے عامہ کے نمائندے بن گئے۔ نہ تو مطالعے کی عادت رہی، نہ مباحثوں کا چلن۔ ایسے میں اگر پاکستان کی اکثریت طارق علی کو بھول گئی ہو، تو حیرت کیسی۔ مگر عالمی دنیا جب بھی کسی پاکستانی اسکالر کی رائے جاننا چاہتی ہے تو اُن کا پہلا انتخاب طارق علی ہی ٹھہرتے ہیں۔

نڈر اور بے باک ضرور ہیں مگر توازن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایک جانب افغانستان اور عراق میں ہونے والے مظالم پر امریکا پر کڑی تنقید کی تو دوسری طرف پیوٹن کو بھی چیچن مخالف اقدامات پر آڑے ہاتھوں لیا۔ کشمیر میں ہونے والی زیادتیوں پر عالمی میڈیا میں کھل کر آواز اٹھاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر عالمی میڈیا کو آئینے میں اس کا منافقانہ چہرہ دکھانے سے بھی نہیں چوکتے۔ طارق علی حقیقی معنوں میں ایک ہمہ جہت انسان ہیں۔ نوجوانی میں وہ ایک ایکٹوسٹ کے طور پر ابھرے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اسکالر ان کی قیادت میں نکلنے والے جلوسوں اور ریلیوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ قلم اٹھایا تو سیاست اور تاریخ کے موضوعات پر ایسی کتب لکھیں جن کا چرچا دنیا بھر میں ہوا۔ ان کے مضامین گارجین، کاؤنٹر پنچ اور لندن بکس آف ریویو جیسے معتبر جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ جب امریکا اور برطانیہ کی درسگاہیں سیمینار رکھتی ہیں تو خصوصی طور پر انھیں مدعو کیا جاتا ہے۔ آج بھی جب سامراجی نظام کے خلاف دانشوروں کا مظاہرہ ہوتا

ہے، وہ مکمل منظر میں دکھائی دیتے ہیں۔

جب اوروں کو آئینہ دکھایا، تو اپنوں کی غفلتوں پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ 1970 میں ان کی کتاب Pakistan: Military Rule or People's Power شائع ہوئی جس میں انہوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی پیشگوئی کی تھی۔ اس کتاب پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بھٹو دور میں ان کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ فوج پی پی حکومت کا تختہ الٹ دے گی۔ ضیا دور میں شائع ہونے والی ان کی کتاب Can Pakistan Survive? کو بھی پابندی کا سامنا کرنا پڑا۔

فکشن نگاری بھی ان کا میدان رہی۔ تاریخی ناول لکھے اور خوب لکھے۔ Shadows of the Pomegranate Tree پہلی کاوش تھی، جس میں اسلامی اور مسیحی تہذیبوں کے درمیان تصادم کو موضوع کیا۔ The Book of Saladin میں صلیبی جنگیں اور صلاح الدین ایوبی کی کہانی بیان کی۔ اس کتاب کا بہت چرچا ہوا۔ ان کا ناول The Stone Woman سلطنت عثمانیہ کے گرد گھومتا ہے۔ Sultan in Palermo میں انہوں نے سسلی میں مسلم کلچر کے پھیلاؤ کو منظر کیا۔ Night of the Golden Butterfly میں وہ لاہور کی ایک ان کہی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ان کتابوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے فلم میکر اور ڈراما نویس کے طور پر بھی خود کو منوایا۔ بھٹو اور ہیوگو شاویز کے متعلق لکھا۔

طارق علی 21 اکتوبر 1943 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تقسیم سے قبل پنجاب کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے والے سر سکندر حیات کے وہ نواسے تھے۔ معروف سیاست دان سردار شوکت حیات ان کے ماموں تھے۔ ان کے والد مظہر علی خان کا شمار اپنے وقت کے ممتاز صحافیوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر رہے۔ انگریزی ہفت روزہ "ویو پوائنٹ" نکالا۔ والدہ طاہرہ مظہر علی خان زندگی بھر بائیں بازو کے نظریات کی ترویج کرتی رہیں۔

گھر کے ماحول نے طارق علی کی تربیت کی۔ بغاوت کا جذبہ وراثت میں ملا۔ مطالعہ اور حلقۂ یاراں کا اثر بھی رہا۔ پھر تعلیم نے فکری در وا کیے۔ مظلوم ان کی جدوجہد کا محور بن گیا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے، جہاں ان کی تقریروں کا طوطی بولتا تھا۔ ایوب آمریت کے خلاف طلبا تحریک شروع ہوئی تو وہ ہراول دستے میں شامل تھے۔ انہیں خطرہ تصور کیا جانے لگا۔ جب حکومت نے تحریک کچلنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا تو اندیشوں کے پیش نظر والد نے انہیں تعلیم کی غرض سے برطانیہ بھجوا دیا۔ آکسفورڈ جیسی تاریخی درسگاہ سے انہوں نے اکتساب فیض کیا۔ ادھر سیاسیات، فلسفہ اور معاشیات کے مضامین پڑھے۔ وہاں کی طلبا سیاست میں جلد ہی اس پُرجوش پاکستانی نوجوان کا ڈنکا بجنے لگا۔ آکسفورڈ یونین کا انتخاب لڑا اور صدر بن گئے۔ وہ یہ منصب سنبھالنے والے پہلے پاکستانی تھے۔ وہ تحریکوں کا زمانہ تھا۔ لیفٹ کے نظریات کا شہرہ تھا۔ ایکٹوازم عروج پر تھا۔ برطانیہ ان سرگرمیوں کا مرکز تھا اور آکسفورڈ یونین کا صدر اہم ترین آدمی سمجھا جاتا تھا۔ ان ہی برسوں میں ان کا رسل اور ایڈورڈ سعید جیسے ممتاز دانشوروں سے تعلق پیدا ہوا۔ برٹرینڈ رسل فاؤنڈیشن کے رکن بھی رہے۔ لیون ٹراٹسکی کے نظریات نے انہیں نوجوانی میں گرویدہ بنایا۔ اس کی کتابوں کو جم کر پڑھا۔ اس کے افکار کو آگے بڑھایا۔

سیاست دانوں میں میلکم ایکس، ہیوگو شاویز، فیڈل کاسترو سے دوستی رہی۔ انہیں ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا بھاشانی نے اپنی پارٹیوں میں شمولیت کی پیش کش کی تھی مگر انہیں اپنی آزاد حیثیت پیاری تھی۔ اس وقت طارق علی لندن میں مقیم ہیں۔

## ☆ صبیحہ خانم

ان کی مسکراہٹ کو جادوئی قرار دیا جاتا تھا، ان کی آنکھیں سحر انگیز ٹھہریں۔ کہنے والے انہیں سلور اسکرین کی گولڈن گرل کہتے، مگر ان کی کامیابی فقط حسن کی دین نہیں تھی، اس میں ذہانت اور ہمت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ 50 کی دہائی میں وہ فلم بینوں کے دل کی دھڑکن بن گئی تھیں۔ ہر سو ان کے حسن کے چرچے ہوتے۔ پرستاروں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یوں تو انہوں نے اپنے زمانے کے تمام بڑے اداکاروں کے ساتھ

کام کیا، مگر سنتوش کمار کے ساتھ ان کی جوڑی بہت مشہور ہوئی۔ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی پہلی خاتون تھیں جسے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔ بہترین اداکارہ کے طور کئی ایوارڈ ملے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں میں اپنا لوہا منوایا۔ اس زمانے میں مسرت نذیر بھی اپنے کیریر کے عروج پر تھیں۔ لوگ ان کے دیوانے تھے، مگر شہرت کے میدان میں صبیحہ خانم ہمیشہ ان سے چند قدم آگے ہی نظر آئیں۔

صبیحہ خانم کا اصل نام مختار بیگم تھا۔ 16 اکتوبر 1935 کو وہ پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق گجرات کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ ان کے والدین نے محبت کی شادی کی تھی۔ ان کی زندگی پر لکھنے والے قلم کاروں کے مطابق ان کے والد محمد علی ماہیا کی پریم کہانی گجرات میں لوک داستان سے مشہور تھی۔ ان کے والد کا تعلق دہلی، والدہ کا امرتسر سے تھا۔ ان کی پرورش میں ان کی دادی کا کردار کلیدی رہا۔ اداکاری کی صلاحیت پیدائشی تھی۔ فلمیں دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ لاہور نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ وہیں انہیں اسٹیج پر پرفارم کرنے کا موقع ملا۔

1948 میں سیالکوٹ کی ایک سنیما میں ہونے والی

تقریب میں انہوں نے فلم سسی پنوں کا ایک گیت "کتھے گیاں پردیساں" گایا۔ ان کی کارکردگی کو بہت سراہا گیا۔ اسی کے بعد وہ شاعر اور تھیٹر رائٹر نفیس خلیلی کی نظروں میں آئیں جنہوں نے انہیں ایک ڈرامے "بت شکن" میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ یہ ان کے کیریر میں "ٹرننگ پوائنٹ" تھا۔ نفیس خلیلی ہی نے انہیں صبیحہ خانم کا نام دیا۔ اب مسعود پرویز کی نظر ان پر پڑی، جو ایک فلم "بیلی" بنا رہے تھے۔ 1948 میں ریلیز ہونے والی اس فلم کے ساتھ انہوں نے فلم نگری میں قدم رکھ دیا۔ اس فلم میں سنتوش کمار نے مرکزی کردار نبھایا۔

اس زمانے میں انور کمال پاشا اور ان کے ساتھی لاہور کی فلمی صنعت کو سنبھالنے میں جتے تھے۔ انہوں نے اس باصلاحیت اداکارہ کو فلم دو آنسو میں کاسٹ کیا۔ اس فلم نے

**جون ایلیا**

(1930ء - 2002) ممتاز اردو شاعر اور ادیب۔ وہ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ 1957ء میں انہوں نے پاکستان ہجرت کی انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شفیق حسن ایلیا کی سرپرستی میں حاصل کی۔ اردو، فارسی اور عربی میں ایم اے کیا۔ آٹھ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا۔ 18 برس کی عمر میں فلسفے پر کتاب کے مصنف تھے۔ تاریخ، فلسفہ، مذاہب عالم پر ان کا مطالعہ بڑا گہرا تھا۔ وہ اردو کے منفرد اور صاحب اسلوب شاعر تھے اور بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ شاعری کو انہوں نے مکالمے میں تبدیل کردیا۔ مشاعروں میں ان کے سامنے کسی اور کا چراغ مشکل ہی سے جلتا تھا۔ لیکن کثرتِ شراب نوشی نے ان کی صحت کو برباد کردیا۔ کلام کا واحد مجموعہ "شاید" نے عوامی پذیرائی حاصل کی، دوسرا مجموعہ "یعنی" کے نام سے مرتب کیا۔ کراچی میں انتقال کیا۔

مرسلہ: اصغر علی سید، لاہور

سلور جوبلی مکمل کی۔ فلم "آغوش" میں وہ اپنی صلاحیتوں کے اوج پر دکھائی دیں۔ اس فلم کے ہدایت کار مرتضیٰ جیلانی تھے۔ 1953 میں وہ انور کمال پاشا کی فلم "غلام" میں نظر آئیں، تو ان کی حقیقت پسندانہ اداکاری نے فلم بینوں کو بے حد متاثر کیا۔

فلم "گمنام" کا بھی بہت چرچا ہوا۔ اس دور میں اداکارہ شمیم آرا، شمی اور بینا شوری بھی میدان میں تھیں، مگر صبیحہ خانم کو "گمنام" نے اگلی صف میں لا کھڑا کیا۔ انور کمال پاشا کی فلم "سرفروش" نے کامیابی کے کئی ریکارڈ قائم کیے۔ اس فلم میں بھی صبیحہ خانم نے یادگار رول کیا تھا۔ اس کے بعد ان پر فلموں کی بارش شروع ہوگئی۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ انہیں فلم میں کاسٹ کرے۔

البتہ جس فلم نے انہیں امر کردیا، وہ "دلا بھٹی" تھی۔ وہ ایک ناقابلِ فراموش کردار تھا۔ اس فلم میں سدھیر ان کے مدمقابل تھے۔ اس کا ایک گیت "واسطہ ای رب دا توں جاویں وے کبوترا" لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔ یہ گانا منور سلطانہ کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا۔ فلم "مکھڑا" میں ان پر فلمایا جانے والا گانا "دلا ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے" آج بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ ہے۔ اس گیت کے پیچھے زبیدہ خانم کی آواز تھی۔ اس وقت کی فلموں میں ہیروئن فقط شوپیس نہیں ہوتی

تھی۔ خواتین کو مضبوط رول دیے جاتے تھے۔ کنیز، دیور بھابی، پاک دامن، انجمن، محبت، تہذیب، اک گناہ اور سہی میں انہوں نے یادگار کریکٹر رول نبھائے۔ "دیور بھابی" میں انہوں نے وحید مراد کی بھابی کا کردار اتنی مہارت سے کیا کہ لوگ اش اش کر اٹھے۔ "اک گناہ اور سہی" کو ناقدین ان کے کیریر کی اہم فلم گردانتے ہیں۔ فلم سات لاکھ، شکوہ، دیور بھابی، اک گناہ اور سہی کے لیے انہوں نے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل کیا۔

ان کی ایک جہت گلوکاری بھی ہے۔ وہ ٹی وی سے نشر ہونے والے موسیقی کے کئی پروگراموں میں دکھائی دیں۔ کئی گیتوں کو انہوں نے اپنی آواز دی۔ ان کا گایا ہوا ملی نغمہ "جگ جگ جیے میرا پیارا وطن" بے حد مقبول ہوا۔

اسکرین پر تو صبیحہ اور سنتوش کی جوڑی مشہور تھی ہی، آف اسکرین بھی وہ ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ اس قربت کا نتیجہ شادی پر منتج ہوا۔ سنتوش پہلے سے شادی شدہ تھے، مگر ان کی پہلی بیوی نے اس رشتے کو عزت دی۔ البتہ سنتوش کمار کے انتقال نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگیں۔ بالآخر وہ بچوں کے پاس امریکا چلی گئیں۔ وقتاً فوقتاً واپس آنے کی کوشش کی، مگر اب یہاں حالات سازگار نہیں تھے۔ وہ یہ شکایت کرتی نظر آئیں کہ ہمارے ہاں سینئر آرٹسٹوں کو وہ عزت نہیں دی جاتی، جو ہندوستان میں دی جاتی ہے۔

## ☆ محمد حفیظ

سیدھے ہاتھ سے آف اسپن کرنے والا قابلِ بھروسا بولر، نئی گیند کا سامنا کرنے والا پُراعتماد بلے باز، الغرض ایک سمجھ دار کرکٹر... مگر کرکٹ عجیب کھیل ہے صاحب، اور اس سے بھی عجیب ہے قسمت۔ آج کا ہیرو، کل کا زیرو۔ آج جس کے گرد مداحوں کا گھیرا، کل وہ تنہا کھڑا نظر آتا ہے۔ آج جس کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے ہیں، کل اسے یکسر بھلا دیا جائے گا۔

پاکستانی کرکٹر محمد حفیظ کی کہانی میں قسمت کی کارفرمائی واضح نظر آتی ہے۔ انہیں پروفیسر کے عرفیت سے پکارا جاتا ہے۔ جب اچھا کھیلتے ہیں، تو اخبارات لکھتے ہیں: پروفیسر نے مخالف ٹیم کو کرکٹ کا سبق بھلا دیا۔ اگر برا پرفارم کریں، تو کہا جاتا ہے: پروفیسر صاحب خود کرکٹ کا سبق بھول گئے۔ آج کل وہ آؤٹ آف فارم ہیں۔ رنز بنانے میں مسلسل ناکامی کا سامنا ہے۔ مگر ان کے ایکشن پر بھی پابندی لگ گئی۔ مستقبل قریب میں ان کے ایکشن سے پابندی ہٹنے کا امکان نظر نہیں آتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ برے دور سے گزر رہے ہیں۔

ایک زمانے میں محمد حفیظ کو پاکستانی کرکٹ کا مستقبل کہا جاتا تھا۔ امید کی جا رہی تھی کہ مصباح الحق کے بعد کرکٹ کے تینوں فارمیٹس میں حفیظ ہی قیادت سنبھالیں گے۔ ٹی 20 میں تو قیادت انہیں مل بھی گئی تھی مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا، حفیظ کو کپتانی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے باوجود اپنی صلاحیتوں کے بل پر وہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کا مستقل حصہ بنے رہے۔ تمام فارمیٹس میں اپنے جوہر دکھا رہے۔ پرفارمینس میں بھی تسلسل تھی مگر پھر ایکشن پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی بیٹنگ بھی لڑکھڑانے لگی۔ اب حالات کا رخ بدل رہا تھا۔ دراصل حفیظ کے ٹیم کا مستقل رکن ہونے کی وجہ یہی تھی کہ وہ بولنگ اور بیٹنگ کے ساتھ فیلڈنگ بھی کمال کرتے تھے، مگر گزشتہ ایک برس سے ان میں وہ پھرتی نظر نہیں آ رہی۔ بولنگ پر پابندی کے بعد یہ باصلاحیت کھلاڑی محدود ہو گیا ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ انہیں کچھ عرصے ریسٹ کی ضرورت ہے۔

17 اکتوبر 1980 کو سرگودھا میں پیدا ہونے والے محمد حفیظ کا ریکارڈ متاثر کن ہے۔ انہوں نے 20 اگست 2003 کو بنگلہ دیش کے خلاف اپنے ٹیسٹ کیریر کا آغاز کیا۔ 50 مقابلوں میں انہوں نے 39.22 کی اوسط سے 3,452 رنز بنائے، جس میں نو سنچریاں شامل ہیں۔ اس فارمیٹ میں انہوں نے 52 وکٹیں بھی لیں۔ ون ڈے کا سفر انہوں نے 3 اپریل 2003 کو زمبابوے سے شروع کیا تھا۔ اس فارمیٹ میں ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ 170 مقابلوں میں انہوں نے صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ 38.22 کی انتہائی مناسب اوسط سے پانچ ہزار رنز داغے، جن میں گیارہ سنچریاں شامل تھیں۔ اس فارمیٹ میں انہوں نے 129 وکٹیں اپنے نام کیں۔ وہ ایک زبردست آل راؤنڈر تھے۔ کسی زمانے میں دنیا کے نمبر ایک آل راؤنڈر

کہلاتے تھے۔65 ٹی 20 مقابلوں میں بھی ان کی کارکردگی ٹھیک ٹھاک رہی۔انہوں نے بطور اوپنر ایک طویل عرصے پرفارم کیا۔اس پوزیشن میں ان کی کارکردگی خاصی اچھی رہی، مگر پاکستان گزشتہ ایک عشرے کے دوران اچھی اوپننگ جوڑی بنانے میں ناکام رہا، جس کا براہ راست اثر حفیظ کی پرفارم پر پڑا کرتا۔ہاں، انہوں نے ناصر جمشید کے ساتھ 2012 کے ایشیا کپ میں 224 رنز کی پانٹر شپ کا ریکارڈ بنایا تھا مگر ایسا کم ہی ہوا، جب انہیں کسی مستقل کھلاڑی کا ساتھ ملا۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ اپنی مہارت اور قابلیت کے وسیلے وہ جلد کم بیک کریں گے۔یہ پہلا موقع نہیں ہے، جب انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ماضی میں بھی کڑا وقت آیا۔انہیں ٹیم سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا، مگر وہ اپنی صلاحیتوں کی قوت سے لوٹ آئے۔2003 ورلڈ کپ میں ان کی کارکردگی اوسط درجے کی رہی تھی، جس کے بعد وہ ٹیم سے باہر ہوگئے مگر ڈومیسٹک کرکٹ میں اچھی کارکردگی کے بعد انہیں دوبارہ موقع دیا گیا۔ٹیم میں واپس آنے کے بعد انہوں نے آسٹریلیا کی مشکل پچ پر اپنی پہلی سنچری بنائی۔انگلینڈ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف دوسری سنچری داغی۔اچھی کارکردگی کے باوجود پھر کٹھن وقت آیا۔وہ ٹیم سے باہر ہوگئے۔خیال کیا جارہا تھا کہ اب ان کا کیریر تمام ہوا مگر پھر وہ پوری طاقت سے پلٹے۔اس بار ان کی کارکردگی میں تسلسل نظر آیا۔

سری لنکا کے خلاف ایک ہی سیریز میں تین لگاتار سنچریاں ان کا بڑا کارنامہ تھا۔انہوں نے 122، *140، اور *113 رنز کی یادگار اننگز کھیلیں۔مصباح الحق نے ان کے کیریر کو سنبھالنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔وہ مصباح کے قریبی لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔مگر شاید قیادت کا اعزاز ابھی اُن کی قسمت میں نہیں۔آج حفیظ ٹیم کے سینئر کھلاڑیوں میں شمار ہوتے ہیں۔اُمید کی جارہی ہے کہ وہ ایک طویل عرصے ٹیم کی نمائندگی کریں گے۔

## ☆ن م راشد

پلا ساقیا مئے جاں پلا کہ میں لاؤں پھر خبر جنوں
یہ خرد کی رات چھٹے کہیں نظر آئے پھر سحر جنوں

بیسویں صدی میں اردو شاعری اپنے اوج پر نظر آئی۔پہلے تحریکوں نے فکری شاعری کے لیے راہ ہموار کی، اشعار انقلاب کے نعرے بنے، پھر جدید رجحانات نے نئے لب و لہجے کے شعرا کو جنم دیا۔تجربات کا دور شروع ہوا۔نظم کی قوت ابھر کر سامنے آئی۔اسی زمانے میں ن م راشد کے نام کی بازگشت سنائی دی۔کسے خبر تھی کہ جلد یہ شاعر اردو میں افسانوی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

راشد کو عہد جدید میں نظم کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے۔موازنہ اُن کا فیض احمد فیض سے کیا جاتا ہے، جن کے اشعار زبان زد خاص و عام ہوئے۔کچھ حلقے تو انہیں فیض سے بھی بڑا شاعر کہتے ہیں۔موازنہ ایک الگ موضوع ہے، تاہم یہ طے کہ وہ ایک عہد ساز تخلیق کار تھے، جس نے پوری نسل کو متاثر کیا۔راشد یکم اگست 1910 کو ضلع گوجرانوالا کے قصبے وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔شمار ذہین فطین طلبا میں ہوتا تھا۔گورنمنٹ کالج، لاہور میں وہ زیر تعلیم رہے۔کسی زمانے میں وہ علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے متاثر تھے۔خاکساروں کی طرح وردی پہن کر مارچ کیا کرتے تھے۔

میدان شاعری میں ان کی آمد نے روایتی حلقوں میں کھلبلی مچادی۔ان کے مصرعوں میں بغاوت کا آہنگ تھا۔ایک نیا ذائقہ تھا۔جلد وہ اردو شاعری کو اُس کے روایتی ڈھب سے نکال کر بین الاقوامی دھارے میں شامل کرنے والے تھے۔1942 نہ صرف راشد بلکہ اردو شاعری کے لیے بھی اہم سال تھا۔تحریک پاکستان کا آغاز ہو چکا تھا، تقسیم کے امکانات ابھرنے لگے تھے اور ایسے میں ان کا پہلا مجموعہ "ماورا" شائع ہوا۔اسے کچھ ناقدین اردو آزاد نظم کا پہلا مجموعہ بھی کہتے ہیں۔ایک ہندوستانی نقاد کے مطابق "ماورا" ہی جدید شاعری کی پہلی کتاب تھی۔"ماورا" سے اردو شاعری میں انقلاب بپا ہوگیا۔راشد نے اسلوب، موضوعات اور پیش کش کی سطح پر جو تجربات کیے تھے، نئی نسل ان کی تقلید کرنے لگی۔

اردو نظم پہلے سیدھی لکیر پر چل رہی تھی۔موضوعات زیادہ تر خارجی مظاہر سے عبارت تھے۔واقعات، موسم یا حب الوطنی سے متعلق نظمیں کہی جاتی تھیں۔انہوں نے داخلیت کو موضوع بنایا۔انسانی نفسیات کی پرتیں اشعار میں کھلنے لگیں۔راشد کا نام گونجنے لگا تھا۔ان کی نظمیں ردیف و قافیہ کی

جکڑ بندیوں سے آزاد تھیں۔ تجریدی اور علامتی آہنگ تھا۔ یہ تخلیقات کی سطحوں پر قاری کو متوجہ کرتیں۔ ان کی گرفت وسیع مطالعے کی دین تھی۔ انہوں نے خلائی دور کے انسان کی زندگی اور عقائد کو بھی موضوع بنایا۔ ان کی مغربی ادب پر گہری نظر تھی۔

راشد کے تین مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے، ماورا، ایران میں اجنبی، اور لا انسان، جب کہ گمان کا ممکن ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔ ہر کتاب قابل مطالعہ۔ ان کی نظم "حسن کوزہ گر" کو ایک شاہکار کہا جاتا ہے، جو ایک تخلیق فن کار کا المیہ بیان کرتی ہے، جو کوزہ گری کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے اور اپنے محبوب سے ایک نگاہِ التفات کا متمنی ہے۔ اس نظم پر آج بھی بحث جاری ہے۔

راشد کے حامی انہیں فیض سے بڑا شاعر ٹھہراتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فیض کے موضوعات محدود تھے، سیاست ان کا محور، پھر انقلابی اپروچ، جس نے یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ یہ موقف بھی اختیار کیا جاتا کہ اُن کے ہاں راشد والی وسعت نہیں تھی۔ البتہ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ فیض نے جو عالمی شہرت حاصل کی، وہ کسی اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

راشد کی زندگی کا آخری زمانہ مغرب میں گزرا۔ ان کے انتقال سے بھی عجیب کہانی جڑی ہے۔ 9 اکتوبر 1975 کو لندن میں ان کا انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے، اُنھوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں دفنانے کے بجائے جلایا جائے۔ اس ضمن میں کچھ شکوک بھی ظاہر کیے جاتے ہیں۔ ان کی آخری رسومات کے وقت صرف دو افراد موجود تھے، راشد کی انگریز بیگم شیلا اور ساقی فاروقی۔ کچھ تحریروں میں عبداللہ حسین کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی بیگم کی ہدایت پر نعش نذر آتش کی گئی۔ اس سلسلے میں ان کے بیٹے شہریار سے بھی مشورہ نہیں لیا گیا، جو ٹریفک میں پھنسنے کی وجہ سے بروقت آتش کدے نہیں پہنچ سکا تھا۔

راشد سے جڑے متنازعہ معاملات اپنی جگہ، مگر ان سے اُن کے ادبی قد پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بے شک وہ نظم کے سر تاج تھے۔ جدید شاعری کے بنیاد سازوں میں سرفہرست۔

## ☆ جلال الدین اکبر

اس کی سلطنت بنگال سے افغانستان تک اور کشمیر سے دکن تک پھیل گئی۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ چندر گپت موریا اور راجہ کمار اشوک سے بھی بڑا بادشاہ۔ شہنشاہوں کا شہنشاہ۔ نہ تو اس خطے میں پہلے اس سا کوئی حکمران گزرا، نہ ہی مستقبل میں کسی کے آنے کی امید۔ مغل دور کا عروج وہی تھا، جب جلال الدین اکبر تخت سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا کہا پتھر پر لکیر تھا۔ اس کے جلوے نے دشمنوں کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔

اکبر مغلیہ سلطنت کا تیسرا فرماں روا تھا۔ وہ بابر اعظم کا پوتا اور ہمایوں کا بیٹا تھا۔ ہمایوں فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھنے والا باذوق بادشاہ تھا۔ البتہ وہ انتشار کا زمانہ تھا۔ بابر کی قائم کردہ حکومت لرز رہی تھی۔ ہمایوں کا تخت چھن گیا۔ اسے جلاوطنی کاٹنی پڑی۔ کبھی افغانستان کا رخ کیا، کبھی سندھ کا۔ وہ دادو کے قصبے پاٹ میں تھا، جہاں اُس کی حمیدہ بانو سے شادی ہوئی۔ اکبر اسی کے بطن سے 1542 میں عمر کوٹ کے مقام پر پیدا ہوا۔ ہوش ہی میدانِ جنگ میں سنبھالا۔ ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر کی عمر تقریباً چودہ برس تھی۔ وہ اس وقت اپنے اتالیق بیرم خان کے ساتھ سکندر سوری کے تعاقب میں مصروف تھا۔

باپ کی موت کی پُرسوز خبر اسے کلانور ضلع گرداسپور میں ملی۔ وہ شدید صدمے میں تھا۔ لگتا تھا، ہر سوں دھند چھا گئی ہے۔ مگر پھر... اسی دھند سے روشنی پھوٹی۔

بیرم خان نے کلانور میں اینٹوں کا ایک چبوترا بنوا کر اکبر کی رسم تخت نشینی ادا کی اور خود اس کا سرپرست بنا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی وہ راجا اور نواب جو بے دلی سے ہمایوں سے آن ملے تھے، مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے بغاوتوں کو کچلنا تھا۔ اس ضمن میں بیرم خان کا کردار کلیدی رہا۔ اس کی فوج نے دلیری سے مقابلہ کیا۔ عادل شاہ سوری کو شکست دی۔ 1556 تک نوجوان اکبر نے دہلی، آگرہ، پنجاب، گوالیار، اجمیر اور جون پور فتح کر لیے۔ سلطنت تیزی سے پھیلنے لگی۔ 1562 میں مالوہ پر بھی اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جلد گجرات بھی اس کے زیر تسلط آ گیا۔ دشمنوں کی دیواریں ڈھتی گئیں۔ اس کی فوج کا جلال مخالفین پر ہیبت طاری کر دیتا۔ آنے والے برسوں میں اس نے بنگال، کابل، کشمیر، سندھ اور اڑیسہ بھی فتح کر لیے۔ اس طرف دکن اس کی

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

عظیم الشان سلطنت میں شامل تھا۔ اور قندھار میں بھی اس کا پرچم لہرا رہا تھا۔

وہ نڈر ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھا۔ خود ناخواندہ تھا، مگر اُس کے دربار میں اس عہد کے بیدار دماغ موجود تھے۔ اس کے ذہین فطین وزیر نورتن کہلائے۔ یہ تھے، راجا مان سنگھ، راجا ٹوڈرمل، ابوالفضل، فیضی، بیربل، تان سین، ملا دوپیازہ، عبدالرحیم خان خاناں اور فقیر عزیہ الدین۔ ابوالفضل اور فیضی کو اپنی علمیت کے باعث خاص مقام حاصل تھا۔ ان ہی نابغہ روزگار شخصیات کے طفیل وہ پچاس برس تک ہندوستان کا حکمران رہا۔

کچھ فیصلے خاصے متنازعہ ٹھہرے۔ اپنے ہندو رتنوں کے مشورے سے اُس نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب شروع کیا۔ اسلام، ہندومت، مسیحیت، سکھ اور زرتشت مذہب کی تعلیمات کو یکجا کر کے ایک نیا دینی تصور قائم کیا، جس میں بھائی چارے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اس مذہب کے فروغ کے لیے اکبر نے فتح پور سکری میں ایک عمارت کی تعمیر کی، جس کا نام عبادت خانہ رکھا۔ اس عبادت خانے میں تمام مذاہب کے لوگ اکٹھے ہوتے اور بحث و مباحثہ کرتے۔ اس کا موقف تھا کہ حق کسی ایک مذہب کا ورثہ نہیں ہے۔ اُس مذہب میں تصوف، فلسفہ اور فطرت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ غرور ممنوع تھا، محبت اور شفقت ترجیح تھی۔ یہ ایک روحانی فلسفہ تھا۔

دین الٰہی کے باعث اکبر مسلمان امرا اور بزرگان دین کی نظروں میں تو ناپسندیدہ ٹھہرا، مگر اس کی حکومت مستحکم ہوتی گئی۔ دراصل اسے اندازہ تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اگر اسے خود کو مضبوط بنانا ہے، تو اس اکثریت کے دل جیتنے ہوں گے۔ اس نے ہندوؤں کو مراعات دیں، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان رشتوں کو فروغ دیا، راجپوت گھرانے کی جودھابائی کو اپنی ملکہ بنایا۔ یہ اس کی سیاسی زندگی کا اہم ترین فیصلہ تھا۔ جودھا ہی سے جہانگیر المعروف شہزادہ سلیم پیدا ہوا۔ کہتے ہیں، اس کی پیدائش کے لیے بادشاہ نے حضرت سلیم چشتی کے دربار میں حاضری دی تھی۔ تاریخ میں شہزادہ سلیم اور انارکلی کی کہانی بڑی مشہور ہے۔ انارکلی کو محبت کے جرم میں دیواروں میں چنوا دیا گیا تھا۔ البتہ مؤرخین کی اکثریت کے مطابق اس قصے میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی ہے اور حقائق چھپانے کے لیے اس رومانوی کہانی کو رواج دیا گیا۔

اکبر اپنے انصاف کے لیے بھی مشہور تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے فن مصوری کے ابتدائی درس لیے۔ مصوروں کو گئی

### جے ایف 17 تھنڈر

پاکستان اور چین کے باہمی اشتراک سے تیار کیا جانے والا جیٹ طیارہ۔ یہ طیارہ ایٹمی ہتھیاروں سمیت ہر قسم کے روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں کو گرانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کم وزن طیارہ ہے، جو ہر قسم کے موسموں میں پرواز کا اہل اور کثیر المقاصد خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ طیارہ 106 میل کی رفتار سے پرواز کر سکتا ہے اور کسی بھی رفتار اور بلندی پر اپنے ہدف کو سو فیصد نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طیارے میں جدید ترین فلائٹ کنٹرول سسٹم نصب ہے اور اس میں ایوانکس کا جدید ترین سسٹم نصب کرنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طیارے کو ہائی اور لوگریڈ (Low Grade) لیزر گائیڈڈ بم، پینی ٹریشن بم (penetration Bomb) اور کلسٹر بموں سے بھی مسلح کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس طیارے کو بھارت میں تیاری کے مراحل سے گزرنے والے ایل سی اے پر بھی برتری حاصل ہے۔

2003 میں جے ایف 17 تھنڈر جیٹ کی پہلی باقاعدہ آزمائشی پرواز کامیاب رہی۔ آزمائشی پرواز چین کے صوبے سی شوان میں کی گئی۔ پہلی پرواز 8 منٹ پر محیط تھی۔ پرواز کے دوران 6 ماڈل میزائل بھی جے ایف 18 تھنڈر کے پروں کے نیچے نصب تھے۔ فائٹر جہاز میں جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے اور یہ ایف 16 سے بہتر طیارہ ہے۔ اس کی محدود پیمانے پر تیاری جون 2004ء میں شروع کی گئی جب کہ پروڈکشن 2006ء میں شروع ہوئی۔ 2004ء میں پاکستان کے دو پائلٹوں نے چین کے شہر چنگ دو میں پہلی مرتبہ جے ایف 17 تھنڈر جیٹ طیارے کی آزمائشی پروازیں کیں، جس سے اس طیارے کی اعلیٰ کارکردگی کا ایک مرتبہ پھر یقین ہو گیا۔

مرسلہ: صدیق صدیقی، کراچی

سہولیات مہیا کیں۔ شاہی کتب خانے میں ایرانی اور ہندوستانی مسودوں کا ذخیرہ جمع کیا۔ شاہی خوش نویسوں کی حوصلہ افزائی کی۔ معمار، سنگ تراش ملک کے ہر حصے سے جوق در جوق دارالحکومت آئے۔

اکبر کا انتقال 27 اکتوبر 1605 کو ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بنائے ہوئے مذہب کا کیا ہوا؟ دراصل عوام میں تو یہ فلسفہ سرایت ہی نہیں کر سکا تھا۔ ہاں شہنشاہ کی زندگی میں کئی درباریوں نے اس کی پیروی کا اعلان کیا، مگر حقیقتاً اسے ماننے والے تھوڑے تھے۔ اس کی موت کے بعد تو ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی تھی۔ نورتنوں میں شامل راجا مان سنگھ اس کے پیروکاروں میں شامل نہیں ہوا۔ فقط بیربل آخر تک اس پر قائم رہا۔ جلد یہ مٹ گیا، کیوں کہ نہ تو اس کی کوئی مقدس کتاب تھی، نہ ہی کوئی مذہبی رہنما اور وارث۔

## ☆ حمود الرحمان

قانون کے شعبے میں قدم رکھنے والے ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جج بنے۔ اگر وہ اپنے صوبے کا چیف جسٹس بن جائے، تو کیا ہی بات ہے۔ اگر ذہین فطین ہے، قدرت بھی ساتھ ہے، تو ممکن ہے کہ وہ چیف جسٹس آف پاکستان بن جائے۔ منصف اعظم بننا بہت بڑا اعزاز ہے۔ البتہ پاکستان کی تاریخ میں ایک چیف جسٹس ایسے بھی گزرے، جن کی شہرت کی وجہ فقط ان کا عہدہ نہ تھا، اصل وجہ تو وہ رپورٹ بنی، جس کے تذکرہ کے بغیر پاکستان کی سیاسی تاریخ ادھوری ہے۔ ہم بات کر رہے ہیں یکم نومبر 1910 کو پٹنہ میں پیدا ہونے والے جناب حمود الرحمان کی۔ ان کا شمار اپنے عہدے کے ممتاز ماہرین قانون میں ہوتا تھا۔

1937 میں انہوں نے لندن سے قانون کی ڈگری لی۔ 1938 میں کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ فقط دو برس بعد وہ کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر مقرر ہوئے۔ 1943 میں انہیں ڈپٹی میئر منتخب کیا گیا، تو یہ طے ہوگیا کہ اس شخص کا مستقبل درخشاں ہے۔ 1943 تا 1947 وہ حکومت بنگال کے جونیئر وکیل رہے۔ 1948 میں اثاثوں کی تقسیم کے سلسلے میں قائم کردہ ثالثی ٹرائی بیونل کے سامنے انہوں نے مشرقی پاکستان کا کیس موثر انداز میں پیش کیا۔ 1950 تا 1953 وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان ڈھاکا کے قانونی مشیر رہے۔ 1953 میں وہ مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ اب یہ واضح نظر آ رہا تھا کہ وہ تیزی سے ترقی کے مراحل طے کریں گے۔ 1954 میں وہ ڈھاکا ہائی کورٹ کے جج ہوگئے اور 1960 تک اس حیثیت میں خدمات انجام دیں۔ اس عرصے میں وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

1960 میں وہ سپریم کورٹ کے جج ہوگئے۔ نومبر 1968 میں چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ وہ پاکستان کے ساتویں چیف جسٹس تھے۔ عہدہ سنبھالنے کے تین برس بعد وہ سانحہ ہوا، جس سے جڑی تحقیقی رپورٹ کے باعث حمود الرحمان کا نام پاکستانی سیاسی تاریخ کا اٹوٹ حصہ بن گیا۔ 1971 میں پاکستان اپنے ایک بازو سے محروم ہوگیا۔ مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش تھا۔

یحییٰ خان کی معزولی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے۔ انہوں نے یحییٰ سمیت کئی جنرلوں کو برطرف کردیا۔ شیخ مجیب کو خصوصی فوجی عدالت کی جانب سے دی گئی سزائے موت منسوخ کردی اور قوم سے خطاب میں وعدہ کیا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ہتھیار ڈالنے کے ذمے داروں کے تعین کے لیے ایک آزاد کمیشن تشکیل دیا جائے گا۔

1972 میں اس شکست کے اسباب کی چھان بین کے لیے جو کمیشن بنا، جسٹس حمود الرحمان اس کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اس کمیشن نے تین سو سے زائد گواہوں کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد پہلی رپورٹ 1972 اور دوسری رپورٹ 1974 میں پیش کی۔ رپورٹ اتنی حساس تھی کہ یہ تیس سال تک مکمل طور پر خفیہ رہی۔ کتنی ہی حکومتیں آئیں گئیں، مگر کوئی اسے منظر عام پر نہیں لایا۔ گو اس دوران مختلف حلقوں کی جانب سے اس کی اشاعت کا مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہا۔ ہاں، اس رپورٹ کے کچھ مبینہ حصے بعض بھارتی اخبارات میں شائع ہوئے۔ پرویز مشرف کے دور میں اس وقت کے وزیر داخلہ معین الدین حیدر کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے رپورٹ کا از سر نو جائزہ لے کر اس کے ایک حصے کی اشاعت کی سفارش کی۔ یوں 2003 میں ایک حصہ منظر عام پر آیا اور اُسے کیبنٹ ڈویژن کی لائبریری میں رکھ دیا گیا۔ اس

کے اقتباسات قومی اخبارات میں شائع ہونے لگے ہیں، رپورٹ کے آٹھ حصوں میں سے صرف دو حصے "اوپن" کیے گئے تھے، باقی حصوں کو حساس قرار دے کر حسبِ سابق ناقابلِ اشاعت کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ البتہ جو حصے شائع ہوئے، وہ بھی انکشافات سے بھرے ہوئے تھے۔

کمیشن نے جنرل یحییٰ اور اُن کے رفقا پر ایوب خان کو اقتدار سے ہٹانے کی سازش پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کی سفارش کی تھی۔ جنرل یحییٰ خان سمیت 115 اعلیٰ فوجی افسران کی کرپشن کو سقوطِ ڈھاکا کا سبب ٹھہراتے ہوئے ان کے کورٹ مارشل کی سفارش کی گئی تھی۔ رپورٹ میں بھٹو پر بھی تنقید کی گئی تھی۔ ساتھ ہی مجیب، چھ نکات، ان کی تیاری اور بیرونی سازشوں کا تذکرہ تھا۔ جنرل نیازی اور دیگر افسران کی بدعنوانی اور بدکرداریوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ جی ایچ کیو نے جنرل نیازی کو بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ فیصلہ جنرل نیازی کا ذاتی تھا۔

31 اکتوبر 1975 کو کراچی میں جسٹس حمود الرحمان کا انتقال ہوا۔ (کچھ ویب سائٹس پر ان کا سنِ وفات 20 دسمبر 1981 درج ہے)

## ☆ بوہیمیا

پاکستان میں صلاحیت کی کمی نہیں، بس ان بیجوں کو تن آور درخت بننے کے لیے سازگار ماحول میسر نہیں۔ محمود بھٹی کو بھی "فیشن آئی کون" بننے کے لیے پیرس کی فضا درکار تھی، عمران طاہر کو اپنے جوہر ساؤتھ افریقا جا کر دکھانے تھے، اسی طرح بوہیمیا کا ستارہ امریکا میں چمکنا تھا۔ اس منفرد کلاکار کے گانوں میں کہیں جمود کے خلاف احتجاج ہے، کہیں وطن سے دوری کا غم ہے، کہیں کراچی کی یادیں ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں سے منفرد ہے اور ان سے ممتاز ہے۔

مشرقی موسیقی کے مانند مغربی موسیقی بھی مختلف اصناف میں بٹی ہے۔ ان ہی میں سے ایک صنف ریپ میوزک ہے۔ بوہیمیا اسی میدان کا راجا ہے۔ ویسے وہ راجا کے نام سے بھی معروف ہے۔ اصل نام تو راجر ڈیوڈ ہے۔ اس طرزِ موسیقی میں ردھم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تیز موسیقی کے ساتھ ایک کہانی بیان کی جاتی ہے۔ ریپ میوزک کی تاریخ سو برس پر محیط ہے۔ کچھ ناقدین اس کی جڑیں افریقی موسیقی کو قرار دیتے ہیں۔

وہ 15 اکتوبر 1979 کو کراچی کے ایک نیم متوسط مسیحی گھرانے میں پیدا ہوا۔ آج یہ 36 سالہ نوجوان موسیقی کی دنیا کا جانا مانا نام ہے۔ اس کا شمار ایشیا کے ان 100 گلوکاروں میں ہوتا ہے، جن کے گیت سب سے زیادہ "ڈان لوڈ" کیے جاتے ہیں۔ کئی امریکی اور بھارتی گلوکار اس کے ساتھ پرفارم کر چکے ہیں۔ کئی اعزازات اس کے حصے میں آئے۔ اس کے اسٹائل کو معروف ہندوستانی فن کار ہنی سنگھ، بادشاہ اور رفتار نے اپنایا۔

ابتدا میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہندوستانی نژاد فنکار ہے، مگر جلد یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔ وہ پاکستان بھی آیا۔ کوک اسٹوڈیو میں پرفارم کیا۔ وہ اپنی جڑوں کو نہیں بھولا تھا۔ بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا کہ شعرا میں غالب، اقبال اور فیض سے متاثر ہے اور اسے خوشی ہے کہ اس کا تعلق ایک ایسے خطہ سے ہے، جہاں ایسے عظیم تخلیق کار پیدا ہوئے۔

موسیقی کا شوق روجر ڈیوڈ کو وراثت میں ملا۔ کم سنی میں اپنے والدین کے ساتھ امریکی ریاست کیلی فورنیا جا بسا تھا۔ وہ زمانہ خاصا مشکل تھا۔ خاندان نے بہت جدوجہد کی۔ ابتدا میں وہ چھوٹے موٹے بینڈز میں پرفارم کیا کرتا رہا۔ اس کی ماں کو کینسر جیسے موذی مرض سے جو لڑنا پڑا۔ مشکل کے ان دنوں میں موسیقی ہی نے اس نوجوان کو حوصلہ دیا۔ دھیرے دھیرے اسے شناخت ملنے لگی۔ پھر وہ وقت بھی آیا، جب روجر ایک ستارہ بن کر چمکا۔ میوزک چارٹ پر اس کے گانے ٹاپ پر ہوتے۔ اس کا پاکستانی پس منظر، جدوجہد اور ریپ میوزک کے امتزاج سے ایک نیا ذائقہ سامعین تک پہنچا جو اُن کے دلوں میں گھر کر گیا۔ اب وہ ایک اسٹائل آئی کون تھا۔ مغربی میوزک میں مقابلے کی سخت فضا ہے، جہاں خود کو منوانا اس کلاکار کی بڑی کامیابی تھی۔

اب تک اس کے پانچ میوزک البم ریلیز ہو چکے ہیں۔ پہلا البم "وچ پردیساں دے" تھا، جو بہت مقبول ہوا۔ بعد میں پیسا نشہ پیار، ہزار گلاں، دی رپ اسٹار اور روح ریلیز ہوئے، جنھوں نے کئی ریکارڈ بنائے۔

# سراب

راوی : شہباز ملک

قسط: 114

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ منا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ
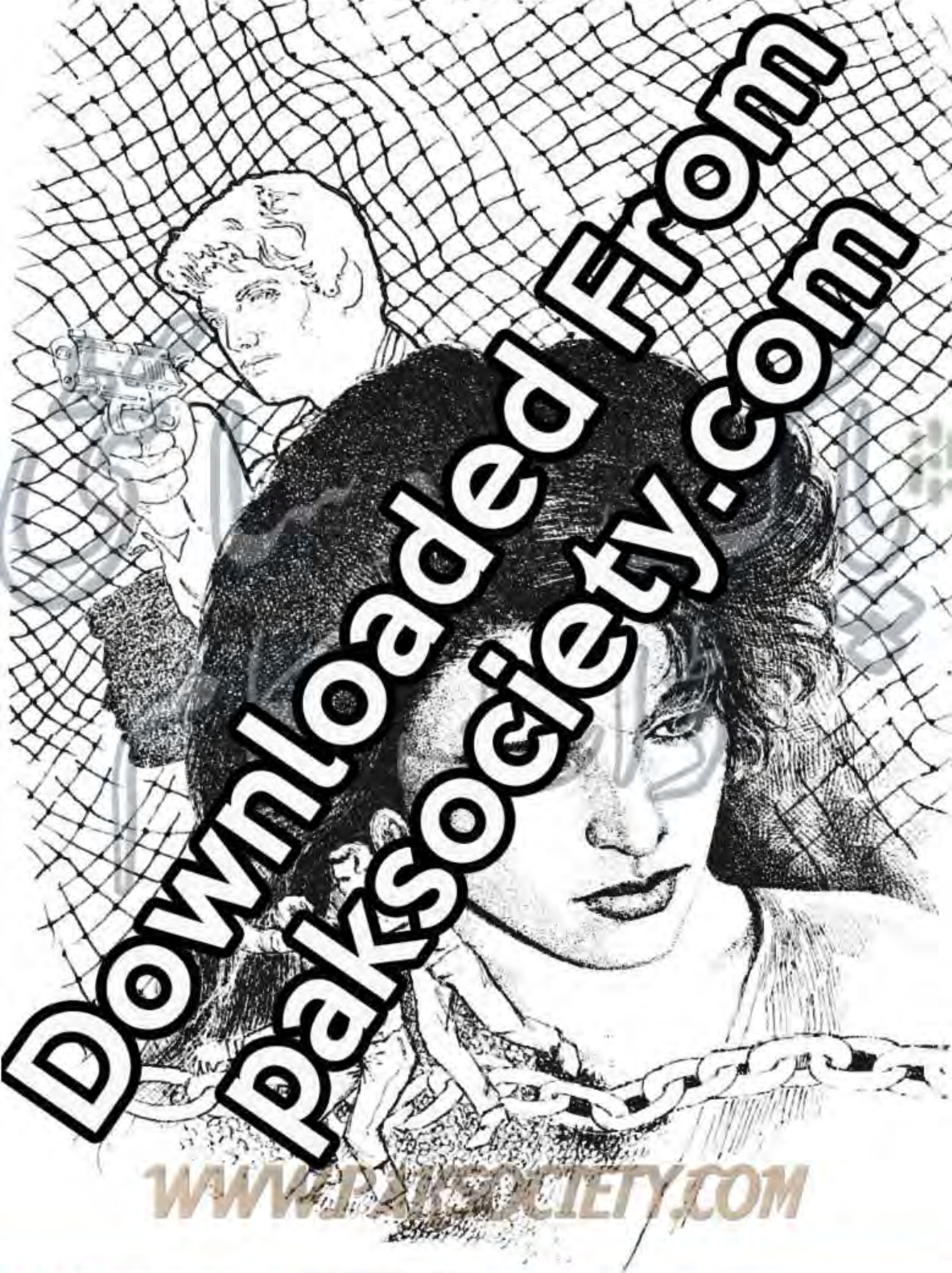
میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بن گئی تو میں انتقاماً حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو تکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو تکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو تکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائیرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی" شاہجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کینسل اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا" کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر......" مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتا کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا جیتا مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آ گئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا" پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم سب چلے جا رہے تھے کہ ہاسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ ڈیمی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے ہاسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔

میں نے فوج کو از سرِ نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ رینا ٹ کے قلعے آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی۔ سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا "اعلان جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنے کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحے کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا کو بھی یقین تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِراہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ریک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ... ساشا ملی جو کیرٹ کی بیٹی تھی۔ کیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور رینا ٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ رینا ٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈنک بچھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑک کے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایزارٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شاہین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شاہین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شاہین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور رینا ٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زینی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر امداد غیبی بن کر آ گیا۔ اس کے ساتھی نے زینی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدان جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر رینا ٹ کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گیا..
ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو بلتستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔ حدِ نظر تک برف ہی برف تھی۔ سفیر، عبداللہ اور وسیم کو غار میں چھوڑ کر میں راستہ تلاش کرنے باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے قید کر لیا۔ قید کرنے والے ریاست خان کو کسی سے ملنا تھا۔ ہم نے پہچان لیا کہ وہ انڈین بندہ ہے۔ ریاست خان کو حقیقت کا پتا چلا کہ وہ نادانستگی میں انڈین کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ محبِ وطن تھا اس نے میرا ساتھ دیا اور اس بندے کی خوب دھنائی کی اور اسے انڈیا میں دھکیل دیا۔ پھر ہم سب پیدل کسی آبادی کی تلاش میں نکلے۔ ایک چھوٹی سی آبادی نظر آ گئی۔ وہ لوگ مہمان نواز تھے۔ انہوں نے ایک گاڑی جو نگر جا رہی تھی اس میں میرے ساتھیوں کو بھیج دیا کہ وہ جا کر نگر سے گاڑی لے آئیں۔ میں اسی آبادی میں تھا کہ امداد شاہ نامی بندے سے ملاقات ہو گئی جو گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔ ہم ریاست خان اور اس کے دستوں کے ساتھ چل پڑے۔ امداد شاہ نے دھوکے سے مجھے اور ریاست خان کو قید کر لیا اور تشدد کرنے لگا۔ مگر میں نے پہلے خود آزاد کیا اور پھر ان سب پر قابو پا لیا۔ امداد شاہ کو لے کر ہم آگے بڑھے۔ ریاست خان کو اسپتال میں داخل کرایا اور نئے سفر پر نکل پڑے۔

(اب آگے پڑھیں)

میں کچھ دیر اکیلے میں حالات کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا اس لیے باہر نکل کر گاڑی میں آبیٹھا تھا۔ لائٹ بند کر دی تھی۔ اسی وقت سڑک کی داہنی جانب سے دو بندے آتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے ان پر توجہ نہیں دی۔ یہ عام شارع تھی اس لیے کوئی بھی کبھی بھی گزر سکتا تھا۔ لیکن جب وہ سڑک سے اتر کر گھر کی طرف آنے لگے تو میں ہوشیار ہو گیا۔ ان کا حلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ میرے اندر تجسس نے جنم لے لیا اور میں نے ان پر نظریں لگا دیں۔

وہ مشکوک انداز میں آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ جب گھر کے نزدیک پہنچے تو رک گئے اور گہری نظروں سے جائزہ لینے لگے۔ میری آنکھیں ان پر مرکوز تھیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرنا کیا چاہ رہے ہیں۔ تبھی گھر کے اندر سے ناصر شاہ نکلا۔ اس سے پہلے اس کا سایہ نظر آیا تھا اس لیے وہ دونوں نزدیک کی ایک ٹوٹی دیوار کے پیچھے چھپ گئے۔ ناصر شاہ باہر آ کر کھڑا ہوا تھا کہ نرجس بھی باہر آ گیا۔ اس نے باہر آنے پر ناصر شاہ کو سرزنش کی تھی کہ ناصر اندر جانے کے لیے مڑ گیا۔ وہ دونوں انہیں اندر جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر دیوار کے پیچھے سے نکلے اور سڑک کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ان کا انداز مشکوک تھا۔ میں نے سوچا کہ باہر نکل کر انہیں روکوں۔ اسی خیال سے نیچے اترا تھا اور سڑک کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

میں تیز قدموں سے سڑک پر پہنچا تھا لیکن وہ دونوں نظر نہیں آئے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ دور ہوتی ٹیل لائٹ نظر آئی۔ وہ ریڈ لائٹ کسی بائیک کی تھی۔ انہوں نے جھاڑیوں میں بائیک چھپا رکھی تھی اسی پر سوار ہو کر فرار ہو گئے تھے۔ ان کا ارادہ کیا تھا۔ کس مقصد سے آئے تھے، یہ میں کچھ نہیں پایا۔ کچھ دیر تک میں وہیں کھڑا ان کے بارے میں سوچتا رہا پھر واپس پلٹ آیا۔

واپسی کے وقت بھی وہی دونوں میرے دماغ پر سوار تھے کہ وہ کیوں آئے تھے۔ جس طرح وہ دونوں مکان کا جائزہ لے رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ ریکی کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ناصر اور امداد شاہ تھے۔ کہیں وہ دونوں ان کے ساتھی تو نہیں؟ ابھی مکان کا جائزہ لے کر گئے ہیں اور بعد میں وہ ساتھیوں کے ساتھ حملہ کریں گے۔ اس خطرے کا تدارک ضروری تھا۔ میں نے اس سلسلے میں سب کو ہوشیار کرنے کا سوچا اور برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ خیال آیا کہ امداد شاہ اور ناصر بھی ساتھ ہیں۔ ابھی تک وہ دونوں مشکوک ہیں۔ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جب میں باہر بیٹھا تھا اور وہ دونوں اجنبی ریکی کر رہے تھے تو ناصر شاہ باہر آ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انہی اجنبیوں کی وجہ سے وہ باہر آیا ہو لیکن نرجس کی مداخلت پر وہ واپس چلا گیا تھا۔ اگر وہ دونوں اسی کی تلاش میں ہیں تو یہ خطرناک بات تھی۔

نرجس نے ایک بات اور بتائی تھی کہ ان دنوں علاقے میں جرائم عام ہو رہے ہیں۔ جب پیٹ کی آگ تیز ہوتی ہے اور ذرائع کم ہو جاتے ہیں تو جرائم کا پنپنا حیرت کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں جرائم پیشہ ہوں اور اپنی جیب بھرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہے ہوں۔ دونوں ہی وجہ ہوش میں رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں کی بابت سب کو نہیں بتاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے خوشگوار انداز میں اندر قدم رکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وسیم نے چہکار بھری "جب اکیلا پن بھانے لگے۔ چاند اور چاندنی رات اچھی لگنے لگے تو ایک ہی بات دل میں سرگوشی کرتی ہے۔" اس نے کچھ توقف کیا پھر شعر پڑھا "لو چاند چھپا بدلی چھائی.. شاید کہ تمہاری یاد آئی۔"

"یاد تو آ رہی ہے لیکن تمہارا اندازہ غلط ہے۔ مجھے مرشد بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"اسے تو میں بھی شدت سے یاد کر رہا ہوں۔ پتا کر لیں اسے رہ رہ کر ہچکی اٹھ رہی ہو گی۔ ایک وہی تو ظالم سماج بنا ہوا ہے ورنہ سادی کب سے دبئی جانے کا خواب دیکھ رہی ہے اور میں اس کے خواب میں رنگ بھرنے سے قاصر ہوں۔"

"تم آج ہی دبئی چلے جاؤ' میری طرف سے پوری آزادی ہے۔" سفیر نے ہانک لگائی۔

"ہاں ہاں میں بھی اجازت دے رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"چلا تو جاؤں لیکن کیا کروں کہ وہاں اکیلے میں دل نہیں لگے گا، سفیر تمہارے بغیر جا نہیں سکتا اور میں سفیر اور تمہارے بغیر جا نہیں سکتا اور تم مرشد کا خاتمہ کیے بغیر جا نہیں سکتے۔ یعنی کہ ہم سب ایک الجھی ڈور کا گولا بن چکے ہیں جو سلجھ کر نہیں دیتی اور ہمیں اپنی اپنی بیویوں کی گالیاں کھاتے رہنا پڑے گا۔" وسیم نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

"اللہ تعالیٰ شکر خورے کو دیتا ہے شکر اور موذی کو دیتا ہے ٹکر۔ اس لیے گالیاں شیریں دہن تمہاری قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ موتا گالیاں دینے کے فن سے نابلد ہے۔" سفیر نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔

”یا اللہ اس صدی کے سب سے بڑے جھوٹ کی پردہ پوشی کرنا۔“ وسیم نے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کی ”ہم تو ازلی بہرے ہیں، ہمیں موٹا کی گالیاں سنائی نہیں دیتیں۔“

”جسے تم گالیاں کہہ رہے ہو وہ اظہار محبت کا اپنا انداز ہے۔“ سفیر بولا۔

”یقیناً جب اظہار محبت میں موٹا کو شدت پیدا کرنا ہوتی ہو گی تو وہ بیلن کو تمہاری پیٹھ پر بجا بجا کر یقین دلاتی ہو گی۔“

”میری طرف سے اجازت ہے کہ جو جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔“ میں نے خوشگوار انداز میں پرانا جواب دہرایا۔

”اور ہم سے کوئی بھی اپنی سانس یہاں رکھ کر جا نہیں سکتا اور ہماری سانسوں کا نام شہباز ہے یعنی کہ کوئی بھی آپ کے بغیر جائے گا نہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ ایک بہت عمدہ کام کر سکتے ہیں۔“

”کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بس اتنا سا کام کریں کہ یہاں وقت برباد نہ کر کے سیدھے پنڈی چلیں۔ وہاں پہنچ کر دیکھتے ہیں کہ مرشد کو کیسے دام میں لایا جا سکتا ہے۔“

”لیکن ہم تو جا ہی رہے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ نے کہا تو یہی ہے لیکن ہر روز ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور ہے۔ بس آپ ہر کام میں مداخلت کرنے کی روش تیاگ دیں تو شاید ہم وقت پر پہنچ جائیں۔“ وسیم نے دل میں جمع تمام باتیں ایک ہی سانس میں کہہ دیں۔

”اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔“ کہہ کر میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پوری طرح ہمہ تن گوش تھا۔ میں نے اسے قریب آنے کا کہا۔ جب وہ قریب آ گیا تو میں نے سرگوشی میں کہا ”ناصر فرنچ سمجھ سکتا ہے۔ اس نے اقرار کیا ہے اس لیے کچھ دیر ہم باہر وقت گزاریں گے۔“

اچھے دوست اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں اور مجھے سفیر و وسیم کی شکل میں بہت ہی اچھے دوست ملے ہیں۔ میری ابرو کی شکن کا مطلب بھی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے صرف سرگوشی کی تھی اور وسیم بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے اسی وقت اونچی آواز میں کہا ”اتنی لمبی چوڑی پلاننگ کی ضرورت کیا ہے۔ سیدھے سیدھے یہاں سے نکلنا ہے اور پنڈی پہنچنا ہے۔ بس۔“ اس نے کچھ توقف کیا اور پھر کہا ”اگر بند کمرے میں یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تو چلیں۔ باہر چاندنی میں بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ سفیر نے کہا اور آگے کی طرف بڑھا۔ اسے بڑھتے دیکھ میں نے بھی چٹائی چھوڑ دی اور باہر کی جانب چل پڑا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے سرگوشی میں کہا ”ابھی کچھ دیر پہلے دو بندے ریکی کرنے آئے ہوئے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آج کی رات اہم ہے۔ ہمیں سوتے ہوئے بھی جاگنا پڑے گا۔“ سفیر نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ اس کی پیشانی پر فکر کی لکیر ابھر آئی تھی۔

”بالکل۔“ میں نے کہا۔

”آپ آرام سے سو جائیں۔ میں ساری رات آنکھیں بند کیے جاگتا رہوں گا۔“

”صرف تم نہیں میں بھی جاگوں گا۔“ میں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ مجھے جو کہنا تھا میں نے اس کا ردعمل سفیر اور وسیم کے چہروں پر دیکھ لیا تھا۔ وہ آج کی رات جاگنے پر آمادہ تھے۔ مجھے واپس مڑتے دیکھ کر وہ دونوں بھی مڑ گئے تھے۔

دروازہ پار کر کے اندر داخل ہوتے ہی وسیم نے کہا۔ ”دوستوں صبح سویرے ہم یہاں سے نکل پڑیں گے اس لیے سب فجر کی اذان کے ساتھ اٹھ جائیں گے۔“

”ہم تیار ہیں۔“ مرتجس بولا۔ لیکن ناصر کا چہرہ جذبات سے عاری نظر آیا۔

ناصر اور امداد شاہ کے دل میں کیا ہے یہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی شکوک کے دائرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر ہمہ وقت مرکوز رہی تھیں۔

”تو پھر آؤ۔ اب آرام کرنے لیٹ جاتے ہیں۔ فجر کے وقت نکلنا ہے اس لیے ایک نیند لے لینا ضروری ہے۔“ سفیر نے کہا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔

”آپ اور شہباز صاحب اندر سو جائیں اندر بیڈ بھی ہے۔ ہم یہاں چٹائی پر سو جائیں گے۔“ ناصر نے کہا۔

”اصل میں مجھے بیڈ پر سونا اچھا نہیں لگتا۔ بیڈ پر روئی کا گدا ہے جو مجھے پسند نہیں۔ فوم کا گدا ہوتا تو اور بات تھی۔“ میں نے کمبل کو اپنے گرد مزید لپیٹ کر جواب دیا۔

”اس علاقے میں فوم کے گدے پسند نہیں کیے جاتے۔ فوم ٹھنڈی ہوا میں مزید ٹھنڈا اور گرمی میں مزید گرم

ہو جاتا ہے لیکن روئی کے گدے صرف گرمی دیتے ہیں۔" مرجس بولا۔

"مجھے معلوم ہے اسی لیے تو میں ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔" میں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ پھر ناصر پر نظر ڈالی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ میں نے سفیر کے برابر میں بیٹھے وسیم سے کہا "تمہیں یاد ہے نا وہ جو چورن کی پڑیا تم اور مرجس لے کر آئے تھے وہ پراڈو میں کہاں پر رکھی ہے؟"

اتنا اشارہ کافی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں ان ہتھیاروں کی بات کر رہا ہوں جو وہ خرید کر لایا تھا اور اسے پراڈو کے مختلف حصوں میں چھپا دیا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے بیزار لہجے میں کہا۔ "آپ بھی نا...... ابھی لے کر آتا ہوں۔"

عبداللہ بھی میرا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سفیر سے کہا "یار تو بھی اس کے ساتھ چلا جا ورنہ یہ ایک پڑیا کے لیے پورے ڈش بورڈ کا خانہ خراب کر دے گا۔"

"یہ بات تو ہے۔" کہتے ہوئے سفیر اٹھ کر وسیم کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ جب وہ دونوں لوٹیں گے تو ان کے کپڑوں میں اسلحے چھپے ہوں گے۔ اسی لیے تو سفیر کمبل کا بکل مار کر گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس آئے تو وسیم کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک پڑیا تھی۔ اس نے اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "خدا کے لیے یہ پڑیا ایک دو گھنٹے بعد ہی کھائیں۔ تب تک ہم سو چکے ہوں گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پڑیا لے لی اور اسے جیب میں رکھ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ خالی پڑیا ہوگی۔ پڑیا دینے کے بعد وسیم میرے کمبل میں گھس گیا کہ سردی لگ رہی ہے۔ کمبل میں آنے کے بعد اس نے ایک پستول اندر ہی اندر میری طرف بڑھا دیا جسے لے کر میں نے کمر میں اڑس لیا۔ کچھ دیر بعد وسیم کمبل سے نکل کر چلا گیا۔

مرجس اندر سے دوری لے آیا تھا، اسے چٹائی پر بچھا کر اوپر سے چادر ڈال دی۔ امداد شاہ تکیہ اٹھا لایا۔ لیکن جب وہ لیٹنے لگا تو وسیم نے کہا "تم اندر جا کر سو جاؤ۔"

"ویری بیڈ...... وہ اگر یہاں سونا چاہتا ہے تو سونے دو۔ تم اور ناصر اندر بیڈ پر سو جاؤ۔"

میری بات اس نے فوراً سمجھ لی کہ میں ان دونوں کو رات بھر خود سے دور رکھنے پر تیار نہیں۔ دونوں کے ساتھ اپنے بندے رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ان پر نظر رہے۔

ناصر شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وسیم بھی اٹھ کر بیڈ پر سونے چلا گیا۔ دروازے کے پاس سفیر لیٹا۔ پھر میں اور میرے برابر میں مرجس۔ آخر میں امداد شاہ۔

دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ باہر کی ٹھنڈی ہوا اندر نہ آئے۔ ارشد حسن پینٹر کے بکس سے کئی کمبل نکل آئے تھے۔ سب کو ایک ایک کمبل مل گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کمبل کی گرمی نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے مرجس کے خراٹے گونجے پھر ناصر شاہ کے۔ میں بس آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اندر وسیم اور دروازے پر سفیر بھی سونے کی اداکاری کر رہا ہوگا۔ وہ لوگ بھی ہوشیار ہوں گے۔ ہم وقت گزار رہے تھے۔

ہر شک کو تقویت نہیں ملتی کچھ شک، بے فائدہ بھی ہوتے ہیں۔ رات کا ایک پہر بیت چکا تھا اور ہر طرف امن چین تھا۔ مجھے یقین آنے لگا کہ میرا خدشہ غلط ہے۔ اس لیے آنکھوں میں آتی ہوئی نیند کو آنے دوں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے تھکن تو تھی۔ ذہن کو سونے پر آمادہ کیا ہی تھا کہ آنکھوں میں نیند اتر آئی اور میں بے خبر ہوگیا۔

یہ میری سرشت میں شامل ہے کہ میں کتنی ہی گہری نیند میں کیوں نہ رہوں اگر ہلکا سا کھٹکا بھی محسوس ہو تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا اور میری آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بغیر سر اٹھائے میں نے آنکھیں کھول دیں اور محسوس کرنے کی کوشش کی کہ یہ کیسی آہٹ تھی۔ پوری قوت سماعت سے سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے آواز کے مخرج کا ادراک ہوگیا اور میں نے ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ صاف پتا چل گیا تھا کہ کسی نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا ہے۔ میں نے آنکھوں کو بند کر کے ہلکی سی جھری پیدا کر لی اور دروازے پر نظریں لگا دیں۔ دروازے پر آٹو میٹک لاک لگا تھا۔ اسے چابی کے بغیر کھولنا ممکن نہیں تھا اور میری سماعت اس ہلکی ہلکی آواز کو سن رہی تھی جو چابی آزمانے کی تھی۔ کوئی باہر سے کسی اوزار سے یا تار یا چابی سے تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نظریں دروازے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ تبھی دروازے کا لاک کھلنے کی کلک سنائی دی اور میں پوری طرح ہوشیار ہوگیا۔

دروازہ ہلکے ہلکے کھل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے والا احتیاط کے ساتھ دروازہ کھول رہا

ہے۔تھوڑا سا ایک پٹ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ نیلی روشنی میں بھی وہ مجھے اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس دور میں بھی کوئی چاقو استعمال کرتا ہے۔وہ دبے قدموں آگے بڑھا۔اس کے داخل ہونے کے کچھ دیر بعد ایک اور شخص اندر آیا۔اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تھیلا پکڑ رکھا تھا۔وہ دونوں کچھ دیر تک کھڑے کمرے کا جائزہ لیتے رہے پھر وہ دونوں اندر کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کی طرف جس میں ناصر سو رہا تھا۔میں نے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وسیم کا دیا ہوا وہ پستول جو کمر میں اڑس رکھا تھا اس کے دستے پر ہاتھ جما دیا تا کہ فوراً پستول باہر لا سکوں۔

ان دونوں نے اندر والے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اندر جھانکا تبھی ہمارے کمرے کی لائٹ جل اٹھی۔ساتھ ہی سفیر کی آواز گونجی ''اپنے چاقو کو نیچے پھینک دو۔''

اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی۔سفیر ہوشیار نہ ہوتا تو چاقو اسے زخمی کر چکا ہوتا۔اس نے عقل مندی یہ کی تھی کہ کمبل کو آگے کی جانب پھیلا کر پکڑ لیا تھا اور ایسا اس نے اتفاقاً کیا تھا۔وہ کمبل کو اتارنے کے لیے پھیلا رہا تھا کہ چاقو اڑتا ہوا کمبل سے ٹکرایا تھا اور اسے پھاڑتا ہوا نیچے گر گیا تھا۔کیونکہ اس کی قوت کمبل نے روک دی تھی۔میں نے اچھل کر کھڑے ہوتے ہی اس پر چھلانگ لگائی تھی۔اس نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے انداز نے بتا دیا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں ہے۔ہاں جسم میں جان ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ میری جکڑ سے نکلنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ہاتھ پاؤں چلانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ لڑائی کے فن میں کورا ہے۔وسیم بھی پستول تانے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔پستول دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئے تھے۔ان کی مزاحمت کی قوت تقریباً ختم ہو گئی تھی۔سفیر نے کمبل کے پیچھے سے کلاشن نکال لی تھی۔اتنے ہتھیاروں کے سامنے وہ دونوں بے بس ہو چکے تھے۔میں نے جس پر چھلانگ لگائی تھی وہ اب میرے نیچے دبا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سفیر نے دوسرے کو چھاپ لیا تھا۔وہ دونوں اب اس طرح کانپ رہے تھے جیسے انہیں سردی کا بخار سر سری چڑھ گیا ہو۔ان کی حالت دیکھ کر نہیں لگ رہا تھا کہ وہ دونوں ٹرینڈ بندے ہیں۔وہ تو باضابطہ رونے دھونے لگے تھے۔مرجس ہی نہیں ناصر اور امداد شاہ بھی اٹھ گئے تھے۔مرجس نے ہی پلاسٹک کی ڈوری کا ایک بنڈل کہیں سے ڈھونڈ نکالا اور اسی رسی سے ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ایک کونے میں بٹھا دیا۔

ان دونوں کو قابو میں کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔''اب بتاؤ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''جی ہم خود آئے ہیں۔ہمیں پولیس کے حوالے نہ کریں۔اب ہم کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔''ان میں سے ایک نے کہا۔

''دیکھو اگر تم لوگ صحیح نہیں بتاؤ گے تو خود تمہارے لیے مشکلات کھڑی ہوتی جائیں گی۔''میں نے نرم لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''ابھی تو ٹریلر بھی شروع نہیں ہوا اور تم لوگ رونے لگے۔''وسیم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا''ابھی تو ہم تمہاری پہلے چمڑی چھیلیں گے پھر ایک ایک عضو کاٹیں گے۔''

''صاحب جی اس بار معاف کر دیں۔اب ہم ہمیشہ کے لیے چوری سے توبہ کر لیں گے۔''ان میں سے ایک نے روتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ چوری کے لیے آئے تھے؟''میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ہم لوگ ٹورسٹوں کو اکیلا پا کر ان سے سامان چھین لیتے ہیں۔ان کے بیگ غائب کر دیتے ہیں بلکہ جب ہمیں معلوم ہوا کہ ارشد مستری نے ایک ٹورسٹ پارٹی کو اپنا مکان کرایہ پر دیا ہے تو ہم نے آپ لوگوں کے ہاں چوری کرنے کی ٹھان لی۔ہم عرصہ سے یہی کام کرتے ہیں۔اس علاقے کے تمام لوگ جانتے ہیں آپ ارشد حسن سے پوچھ لیں۔''

''پتا کر لیں گے۔یہ بتاؤ کہ اس تھیلے کو کیوں لے کر آئے تھے؟ کیا اس میں ہمارے سر کاٹ کر لے جانا تھا؟''وسیم نے اس کے تھیلے کو اٹھا کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''سر جی یہ تھیلا اس لیے لائے تھے کہ اس میں سامان بھر کر لے جائیں گے۔''اس نے جواب دیا۔

ان کے انداز واطوار بتا رہے تھے کہ وہ سچ بول رہے ہیں لیکن کسی کے بارے میں اتنی جلدی فیصلہ دیا بھی نہیں جا سکتا۔تھیلے کی موجودگی اور ان کا انداز عکاسی کر رہا تھا کہ وہ لوگ واقعی چور ہیں اور چوری کی نیت سے گھر میں داخل ہوئے ہیں۔دو چار سوالات کے بعد میں نے کہا کہ انہیں اسی طرح بندھے رہنے دو۔اور میں جا کر لیٹ گیا۔لیٹنے کے بعد کہا''تم سب بھی جا کر سو جاؤ۔صبح سوچیں گے کہ ان

کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

وہ دونوں سسکتے رہے اور تمام لوگ لائٹ بجھا کر اپنی اپنی جگہ جا کر لیٹ گئے۔ مجھے اس بات کی ذرا بھی فکر نہیں تھی کہ وہ لوگ فرار ہو جائیں گے۔ نیند نے بے حال کر دیا تھا اور مجھے خود پر بھروسا بھی تھا کہ اگر دروازہ کھلا تو آہٹ سے فوراً میری آنکھ کھل جائے گی۔ یہی حال سفیر کا تھا۔ وہ بھی ہلکی سی آہٹ پر اٹھ جایا کرتا تھا پھر دروازے کے درمیان وسیم نے بستر بچھا لیا تھا۔ کمرے سے نکلنے والے کو اس پر سے ہو کر گزرنا تھا۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے میں کچھ حد تک مطمئن ہو کر سویا تھا۔ یوں بھی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اس لیے فکر بھی نہیں تھی کہ کیا ہوگا۔

میں سو رہا تھا کہ مرجس نے آواز دے کر مجھے اٹھایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ مجھے کچھ پریشان سا لگا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔"

اس وقت بھی کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ میں جواب کی اُمید پر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں بتایا کہ وہ دونوں فرار ہو گئے ہیں۔"

"کیسے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا اس لیے کہ یہ ناممکن نہیں لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ وسیم کو پھلانگ کر گیا اور اسے خبر نہ ہوئی جب کہ ہوا کی سرسراہٹ پر بھی وہ اٹھ جاتا ہے۔ پھر دروازہ کھلا تو مجھے خبر کیوں نہیں ہوئی۔ جب کہ میں ہلکے سے کھٹکے سے اٹھ جاتا ہوں۔

اس خبر کے بعد نیند کہاں آتی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں دیکھا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی ساری بات سمجھ آگئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کھڑکی میں گرل نہیں تھی اس لیے کوئی بھی اس راستے سے باہر کود سکتا تھا۔ وہ دونوں اسی راستے سے باہر نکلے ہوں گے۔ میں نے بیڈ پر نظر ڈالی ناصر شاہ نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

انہوں نے کھڑکی کھولی اور فرار ہو گئے یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان ہاتھوں کو وسیم نے باندھا تھا اور یہ کام اس سے پہلے بھی وہ کئی بار کر چکا تھا۔ اس نے کمزور بندھن باندھنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ یقیناً اس نے بہت سنبھل کر گانٹھ لگائی ہوگی۔ ایسی گانٹھ جو آسانی سے نہ کھل سکے... پھر بھی کھل گئی مگر کھلی کیسے؟ اس کے باندھے ہوئے گانٹھ کو جب تک کوئی کھولے نہیں کیسے کھل سکتی ہے؟

مجھے حیرت زدہ اور پریشان دیکھ کر مرجس بولا کہ آپ فکر نہ کریں۔ وہ لوگ جہاں بھی ہوں گے صبح اس کا پتا لگالوں گا۔ حسن پینٹر کو پتا ہوگا۔ وہ یہاں کے ہر اینٹ پتھر کو جانتا ہے۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی افسردہ تھا۔ میں نے اس سے کہا "وہ فکر نہ کرے۔ وہ اتنے بھی اہم نہ تھے۔"

مرجس نے جواب دیا۔ "صاحب جی وہ بھاگے نہیں بھگائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ میں جاگ رہا تھا جب اس کمرے سے سرگوشیاں سنائی دیں تھی۔ کسی نے ان کے ہاتھ کھولے تھے مگر وہ کون تھا اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ جس نے بھی یہ کام کیا ہے وہ اوّلی کمینہ ہے۔"

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "فکر نہ کرو اگر ہمیں جلدی نہ ہوتی تو میں اسے چوہے کے بل سے بھی باہر نکال لاتا۔ لیکن ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ پنڈی پہنچنا ضروری ہے۔"

اسے اطمینان دلا کر میں واپس اپنی جگہ آ گیا۔ اب دوبارہ نیند آنے کا سوال نہ تھا پھر بھی میں سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ وسیم قریب ہی تھا اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہی ارشد حسن پینٹر کھڑا تھا۔ اس نے وسیم کو دیکھتے ہی کہا "آپ کے ہاں سے کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی ہے؟"

"چوری...... نہیں تو لیکن یہ بات تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ اس کے چہرے پر فکر کا پرتو تھا جو صاف نظر آرہا تھا۔ "اندر آجائیں۔"

وہ اندر آکر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ گھر ارشد حسن پینٹر کا ہے۔ اس کی ہر اینٹ جواب دہ ہے۔ ایک ایک ذرہ اس کی نگرانی کرتا ہے پھر بھی وہ دونوں ہمارے گھر میں گھسے۔ انہوں نے کیا سمجھا تھا کہ میری آنکھیں بند ہیں۔"

وہ کسی فلمی اداکار کی طرح ڈائلوگ بول رہا تھا۔ گاؤں قصبوں کے لوگ ذرا ذرا سی بات میں خوش ہو اٹھتے ہیں اس کا علم بخوبی تھا۔ وہ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے پتا لگ گیا ہے کہ کوئی ہمارے گھر میں داخل ہوا تھا اور اسے ہم نے پکڑ لیا تھا اسی لیے اب وہ خود کو ہیرو ثابت کرنے کے لیے آگیا تھا۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے پوچھا۔ "ہوا کیا ہے؟"

"ارے جناب! آپ لوگ تو سو رہے تھے مگر میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں اپنے مہمانوں کا خاص خیال رکھتا ہوں۔ یہ گھر آپ لوگوں کو دیا تو آپ لوگوں کی حفاظت کی ذمے داری بھی مجھ پر ہے۔" وہ گردن اکڑا کر بول رہا

تھا" رات میں میرا چھوٹا کلفٹ سے واپس آرہا تھا۔ اور ان سے کچھ پہلے اس نے دیکھا کہ یہ والی کھڑکی کھلی" اس نے اشارے سے دوسرے کمرے کی کھڑکی دکھائی" اور اس کھڑکی سے کوئی کودا۔ وہ سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ وہ اسے روکتا کہ ایک اور شخص باہر کودا۔ وہ دو تھے اور چھوٹا اکیلا۔ اس لیے اس نے مداخلت نہ کی اور ان دونوں کا تعاقب کرنے لگا کہ وہ دونوں جاتے کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ سڑک پر پہنچے اور شاہ جی کے حجرے کے سامنے سے گزرے تو اس نے ان دونوں کا چہرہ دیکھ لیا۔ گھر کے باہر جو لائیٹ لگی ہوئی ہے اس کی روشنی میں اس نے انہیں پہچان لیا اور سیدھا گیراج پہنچا اور مجھے اٹھا کر بولا......"

وہ پوری تقریر کرنے پر آمادہ تھا اور مجھے اس کی تمہید سے الجھن ہو رہی تھی لیکن میں اسے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ معصوم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن وسیم چپ نہ رہ سکا اس نے کہا" کیا بولا...... اب وہ بھی بتا ہی دیں۔"

" وہی تو بتا رہا ہوں کہ اس نے کہا' استاد آپ کے گھر سے فیکے اور لعل کھڑکی سے باہر کودے ہیں۔ وہ دونوں چور ہیں اور ان کا اس طرح آپ کے گھر سے نکلنا بتا رہا ہے کہ کچھ چوری کر کے نکلے ہیں۔ میں نے دو آدمیوں کو ان کے گھر بھیجا ہے وہ انہیں پکڑ کر لاتے ہی ہوں گے۔ آپ کو خبر کرنا ضروری تھا اس لیے میں بھاگتا ہوا آیا ہوں۔"

" نہیں، وہ لوگ کچھ چرا کر نہیں بھاگے ہیں لیکن چوری کرنے آئے ضرور تھے۔ ہم نے پکڑ لیا تھا پھر بھی وہ لوگ فرار ہوگئے۔" میں نے جواب میں کہا۔

" پھر بھی ان کو سزا دینا ضروری ہے۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے گھر میں داخل ہوئے۔" ارشد حسن پُرجوش انداز میں بولا۔

شاید اسے اُمید تھی کہ میں اس سے خوش ہو کر اسے کچھ اور انعام دوں گا۔ لیکن جلد ہی اس کی سوچ دم توڑ گئی جب میں نے کہا" وہ کچھ چرا کر لے جا نہ سکا تو اسے بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی ہم کچھ دیر میں واپسی کے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔"

" نہ جی نہ...... میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میرے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہو۔"

" یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ اس میں ہمیں نہ گھسیٹو...... ہم اب یہاں سے جانے ہی والے ہیں۔ تمہیں جو رقم ایڈوانس دی ہے۔ وہ تمہاری ہوئی۔ اسے واپس نہیں کرنا۔" میرا اتنا کہنا جادو جیسا کام کر گیا۔ اسے یاد آ گیا ہوگا کہ اصولی طور پر ایڈوانس کی رقم واپس بھی ہوتی ہے۔ ہم اسے مانگ نہیں رہے اس بات پر وہ خوش ہو گیا۔

" جی جناب آپ لوگ بڑے آدمی ہیں۔ ہم غریبوں پر یہ ایک احسان ہوگا۔ یوں بھی میں اپنے ہاں کام کرنے والے بچوں کو اضافی پیسے دیتا ہوں۔ اس کار خیر میں آپ کا بھی حصہ بن جائے گا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے اسے جواب دینے کی بجائے وسیم سے کہا" او بھائی راستہ طویل ہے۔ تیاری کرنا شروع کر دو۔" دراصل مجھے ارشد حسن کی مکاری پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ کچھ دیر کی واقفیت تھی پھر بھی میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ ایک مکار اور چاپلوس بندہ ہے اور ایسے لوگ اپنی مطلب براری کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں اور ایسے لوگوں پر کبھی بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔

سفیر نے میرے کہنے سے پہلے ہی سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ نرجس بھی کام میں لگا ہوا تھا لیکن امداد شاہ اور ناصر بالکل خاموش کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے وسیم نے کہا" او بھائی ناصر تم بھی تو ہاتھ بٹاؤ۔"

" سامان ہے ہی کتنا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا" میں کروں تو کیا کروں؟"

" سامان سمیٹنا ہی کام نہیں کہلاتا۔ تم ایسا کرو کہ ہم سب کے لیے چائے ہی بنا لو۔" وسیم نے بیگ کی چین بند کرتے ہوئے کہا۔

" ابھی لیجیے۔" کہہ کر وہ کچن کی طرف چلا گیا۔

چائے کا سن کر ارشد حسن کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ چائے لانے تک ہم سب پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے کر میں نے ارشد حسن سے کہا" اچھا جناب، ہمیں اجازت دیں۔ اگر زندگی میں پھر کبھی ادھر آنا ہوا تو آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔"

" جی جی۔" اس نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

چائے پی کر ہم سب پراڈو میں آ کر بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ پر حسبِ معمول نرجس تھا۔

راستے میں ہمیں ایک بائیک اور سوزوکی کیری بھی مل گئی تھی۔ اسے بھی ساتھ لینا ضروری تھا۔ میں نے وسیم سے کہا" تم اور عبداللہ سوزوکی میں بیٹھ جاؤ۔"

" عبداللہ کے زخم بھرے نہیں ہیں اسے پراڈو میں ہی رہنے دیں میں سوزوکی لے کر آرہا ہوں۔"

''جیسی تمہاری مرضی۔'' کہہ کر میں نے پراڈو کا گیٹ بند کرلیا۔

ہمارا نیا سفر شروع ہو چکا تھا۔ مرجس ہوا کی رفتار سے گاڑی بھگا رہا تھا۔ ایک تو اترائی کی طرف جاتی سڑک دوسرے ٹریفک بس نام کو، اس لیے رفتار تیز لگ رہی تھی۔

میں کھڑکی سے باہر مظاہر قدرت سے لطف لے رہا تھا۔ ایسے حسین مناظر سے منہ موڑ لینا زیادتی ہوتی۔ ابھی میں پہاڑیوں، جھاڑیوں سے اٹے میدانوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ چونک گیا۔ کافی نیچے پولیس کا ناکا نظر آیا جو ابھی کافی دور تھا۔ ویرانی سے گزرنے والی سڑک پر گاڑیاں دور سے ہی نظر آجاتی ہیں۔ وہ لوگ پراڈو دیکھ کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ انہوں نے سڑک پر پوزیشن لینا شروع کر دی تھی۔ ہماری گاڑی کچھ دیر تک پولیس کی تحویل میں رہ چکی تھی۔ انہوں نے اس میں دو لاشیں بھی دیکھی تھیں۔ گو کہ وہ لاشیں اب انسانوں کی طرح شرافت سے بیٹھی تھیں لیکن ڈر تو باقی تھا کہ کہیں وہ گاڑی کو پہچان نہ لیں۔ ایک نظر میں بھلے ہی گاڑی پہچانی نہیں جا سکتی تھی پھر بھی دل میں ڈر تو باقی تھا۔ شاید ایسا ہی ڈر مرجس کے دل میں بھی تھا۔ اس نے پوچھا ''سر آگے پولیس والوں نے ناکا لگا رکھا ہے۔ کیا ہمیں رکنا ہوگا؟''

''بالکل رکیں گے۔ اس لیے کہ ہم قانون نہیں توڑ سکتے۔ خیال رہے تم انہیں اپنا یا میرا تعارف نہیں کراتا۔ ورنہ وہ لوگ زبردستی چائے کے لیے روک لیں گے۔ اس لیے کہ دور صحیح لیکن ایک ہوٹل نظر آرہا ہے۔ اور وہ اس ہوٹل والے سے مفت کی بیگار لیں گے۔'' میں نے ناصر وغیرہ کو سنانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

''جیسا آپ کہیں۔'' مرجس نے رفتار گھٹاتے ہوئے کہا اسپیڈ ہلکی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر پولیس والے اشارہ کریں تو رک سکے۔

قریب پہنچنے پر پولیس والوں نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ مرجس نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ پراڈو کے رکتے ہی دو تین پولیس والے آڑ سے نکل کر سامنے آئے۔ نئے آنے والوں میں سے ایک کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔ اس لیے کہ یہ وہی آفیسر تھا جس نے پراڈو چور کو پکڑا تھا اور اپنے ایک سپاہی کو پراڈو میں بٹھا کر چور کو تھانے لے گیا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ اس میں پہلے والی اکڑفوں نہیں تھی۔ شاید وہ افسران سے جھاڑ کھا چکا تھا اور اب محتاط انداز میں تلاشی لے رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے پراڈو کو پہچان لیا تو کیا ہو گا۔ یوں تو سرسری نظر سے جائزہ لے گا مگر شک ہو گیا تو بال کی کھال نکالنے کی کوشش کرے گا اور پراڈو کے نیچے جو اسلحے ہیں وہ بھی برامد کر لے گا۔ گو کہ جس طرح اسٹیکر سے ارشد حسن نے پراڈو کا حلیہ بدلا تھا' یہ مشکل ہی تھا کہ وہ پہچان سکے پھر بھی ڈر اپنی جگہ قائم تھا۔ میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ اس نے مرجس سے پوچھا ''گاڑی کے کاغذات ہیں؟''

مرجس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے کاغذات نکال کر آگے کر دیے۔ اس نے کاغذات کا معائنہ کر کے واپس کیا اور پھر کہا ''کہاں جا رہے ہو؟''

''پنڈی'' اس نے جواب دیا

''کس لیے؟ کس کام سے؟''

''یہ ٹورسٹ لوگ ہیں۔ ان کو پہنچانا ہے۔'' مرجس کی بات سن کر اس نے باری باری سے اندر بیٹھے تمام افراد کا جائزہ لیا۔

''آپ لوگ کیا ٹریکنگ پر گئے تھے؟'' اس بار اس نے ڈائریکٹ مجھ سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ باتوں کے دوران پراڈو کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے بدلتے زاویے کے ساتھ میری نگاہیں بھی زاویہ بدل رہی تھیں اس لیے کہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسٹیکر پر شک نہ کرنے لگے کہ یہ بعد میں لگی ہے۔ اسٹیکر لگ جانے کی وجہ سے کہیں سے بھی نہیں لگ رہی تھی کہ یہ وہی گاڑی ہے۔ پھر بھی دشمن کو کبھی بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے وہ گاڑی کا معائنہ کرتے ہوئے پچھلی طرف چلا گیا اور ادھر سے اندر جھانکتے ہوئے بولا ''یہ آکسیجن سلنڈر کیوں ہے؟''

سوال سنتے ہی مرجس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ شاید اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ کھیل بگڑنے والا ہے۔ تبھی داہنی جانب کی سیٹ پر بیٹھے سفیر نے کہا ''ڈاکٹر غلام حسین نے کہا تھا کہ یہ دونوں سلینڈر اور اسپتال میں استعمال ہونے والا کچھ سامان پنڈی میں ایک آدمی کو دینا ہے۔ وہ اسے بدل کر نیا دے گا جسے واپسی میں ساتھ لانا ہے۔''

''او اچھا تو یہ سامان غلام حسین کا ہے۔ ان سے میرا سلام کہنا۔ میں گلگت آیا تو ان سے ضرور ملوں گا۔ انہوں نے میرے بچے کا علاج کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔'' انسپکٹر نے جواب دیا اور پھر سپاہیوں سے بولا ''انہیں جانے دو۔''

میں نے جلدی سے سر باہر نکال کر کہا۔ ''سر جی، پیچھے

والی سوزوکی جس پر بائیک ہے وہ بھی ہماری ہے۔"
اس نے وسیم کو بھی تلاشی لیے بغیر آگے بڑھنے کا اشارہ دے دیا۔

بیریئر ہٹ گیا اور ہم دوبارہ سے آگے بڑھنے لگے۔
پھر سے وہی راستہ تھا اور ہم تھے۔ چہار جانب ویرانہ تھا۔ سنگلاخ پہاڑیاں تھیں اور دوڑتی ہوئی پراڈو تھی۔ اس بے وجہ کی تلاشی نے موڈ بگاڑ دیا تھا۔ سفیر چہرہ شناس تھا۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ میرے دل میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اس نے عبداللہ کی طرف دیکھ کر کہا "یار عبداللہ ذرا حویلی فون لگانا۔"
"کوئی خاص بات ہے کیا؟" عبداللہ نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے پوچھا۔
"خاص نہیں خاص الخاص... ذرا سویرا بھابی سے بات کرنی ہے۔" اس کی اس بات نے میرے کان کھڑے کردیے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کرلیا تاکہ سن سکوں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔
"تم خود کال کرلونا۔" عبداللہ نے اس کی طرف موبائل بڑھایا تھا کہ میں نے ہنستے ہوئے کہا:
"میں سب سمجھتا ہوں۔ میرا موڈ کسی اور وجہ سے بگڑا ہے۔"
میری ہنسی نے یک لخت اندر کا ماحول بدل دیا۔ سفیر بولا "اسی طرح چہرے پر شگفتگی قائم رہے تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ تو ہوکر رہتا ہے پھر فکر کرنے سے کیا فائدہ؟"
"یہی تو میں کہتا ہوں۔ اس طرح سر جھکا کر بیٹھنا دوسروں کے مورال کو بھی ڈاؤن کرتا ہے۔" عبداللہ بولا۔
اس کی بات پر ناصر نے کہا "آپ لوگوں کے ساتھ رہ کر ایسا لگتا ہی نہیں ہے کہ ہم سے موت آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم سب پکنک پر نکلے ہیں۔"
"بھائی میاں ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ایسے راز آشکار ہوں گے کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی تو ساتھ ہوا ہے۔ کچھ وقت گزرنے دو پھر تم بھی ہمارے رنگ میں رنگ جاؤ گے۔" سفیر بولا۔
"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" ناصر نے کہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔
میں نے موبائل نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ کسی کا نام نہیں تھا نمبر نظر آرہے تھے۔ میں نے موبائل کو کان سے لگا کر کہا "ہیلو کون؟"

"شہباز بیگ ہوں۔" ادھر سے آواز آئی تو میں بری طرح چونک گیا۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے کال کرے گا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کو میں نے یہ نمبر نہیں دیا تھا اسے تو کچھ ہی دن پہلے لیا تھا پھر یہ نمبر اس کے پاس کیسے آگیا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ادھر سے آواز آئی "کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔"
"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ نمبر ملا کیسے؟ کس نے دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ڈھونڈنے والوں کو خدا بھی مل جاتا ہے یہ تو صرف موبائل نمبر ہے جو بڑی آسانی سے کوئی بھی حاصل کرسکتا ہے صرف جیب میں پیسے ہونا چاہیے۔"
ادھر کی آواز نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔
"بکو... میرے پاس وقت کم ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں تو ہمیشہ ہی بکواس کرتا ہوں۔ جاؤ میں وہ بات نہیں بتاتا جس کے لیے فون کیا ہے۔" کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح اس نے کہا۔
"اب دوبارہ بکواس کی تو یاد رکھو میرے پاس تمہارے گھر کا نمبر بھی ہے۔ میں اگر چاہوں تو ابھی تمہاری بیوی کو فون کرکے بتا سکتا ہوں کہ اس وقت تمہارے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے اور تم دفتر کی بجائے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہو۔"
"بسم اللہ بسم اللہ...... ضرور فون کرو لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ میں اس وقت گھر پر ہوں۔ آج کورٹ میں ہڑتال ہے اس لیے میں گیا ہی نہیں۔" دوسری طرف سے قہقہہ کے ساتھ جواب آیا۔
"میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ اگر ہڑتال ہو بھی جائے تو تم گھر میں نہیں رہ سکتے۔ خیر جانے دو' یہ بتاؤ کس لیے فون کیا ہے؟"
"یہ بتانے کے لیے کہ ایک اور کیس کا فیصلہ تمہارے حق میں ہوگیا ہے۔ اب صرف دو کیس رہ گئے ہیں جن کا فیصلہ ہونا ہے۔ لیکن مرشد کا وکیل حاضری لگا ہی نہیں رہا۔ جب کہ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ دونوں کیس اٹھالے گا۔"
"تم نے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی؟" میں نے پوچھا۔
"بالکل کی تھی لیکن مرشد کے ہاں سے کوئی جواب ہی نہیں آرہا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہاں بیٹھے لوگوں کو میرا نمبر دے

کر کہا گیا ہے کہ اس نمبر کی کال ریسیو ہی نہ کی جائے۔"

"ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ مرشد اپنی سیاسی سرگرمیوں میں الجھا ہوا ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی خانقاہ پر حملے کے بعد اس کی پارٹی نے ایک طرح سے اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اس لیے کہ کچھ اینکرز نے پارٹی کے بھی لتے لے لیے تھے۔ پارٹی کو بچانے کے لیے اسے کچھ دنوں کے لیے سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اگر وہ پارٹی کے کسی بھی جلسے میں نظر بھی آ گیا تو صحافی ہی نہیں حزب اختلاف بھی اس کے خلاف بولنا شروع ہو جائیں گے۔"

"پھر ایسی کیا بات ہو گئی کہ وہ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گیا ہے۔"

"ویسے ایک بات بتادوں کہ ان دنوں اس کی خانقاہ میں عام لوگوں کی آمد و رفت بھلے ہی کم ہو گئی ہو لیکن کچھ خاص لوگ وہاں برابر نظر آ رہے ہیں۔ یہ بات میرے ایک دوست نے اگلا ہے جو محکمہ خفیہ میں ہے اور اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔"

"کال لمبی ہوتی جارہی ہے۔ شام میں تمہارے ساتھ چائے پیوں گا تو باقی باتیں بھی کرلوں گا۔ اب کال کاٹ رہا ہوں۔"

"فکر نہ کرو میں نے پیکج لے رکھا ہے۔ اگر تم اکتا گئے ہو تو اور بات ہے۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"لگتا ہے دوسری طرف وکیل صاحب تھے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"ہاں وہی تھا ورنہ کسی اور سے میں اس لہجے میں بات کرتا ہوں۔" میں نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

باتوں کا سلسلہ دراز ہو رہا تھا کہ میری نظر بے اختیاری میں بیک ویو مرر پر پڑی اور میں چونک گیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ کافی دیر.... بعد کوئی ٹرک یا بس گزرتی تھی۔ زیادہ تر علاقے غیر آباد نظر آتے تھے اس لیے پیدل چلنے والے بھی نہ کہ برابر تھے۔ سانپ کی طرح لہراتی ہوئی سڑک پر پراڈو بھاگتی جارہی تھی۔ پیچھے بھی دور دور تک کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی کہ یکایک ہی وہ سفید فور وہیل ڈرائیو نظر آ گئی تھی جو بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ میرے چونکنے کا سبب کچھ اور تھا۔ فور وہیل ڈرائیو اب بالکل قریب آ گئی تھی اسی لیے میری نظر اس کے داہنی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی نال نظر آ گئی تھی۔ نال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی آٹومیٹک رائفل کی تھی۔ میں نے اپنے سر کو نیچے کرتے ہوئے چیخ کر کہا "سب اپنے اپنے سر کو جھکالیں۔"

میری آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور پراڈو کی باڈی سے کئی گولیاں ٹکرائیں۔ میری طرف کا شیشہ چور ہو کر بکھر گیا تھا۔ کرچیاں میرے چہرے سے بھی ٹکرائی تھیں اگر بر وقت چھٹی حس اشارہ نہ دیتی تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی شکار ہو چکا ہوتا۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ ہم سب محفوظ رہے تھے۔

کمال تو نرجس کا تھا کہ اس نے سر نیچے کرنے کے بعد بھی اسٹیئرنگ پر قابو رکھا تھا ورنہ ہم کسی کھڈ میں پڑے ہوتے۔

میں نے بھاگتی ہوئی فور وہیل ڈرائیو کو دیکھا جو کافی دور جا چکی تھی۔ نرجس نے بریک دبا کر گاڑی روک لی تھی اور پیشانی پر نمودار ہونے والے قطروں کو صاف کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوفزدہ ہے۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے سفیر نے کہا "نرجس تم ہٹ جاؤ میں ڈرائیو کرلوں گا۔"

نرجس کی حالت ہی ایسی تھی کہ اس سے ڈرائیو نہیں ہوسکتا تھا۔ موت اتنے قریب سے گزرے تو خوف کا عفریت دہلا ہی دیتا ہے۔ لیکن ناصر کے چہرے پر ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ ایسا مطمئن تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ میری نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن میں ڈائریکٹ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسی وقت میرے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ میں نے موبائل کو جیب سے نکالا اور اسکرین پر نظر ڈالی نمبر دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں نے ٹہلنے کے انداز...... میں سڑک کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ گاڑی سے کافی فاصلے پر آ کر میں نے کال ریسیو کی۔ موبائل کو کان سے لگا کر کہا "ہیلو!"

"شہباز کیسے ہو... کافی دن بعد بات کر رہا ہوں اس لیے حال احوال پوچھنا ضروری سمجھا۔" دوسری طرف سے آتی مکروہ آواز نے میرے اندر نفرت کی تیز لہر اٹھا دی تھی۔

"اصل مدے کی طرف آؤ... کس لیے فون کیا۔ اس لیے کہ میری طرف سے بات کرنے کے لیے میں نے اپنے وکیل کو نامزد کر رکھا ہے۔" میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"میں جب کسی کو تحفہ دیتا ہوں تو اس سے پوچھتا ضرور ہوں کہ میرا تحفہ کیسا لگا؟"

”تحفہ کیسا تحفہ؟“ میں نے لہجے کو حیرت بھرا بنانے کی کوشش کی۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اپنے دشمنوں کو بھول جاتا ہوں...... نہیں، کبھی نہیں...... تم تو میرے سب سے بڑے دشمن ہو۔ تمہیں کیسے بھلا دوں۔ جیسے ہی تمہارے بارے میں میرے ایک دوست نے خبر دی میں نے تم پر نظریں جما دیں۔ تم پر میری نظریں گلگت سے ہیں۔“

”واہ بہت خوب.. خانقاہ کی تباہی کے بعد تم نے ٹیم دوبارہ سے تشکیل دے دی ہے۔ کیا سیاست سے کنارہ کشی کرنے والے ہو۔“

”سو فیصد...... سیاست میں کیا رکھا ہے۔ اب میرے پاس سیاست سے زیادہ پاور ہے۔“

”اچھا...... جب تو تم سے مجھے ڈر جانا چاہیے۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”بالکل ڈرو اس وقت سے جب میرا عتاب تمہیں تباہ کر دے اور وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ اس کا ٹریلر تم نے دیکھ ہی لیا۔ اگر رائفل کی نال تھوڑی سی اونچی رکھنے کا حکم دے دیتا تو ابھی تم برف خانے میں پڑے ہوتے۔“

”اچھا تو یہ فائرنگ تمہارے کرگوں نے کی ہے۔“

”پنڈی آنے کا انعام ہے یہ۔ ہم اسی طرح استقبال کرتے ہیں۔ پنڈی پہنچتے ہی اس سے بھی شاندار طریقے سے میں استقبال کروں گا۔ آؤ تو صحیح۔“

”اور اتنے سال سے تم کیا کرتے رہے؟“

”اس وقت تک میرے پاس یہ قوت نہیں آئی تھی۔ اب میں اتنا قوی ہوں کہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔“

”ماشا اللہ...... گویا تم فرعون سے بھی زیادہ قوی بن گئے ہو لیکن یہ بھول رہے ہو کہ ’ہر فرعون را موسیٰ است‘۔“

”میری قوت کا اندازہ پنڈی پہنچ کر ہوگا۔ آؤ تو صحیح۔“

”بالکل آرہا ہوں۔ تم استقبال کی تیاری کر لو۔“

”ہاں یہ بتا دوں تمہارے ساتھ میرے دو کتے ہیں جو میری پھینکی ہوئی ہڈی کھاتے رہے ہیں۔ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ کافی طویل گفتگو ہوئی، باقی باتیں اس وقت ہوں گی جب تم میرے قدموں میں بیٹھے ہو گے۔“ اس نے کہہ کر کال آف کر دی۔

میں اسی جگہ کھڑا فکر میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے امید نہ تھی کہ مرشد اتنا طاقتور بن جائے گا۔ پہلے تو ڈیوڈ شا کے بل پر کود رہا تھا۔ اب اسے کس کا سہارا مل گیا جو ڈیوڈ شا سے بھی زیادہ قوی ہے۔ اس نے نیٹ ورک اتنا کیسے پھیلا لیا کہ گلگت تک اس کے آدمی پھیل گئے ہیں۔ ناصر اور امداد شاہ کی باتوں سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ صرف وہی دونوں اس کے کسی کام سے گلگت آئے تھے لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے یہاں پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس بات نے فکر میں ڈال دیا تھا۔ ہماری پوری ٹیم ایک ہی گاڑی میں ہے۔ اگر اس نے بھرپور حملہ کر دیا تو......؟ اس تو کا جواب سوجھ نہیں رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہے ہیں۔“ سفیر نے آواز دی تو میرے خیالات کا گرداب تھما۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا۔ سفیر کی آواز نے مرجس کو بھی چونکا دیا تھا۔ اتنی دیر میں اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ سفیر کو میری طرف بڑھتے دیکھ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف آنے لگا۔ اسے آتے دیکھ کر میں مخمصے میں پڑ گیا اس لیے کہ اس کے سامنے میں سفیر سے کوئی بات کر نہیں سکتا تھا۔ موبائل میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے جلدی جلدی ایک چھوٹا سا مسیج بنایا کہ وہ مرجس کو روکے۔ اور اسے میں نے وسیم کے موبائل پر سینڈ کر دیا۔ میری نظریں وسیم پر تھیں۔ وہ پراڈو کے قریب کھڑا گولیوں کے نشان کو چھپانے کے لیے اسٹیکر کی جگہ تبدیل کر رہا تھا۔ موبائل پر بیپ ہوتے ہی اس نے موبائل نکال کر دیکھا پھر وہیں سے آواز دی ”مرجس... بات سنو۔“

مرجس آگے بڑھتے ہوئے رک گیا۔ اس نے سر موڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر وسیم کے اشارے پر اس کی جانب مڑ گیا۔ لیکن سفیر آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ میرے قریب پہنچ گیا تو میں نے کہا ”ابھی ابھی مرشد کی کال آئی تھی۔ یہ حملہ اس کے کرگوں نے کیا ہے۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ ہمارے کس دشمن نے ایسی حرکت کی۔ صرف گولیاں چلائیں اور بھاگ لیے۔“ سفیر نے جواب میں کہا۔

”ہمیں دہلانے کے لیے ایسی حرکت کی ہے۔ مرشد کا کہنا تھا کہ شوٹر کو کہہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف خوفزدہ کر کے فرار ہو جائے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”مرشد کا کہنا ہے کہ وہ شروع سے ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

"یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ اس نے ہوا میں تیر چلایا ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اسے ان لوگوں نے خبر دی ہو جنہیں ہم بے ہوش چھوڑ آئے ہیں۔ امداد شاہ کے غائب ہونے کی خبر دیتے وقت انہوں نے بتا دیا ہو کہ یہ کام شہباز کا ہے۔ وہ سب کے سب گلگت کے نہ ہوں ان میں سے کوئی ایک مرشد کا خاص آدمی ہو جو مجھے پہچانتا ہو لیکن اس وقت منہ سے پھوٹا نہ ہو۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے۔ بات کچھ بھی ہو میں نے سوچا ہے کہ پروگرام میں کچھ تبدیلی کرلوں۔"

"کیسی تبدیلی؟"

"تم پراڈو میں رہو گے اور تمہارے ساتھ امداد شاہ اور ناصر ہوں گے۔ تمہارے کچھ پیچھے وسیم سوزوکی میں عبداللہ اور مرجس کے ساتھ رہے گا' کچھ فاصلے سے کور دینے کے لیے۔ میں پبلک ٹرانسپورٹ سے آجاؤں گا۔ اس طرح ہم سب الگ الگ ہوں گے تو اسے گھیرنے میں دشواری ہوگی۔"

"اگر آپ الگ سفر کرنے پر بضد ہیں تو ایسا کریں کہ بائیک اتار لیں۔ بائیک سے سفر اچھا گزرے گا۔" سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے یہ مشورہ مذاق میں دیا تھا۔ اس لیے کہ بائیک پر طویل سفر آسان نہیں ہے۔ ایسی بائیک پر تو بالکل ہی نہیں لیکن میں نے کچھ سوچ کر کہا:

"ہاں بائیک بہتر رہے گی اس لیے کہ بائیک کے مسافر کو لوگ نزدیکی علاقے کا سمجھتے ہیں اور پھر جہاں چاہا اسے پارک کردیا۔"

"شہباز صاحب عقل سے کام لیں۔ یہ کوئی کلو دو کلو میٹر کا سفر نہیں ہے۔ اتنا طویل سفر بائیک پر کوئی صحیح العقل آدمی کر نہیں سکتا۔"

"جو کوئی نہیں کرتا وہ میں کرتا ہوں...... میں کچھ سوچ کر یہ رسک لے رہا ہوں۔ یوں سمجھو کہ میں دونوں گاڑیوں کو کور دوں گا۔ جیسے ہی خطرہ محسوس کروں گا تو میں مس کال دوں گا اور تم لوگ الرٹ ہو جانا۔"

"جب آپ ضد پر اتر آئے ہیں تو بائیک اتروا لیجیے۔"

"جاؤ اتروا لو اور ان سب سے کہنا کہ شہباز کو ایک کام کی وجہ سے رکنا پڑ رہا ہے۔ وسیم کے لیے کہنا کہ اسے راستے میں ایک کام کے لیے رکنا ہے اسی لیے وہ سوزوکی لے جارہا ہے۔ لیکن سب ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔"

سفیر نے بائیک اتار دی۔ مرجس نے لاکھ کوشش کی کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ لے لوں تاکہ زبان کا مسئلہ آڑے نہ آئے لیکن میں نے اسے منع کردیا کہ بس ایک دو دن کا معاملہ ہے میں جلد آملوں گا۔"

سفیر نے فوراً ہی اپنی گاڑی بڑھا دی۔ جب وہ لوگ کافی دور نکل گئے تب میں نے اپنا سفر شروع کیا۔ اگر کوئی سن لیتا کہ میں بائیک پر چلاس سے پنڈی جارہا ہوں تو تعجب کا اظہار ضرور کرتا۔ لیکن میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا صرف اس لیے کہ میرے ساتھی محفوظ رہیں۔ وہ جلد سے جلد پنڈی پہنچ جائیں۔ اور اگر راستے میں وہ کسی دشواری کا سامنا کرتے ہیں تو میں ان کو باآسانی کور دے دوں گا۔ اسی خیال سے میں بائیک پر تھا۔

ویران سڑک' صرف آتی جاتی گاڑیاں ایسے میں بائیک کا سفر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا مگر میں بائیک دوڑائے چلا جارہا تھا۔ کافی دور آچکا تھا۔ پراڈو اور سوزوکی کافی آگے نکل چکی تھیں اور اب نظر بھی نہیں آرہی تھیں۔ چلاس بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دھوپ کی تپش میں بائیک کا سفر ایک عذاب بن گیا تھا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ بائیک کی ہامی بھری۔ اگر میں نے اکیلے سفر کا سوچ ہی لیا تھا تو مجھے سوزوکی لینی چاہیے تھی ورنہ پیٹھ ایسی اکڑتی تو نہیں۔ اسی سوچ میں کافی سفر طے کرلیا تھا کہ احساس ہوا جیسے انجن میں کوئی خرابی آرہی ہے اس لیے کہ بائیک کی آواز بدل رہی تھی۔ تبھی مجھے ایک چھپر ہوٹل نظر آیا اور میں نے وہاں رک کر کچھ دیر ستا لینے کی ٹھانی۔ اگر انجن گرم ہو جانے کی وجہ سے ایسی آواز آرہی ہے تو وہ خود ٹھیک ہو جائے گی۔

ہوٹل میں قطار در قطار بہت سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر میں بیٹھ گیا۔ وہ چارپائی نیم کے پیڑ تلے بچھی تھی۔ نیم کا پیڑ یوں بھی ٹھنڈک دیتا ہے اس کا... پرانا ہونا سونے پر سہاگہ ہے۔ دھوپ کی شدت کو ایک لمحے میں نیم ٹھنڈک میں بدل دیتا ہے۔ میں نے چارپائی پر لیٹ کر اس بچے کی طرف دیکھا جو مجھے دیکھتے ہی بھاگا ہوا آیا تھا تاکہ آرڈر لے سکے۔

"کھانا کھا کر چلا ہوں اس لیے صرف چائے مل جائے گی۔" میں نے پوچھا۔

"باؤ اس وقت چائے کہاں سے ملے گی اگر کہو تو تیار کرا دوں۔" بچے نے کہا اور اس انداز میں میری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے امید ہو کہ میں اس کی بات کی تائید میں آرڈر ضرور دوں گا۔ یہ ہوٹلوں گیراج اور دیگر جگہوں پر کام

کر کے اپنا بچپنا گنوا دینے والے یہ بچے دراصل اپنے گھر کے لیے بڑے ہوتے ہیں۔ پورے گھر کا بوجھ اٹھانے والوں میں شامل ہوتے ہیں۔ قانونی طور پر چھوٹے بچوں سے کام لینا جرم ہے اور یہ جرم ہمارے ہاں عام ہے۔ میں دل سے اسے پسند نہیں کرتا۔ انسانیت کی اس تذلیل کو کون پسند کرسکتا ہے لیکن میں اسے مجبوری کی دلیل بھی کہتا ہوں اسی لیے ایسے بچوں کو ٹپ دینے میں، میں کبھی پیچھے نہیں رہا اسی لیے میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''ہاں بنوا دو لیکن ذرا جلدی کرنا۔''

بچہ آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بائیک کا سفر ایسے ہی جوڑ جوڑ کو ہلا دیتا ہے۔ اس پر مرشد کی فکر الگ۔ مرشد کا نام ذہن میں آتے ہی میں نے سفیر سے بات کرنا چاہی اور موبائل نکال لیا۔ اسکرین پر نظر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ سگنل کا کوئی پتا نہیں تھا۔ چلاس میں تو موبائل کام کر رہا تھا لیکن اب یہاں کسی کام کا نہ رہا۔ معمولی سا ڈبہ بن کر رہ گیا تھا جس پر گیم کھیلا جاسکتا تھا یا پھر ٹائم دیکھا جاسکتا تھا اس لیے میں نے موبائل کو دوبارہ سے جیب میں رکھ لیا اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے آرام سے راحت ملے گی یہی سوچ کر میں لیٹا تھا کہ بچے نے آکر اٹھا دیا۔

''صاحب جی چائے۔'' اس آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی میں چائے کا سپ لے رہا تھا کہ ایک ہائی روف آکر رکی اور اس سے تین آدمی اترے۔ ان پر سرسری نظر ڈال کر میں نے چائے کا دوسرا سپ لیا۔ چائے کیا تھی۔ ایسا لگ رہا تھا دودھ کو گاڑھے محلول میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور شکر اتنی تھی کہ اس سے مزید دو کپ چائے بن جاتی۔ حلق تک میٹھا ہوا جا رہا تھا۔ جیسے تیسے میں نے چائے حلق میں انڈیلی اور دوبارہ سے آنکھیں بند کرلیں کافی دیر تک اسی پہلو لیٹا رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ اگر وقت یہیں گزار دیا تو ناران پہنچتے پہنچتے رات کا پہلا پہر شروع ہو جائے گا اس لیے چل دینا چاہیے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تبھی میری نظر نئے آنے والوں پر پڑی۔ وہ لوگ کھانا آنے کے انتظار میں بیٹھے تھے لیکن ان کی نظریں ایسے گردش کر رہی تھیں جیسے وہ پورے ہوٹل کا سروے کر رہے ہوں۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ یہ کوئی عجیب بات تو نہیں تھی۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ غیر آباد علاقے میں کوئی انسان نظر آجائے تو وہ

## دریائے رائن

## ( River,Rhine)

یورپ کا مشہور دریا، سوئٹزرلینڈ سے نکلتا ہے اور جھیل کانسٹینس (Constance) سے لے کر بیسل (Basel) تک سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی سرحد بناتا ہے۔ جرمنی اور فرانس کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا ہے اور Barisure کے قریب جرمنی میں داخل ہوجاتا ہے۔ پرتگال کی سرحد پار کرکے یہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور آخر کار بحر شمالی میں جا گرتا ہے بیسل تک اس میں جہاز رانی ہوسکتی ہے۔ یہ 820 میل یا 1320 کلومیٹر لمبا ہے۔

مرسلہ: نعمان علی، سیالکوٹ

اسے بغور دیکھتے ہیں۔ یہاں بھی میرے علاوہ دو تین آدمی ہی تھے اس لیے اگر وہ میری طرف دیکھ رہے تھے تو تعجب کی بات کیا تھی اس لیے میں نے توجہ نہ دی اور بچے کو اشارے سے بلا کر سو کا نوٹ دیا اور بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

میرا سفر دوبارہ سے شروع ہو گیا تھا۔ قراقرم ہائی وے کی ویرانی ہمرکاب تھی۔ سڑک تقریباً ویران تھی۔ کافی دیر دیر بعد کوئی گاڑی گزرتی تھی۔ ایسے سنسان سڑک پر ڈرائیو کا اپنا مزہ ہے۔ میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہوٹل سے نکلے دو گھنٹے سے زائد ہو چکا تھا۔ اب شام اترنے لگی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ناران سے پہلے رکنا نہیں ہے۔ اسپیڈ بھی بڑھا دی تھی۔ آتی جاتی گاڑیوں سے زیادہ دشواری بھی نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ کچھ پریشان ضرور کرتی لیکن ایسی باتوں پر میں توجہ نہیں دیتا۔ کیونکہ کافی دیر دیر بعد یہ گاڑیاں پریشان کرتی تھیں اس لیے سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھ کر میں اسپیڈ سلو کر لیتا تھا۔

اب میں کافی آگے آچکا تھا۔ ناران زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ قریب آتا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میرے آگے تک پہنچنے لگی۔ میں نے بائیک کو مزید کنارے کر لیا تھا۔ میری پوری توجہ سامنے کی طرف تھی۔ انسان ہوں قدرت سے ٹکرا نہیں سکتا۔ انسان سانس نہ لے تو مر جائے لیکن جو سانس لیتا ہے اسے اپنے پھیپھڑے

میں رکھ نہیں سکتا۔ خارج کرنا ہی پڑتا ہے۔ انسانی ضرورت کے تحت میں نے بائیک روک دی مگر زیادہ دور گیا نہیں۔ وہیں سڑک کنارے بیٹھ گیا تھا کہ جس گاڑی کی ہیڈ لائٹ نظر آئی تھی وہ قریب آ گئی۔ تب میں نے دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ یہ وہی ہائی روف تھی جو مجھے ہوٹل پر نظر آئی تھی۔ وہ ہائی روف برابر سے گزرتی ہوئی کچھ آگے گئی اور پھر رک گئی۔

اسے رکتے دیکھ میں کھڑا ہو گیا۔ یوں بھی کھڑا ہونا ہی تھا کہ واپس بائیک تک بھی آنا تھا۔ تبھی ہائی روف کا دروازہ کھلا اور ایک بندہ باہر آیا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میں نے توجہ نہیں دی کیونکہ ایسی شارع پر اگر گاڑی خراب ہو جائے تو لوگ رک کر پوچھ لیتے ہیں کہ مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ایسا ہی کوئی سوال کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوا بائیک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اسی وقت گاڑی سے ایک اور بندہ اترا اور تیز قدموں سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اتنی دیر میں دوسرا بندہ میرے بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا بائیک خراب ہو گئی ہے؟"

"نہیں...... وہ میں ضرورت کے تحت اترا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" کہتے ہوئے وہ بندہ جو بعد میں ہائی روف سے اترا تھا میرے بالکل قریب آ گیا۔

"آپ اتنا لمبا سفر بائیک پر کریں گے۔ یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔" اس نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" میں نے الجھے انداز میں کہا۔

"یار، پنڈی کوئی یہاں تو ہے نہیں۔ اتنی دور کا سفر اور معمولی سی کھٹارا بائیک۔ مر جاؤ گے صاحب۔ اتنا لمبا سفر بائیک پر آسان نہیں۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں پنڈی جا رہا ہوں۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا لیکن ذہن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

"یہ جیدے تو ایسے ہی بکواس کرتا ہے۔ لیکن میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ میری گاڑی میں آ جائیں۔ جہاں کہیں گے اتار دوں گا۔ بائیک یہ جیدے لے آئے گا۔" نئے آنے والے نے کہا۔

"شکریہ میں بائیک پر ہی ٹھیک ہوں۔" کہتے ہوئے میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس نے یہ جملہ کیوں کہا کہ آپ اتنا لمبا سفر بائیک پر کریں گے۔ اسے کیا پتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

"آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ آپ لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ بات صاف ہے' آگے ناران ہے۔ راستے میں کوئی گاؤں بھی نہیں ہے یعنی کہ آپ ناران یا اس سے آگے جائیں گے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی۔ چلیں ہائی روف میں اتنی جگہ ضرور ہے کہ ایک آدمی اور بیٹھ جائے۔"

"جی ہاں مجھے اندازہ ہے کہ تین آدمیوں کے بیٹھنے کے بعد بھی اتنی جگہ ہوتی ہے کہ چوتھا آدمی بیٹھ سکے لیکن میں اپنی بائیک کو ہی پسند کروں گا۔" میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ عین اسی وقت میرے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آخری الفاظ جو میں نے سنے تھے وہ یہ تھے "ہمارے ہوتے آپ اسکوٹر پر کیوں جائیں گے۔ ابھی تو آپ کی خاطر داری بھی کرنی ہے۔" اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں اس لیے کہ ذہن پر اندھیرا سا چھاتا چلا گیا تھا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک بیڈ پر لیٹے ہوئے پایا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا صرف میں تھا۔ لیکن میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنے پیروں کو دیکھا۔ وہ آزاد تھے۔ اب میں نے سر گھما کر دیکھا تو کمرا کسی عاشق کے دل کی طرح خالی تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ہاتھوں کو ہلایا تا کہ رسی کی مضبوطی کا اندازہ کر سکوں۔ جس نے بھی گانٹھ لگائی تھی مضبوطی کا خاص خیال رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ کو آگے پیچھے کرنا شروع کر دیا تا کہ رسی کچھ تو ڈھیلی پڑے۔

ابھی میں ہاتھوں کو ہلا ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور مجھے لانے والے وہ تینوں بندے اندر آئے۔ اندر آتے ہیں ان میں سے ایک نے کہا "کیوں شہزادے کیسا لگ رہا ہے... ویسے فکر نہ کرو ہم بہت اچھے میزبان ہیں۔ اپنے مہمانوں کی خاطر داری خوب کرتے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں... مجھے کیوں لائے ہو۔" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں لایا گیا ہے یہ تو مجھے بھی پتا نہیں بس ہمیں حکم دیا گیا اور ہم بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جیسے وہ میرا جگری دوست ہو۔ "ویسے میں تعارف کرا دوں...... یہ جیدے ہے۔" اس

نے موٹی مونچھ والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا "یہ ہاتھ پیروں کے جوڑ کھولنے کا ماہر مانا جاتا ہے۔ اور یہ چاقو سے چرکا لگا کر گونگے سے بھی پیٹ کی بات اگلوا لیتا ہے۔" پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا "مجھے لوگ آصف کہتے ہیں اور میں دانت اکھاڑنے کا کام کرتا ہوں۔"

"لیکن یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو۔ میں تو تم لوگوں کو پہچانتا بھی نہیں ہوں۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ میرے بہت قریب آگیا اور پھر میرے بال کو مٹھی میں پکڑ کر بولا:

"ابھی پہچان جاؤ گے۔ بس مجھے فون کا انتظار ہے کہ تمہیں سزا دینے کے لیے کون سی جگہ مقرر کی گئی ہے۔ یہاں تمہاری خاطرداری ہوگی یا پنڈی میں۔"

"مجھے اس طرح بے ہوش کر کے لانے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ میں وہ وجہ سننا چاہتا ہوں۔" بال کھنچنے سے جو تکلیف ہورہی تھی اس تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"فکر کیوں کرتے ہو کچھ ہی دیر میں علم ہو جائے گا کہ تمہیں کیوں سزا دی جائے گی۔ بس فون آنے کی دیر ہے۔" وہ ایسے بول رہا تھا جیسے ہم کسی ہوٹل یا اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے فرینڈلی ٹاک میں مصروف ہیں۔

"دیکھو بھائی... پتا نہیں تم کس کے دھوکے میں مجھے اٹھا لائے ہو۔ بس اتنا کرم کر دو میرے ہاتھ میں خون کی روانی رک رہی ہے۔ پلیز ہاتھ ہی کھول دو تب تک فون بھی آجائے گا اور وہ خود کہیں گے کہ میں بے قصور آدمی ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کو التجائیہ بنا لیا تھا۔

"بات تو صحیح ہے کہ ہم سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہم جانتے ہیں کہ تم کون ہو۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم تیزی سے ناران سے نکلیں اور قراقرم روڈ پر جو بندہ ادھر بائیک سے آرہا ہے اسے اغوا کر کے کسی محفوظ جگہ رکھ دیا جائے۔ فیصلہ پنڈی والے کریں گے۔" اس نے میرے بالوں کو چھوڑ کر کہا "فی الحال ایسا کرتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کو کھول دیتے ہیں۔ اس طرح تمہاری شکایت کا ازالہ ہو جائے گا۔" پھر اس نے میرے ہاتھوں کو بندھن سے آزاد کر دیا۔

نائیلون کی رسی کو اتنی سختی سے باندھا گیا تھا کہ واقعی میرے ہاتھوں میں خون کی گردش رکنے لگی تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہ ہاتھ کمزور تھا۔ حکیم قابوس کے علاج سے کچھ صحیح تو ہوا تھا لیکن خون کا دوران رکتا تو پریشانی پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے ہاتھوں کی دونوں کلائیوں کو گول گول گردش دینا شروع کر دیا تھا۔ تا کہ خون کی روانی بحال ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ میری نظریں ان تینوں کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ غلط کام میں مشغول ضرور ہیں لیکن فطرتاً غلط نہیں ہیں۔ شاید پڑھے لکھے ہیں یعنی جو بات کر رہا تھا وہ تعلیم یافتہ لگ رہا تھا اسی وجہ سے اتنی شائستگی سے پیش آرہا ہے۔ ان میں سے ایک جس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں اس کے کمر میں اڑسا ہوا پستول مجھے نظر آگیا تھا۔ اب وہ پستول میرے قبضہ میں کیسے آئے میں اسی بابت سوچ رہا تھا۔

ابھی میں پستول حاصل کرنے کا طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی اور وہ فون سننے لگا۔ دوسری طرف کی بات سن کر بولا "یس سر میں اسے اپنے ساتھ لے کر آرہا ہوں۔"

فون بند کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب تھا "واہ بھائی تم تو بڑی چیز ہو۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں باندھ کر لایا جائے۔"

"بھائی ایسا ظلم تو نہ کرو۔ باندھ کر لے جانا کیا ضروری ہے؟"

"ہمیں کہا گیا ہے کہ آپ بڑی اونچی چیز ہیں۔ کسی وقت بھی پینترا بدل کر بازی الٹ سکتے ہیں۔"

"بھائی کون ایسی بات کہہ رہا ہے' کون حکم دے رہا ہے اور مجھے کہاں لے جانا ہے' کچھ تو بتاؤ۔" میں معصوم بنا سوالات پر سوالات کیے جا رہا تھا۔

"تم سائیں بادشاہ کے مہمان ہو۔ صبح کی چائے تم مرشد سائیں کے ساتھ پیو گے۔" اس نے سانس لے کر کہا "وقت کم ہے اس لیے ہم ابھی نکل پڑیں گے۔"

"اسی ہائی روف پر چلنا ہے؟" میں نے ایسے کہا جیسے میں راضی ہو گیا ہوں۔

"نہیں ٹرک پر۔ لیکن تم ٹرک پر نہیں ٹب میں جاؤ گے تا کہ اگر کہیں چیکنگ ہو تو گڑبڑ نہ کردو۔"

"ٹب میں...... میں سمجھا نہیں؟" کہتے ہوئے میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے پیر کو بھی کھول لیا۔ باتوں کے درمیان میں ایسے بندھن کھول رہا تھا جیسے غیر ارادی طور پر ایسا کر رہا ہوں۔

"ہم جسے یہاں سے لے جاتے ہیں اس کے لیے ایک بڑا سا ٹب استعمال کرتے ہیں۔ اس ٹب میں بندے کو بے ہوش کر کے لٹا دیتے ہیں اور ٹب کو ٹرک کے نیچے باندھ دیتے ہیں۔ جھولتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ پہنچ جاتا ہے۔ راستے میں چیکنگ ہوتی بھی ہے تو کوئی ٹرک کے

پیچھے جھانکتا نہیں ہے۔ اگر جھانکتا بھی ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ تب ٹرک کا حصہ ہے یا الگ سے لگایا گیا ہے اس لیے تمام کام خوش اسلوبی سے طے پا جاتا ہے۔"

"تو پھر میں ایسا کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے ایک ایسی حرکت کی کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔ بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے اچھلا تھا اور تقریباً اڑتا ہوا مونچھ والے پر جا پڑا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی مگر میرے ہاتھ نے کمال دکھا دیا تھا۔ اس کی کمر میں اڑسا ہوا پستول میرے ہاتھ میں آتے ہی میں نے دوبارہ سے اچھال بھری تھی اور دروازے کے نزدیک جا کھڑا ہوا تھا۔

میری اس حرکت نے ان تینوں کو بوکھلا دیا تھا۔ وہ ایک ساتھ میری طرف دوڑے تھے۔ ان کی اس اضطراری حرکت نے بتا دیا تھا کہ وہ ٹرینڈ نہیں ہیں۔ لڑائی بھڑائی کے جو اہم نکات ہوتے ہیں وہ بھی انہیں معلوم نہیں اسی لیے وہ سب ایک ساتھ میری طرف دوڑے تھے۔ اور یہی ان کی غلطی تھی۔ میں نے دوبارہ سے اچھال بھری اور ان پر جا پڑا۔ وہ تینوں اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک ساتھ زمیں بوس ہوئے اور ان پر میں سوار تھا۔ لیکن میں نے گرتے ہی دوبارہ اچھال بھری تھی اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا ساتھ ہی ساتھ اچھل کر دور چلا گیا تھا۔

جس کی گردن پر میرا ہاتھ لگا تھا وہ اپنی گردن تھامے ہوئے تھا اور جس کو لات لگی تھی وہ الگ پڑا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اتنی دیر سے وہ شریف بنے ہوئے تھے۔ زبان میں شائستگی کی مٹھاس لیے ہوئے تھے لیکن ایک ہی وار نے ان کی شائستگی کو ہوا میں اڑا دیا تھا۔ وہ تینوں گالیاں بکتے ہوئے میری طرف دوڑے تھے۔ میں نے ان کو موقع دیا اور جیسے ہی وہ نزدیک پہنچے میں نے ہوا میں اچھال بھری اور ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ شاید یہ سب ان کے لیے نیا تھا کیونکہ ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا تھا۔ "ابے کیا پرندے کی اولاد ہے۔"

میں نے دوبارہ کھڑکی کی طرف اچھال بھرتے ہوئے کہا "باز ہوں میں... شہباز ہے میرا نام' صرف میرے جسم میں ہاتھ لگا دو تو میں مان لوں گا۔"

ان سے کھیلتے ہوئے مجھے مزہ آرہا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود کو کوئی اونچی چیز سمجھ رہے تھے اسی لیے اتنی دیر تک بکواس کرتے رہے تھے۔ اب ان کو اپنے مقام کا تعین ہو گیا ہو گا۔ تبھی ان میں سے ایک نے کہا "یہ ہاتھوں سے پکڑائی نہیں۔ فائر کر۔"

فائر کا نام سنتے ہی میں نے دروازے کی جانب اچھال بھری اور ان کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا عین دروازے کے بیچوں بیچ پہنچا۔ زمین پر قدم ٹکائے اور چیخ کر کہا "اچھا دوستو ورزش کرانے کا شکریہ۔ میں تو چلا۔"

اتنا کہہ کر میں نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی ساتھ ہی ساتھ ایک فائر بھی کر دیا تھا تا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اندر رکے رہیں اور مجھے موقع مل جائے۔ باہر اندھیرا اترنے لگا تھا۔ میں نے باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور و نزدیک کوئی عمارت یا مکان نہیں تھا۔ ویرانے میں یہ اکلوتا مکان تھا۔ شاید یہ اطاق کے قسم کی کوئی چیز تھی۔ رکنا خود کو پریشانی میں ڈالنا تھا۔ اس لیے میں ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا تھا۔ یہ بھی نہیں دیکھ رہا تھا کہ میں جا کہاں رہا ہوں۔

ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری نظر ایک گاڑی پر پڑی۔ وہ کچھ دور تھی اور اس کا رخ اسی مکان کی طرف تھا۔ وہ تیزی سے آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری چھٹی حس نے خطرے کا سگنل دیا۔ یقیناً وہ گاڑی اسی مکان کی طرف جا رہی ہے تو اس میں دشمن ہی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کسی نے کال کر کے مدد مانگی ہو۔ لیکن اتنی جلدی مدد کیسے آ گئی، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں دوڑتا ہی رہا۔ میرا رخ اس طرف تھا جہاں بہت سارے پیڑ نظر آرہے تھے۔ شاید وہاں سے جنگل شروع ہو رہا تھا یا پھر وہ کوئی گھاٹی تھی۔ وادی تھی۔ ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا اور دور کی چیزیں بھی آسانی سے نظر آ رہی تھیں۔

میں پاگلوں کی طرح ادھر بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ گاڑی اسی مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ تبھی اندر سے دوڑ کر کوئی نکلا تھا اور گاڑی والے سے کچھ بولا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ گاڑی میں میرا پیچھا کریں گے۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

کچھ اور آگے جانے کے بعد مڑ کر دیکھا۔ تو خطرے کو اپنی طرف بڑھتے پایا۔ وہ گاڑی اب تیر کی طرح میری طرف آرہی تھی۔ گویا اب زندگی اور موت کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ آنے والے مسلح بھی ہوں گے اور کسی بھی وقت وہ مجھ پر فائر کر سکتے تھے اس لیے میں نے اپنی پوری قوت لگا دی تھی۔ اب اندھیرا ابھی بڑھ چکا تھا۔

اس وقت میں ایسے بھاگ رہا تھا جیسے میرے پیچھے جہنم کی بلائیں لگ گئی ہوں۔ اس لیے کہ عقب سے فائر ہوا تھا اور گولی میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اب جھاڑیاں بھی قریب آ گئی تھیں گو کہ یہ جھاڑیاں کٹیلی

تھیں۔ جسم پر خراشیں ڈال سکتی تھیں مگر موت سے خراش بہتر ہے۔ یہ سوچ کر میں ان جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا تھا۔

جسم پر جا بہ جا سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں لیکن میں رکا نہیں تھا۔ اندر کی طرف دوڑتا چلا گیا تھا۔ اسے دوڑنا بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ میں اچھلتا کودتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ جا بہ جا چھوٹے چھوٹے پتھر بھی تھے جن سے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اندھیرا مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اندھیرا بڑھ جانے میں ان اونچے اونچے پیڑوں کا کردار زیادہ تھا جو ہر دو تین قدم کے بعد سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اور یہی پیڑ مجھے بچائے ہوئے تھے اس لیے کہ اب عقب سے فائر بھی ہو رہا تھا۔ یہ فائر کسی نشانے پر نہیں تھا۔ وہ لوگ اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ کوئی گولی بھی میرے نزدیک سے نہیں گزر رہی تھی۔ شاید وہ لوگ مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش میں تھے۔ ان کی کوشش کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئی تھی۔ میں اب بھی اسی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ بار بار ٹھوکر لگ رہی تھی۔ لڑکھڑا رہا تھا مگر میں رک نہیں رہا تھا۔ سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ پھیپھڑے جواب دیتے جا رہے تھے۔ الجھ الجھ کر جتنی بار گرا تھا اتنی ہی بار چہرے پر خراشیں آئی تھیں۔ جلن بھی بے چین کیے ہوئے تھی مگر رکنے کا سوال نہیں تھا اس لیے کہ رکتا تو گولیاں مقدر ٹھہرتیں۔

میرے دائیں بائیں ویرانہ تھا اور عقب میں موت کے فرشتے۔ اگر ایک لمحے کو بھی میں رک جاتا... تو لاچارگی کی موت ملتی۔ اس لیے ہی دوڑے جا رہا تھا۔ اب تاریکی بھی بڑھ گئی تھی۔ اور راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تبھی مجھے دور بہت دور روشنی سی نظر آئی۔ گو کہ وہ روشنی ایک ڈیڑھ کلومیٹر سے کم دور نہیں تھی پھر بھی مجھے ایسا لگا کہ ایک نئی زندگی کی نوید مل گئی ہے۔ میں نے اب اپنا رخ اسی طرف کر لیا تھا لیکن مجھے حد سے زیادہ کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ جسم میں قوت بالکل نہیں رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج کئی دن سے مسلسل ایک نہ ایک ہنگامہ منتظر رہ رہا تھا۔ وادی سے نکلنے کے بعد سے کوئی نہ کوئی مسئلہ الجھائے ہوئے تھا۔ پھر اتنی دیر تک بائیک کا جھٹکا بھی یہ جسم سہہ چکا تھا۔ پیروں میں اب قوت ختم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ پیر لڑکھڑانے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میں گر جاؤں گا۔ ایسی کمزوری اس سے قبل میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ یوں لگا جیسے میں اب گرا کہ اب گرا اور پھر واقعی گر گیا۔ پیر ایک جھاڑی سے الجھا تھا کہ میں خود کو سنبھال نہ سکا اور منہ کے بل گرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے نوکیلے پتھر جسم میں چبھتے رہے اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ڈھلان ایسی تھی کہ میں رک ہی نہیں سکا۔ نیچے کی جانب لڑھکتا ہی رہا۔ پھر ایک جھاڑی درمیان میں آئی اور اضطراری طور پر میں نے اسے پکڑ لیا۔ ایک ساتھ کئی جھاڑیاں پکڑ میں آئی تھیں اس لیے سنبھل گیا۔ رک گیا۔

جھاڑیوں نے روک تو لیا تھا لیکن پتھروں پہ لڑھکنے سے جسم میں جا بجا چوٹیں آئیں تھی لیکن یہ چوٹیں گولیاں کھانے سے بہتر تھیں۔ میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت میں ایک گڑھے میں پڑا تھا جس میں جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ انہی جھاڑیوں نے مجھے چھپا لیا تھا۔ میں جھاڑیوں کو ہٹاتا کہ اوپر دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی پھر پہاڑی کے سرے پر مجھے دو سائے سے نظر آئے اور میں دبک گیا۔ آسمان صاف تھا اور ستارے جھلملا رہے تھے۔ ایسی خاموش فضا میں ستاروں کے نظارے کا لطف لینا ایک اپنا مزہ ہے مگر میں ستاروں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا میری نظریں ان دونوں پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ تھوڑا سا نیچے اترتے تو مجھے دیکھ لیتے۔ اس خوف نے مجھے لرزا دیا اور میں بالکل ساکت ہو گیا تھا کہ کہیں جھاڑیاں ہلیں تو ان کی نظریں اس پر مرکوز ہو جائیں گی اور وہ نیچے اتر آئیں گے۔ وہ دونوں سرگوشی میں مشورہ کر رہے تھے اس لیے کہ ان کی آواز مجھ تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشن کوف تھا جب کہ دوسرے کے ہاتھ میں پستول تھا۔

ابھی میں ان کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک نئی افتاد آن پڑی۔ کلاشن کوف والے نے نال کا رخ نیچے کی طرف کر کے برسٹ چلایا۔ بارش کی بوندوں کی طرح برستی ہوئی گولیاں میرے قریب سے گزر گئیں۔ صرف بالشت بھر کا فاصلہ رہ گیا تھا ورنہ ایک نہ ایک گولی میرے جسم میں چھید کر دیتی۔

”لگتا ہے وہ اس نالے سے ہوتا ہوا بھاگا ہے۔“ ان میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔

”اگر ادھر سے بھاگا ہے تو وہ اس فیکٹری کی طرف گیا ہو گا۔ اس لیے کہ ادھر ہی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کوئی فیکٹری ہے۔

"چلو ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔ خالی ہاتھ جانے کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا۔" اس آواز کے ساتھ وہ دونوں اس فیکٹری کی سیدھ میں چلنے لگے۔ اب میرا ادھر جانا بے کار تھا۔ کدھر جاؤں۔ کس طرف بڑھوں میں یہی سوچ رہا تھا لیکن میری نظریں ان دونوں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں اب نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید اسی فیکٹری کی طرف چلے گئے تھے۔ تقریباً میں پندرہ منٹ تک وہیں دبکا رہا پھر آہستہ سے جھاڑیوں کو ہٹا کر باہر آیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کوئی آہٹ نہیں تھی۔ البتہ جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ جگہ جگہ خراشیں آگئی تھیں اور خون رس رہا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ دور روشنی جھلملا رہی تھی جس کے بارے میں ان لوگوں نے کہا تھا کہ وہ کسی فیکٹری کی روشنی ہے۔ کیا واقعی ادھر کوئی فیکٹری ہے، مجھے خود پتا نہیں تھا لیکن اب میں ادھر نہیں جاسکتا تھا اس لیے کہ وہ لوگ ادھر ہی گئے تھے۔ مجھے اب کسی اور طرف جانا تھا۔ کہاں، اس کا خود مجھے پتا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پورا علاقہ میرے لیے نیا تھا۔ میرے پاس اب بائیک بھی نہیں رہی کہ اس پر سوار ہو کر باقی کا راستہ طے کرتا۔ پھر ان نامعلوم دشمنوں کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ پھر سے گھیرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اتنا تو احساس ہو ہی چکا تھا کہ ان کا تعلق مرشد سے ہے اور مرشد پہلے سے زیادہ قوی ہو چکا ہے۔ اس سانپ کا سر کچلنے کے ہی ارادہ سے میں جا رہا تھا کہ اس نے گھیر لیا۔ اور میں ایسی جگہ پہنچ گیا کہ جہاں سے سڑک کدھر ہے اس کا بھی پتا نہیں تھا۔ خدا کا نام لے کر میں نے قدم بڑھا دیے۔ تکلیف کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی پھر بھی ایک بے چینی سی بے چینی تھی۔ کپڑے دھول میں اٹ گئے تھے اور جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا لیکن ستاروں کی مٹمیلی روشنی میں دھبے صاف نظر آگئے تھے۔ اس حالت میں اگر میں کسی سے لفٹ مانگتا تو دیکھنے والا خوفزدہ ہو جاتا۔ پھر بھی میں بڑھتا رہا۔ کچھ آگے گیا تھا کہ ایک حویلی نما مکان کا ہیولہ سا نظر آنے لگا۔ رات گزارنے کے لیے وہ ایک معقول سہارا بن سکتا تھا اس لیے میں اسی طرف بڑھنے لگا۔ پہاڑی راستوں پر زخمی بدن کے ساتھ آگے بڑھنا آسان نہیں لیکن جب موت اور زندگی کا کھیل شروع ہو جائے تو پھر زندگی بچانے کی جدوجہد تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی کوشش جاری رکھی تھی۔ لنگڑاتا ہوا اس عمارت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد میں نے جیب سے موبائل نکالا اور اپنی پوزیشن سے سفیر کو آگاہ کرنا چاہا لیکن اسکرین پر نظر پڑتے ہی جوش ٹھنڈا پڑ گیا اس لیے کہ سگنل اب تک غائب تھا۔ اتنی دیر میں، میں نے ٹائم دیکھ لیا تھا۔ گھڑی آٹھ بجا رہی تھی۔ دوستوں سے الگ ہوئے مجھے چھ گھنٹے ہو چکے تھے اور جان بچانے کی کوشش میں ایک گھنٹا غارت ہو گیا تھا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں کسی طرح رات گزاروں اور صبح کا اجالا پھیلے تو سڑک کدھر ہے اس کا اندازہ لگاؤں۔ رات گزارنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کا انتخاب ضروری تھا۔ اگر وہ ہیولہ کسی عمارت کا ہے تو یہ متروکہ ہے تو بہت بہتر تھا اسی خیال کے تحت میں آہستہ آہستہ اسی ہیولے کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ متروکہ عمارت ہے کیونکہ اگر آباد مکان ہوتا تو اس میں روشنی ضرور نظر آتی۔

ایک قدم کے بعد دوسرا اٹھے تو منزل قریب آ ہی جاتی ہے۔ بالآخر میں اس حویلی تک پہنچ ہی گیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ وہ ایک متروک حویلی تھی۔ جسے برسوں پہلے ترک کیا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ اس کی اینٹیں جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھیں۔ دیواریں گری ہوئیں تھی لیکن اسٹرکچر اب بھی مضبوط تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ جگہ مناسب بھی تھی اور محفوظ بھی۔ لیکن اندر اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے موبائل آن کر کے جائزہ لیا پھر ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کئی جگہ ٹھوکر بھی لگی۔ مگر میں رکا نہیں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ بار بار موبائل آن نہیں کر رہا تھا کہ روشنی دور سے نظر آجاتی۔ پھر ایک جگہ سیڑھیاں سی محسوس ہوئیں تو میں نے پیروں سے ٹٹولا۔ پھر قدم اوپر اٹھایا۔ ابھی ہاتھوں سے ریلنگ ٹکرائی اور میں اس کا سہارا لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچتے ہی اندھیرا کچھ ہلکا ہو گیا کیونکہ ایک جانب کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور اس دیوار سے تاروں کی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں نے اس ہلکی روشنی میں فرش کا جائزہ لیا۔ فرش پر دھول اور گرد کے علاوہ دیوار کا ملبا بھی پڑا ہوا تھا۔ ملبے پر ایک تار پڑا نظر آگیا۔ موٹا الیکٹرک وائر تھا جو کوئی اٹھا لایا ہوگا اور بعد میں بیکار سمجھ کر پھینک گیا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور بے خیالی میں اسے موڑتا ہوا میں کچھ اور آگے بڑھا۔ اس ٹوٹی ہوئی دیوار تک پہنچا جس کے گرنے سے کمرے میں روشنی آگئی تھی۔

ابھی دیوار تک پہنچا ہی تھا کہ نیچے نظر پڑی اور میں تھم کر رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اندر عمارت میں داخل ہوا

ہے۔ میں زیادہ آگے بڑھ نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ حصہ زیادہ مخدوش تھا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو شاید دیوار کے ساتھ میں بھی نیچے چلا جاتا۔ میں نے پوری قوت سماعت ادھر لگا دی۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں ہوشیار ہو گیا۔

یہ آواز نیچے سے آ رہی تھی۔ ایک سے زائد آدمی کے چلنے کی آواز تھی۔ میں پوری توجہ سے آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا' تبھی کسی کی آواز آئی کہ وہ اسی عمارت میں چھپا ہوگا۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اسی کھنڈر میں آیا ہے؟“ اس آواز نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ میں نے آواز پہچان لی کہ یہ وہی دونوں ہیں جو میرے تعاقب میں ڈھلان تک آئے تھے۔

”میں نے اس کھنڈر میں ہلکی نیلی روشنی دیکھی تھی۔ ایسی روشنی جو موبائل کے آن ہونے پر نظر آتی ہے۔“ اس بات نے مجھے سر پیٹ لینے پر مجبور کر دیا کہ میں نے ایسی غلطی کیوں کی تھی۔

”تب پھر اوپر چلو۔ اگر وہ اس طرف آیا ہے تو اندر ہی کہیں دبکا بیٹھا ہوگا۔“

پھر وہ دونوں شاید سیڑھیوں سے مزید اوپر آ گئے تھے۔ تبھی ایک آواز صاف سنائی دی ”وہ دیکھو۔ دھول پر بنے پیروں کے نشان یہ بالکل تازہ ہیں۔ اگر دیر کے ہوتے تو ہوا اڑا دیتی۔“

”ہو سکتا ہے کہ کوئی گڈریا صبح آیا ہو اور دیواروں کی وجہ سے یوں بھی اندر دھول مٹی کم آتی ہے اس لیے یہ نشان تازہ لگ رہا ہے۔“

”کچھ بھی ہو اب آگے بڑھنا ضروری ہے۔ شاید قسمت یاوری کر جائے اور وہ ہمیں مل جائے ورنہ ہماری خیر نہیں۔“

پھر وہ دونوں اوپر آ گئے تھے کیونکہ اب ان کے قدموں کی دھمک سیڑھیوں سے اوپر سنائی دے رہی تھی۔ تبھی ایک نے دوسرے کو ڈانٹا ”ٹارچ بجھا دو۔ روشنی دور سے نظر آ جاتی ہے۔“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بالکل سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کبھی وہ کمرا رہا ہوگا لیکن اب اس میں دروازہ بھی نہیں تھا۔ شاید کسی کے گھر کا ایندھن بن چکا ہوگا' جلانے کے کام آ گیا ہوگا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر جائزہ لیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی مجھے اس کمرے میں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دھمک کلیارے سے آئی۔ گویا وہ دونوں کلیارے میں پہنچ گئے تھے۔ اب کچھ ہی دیر میں وہ اس کمرے میں آ جائیں گے اور یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جس کی آڑ میں خود کو چھپا سکتا اس لیے میں اس دیوار کے قریب ہو گیا جس سے نزدیک دروازہ تھا۔ میں نے کمر کو ٹٹولا اور دل دھک سے رہ گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں نہ جانے کب پستول کہیں گر چکا تھا۔ اسی وقت باہر سے سرگوشی سنائی دی۔ کوئی بہت نیچی آواز میں بولا تھا۔ ”اسی کمرے کی طرف پیروں کے نشان جا رہے ہیں۔ ضرور وہ اسی کمرے میں چھپا بیٹھا ہے۔“

میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ میں نے الیکٹرک وائر کو جو بے خیالی میں اٹھا لایا تھا اسے آزمانے کی سوچ لی۔ اس کے دونوں سرے کو میں نے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور اندر آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ باہر کھڑا شخص بھی کم چالاک نہیں تھا۔ اس نے کلاشن کوف کی نال اندر کی۔ گو کہ نال ٹھیک سے نظر نہیں آ رہی تھی پھر بھی میں تیار ہو گیا۔ اندر آنے والے نے پہلا قدم اندر رکھا تھا کہ میں نے اچھل کر تار کا حلقہ اس کی گردن میں ڈال دیا اور پوری قوت سے کھینچنے لگا۔ عام طور سے میں کسی کی جان لینے کے حق میں نہیں ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں سامنے والے کو صرف بے ہوش کروں لیکن یہاں معاملہ بہت زیادہ بگڑا ہوا تھا' وہ دو تھے اور مسلح تھے۔ اگر میں ذرا سی بھی کمزوری دکھاتا تو وہ مجھے بھون کر رکھ دیتے۔ اس لیے میں پوری قوت سے تار کو دو طرف سے کھینچ رہا تھا۔ اس وقت تک کھینچتا رہا جب تک کہ وہ گر نہ گیا۔ باہر والے کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیوں رکا ہے مگر جب وہ گرنے لگا تو اس نے زور سے پوچھا ”کیا ہوا؟“

جواب کون دیتا اس لیے کہ وہ تو کب کا مردے میں بدل چکا تھا۔ اس کے گرتے ہی میں نے اس کی کلاشن کوف اٹھا لی تھی۔ تبھی باہر والے نے ٹارچ جلا کر اندر قدم رکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں پستول۔ موقع گنوانا اچھا نہیں تھا۔ میں نے کلاشن کی نال اس کے سینے سے لگا دی ”پستول نیچے پھینک کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔“ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اسے اس رخ پر زمین پہ رکھا کہ اس کی روشنی نیچے گرے ہوئے شخص کے چہرے پر پڑے۔ نئے آنے والے کی نظر زمین پر پڑے ہوئے شخص پر پڑی تو اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ مجھے اس سے کوئی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں اس لیے میں نے اس سے

پستول لینے کے بعد کہا "تم سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اس لیے اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو میں تمہارے لیے محفوظ پناہ گاہ بن جاؤں گا اور اگر اڑنے کی کوشش کرو گے تو بے موت مارے جاؤ گے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"میں... میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لے کر پستول کو کمر میں اڑسا اور کہا:

"دیکھ رہے ہو میں نے بغیر کسی ہتھیار کے تمہارے ساتھی کی حالت کیا کر دی ہے اس لیے اڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ جو پوچھوں اس کا صحیح صحیح جواب دو۔"

"جی جی پوچھیں۔" اس کی آواز میں اب بھی لرزا تھا۔ اگر روشنی ہوتی تو شاید میں اسے بہتر طریقہ پر دیکھ بھی لیتا کہ وہ واقعی لرز رہا ہے یا ڈراما کر رہا ہے۔

"فی الحال مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے سڑک کس طرف ہے؟"

"کون سی سڑک؟"

"ناران جانے والی۔"

"ناران یہاں سے بالکل قریب ہے۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہم ناران میں کھڑے ہیں۔ مرکزی سڑک بتاؤں یا ذیلی؟"

"جہاں سے مجھے کوئی لفٹ مل جائے۔"

"مغرب کی طرف جو سڑک ہے وہی مرکزی ہے جو گلگت سے آرہی ہے۔"

"چلو مجھے وہاں تک لے چلو۔"

"اور یہ... اس کا کیا ہوگا؟"

"اس کا کیا ہے؟ یہ ابھی بے ہوش ہے۔ اسے کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔"

"چلیں۔" وہ بادل ناخواستہ تیار ہوگیا۔ "لیکن آپ کو پہنچا کر میں واپس آجاؤں گا۔"

"آجانا... مجھے کون سا تمہیں گائڈ بنا کر لے جانا ہے۔" کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیے۔

وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے پتھریلے راستے پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے تقریباً بیس منٹ چلے ہوں گے کہ سڑک نظر آنے لگی۔ وہ بھی اس طرح کہ سڑک پر جو گاڑیاں چل رہی تھیں ان کی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ چلتے ہوئے ہی اس نے کہا "دراصل اس عمارت تک جو سڑک آئی تھی وہ کافی کھو کر آئی تھی پھر وہ بھی ختم ہوگئی۔"

اسے بولتے دیکھ کر میں نے پوچھا "تم تو فائرنگ کرنے کے بعد فیکٹری کی طرف گئے تھے پھر ادھر کیسے آگئے۔ یعنی اس کھنڈر میں؟"

"موتی جو میرے ساتھ تھا۔ چلتے چلتے وہ رکا تھا اور ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھنے کی اسے ضرورت پیش آگئی تھی۔" کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا "وہ تو جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا اور میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ تبھی اس کھنڈر میں موبائل کی روشنی چمکی۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ جگنو ہے لیکن دوسری بار وہی روشنی دیکھی تو سمجھ گیا کہ کھنڈر میں کوئی ہے اور میں موتی کو زبردستی وہاں لے آیا۔"

"تم لوگ کب سے یہ کام کر رہے ہو۔"

"پہلے میں قلات خان کے ساتھ تھا۔ اس کا ساتھ چھوٹا تو ذاکر کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اسی دوران موتی سے ملاقات ہوگئی۔ وہی جسے آپ بے ہوش کر آئے ہیں۔ اس نے زیادہ پیسے دینے کا آفر کیا اور کہا کہ اس کام میں تھانہ پولیس کا بھی خطرہ نہیں ہے۔ ہمیں صرف جسے کہا جائے گا اسے اٹھا کر لانا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں فوراً راضی ہوگیا۔ دو مہینے سے اس کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔"

"میں بھی تمہیں ایک پتا دوں گا۔ تم کراچی آکر مجھ سے ملو تمہاری زندگی بن جائے گی۔"

"آپ کراچی میں رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے ایک اور جھوٹ گھڑا۔ "میں وہاں شرفو بھائی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ ہم لوگ سونا لاتے لے جاتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ مل گئے تو تمہاری زندگی بن جائے گی۔"

"آپ دبئی سے کام کرتے ہیں۔ میں کب سے سوچ رہا ہوں کہ کسی ایسے بندے کے ساتھ کام کروں جو دوسرے ملکوں کی سیر کرائے۔ مجھے بہت شوق ہے کہ میں دبئی جاؤں۔ آپ مجھے ضرور اپنے ساتھ لے لیں۔ اگر کہیں تو میں ابھی آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ موتی خود ہی اٹھ کر گاڑی تک چلا جائے گا۔"

اس نے گاڑی کا نام لیا تو مجھے یاد آیا کہ میرا تعاقب کرنے والے تو جیپ میں سوار تھے۔ میں نے پوچھا "جیپ کہاں روکی؟"

"شمال کی جانب سڑک کنارے۔" اس نے ہاتھ

کے اشارے سے ایک سمت دکھایا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم سڑک تک آ گئے تھے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر پوچھا ”یہ بتاؤ کہ گلگت کس طرف ہے اور ناران کس طرف۔“

اس نے اشارے سے بتایا اور اب میری نظر گلگت سے آنے والی سڑک کی طرف تھی۔ میں اسے باتوں میں پھنسائے رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ واپس جانے کی ضد نہ شروع کر دے۔ اسے تو میں نے باتوں میں پھنسا رکھا تھا۔ اگر یہ واپس چلا جاتا اور موتی کو مردہ دیکھتا تو پھر سے کوئی دوسری پریشانی کھڑی ہو جاتی اسی لیے اسے اپنا دم چھلا بنائے ہوئے تھا۔ اور ہم سڑک پر کھڑے کسی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے جس سے لفٹ لی جاسکے۔

کچھ ہی دیر بعد دوسری جانب سے آتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ آنے والی گاڑی یا تو گلگت سے آ رہی تھی یا پھر چلاس سے۔ اگر یہ گاڑی والا لفٹ دے دیتا ہے تو میں بڑی آسانی سے اس علاقے سے نکل جاؤں گا۔ پھر بڑی آسانی سے سفیر وغیرہ سے رابطہ بھی ہو جائے گا اس لیے کہ آگے کہیں نہ کہیں سگنل ضرور آتے ہوں گے۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے ہاتھ کھڑا کر کے گاڑی روکنے کا اشارہ دینے لگا۔

وہ ایک ٹرک تھا۔ اشارہ دینے پر اس نے روک لیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولا ”کہاں جانا ہے؟“

”ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ جہاں تک پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر سے آجاؤ۔“ کہہ کر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے ساتھ آنے والے کو خدا حافظ کہا اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے اور ڈرائیور کو سنانے کے لیے اس سے بولا ”جیسے ہی گاڑی ٹھیک ہو جائے ناران چلے آنا وہاں محمود ہوگا اسے گاڑی دے کر پنڈی آجانا۔“

میرے بیٹھتے ہی اس نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔ ٹرک والا کوئی باتونی لگتا تھا۔ بیٹھتے ہی بولا ”باؤ جی کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں تک جانا ہے؟“

”کراچی سے آیا ہوں۔ ٹریکنگ کے لیے شمشال گیا تھا واپس آ رہا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔“

”تو پھر اب رکنا کہاں ہے؟“ اس نے عام سے انداز میں پوچھا تھا

”تم کہاں تک جاؤ گے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”باؤ جی ہمارا کیا ہے۔ ہم تو رمتا جوگی ہیں۔ جہاں کا راستہ ملے ادھر چل دیتے ہیں۔“ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بول رہا تھا ”ہم تو دنیا کے آخری کونے تک جاتے ہیں۔ ویسے لگتا ہے آپ پنڈی تک ہی جائیں گے۔“

”نہیں بھائی ہمیں تو کراچی جانا ہے۔ پنڈی پہنچ کر ہم بائی ائر جائیں گے۔“ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس کا لہجہ بناوٹی ہے۔

”باؤ جی پنڈی سے آپ کو آگے جانے کون دے گا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ میرا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

”صاف بات ہے آپ جس کام کے لیے نکلے ہو اسے تو پورا کرو گے نا؟“ اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ میں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ ”پھر آپ کو ایک کام اور بھی کرنا ہے۔“

”کون سا کام؟“

”باؤ جی میرا گھر بھی پنڈی میں ہے اگر آپ چاہیں تو میرے گھر میں ایک دو دن ٹھہر سکتے ہیں۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن مہمان کا آنا بہت پسند کرتے ہیں۔ میں تو آپ کو ایسے جانے نہیں دوں گا۔“ اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

دل میں اگر شک کا سانپ پھن پھیلانے لگے تو رسی بھی سانپ لگتی ہے۔ وہ مجھے مہمان ٹھہرانے کی بات کر رہا تھا اور میں اس پر شک کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اس کا جائزہ لیا۔ سر پر ملگجی سی پگڑی تھی لیکن جسم بھرا بھرا اور اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پینڈو ابھی اٹھ کر آیا ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”فکر نہ کریں۔ کراچی سے لوٹ کر آپ سے رابطہ ضرور کروں گا۔“ کہتے ہوئے میں نے جیب سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر نظر پڑتے ہی دل خوش ہو گیا۔ سگنل نظر آ رہے تھے میں نے سفیر کا نمبر ملایا۔ کان سے لگاتے ہی دوسری جانب سے رنگ ٹون آتی ہوئی سنائی دی۔ میں نے جیسے ہی ہیلو کہا ادھر سے سفیر کی دہاڑ سنائی دی ”کہاں ہیں آپ۔ کوئی رابطہ نہیں۔“

”بتاؤں گا۔ فی الحال یہ بتاؤ تم سب کہاں ہو؟“

”ہم پنڈی پہنچ گئے۔ راستے میں ہی وسیم نے کمال دکھا دیا۔ اس نے ایک بندے سے بات کر لی اور اب ہم ایک ویل اسٹیبلشڈ مکان میں بیٹھے ہیں۔ بس آپ کا انتظار ہے۔“

”عمدودوار یہ بتاؤ۔“

"تم ہوٹل پہنچ کر کال کرلیں۔"

"اوکے میں کچھ دیر میں کال کرتا ہوں۔" کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔

"یہ آپ کس زبان میں بات کررہے تھے۔ میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آرہی تھی۔"

"جسے میں نے فون کیا تھا وہ غیر ملکی ہے اس لیے اسی کی زبان میں بات کررہا تھا۔" کہہ کر میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اندھیرا اب چھٹنے لگا تھا اور مشرقی سمت میں اجالا پھیلنے لگا تھا۔ صبح کے آثار ہویدا تھے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا "بھائی ہم کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟"

"بس تھوڑی دیر اور۔ اذان کے ساتھ ہم شہر کے قریب ہوں گے۔"

اس کے جواب نے مجھے مطمئن کردیا۔ میں نے سیٹ سے سر ٹکا دیا۔ پتا نہیں ذہنی تھکن تھی یا کوئی اور بات ہلکی سی جھپکی آگئی اور میں غنودگی میں چلا گیا۔

ٹرک کی آواز لوری دے رہی تھی۔ میں نیم غنودگی میں تھا۔ عام حالات میں مجھ پر ایسی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔ شاید یہ تھکن تھی یا پھر ذہنی کشمکش یا بعد کی صورت حال کہ میں نیند پر قابو نہ رکھ سکا۔

کتنا ہی اعصاب قوی کیوں نہ ہو ایک نہ ایک وقت کچھ دیر کے لیے ہی صحیح وہ کمزور ضرور ہو جاتا ہے۔ وادی سے نکلنے کے بعد سے میں محسوس کررہا تھا کہ میں کچھ کمزور ہو چلا ہوں۔ یہ غنودگی بھی شاید اسی کی طرف اشارہ تھا۔

ابھی ٹرک نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کان میں کچھ کہا ہو۔ آواز تیز نہیں تھی پھر بھی مجھے چونکا گئی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ شاید اسی کو چھٹی حس کہتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس وقت میں نیند سے بیدار نہ ہوتا تو شاید آج میں اپنی کہانی سنانے نہ رہا ہوتا۔ کیونکہ اگلے ہی پل میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی تھی اور میں نے اس میں پیچھے سے آتی شیراڈ کو دیکھ لیا تھا۔

یہ عام شارع تھی۔ ہر قسم کی گاڑیوں کو آنے جانے کی آزادی تھی۔ بہت سی گاڑیاں آتی جاتی نظر آئی تھیں اور میں نے ان پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اس شیراڈ پر توجہ اس لیے دے دی تھی کہ وہ تیزی سے نزدیک آتی جارہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹرک کو کراس کرنا چاہتی ہے۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ شیراڈ سے ایک ہاتھ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا اور اس ہاتھ میں پستول تھا۔ صبح کاذب کا وقت تھا اس لیے ہلکی روشنی تھی پھر بھی میں نے پستول دیکھ لیا۔ ڈرائیور کو ہوشیار کرتا کہ پہلے پستول کا دھماکا ہوا اور پھر ٹائر کا۔ اس نے گولی ٹائر پر ماری تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹرک روکنا چاہتے تھے۔

ٹائر کے بلاسٹ ہوتے ہی ٹرک لہرایا تھا لیکن ڈرائیور مشاق تھا۔ اس نے سنبھال لیا تھا۔ پچھلے دو ٹائیروں میں سے ایک پھٹ چکا تھا اب وہ دوسرا بھی پھاڑنے کے فراق میں ہوگا۔ اس خیال کے تحت میں نے ڈرائیور سے کہا "لگتا ہے شیراڈ میں ڈاکو ہیں۔ وہ سامنے جو دور تک پھیلی جھاڑیاں ہیں اس میں ٹرک کو گھسا کر روک لو۔ تاکہ ہم اتر کر فرار ہو سکیں۔ بعد میں آکر ٹرک لے جائیں گے۔ ابھی تو محفوظ رہنے کی سوچو۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس نے میرے مشورے کو مان لیا اور اسی طرف ٹرک کو دوڑا دیا جدھر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ قدآدم جھاڑیاں۔ عین اسی وقت میرے موبائل کا ویبریٹر آن ہوا۔ کس کی کال ہے یہ دیکھنے کے لیے میں نے موبائل نکالا مگر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے کان میں فوراً ہی لگا لیا اور بولا "ہیلو۔"

دوسری جانب سے مرشد کی مکروہ آواز آئی "کیسے ہو شہباز... میں نے کہا تھا نا کہ تم میری نظروں سے دور نہیں ہو۔ تم نے دوستوں سے الگ ہو کر سمجھا تھا کہ مجھے ورغلا دو گے۔ اور میں تمہاری فکر چھوڑ کر ان کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اسی لیے میں نے اس بار اپنے اصل بندوں کو بھیجا ہے جو تمہیں باندھ کر لائیں گے۔"

جواب دے کر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بغیر کوئی جواب دیے میں نے موبائل آف کردیا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے ٹرک کو ان اونچی اونچی جھاڑیوں میں پہنچا دیا تھا۔ جھاڑیاں قدآدم تھیں مگر ٹرک کو تو چھپا نہیں سکتی تھیں۔ شیراڈ شاید ابھی سڑک پر تھی۔ وہ لوگ اسے جھاڑیوں میں لانے کا رسک نہیں لینا چاہتے ہوں گے مگر اس سے اتر ضرور گئے ہوں گے اور ہمیں پکڑنے کے لیے ہمارے پیچھے آرہے ہوں گے۔ اس سوچ نے مجھے پھرتی دکھانے پر زور دیا اور میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے ڈرائیور سے کہا کہ وہ بھی اتر کر سیدھ میں دوڑنا شروع کردے۔

ہم لوگ ایک ساتھ نیچے کودے اور پھر دوڑے تھے اس لیے تقریباً آگے پیچھے تھے۔ دوڑتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ جھاڑیاں تھی ہی اتنی گھنی اور

اونچی کہ اس میں کسی کا نظر آنا ناممکن تھا۔ میں مسلسل دوڑ رہا تھا کہ آواز آئی ”شہباز تم بھاگ نہیں سکتے۔ اگر رکے نہیں تو میں گولی چلادوں گا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بولنے والا ٹرک کی چھت پر چڑھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے بھی ہم اسے نظر نہیں آرہے ہوں گے لیکن ہمارے دوڑنے سے جھاڑیاں ہل رہی ہوں گی اس لیے وہ اندازہ لگا چکا ہوگا کہ ہم کس طرف ہیں اور ہمارا رخ کدھر ہے۔ میں نے رکنا اپنی موت سمجھا اور دوڑتا رہا۔ تبھی ایک زوردار دھماکا گونجا۔ گردن موڑتے وقت میں نے اسے ترچھا ہوکر نشانہ لیتے دیکھ لیا تھا اس لیے ایک لمحے میں فیصلہ کیا تھا اور جھاڑیوں میں خود کو گرالیا تھا اور یہی بچت ہوئی تھی۔ لیکن ڈرائیور نے توجہ نہیں دی تھی۔ دھماکے کے ساتھ وہ لڑکھڑایا تھا اور زمین پر گر گیا تھا مگر فوراً ہی اٹھ کر رکوع کے انداز میں بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اسے گولی لگی ہے۔ فوراً ہی اس کے پاس پہنچا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا دوڑ رہا تھا لیکن اس کے قدم قابو میں نہیں تھے۔ اسے گولی کہاں لگی ہے یہ نہ پوچھنے کا وقت تھا اور نہ دیکھنے کا اس لیے میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی اسے سہارا دیا تھا۔ اور ہم پھر سے دوڑنے لگے تھے۔ گولیاں اب بھی چلائی جارہی تھیں لیکن ہم اس پستول کی رینج سے باہر آگئے تھے مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ ان کے پاس وائیڈ رینج کا بھی کوئی ہتھیار ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ کلاشن اور رائفل کی رینج میں ہم اب بھی تھے۔

ہم مسلسل دوڑ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے میرے ہونٹوں پر ہنسی آگئی اس لیے کہ نہ تو وہ بول رہا تھا اور نہ مجھے اندازہ تھا کہ ہم کس گاؤں کے نزدیک ہیں۔ مجھے الٹے ہاتھ پر روشنیاں نظر آگئی تھیں۔ خاصی بڑی بستی یا کوئی قصبہ تھا۔ اس لیے کہ لائٹ پوسٹ بھی نظر آرہے تھے اس لیے میں نے اپنا رخ ادھر موڑ دیا تھا۔ اور اب ہم اسی طرف دوڑ رہے تھے۔ ڈرائیور بالکل خاموش تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ روبوٹ ہے جو صرف دوڑنا جانتا ہے اسے اور کسی چیز سے مطلب نہیں تھا۔ بس میرے ساتھ کھنچا چلا جارہا تھا۔

جھاڑیوں نے کپڑے تار تار کردیے تھے۔ جسم پر بھی جابجا خراشیں آگئی تھیں۔ پھر بھی میری رفتار سست نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ اگر رفتار سست پڑی تو سانس کی رفتار ختم ہوجائے گی۔ یہ درندوں کی فطرت ہے کہ جب وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں تو ان کی حسیں پوری طرح بیدار ہوجاتی ہیں۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے

## زیلم خاں

(1952ء سے 2004ء) چیچنیا کے سابق صدر۔ وہ سرائے آتفی (گروزنی) میں پیدا ہوئے۔ 1981ء میں چیچن انگش اسٹیٹ یونیورسٹی سے چیچن اور روسی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری لی۔ اس کے بعد ماسکو لٹریچر انسٹی ٹیوٹ سے پوسٹ گریجویشن میں ڈپلوما لیا۔ ایک سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ادیب اور شاعر بھی تھے، ان کی شاعری کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ وہ چیچن انگش روسی کے علاوہ عربی زبان بھی جانتے تھے۔ 1989ء میں انہوں نے ایک سیاسی جماعت وائی نخ ڈیموکریٹک پارٹی تشکیل دی۔ انہوں نے ابخازیہ کے دارالحکومت سوخومی میں قفقاز کی مظلوم قوموں کا کنونشن بھی بلایا، جس میں پورے قفقاز سے لوگ شریک ہوئے۔ اکتوبر 1991 کے انتخابات میں جوہر دودائف صدر منتخب ہوئے تو انہیں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ سوویت یونین کے آخری دور میں روس میں بغاوت کے دوران چیچنیا کی آزادی کا اعلان کردیا۔ اپریل 1992ء میں صدر جوہر دودائف شہید کردیا گیا تو انہیں ملک کا صدر بنا دیا گیا۔ مئی 1996ء میں روسی صدر یلسن اور ان کے مابین اندر بے کے درمیان جنگ بندی اور جنگی قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ ہوا۔ اگست 1996ء کو روس کی قومی سلامتی کے چیف الیگزینڈر لیبڈ اور ارسلان مسخادوف کے مابین معاہدہ امن طے پایا۔

مرسلہ: محمد تقی، جھنگ صدر

اندر بھی درندوں کی حس ہے اور اس وقت میرے اندر بھی ایک درندہ بیدار ہو چکا تھا۔اس وقت میرے سامنے جو بھی آتا میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔اپنی جان بچانا ہر ایک پر فرض ہے اور جان بچانے کے لیے کسی کا بھی خون کیا جا سکتا ہے۔

جھاڑیوں سے باہر آتے ہی میری نظر ایک ایسے مکان پر پڑی جو دوسرے گھروں سے زیادہ فاصلے پر تھا اور اس وقت وہی مجھے جائے پناہ نظر آیا۔میں ڈرائیور کو گھسیٹتا ہوا ادھر بڑھا تھا کہ اس نے کہا" اس گھر میں پناہ ملنی مشکل ہے اس لیے کہ یہ حکمت خان کا بنگلا ہے اور اس وقت بھی اس بنگلے میں آٹھ دس لوگ ہوں گے۔اس کے عقب میں کئی اور گھر ہیں۔انہی میں سے کسی کا انتخاب کرو۔"

اس نے اس دوران پہلی بار زبان کھولی تھی، کچھ کہا تھا۔لیکن جو کہا تھا اس میں وزن تھا اس لیے میں نے ادھر جانے کا خیال موقوف کردیا۔اور اس گھر کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔سامنے ایک گلی سی نظر آئی اس لیے کہ اس میں بہت سارے مکان قطار سے نظر آرہے تھے۔میں اس گلی میں داخل ہو گیا۔ابھی ہم ایک گھر میں داخل ہونے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اس گلی میں یکایک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ چمکی۔گاڑی دوسری طرف سے داخل ہوئی تھی۔اب سوچنا، غور کرنا عبث تھا۔میں نے سامنے والے گھر میں قدم رکھ دیا۔احاطہ کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔میں نے پہلے ڈرائیور کو سہارا دے کر چڑھایا اور پھر خود بھی چڑھ گیا اور پہلے اسے سہارے سے نیچے اتارا پھر خود بھی اتر گیا۔یہ کام اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ اب سوچتا ہوں تو ناقابل یقین لگتا ہے۔جب زندگی داؤ پر لگی ہو تو پھرتی ٹوٹ کر برستی ہے۔نیچے اترنے کے بعد بھی میں کسی چیتے کی طرح ہوشیار تھا اور ہر طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔احاطے میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔اگر یہ احاطہ کسی بڑے شہر میں ہوتا تو مالک اسے گارڈن بنانے کی پوری کوشش کرتا لیکن یہاں سوائے گھاس کے کچھ بھی نہیں تھا۔خالی قطعہ زمین کو پار کر کے میں آگے بڑھا۔میں نے ڈرائیور کا پورا وزن اپنے کندھے پر اٹھا لیا تھا۔پھر بھی وہ خود کو گھسیٹنے کے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔

خالی زمین کو پار کرنے کے بعد ہم برآمدے میں پہنچے۔برآمدے کے بعد ایک دروازہ تھا جو بند نظر آرہا تھا۔میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔پورے احاطے کا جائزہ لیا لیکن ہر طرف خاموشی تھی۔جو لوگ گلی میں داخل ہوئے تھے وہ بھی نظر نہیں آئے یعنی ان کی گاڑی کی ہیڈ لائٹ نہیں چمکی۔میں نے ادھر سے توجہ ہٹا کر دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔دروازہ کھلتا چلا گیا۔اندر اندھیرا تھا۔میں نے اندر قدم رکھ دیا۔وہ ایک بڑا سا کمرا تھا جسے شاید ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لیے کہ وہ کمرا فرشی قالین سے سجا ہوا تھا۔قالین شاید خوبصورت بھی ہو لیکن اندھیرے کی وجہ سے ہم دیکھ نہیں پائے تھے۔پیروں کے نیچے آنے پر پتا چلا تھا کہ قالین بچھا ہے۔میں ڈرائیور کو سہارا دیے ہوئے اندر کی طرف بڑھا۔کمرے کے اختتام پر جو دروازہ تھا اسے پار کرتے ہی میں نے خود کو ایک دوسرے کمرے میں پایا۔یہ بیڈ روم تھا۔بڑا سا بیڈ بچھا ہوا تھا۔بیڈ پرانے انداز کا تھا لیکن اس کا جائزہ لینے کی فرصت نہیں تھی۔میری نظریں اس پر سوئے ہوئے دو جسموں پر ٹک گئی تھیں۔ان میں ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی تھی۔یوں لگ رہا تھا کہ نئی شادی ہوئی ہے۔اس لیے کہ دیوار پر ایک ہار بھی لٹکا ہوا تھا۔نوٹوں کا ہار۔عام طور پر لوگ کئی کئی سال تک ایسے ہار کو یادگار کے طور پر رکھتے ہیں۔میں نے الماری پر نظر ڈالی وہ بھی نئی تھی۔کمرے کا جائزہ لے کر نظریں واپس ان دونوں پر آگئیں۔

وہ دونوں ہر طرف سے بے خبر خواب خرگوش میں ڈوبے ہوئے تھے۔میں نے ڈرائیور کو دیوار کے سہارے کھڑے ہونے کو کہا اور آگے بڑھ کر ان پر ڈھکے کمبل کو کھینچ لیا۔لڑکی کسمسائی لیکن لڑکے کی آنکھ کھل گئی۔وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ چیخنے والا تھا لیکن اس کی چیخ حلق میں ہی گھٹ گئی تھی۔اس لیے کہ اس نے میرے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔یہ وہی پستول تھا جو میں نے موتی کے ساتھی سے چھینا تھا۔پستول دیکھتے ہی اس کی ہوا سرد ہو گئی۔اس نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔شاید وہ کانپ بھی رہا تھا اس لیے کہ لڑکی نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں اور پھر وہ بھی اٹھ بیٹھی تھی۔بیٹھتے ہوئے اس نے کمبل سے اپنے کو ڈھک لیا تھا۔اس کا چہرہ بھی خوف سے دھواں دھواں ہو گیا تھا۔میں نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا" بیٹی خوف نہ کرو۔ہم کسی کو نقصان پہنچانے نہیں آئے ہیں۔کچھ دشمن ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ان سے بچنے کے لیے اندر آگئے ہیں۔"

اس لڑکے سے زیادہ جی دار لڑکی تھی۔اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور دھیمے لہجے میں بولی" انکل ہم غریب لوگ ہیں۔ہمارے پاس کچھ نہیں ملے گا۔"

" بیٹی جب میں نے کہا کہ ہم لوٹنے نہیں آئے ہیں

اور نہ ہم ایسا کوئی کام کرتے ہیں۔ بس دشمنوں سے بچنے کے لیے یہاں آگئے ہیں۔ ابھی چلے جائیں گے۔" میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈرائیور کھڑے کھڑے گر گیا۔ شاید اس میں اب کھڑے ہونے کی قوت نہیں رہی تھی۔ میں نے سر موڑ کر اسے دیکھا۔ تبھی لڑکی بولی:

"انکل اگر آپ اجازت دیں تو یہ ان کو جا کر اٹھا دیں۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

لڑکے کو لڑکی نے زبردستی دھکیل کر ڈرائیور کی طرف بھیجا اور پھر خود بھی اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ لڑکے نے ڈرائیور کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا تھا کہ وہ کراہا "مجھ سے اٹھا نہیں جائے گا۔ میرے پیروں میں قوت بالکل نہیں ہے۔"

لڑکی نے مڑ کر کہا۔ "انکل آپ اگر اجازت دیں تو میں ان کا زخم دیکھ لوں کیوں کہ ان کی شلوار خون سے لت پت ہو رہی ہے۔ شاید گولی لگی ہے۔ میں مقامی اسپتال کی اکلوتی نرس ہوں مجھے زخم صاف کرنے کا تجربہ بھی ہے۔"

"دیکھ لو۔" میں نے نزدیک آ کر کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں برابر والے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لاؤں۔" لڑکی نے اجازت طلب کی۔ میں مخمصے میں پھنس گیا۔ لڑکی کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کافی چالاک ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی وہ دروازہ بند کر لے اور شور مچانا شروع کر دے۔ اگر میں اس کے پیچھے جاتا ہوں تو یہاں یہ لڑکا اکیلا رہ جائے گا اور ڈرائیور اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ اسے روک سکے۔ میرے ہٹتے ہی وہ شور مچانا شروع کر دے یا بھاگ کر باہر نکل جائے۔

"کیا سوچنے لگے انکل۔ میں آپ لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ پر شک نہ کریں۔" لڑکی نے پھر کہا۔ عین اسی وقت باہر گلی میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ گاڑی آگے آ کر دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ میں نے کھڑکی پر جا کر دیکھا۔ کھڑکی پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں نے نہایت احتیاط سے ذرا سا پردہ سرکایا اور باہر کی جانب نظر ڈالی۔ جس مکان میں ہم چھپے ہوئے تھے اس سے دو مکان آگے والے دروازے پر گاڑی کھڑی تھی۔ اندر اندھیرا تھا پھر بھی مجھے اندازہ تھا کہ اندر بیٹھے لوگوں کی نظریں ہر جانب چکرا رہی ہوں گی۔ وہ ایک ایک کھڑکی دروازے پہنچ کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ اگر گلی کے ایک مکان سے باہر آتی روشنی اس گاڑی پر نہ پڑ رہی ہوتی اور اس روشنی میں اندر بیٹھے شخص کے ہاتھ میں تھامی ہوئی کلاشن کوف نظر نہ آتی تو میں اسے اتفاقاً آئی ہوئی گاڑی سمجھتا لیکن کلاشن دیکھتے ہی میں پوری طرح ہوشیار ہو گیا تھا۔ میں آڑ میں کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اندر دو افراد ہیں یا زیادہ ہیں۔ اور یہ لوگ کس مقصد سے رکے ہوئے ہیں۔

میں تو ان لوگوں کی جانب متوجہ تھا اس لیے دیکھ نہیں پایا کہ اتنی دیر میں وہ لڑکی اپنا بیگ اٹھا لائی تھی۔ میں اس گاڑی کی جانب اس قدر محو تھا کہ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ وہ کب دوسرے کمرے میں گئی اور کب وہ بیگ اٹھا کر لائی۔ اور اب وہ مجھے آواز دے رہی تھی۔ اس کا پکارنا سرگوشی کے ذمرے میں آ رہا تھا۔ وہ بہت ہلکی آواز میں پکار رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ قینچی سے ڈرائیور کی شلوار کو سیدھ میں کاٹ رہی تھی۔ اس لیے کہ پائنچا اوپر جانا مشکل تھا۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا کر باہر دیکھا۔ گاڑی اب بھی اسی جگہ کھڑی تھی۔ دونوں کام ضروری تھے۔ گاڑی پر بھی نظر رکھنا تھا اور لڑکی کی مدد کے لیے ڈرائیور کا پیر بھی پکڑنا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو سنبھالنا ضروری جانا اور مڑ کر ان کے پاس آگیا۔

لڑکی نے شلوار کو اوپر تک چاک کر دیا تھا اور اب وہ زخم کو دیکھ رہی تھی۔ معائنے کے بعد بولی "میں تو ڈر رہی تھی کہ گولی اندر نہ رہ گئی ہو لیکن اللہ کا شکر ہے کہ گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس لیے صرف بینڈیز کرنا کافی ہوگا۔"

اتنا کہہ کر اس نے ٹنچر سے زخم کی صفائی شروع کر دی۔ ٹنچر کی سوزش کا عکس ڈرائیور کے چہرے پر ابھر... رہا تھا۔ جلن کی وجہ سے وہ ہونٹوں کو دانتوں میں دبا رہا تھا۔ زخم کی مکمل صفائی کے بعد اس نے پائیوڈین لگا کر بینڈیز کر دی لیکن کہہ دیا کہ شہر پہنچ کر کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ ضرور کر لیں۔" پھر اس نے پین کلر کا انجکشن بھی لگا دیا جس کی وجہ سے ڈرائیور کو آرام آگیا تھا۔

میں دوبارہ سے کھڑکی کے پردے کی آڑ سے جھانکنے چلا گیا۔ نیچے نظر ڈالی تو ایک اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ گلی خالی پڑی تھی۔ شاید وہ لوگ مایوس ہو کر جا چکے تھے۔ میں نے واپس آ کر لڑکے سے پوچھا "کام کیا کرتے ہو؟"

"جی میں اسپتال کا ڈرائیور ہوں۔ اکلوتی ہائی روف جس پر ایمبولنس لکھا ہے اسے چلاتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو

# ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔


ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

گھر سے لانا لے جانا اور ان کی ضرورت کی چیزیں بازار سے لانا میرے ذمے ہے۔"

اس جواب نے مجھے خوش کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ "ایمبولنس باہر تو نظر نہیں آئی۔ ہے کہاں؟"

"وہ گھر کے پیچھے کھڑی کرتا ہوں۔ وہیں کھڑی ہے۔"

"اسے میں لے جا رہا ہوں۔ کل صبح پنڈی کے راجا بازار کی جامع مسجد کے سامنے کھڑی ملے گی۔ وہاں سے لے لینا۔"

"نہیں...... یہ ناممکن ہے۔ میری نوکری کا سوال ہے۔"

"دیکھو بھائی۔ میں زور زبردستی بھی کر سکتا ہوں لیکن تمہاری بیوی نے جس طرح ہمارے ساتھ تعاون کیا اس کی وجہ سے میں کہہ رہا ہوں کہ صبح جا کر لے لینا۔ یوں سمجھ لو کہ میں اسے کرایہ پر لے جا رہا ہوں۔ یہ لو پانچ ہزار۔ رات بھر کی بات ہے۔"

لڑکی نے دخل دیا "یہ جو کہہ رہے ہیں سن لو۔ اس میں ہمارا نقصان کیا ہے۔ تم پہلی بس سے نکل جانا۔ اگر یہ اجازت دیں تو انہی کے ساتھ چلے جاؤ۔ ان کو مطلوبہ جگہ اتار کر واپس آ جانا۔"

"ہاں ایسا بھی کر سکتے ہو۔" میں نے اجازت دے دی۔

لڑکا ابھی بھی تردد میں تھا کہ لڑکی بولی "اب سوچ کیا رہے ہو۔ ہمارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔ اگر یہ چاہیں تو پستول دکھا کر بھی ایمبولنس لے جا سکتے ہیں۔ اس لیے پانچ ہزار مل رہے ہیں تو برا کیا ہے۔"

"چلیے!" لڑکا تیار ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا "بھائی میاں، اب طبیعت کیسی ہے؟ سفر کر سکو گے نا؟"

"جی ہاں بہتر ہے۔ مجھے اپنے ٹرک کی فکر کھائے جا رہی ہے۔"

"ٹرک انشورڈ ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"تو فکر کیسی... ایک دو دن بعد آ کر لے جانا۔ انہیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ وہ میرا شکار کرنا چاہتے تھے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ مجھے اس بندے نے پستول دکھا کر مجبور کر دیا تھا۔"

"وہ مان لیں گے؟" اس نے معصوم لہجے میں پوچھا۔

"بھائی، وہ لوگ میری تلاش میں آئے تھے، میں ان کے ہاتھ نہیں آیا مجبوراً وہ لوٹ گئے۔ اب تک تو پنڈی پہنچ چکے ہوں گے۔ کوئی مقامی تو تھے نہیں جو تمہارے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔"

"بات تو آپ کی دل کو لگتی ہے۔ میں نے اب تک کسی سے دشمنی مول نہیں لی ہے اس لیے کوئی میرا دشمن کیوں بنے گا۔"

"بالکل... تم ایک معصوم سے آدمی ہو۔ وہ پاگل تو ہیں نہیں کہ خوامخواہ تمہارے دشمن بن جائیں۔ اس لیے تم بے فکر رہو۔ وہ لوگ تمہیں دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیں گے۔"

"تو کیا میں گاڑی دیکھنے ابھی نکل جاؤں۔"

"نہیں ابھی نہیں۔" پھر میں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر اس سے پوچھا "اگر یہ یہاں، باہر والے کمرے میں صبح تک کے لیے ٹھہر جائے تو کیسا رہے گا۔ تم اپنا کمرا اندر سے لاک کر لینا؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر اس بات کے لیے بھی آپ ہماری کوئی مدد کر دیں تو زندگی بھر دعائیں دیں گے۔" اس نے نہایت خوبصورت انداز میں رشوت مانگ لی اور میں نے مسکراتے ہوئے مزید پانچ ہزار اسے دے دیا۔ کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو چکا تھا کہ لڑکی بہت چالاک ہے اور لالچی بھی۔ ایسے لوگوں سے من پسند کام نکلوانا بہت آسان ہوتا ہے اسی لیے میں نے بغیر حیل و حجت کے روپیا دے دیا تھا۔ رقم دیکھ کر لڑکا اور لڑکی دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ ایک ساتھ دس ہزار کی آمدنی ہو گئی تھی۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "تم باہر والے کمرے میں آرام کرو۔ صبح اٹھ کر ٹرک تلاش کر لینا۔ انشا اللہ وہ محفوظ ملے گا۔ اگر کوئی نقصان ہوا بھی تو انشورنس والے پورا کر دیں گے۔"

"ان لوگوں نے نقصان نہ پہنچایا ہو تو یقیناً محفوظ ہو گا۔ ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ ٹرک کو چھیڑے۔ آپ کہتے ہیں تو میں رک جاتا ہوں۔ باجی اندر سے اپنا کمرا بند کر لیں۔ یوں بھی میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ بستر پر گرتے ہی نیند آ جائے گی۔"

"میں آپ کو بستر دے رہی ہوں۔ آپ اس کمرے میں بچھا کر آرام سے سو جائیں۔ تب تک شہزاد بھی واپس آ جائیں گے۔ میں ناشتا کرا کر آپ کو رخصت کردوں گی۔"

جو کام مشکل لگ رہا تھا وہ بڑی آسانی سے ہو گیا تھا۔ شہزاد ایمبولنس لانے کے لیے باہر جا چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور پر نظر ڈالی اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے سائے تھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ لفافہ نکالا جس میں رقم تھی۔ اس کے اندر دیکھتے ہی مایوسی چھا گئی۔ شاہ خرچی نے... ور یادتی نے سارے پیسے ختم کر دیے تھے۔ بمشکل دس

ہزار بچے ہوں گے۔ میں نے اس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکالے اور ڈرائیور کی طرف بڑھا کر بولا ”یہ رکھ لو اگر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہوگی تو کام آجائیں گے۔“

اس نے ہاتھ بڑھا تو دیا تھا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ لینا نہیں چاہتا ہے۔ اس نے کہا ”سر آپ اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ میں شام تک پنڈی پہنچ جاؤں گا۔ آپ کی دعوت مجھ پر قرض ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کاغذ پر اپنا نمبر لکھ کر دے دیا۔ اتنے میں باہر سے گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور میں باہر کی جانب چل پڑا۔ باہر آیا تو ایمبولنس کھڑی تھی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ شہزاد نے ایمبولنس چلا دی۔ اب میں ایک بار پھر پنڈی کی جانب عازم سفر تھا۔ میں نے راستے میں شہزاد کی خاموشی توڑنے کے لیے پوچھا ”بھئی شہزاد! تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں؟“

”جی سات مہینے ہوئے ہیں۔“ اس نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے جواب دیا۔

”والدین کہاں ہیں؟“

”میرا گھر چترال میں ہے۔ یہاں نوکری کے لیے آیا تھا کہ نسیم سے محبت ہو گئی اور پھر ہم نے شادی کرلی۔“

”کیا وہ بھی چترال کی ہے؟“

”جی نہیں، وہ پنجاب کی ہے۔ اس کی یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔“

باتوں کے درمیان راستہ طے ہوتا جا رہا تھا۔ جس اسپیڈ سے ہم آگے بڑھ رہے تھے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم پو پھٹنے تک پنڈی پہنچ جائیں گے۔ آگے کوئی چھوٹی سی بستی تھی اس لیے کہ وہاں روشنی نظر آرہی تھی۔ تبھی شہزاد بولا ”سر اگر آپ کہیں تو میں سامنے والے ہوٹل پہ رک جاؤں۔ چائے پی کر آگے بڑھتے ہیں۔ دراصل مجھے نیند ستا رہی ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے تائید کردی۔

سوچا اس بہانے میں علاقے کا جائزہ بھی لے لوں گا۔ اگر کوئی پیچھا کر رہا ہوگا تو پتا چل جائے گا۔ کیونکہ اس پہر خال خال ہی گاڑیاں آ کر رکتی ہوں گی۔

اس نے کچھ آگے جانے کے بعد ایک ڈھابے پر گاڑی روک دی۔ اس ہوٹل پر ایک دو گاڑیاں کھڑی تو تھیں لیکن جاگتا ہوا کوئی نہ تھا۔ اس نے گاڑی روکتے ہی ہارن بجایا تھا۔ شاید یہ ہارن کی آواز کا اثر تھا کہ ایک بندہ جن کی طرح نمودار ہو گیا۔ اس نے آتے ہی کچھ پوچھا۔ سوال چترالی زبان میں کیا گیا تھا اس لیے میں کچھ نہیں پایا۔ لیکن شہزاد نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ آرڈر سنتے ہی واپس چلا گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن میں اطراف کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ اسی لیے وہ شخص میری نظروں میں آ گیا تھا۔ وہاں بہت سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ خالی تھیں اور کچھ پر لوگ لیٹے ہوئے تھے لیکن وہ شخص خالی چارپائیوں کو نظر انداز کر کے ایک پیڑ کے نیچے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چائے بنتی پھر آتی اس لیے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر شہزاد نے پوچھا ”واش روم جائیں گے؟“

”نہیں۔“ کہہ کر پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں اٹھ کر اس پیڑ کے نیچے بیٹھے شخص کے پاس چلا گیا۔ اس لیے کہ وہ مجھے بہت پریشان سا نظر آرہا تھا شاید کسی بڑی مصیبت میں گرفتار تھا۔

میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا ”کیوں بھائی کیا بات ہے۔ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہو؟“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے سر اٹھایا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ شاید وہ رو رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اس سے پوچھا ”بھائی کوئی حادثہ ہوا ہے کیا؟ مجھے بتاؤ شاید میں کوئی صحیح مشورہ دے سکوں؟“

اس نے دوبارہ سر اٹھایا اور کہا ”بھائی جس کام سے آئے ہو وہ کرو میرے زخم کو نہ چھیڑو۔“

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اردو صحیح طور پر بول نہیں سکتا پھر بھی اپنی بات کہہ رہا تھا۔ اور ہم سمجھ بھی رہے تھے۔ اس کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ غمگین ہے۔ اب مجھے اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے کہا ”بھائی مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ دکھ بتانے سے بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔“

شاید یہ میرے لہجے کا اثر تھا کہ وہ دوبارہ سے سسک پڑا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولا ”بھائی جب تک کسی کو بتاؤ گے نہیں اس وقت تک اس مسئلہ کا کوئی حل کیسے بتا سکتا ہے۔ اپنا دکھ بتاؤ شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”بھائی میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ ہم جس گاؤں

میں رہتا ہوں وہیں ایک فیض خان بھی رہتا ہے۔ اس کے پاس بہت پیسا ہے اور اسی وجہ سے وہ ہم جیسے غریبوں کا خون چوستا ہے۔ لوگوں کو ادھار رقم دیتا ہے اور پھر اس کے سود سے قرض لینے والے کی مٹی خراب کر دیتا ہے۔ میری بیٹی کی شادی جس لڑکے کے ساتھ ہونا تھی وہ برات لے کر آ گیا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر تاریخ دی تھی کہ فیض خان سے رقم ادھار لے کر باراتیوں کا کھانا وغیرہ کر دوں گا۔ ہمارے علاقے میں جہیز دینا لینا ہوتا نہیں ہے لیکن......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"لیکن کیا؟ اس لڑکے نے جہیز مانگ لیا ہے؟"

اس نے دوبارہ سے آنکھوں پر ہتھیلی پھیر کر بہہ آئے آنسوؤں کو پونچھا پھر بولا "ہوا یہ کہ فیض خان نے قرض دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن عین وقت پر اس نے کچھ نہیں دیا۔ پھر بھی میں نے براتیوں کی دعوت کا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن جب نکاح ہو گیا تو لڑکے نے ایک عجیب بات کر دی۔ اس نے جھوٹ کہہ دیا کہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے موٹر سائیکل دوں گا۔ اگر میں نہیں دیتا تو جھوٹا ثابت ہو جاؤں گا اور وہ یہی چاہتا ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ اسے ایسا کرنے کے لیے فیض خان نے ورغلایا ہے کیونکہ وہ خود میری بیٹی پر نظر رکھتا ہے۔ اس نے اشارے اشارے میں ایک بار یہ بات مجھ سے کہی تھی لیکن اب خیال آ رہا ہے کہ یہ پوری سازش اسی کی ہے کہ میری بیٹی کی برات لوٹ جائے۔ اب میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں کہ بیٹی کو رخصت کر سکوں۔" وہ پھر سے رونے لگا تھا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا "رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کتنی دور ہے تمہارا گاؤں؟"

"جی ۔ وہ جو روشنی دکھائی دے رہی ہے وہ میرے گاؤں کی ہے۔"

"ایسا کرو تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔" میں نے اس سے کہا اور واپس شہزاد کے پاس آ گیا۔

شہزاد چائے کا سپ لے رہا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی بولا "کوئی شناسا مل گیا ہے کیا۔ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے ہیں۔"

"شناسا تو نہیں لیکن ایک مصیبت کا مارا ہے۔ ہم لوگ زندگی بھر گناہ پر گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن جب بھی موقع ملتا ہے ایک دو اچھے کام بھی کر لیتے ہیں تا کہ گناہوں کی طویل فہرست کے ساتھ اچھے کام کی بھی فہرست بن جائے۔ شاید کچھ تلافی ہو جائے۔"

"میں سمجھا نہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیسا گناہ؟"

"بھائی میں نے اردو میں بات کی ہے۔ انسان زندگی بھر گناہ کرتا ہے لیکن گناہ کو کم کرنے کے لیے نیکی بھی کرتے رہنا چاہیے۔ نیکی کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ رہا ہے سوچ رہا ہوں کر لوں۔"

"اگر کوئی نیکی کا کام ہے اور میری مدد چاہیے تو میں بھی حاضر ہوں۔" شہزاد نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تمہاری مدد چاہیے۔ ٹھہرو میں اس بندے سے بات کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے چائے کا کپ خالی کیا اور اس بندے کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بندہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے کہا "اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور مجھے راستہ بتاتے رہنا۔"

اس نے بغیر کچھ کہے میری ہدایت پر عمل کیا اور جا کر گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں نے چائے لانے والے کے ہاتھ پر سو روپے کا نوٹ رکھا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شہزاد بھی آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے شخص سے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی منیر نام ہے۔ منیر الاسلام۔"

"منیر میاں راستہ بتاتے رہنا۔" کہہ کر میں..... اندھیرے میں پچھلے راستے کو دیکھنے لگا۔ کہیں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ اب اذان کا وقت قریب آ رہا تھا اور اس وقت گاؤں دیہات میں لوگ بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

"سر ایک بات بولوں۔" شہزاد نے کہا۔

"بولو۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچے راستے پر نظریں لگائے کسی سوچ میں گم تھا۔

"سر آپ پہلے ہی دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ کہیں یہ بندہ کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔"

شہزاد کی بات میں وزن تھا۔ مرشد نے عجیب و غریب چال پھیلا رکھا تھا۔ ہر دوسرا شخص اس کا بندہ نکل رہا تھا کہیں یہ بھی اس کی کوئی چال نہ ہو، میں کچھ دیر کے لیے الجھ گیا تھا لیکن اب آدھے راستے سے مڑوں تو کیسے یہ مجھ سے باہر کی بات تھی۔ کافی سوچنے کے بعد میں نے کمر پر تھپکی دے کر پستول کی موجودگی کا احساس کیا۔ ابھی......

کہانی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں

(نزہت افشاں کا جواب)

قاضی شرف معروف حمیدی.........کراچی

یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا
اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا

عباس علی.........بہاولپور

یاد کے سرمئی دھندلکوں سے
ایک سایہ ہمیں بلاتا ہے

(عنایت تبسم مظفر گڑھ کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان.........ڈہرانوالہ

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

(نوشین اختر کا جواب)

نجمی رحمٰن.........برٹ لیٹ یو ایس اے

مجھ سے مجھ تک ہی تھا کتنا فاصلہ
رہبروں کی گمرہی تھی میں نہ تھا

شبیر فدا.........لاہور

مرے دل پر وہ اب چھانے لگا ہے
مجھے دن رات تڑپانے لگا ہے

(سارہ عتیق کا جواب)

عبدالحکیم ثمر.........کراچی

اس کو ہی جینا کہتے ہیں تو یونہی جی لیں گے
اف نہ کریں گے لب سی لیں گے آنسو پی لیں گے

نورین تبسم.........سکھر

آج ہمیں بارش کا پہلا قطرہ بننا ہے
تم کچھ دیر رک جاؤ ابر ہونے تک

(ساجد فاروق کا جواب)

عبدالغفار.........ایبٹ آباد

اتنا ٹوٹا ہوں کہ چھونے سے بکھر جاؤں گا
اب اگر اور دعا دو گے تو مر جاؤں گا

(عنایت تبسم مظفر گڑھ کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری.........سرگودھا

میرے دل پر بھی کڑی عشق میں گزری ہے مگر
میں نے اس پر بھی محبت کو نبھا رکھا ہے

امتیاز سومرو.........لاڑکانہ

مرے وجود سے اب بھی دھواں سا اٹھتا ہے
کس آگ سے بھلا تو نے مجھے گزارا تھا

تبسم شبیر.........سکرنڈ

یہ آنسوؤں میں ڈوب کے سراپا ناز بن گئی
وہ چند مسکراہٹیں جو میرے نام کر گیا

درشہوار عابدی.........نوشہرہ

ملا دو خاک میں ہم کو مگر دھیان رہے
ہم جیسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے

(ملک شیر ملک رحیم یار خان کا جواب)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

افراسیاب سیال.........چنیوٹ

تنہا زندگی میری سلامت
کسی کی زندگانی میں نہیں ہوں

انجم توقیر.........لاہور

یہ صبح کون سا خورشید لے کے اتری ہے
جو آج روشنی میرے مکان تک آئی ہے

محمد فہیم.........کوٹ ادو

یہی تو عنوانِ کرم ہے تو زہے لطف و کرم
سانس چلتی ہے تو چلتے رہیں نشتر تیرے

اکرام اللہ وجھی.........سیالکوٹ

یہ خدا بن کے رعایت نہیں کرتے وصی
ان حسن والوں کو کبھی قبلہ و کعبہ نہ بنا

(عینی فہیم گوجرانوالہ کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری..........لاہور

آفریں ہے اس کی بے لوث محبت پر
جس کی صداؤں میں میرا ذکر رہا خوشبو کی طرح

اطہر حسین..........کوئٹہ

اتنے سلیقے سے یاد آتے ہو تم
جیسے بارش ہو وقفے وقفے سے

اسفند خان..........پشاور

اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے تا دیر اسے دہرائیں کیا
وہ زہر جو دل میں اتار لیا اب اس کے ناز اٹھائیں کیا

عباس علی..........ٹنڈو الہ یار

ایک سے ایک خداوند ملا سجدہ طلب
آدمی سخت مراحل سے خدا تک پہنچا

انجم پرویز..........واہ کینٹ

آتی ہے تو کانٹے بھی دعا دیتے ہیں اس کو
جاتی ہے تو گلشن کو رلا جاتی ہے خوشبو

(عارفہ توقیر لاہور کا جواب)

سید محمد حسین شاہ..........انجرہ جنڈ اٹک

وابستہ مری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کردیا

(عظمیٰ سید لاہور کا جواب)

نسرین حسین..........لاہور

وقت کٹ جائے گا ہر صورت
تو کوئی شرط زندگی تو نہیں

(عنایت علی لاہور کا جواب)

حمزہ علی..........سیالکوٹ

عورت پیتل بھی بیچے تو خریدار بہت
مرد سونا بیچے تو کوئی نہ خریدے

حمید اختر..........شہر سلطان

عالمِ خواب سے کیوں جاگے ہو برہم ہو کر
قصہ درد تمنا تو سنا لینے دو

نازش حسن..........کراچی

عشرتوں کا شکار ہو جائیں
کیا یہی مقصدِ ترقی ہے

(مجی رحمٰن برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

محمد شفیق احمد..........بہاولپور

تھے حادثوں کے وار تو کاری مگر مجھے
مرنے نہیں دیا خلشِ انتقام نے

زریں مجید..........لاہور

تمہاری راہ میں شاخوں پر پھول سوکھ گئے
کبھی ہوا کی طرح اس طرف بھی ہو لیتا

انیس قائم خانی..........حیدرآباد

تیز بارش کا مزہ لوٹنے والوں پہ نہ جا
وہ تیری خستہ مکانی کو کب سمجھتے ہیں

اریبہ آفاق..........دینہ جہلم

تعبیر جو مل جاتی تو اک خواب بہت تھا
جو شخص گنوا بیٹھے ہیں نایاب بہت تھا

فاطمہ توفیق چوہان..........لاہور

تیری آنکھیں یہ تیرے لب جن سے
زندگانی ادھار لی میں نے

زیبا رؤف..........کراچی

تھی اپنے آپ سے ملنے کی آرزو جس میں
تمام عمر وہی ایک گھڑی نہیں آئی

ثمینہ اکرام..........اوکاڑہ

تسکین محبت کے فقط دو ہی طریقے تھے
بادل نہ بنا ہوتا یا تم نہ بنے ہوتے

(غیاث شیدی کراچی کا جواب)

اشرف الدین..........العین یو اے ای

نکلے گا کبھی سورج بدلے گا کبھی موسم
دیکھیں گے کبھی ہم بھی اے دل تری تابانی

احمد اشرف..........مظفر گڑھ

نہ جانے کتنے چراغوں کا خون ہوا ہو گا
نہیں ہے سہل کسی دل کو بے وفا کہنا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
130
30 اکتوبر 2016ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.................................ہے۔

نام:.................................

پتا:.................................

.................................

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اکتوبر 2016ء تک علمی آزمائش 130 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
# بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام.................................

پتا.................................

.................................

محترم / محترمہ ......... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
91

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

# علمی آزمائش۔ 130

ادارہ

**ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ**

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک گمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح بیسرڈاک بھیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2016 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

### اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ملتان میں 3 جولائی 1952 میں پیدا ہوئے۔ بائیں ہاتھ کے بیٹس مین اور لیگ بریک گگلی بالر تھے۔ 1985 تک ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔ 2821 رنز بنائے جن میں 4 سنچریاں شامل ہیں۔ بہترین اسکور 125 ہے۔ 51 وکٹیں حاصل کیں۔ 20 کیچ پکڑے۔ پاکستان کے نامور کرکٹ کھلاڑی کہلاتے ہیں

### علمی آزمائش 126 کا جواب

عبدالستار ایدھی بانٹوا نامی علاقے میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کا دکھ اٹھا کر پاکستان آئے تو ماں پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اپاہج ہو گئیں۔ وہ علاج کے لیے کوشش کرتے رہ گئے لیکن ماں کو بچا نہ سکے۔ اس دکھ نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے خود سے عہد کیا کہ اپنی ماں کو تو بچا نہ سکا لیکن دوسروں کو بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ کل جمع پونجی سے انہوں نے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کی اور خدمتِ انسانیت میں لگ گئے۔ نیت صاف تھی۔ خدمت کا جذبہ قوی تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بنگلہ دیش، ایتھوپیا، فلسطین، افغانستان غرض بہت سارے ممالک میں امدادی کام کرنے لگے۔

## انعام یافتگان

1۔ امداداللہ، پشاور۔ 2 ناصر الحسن زیدی، جہلم۔ 3 آفاق عثمانی، حیدرآباد

4۔ نسرین عارف، کوئٹہ۔ 5 وجیح الحسن، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے محمد خواجہ (اورنگی)، مسز ناظمہ اطہر (جوہر)، سید امجد علی عابدی (گلشن حدید)، عزیزہ بانو (کے یو کیمپس)، شرف معروف حمیدی وارثی (گلشن)، صنوبر یاسمین (بلدیہ)، سنبل جبیں (ایف بی ایریا)، سہیل احمد کھتری (لیاری)، خادم حسین (کریم آباد)، وکیل الرحمن (ایف بی ایریا)، سمیعہ جاوید (گلشن)، سید مسرت حسین رضوی (شاہ فیصل)، ارباب حسن، سید عباس، خالدہ یوسف، یاسین خان، ایم ناصر، اشتیاق

محمد، دانش قریشی، ناصر بٹ (پنجاب کالونی) محمد یامین (گلشن بدر)، علیم ذکائی، طیب الحسن (ایف بی ایریا) توقیر ناصر، منیبہ حبیب، منیر الحسن، اکبر حیات (ڈی ایچ اے)، مرزا سلیم، خادم حسین، صالحہ محمود (کورنگی)، عباس خان، راغب الحسن، شجاع رضوی، طیب خان (ملیر)، سید فرح محمود، فیض محمد، دانش قریشی، محمد اختر (لانڈھی) توقیر عباس اچکزئی، سلطان جونانی، ایاز سکھیرا (پاکستان چوک)، محمد اختر، سلطان خان، فرحین سلطان، ناصر حسین، عارف اچکزئی (شیر پاؤ)، امجد اسلام، نازو، نمرہ (محمود آباد)۔ لاہور سے عبدالجبار رومی، ڈاکٹر کامران آرزو، مسز احمد جمال، تمکین بٹ، ظفر جتوئی، فہد اللہ، خادم علی، نوید اصغر، محمد اکرام، عباس علی، سرور جاوید، آصف خان، عبدالخالق، انیس الحسن، ظفر قاسم، نواب احسن، فاضل اختر، شیخ محمد، یاسمین محمد، فرحت مصطفیٰ، ناصر علی، زرینہ ایوب، چوہدری فضل اللہ، برکات اللہ، ذیشان علی، احمد صدیقی، ناظم حسین سید، راحیل عثمان، نیاز ملکانی، کائنات علی، تابش بلوچ، فرحت بٹ، جاوید عثمانی، ابرار رضوی۔ پشاور سے مظہر حسین غلام عباس طوری بخش، فتح باری، نوازش علی سید، اکرام مصطفیٰ، باسط علی، شاہ زرولی، رضوان شاہ، قدرت خان، ملک نوروز علی، زاہد زرعلی، بخت آور خان، خرم پاشا، عنایت علی، محمد عرفان، وزیر محمد خان، عباس حسن زئی، گلفشاہ گل سید بخاری، نعمان شاہ۔ خانیوال سے محمد کاشف، حشمت علی بٹ۔ ملتان سے عنبرین چشتی، اشرف عبداللہ، اقبال انصاری، لبنیٰ ارشاد، نوید اصغر بخاری، محمد معین خضر حیات بھٹی، خواجہ محمد حسین، بابر سعید، محمد آصف، اشفاق حسن، اویس سلمان، حسین ارشاد، معین خان، اقبال حسن خان، سلطان فتح علی، ناصر گواچہ، توقیر عباس، فتح محمد حسن، رشید علی سید، آفاق حسن، راشد علی خان، امام بخش، انعام حسن، فصاحت انس، پیر ناصر شاہ بخاری، امداد شاہ، حنیف محمد، اسماعیل آفاق، غلام علی شاہ بخاری، برکات اللہ بخش، ارشاد کاظمی، نہال کاظمی، شیخ نہال احمد، سید فرحت عباس، مظہر حسین سید، فرقان اللہ۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ، پیر محمد۔ صوابی سے کوثر اسلام (شمشو خیل رزڑ)۔ مظفر آباد آزاد کشمیر سے سیدہ مہوش گیلانی، اسماعیل حیات، زرین مجید، زاہد شاہ، ملک زین، حکیم حسن خان، ابرار حسن، ضیاء الحسن، فرحت عباس، جاوید بٹ، کاظم حسن شاہ۔ اسلام آباد سے محمد ریاض راحیل، نیلوفر شاہین، انور یوسف زئی، افشاں زیاد، شیخ فتح باب، صدیق بھٹی، ساغر علی، عبداللہ، عبدالاحد، خرم لودھی، فہد ملک، فیض بخش، شگفتہ مشتاق، یوسف احمد گل، عباس نیازی، ارشد خانم بتول کاظمی، جہانزیب خان، قیام حسین، ملائکہ احسن، وسعت اللہ، توصیف ہمدانی، منیر خان۔ راولپنڈی سے محمد آصف محمود (گوجر خان)، ڈاکٹر سعادت علی خان (قاسم مارکیٹ)، عنایت اللہ، کلفر خان زادہ، وسیم الدین ہمدانیم زرین زرولی، کاظم حسین، معین خان، بے بی فرحت اعجاز، قیام الدین، زرفشاں، ثمر متین، علی اسد، طیب حسن، غلام علی، آصف علی، نیلم خان، عباس مشہدی، عنایت بھٹو، زویا اعجاز۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے زہرا نوشین، شوکت علی نیچر (عارف والا)۔ فیصل آباد سے حامد امین صوفی ایڈووکیٹ۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے نوید احمد علیزئی، اعجاز احمد علیزئی۔ اٹک سے سید محمد حسین شاہ، سید تجمل حسین شاہ (جنڈ)، حیا علی، فلک خان اچکزئی، نعمان ملک۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی (فرید ٹاؤن)، اسماعیل شاہ، نصیر الدین، عباس علی، حسن اختر صدیقی، آغا علی شاہ، ذیشان حیا، سید محمد، حافظ افراسیاب خان، قاسمی۔ میانوالی سے اظفر کمال، شہاب شیخ، فتح الدین، خرم بٹ۔ سیالکوٹ سے ڈاکٹر حسین مصطفیٰ، کوکب سلمان، نعمت خان، اسد اللہ، اقبال کاظمی، کاوش بخاری، فریحہ سلطان، اختر عباس، امداد اللہ، حسین مرزا، اللہ بخش سونگی، فیروز حسن۔ حیدر آباد سے ماہ رخ، سید کاظم علی، نعمان فاروقی، بشیر اللہ اسدی، ساجد فاروق، فرحت علمان، نسیم بوترابی، بے بی پروین، زین انصاری، اختر ہاشمی، عنبرین فاطمہ، دانش فتح محمد، کاظم علی کاظمی۔ سانگھڑ سے عاشق حسین مغل (جام نواز علی)، رضوانہ اسحاق، ملک یاسر، عفت انصاری، ملک یاسر، عائشہ اعوان، منیر الدین، بدر اسحاق، عباس علی، عثمان پیرزادہ، بھیرول جسکانی، یکیٰ علی سید۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ (کچھی درہ)۔ بٹگرام سے کاشف عبید کاوش (بدموڑی)، زین الاسلام۔ جہلم سے ملک شاہین۔ لودھراں سے محمد یار شاہد، حافظ احمد یار، مولوی بشیر قاسمی، حافظ الدین۔ شیخوپورہ سے سلمیٰ مہر، ثاقب علی، فہیم الدین قاسمی، کاظم شاہ، اسد بٹ، منیر چوہان۔ اوکاڑہ سے صاحب جان، اسماعیل شاہ، نذر محمد، عباس جنجانی، شبیر علی ڈرائیور، صالح الدین۔ لیہ سے امروز اسلم مغل، یمیں ناظر، اسلم شیخ، ظریف ابن علی، عبدالقادر، نعمانہ شیخ، رابعہ متین، زبیدہ اسلم پراچہ۔ کمالیہ سے زاہد طارق۔ بہاولنگر سے غلام یاسین، وزرین اشفاق، ساجد شاہ۔ عثمان والا سے امتیاز محمد۔ بہاولپور سے محمد منیب جاوید، سعیدہ طارق، اشفاق محمود، زاہد بٹ، ارشد عباس، زاہد علی، ابرار حسن خان، ذیشان احمد۔ وزیر آباد سے سلمیٰ فرحت، ظریف حسن، محمود علی، حسن نواز شاہ، برکت اللہ، نورین اشفاق، عبدالخالق، فیض محمد شاہ۔ مردان سے م انور (باڑی چم ہوتی)۔ گوجرانوالہ سے محمد وقار بٹ، عبدالغفار علی عباس، زاہد شاہ، فرحت خان، عثمان علی، بندہ شاہ، ملک ممتاز۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے صائمہ عمران، عبدالجبار خان، فرید الدین، مشتاق ناز، دانش احسن، ناصر خان، توقیر ضیائی، یاسین احمد، شاہد خان۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، ماریہ حسن، غلام علی، لبنیٰ فرید، اصغر نوید، معین احسن، ابرار حسن، برکات اللہ۔ میلسی سے محمد جہانگیر شاہ، شگفتہ پروین، مشتاق احمد، منیر فراست۔ خوشاب سے شمس الاسلام، حافظ فیروز، محمد محسن۔ ہری پور ہزارہ سے طوبیٰ شاہ، نعمت اللہ، تہذیب حسین، مہ جبیں، الماس فاطمہ، نازش سلطان، اشرف الدین، شریف خان، رفیق ناز۔

بیرون ملک سے امداد اللہ خان پاکستانی (جدہ۔ سعودیہ)، حافظ محمد حیات خان (جرمنی)، رضا شاہ موسوی (ٹورنٹو کینیڈا)، انجینئر جنید مصطفیٰ (مانچسٹر یوکے)، ملک محمد ظفر (لندن یوکے) ظہیر الدین عباسی (اوسلو، ناروے)۔

محترم مدیر

سلام تہنیت

بنتِ حوا آدم کی پسلی سے تخلیق کردہ ہے جو روزِ اوّل سے ایک پہیلی ہے، ساز ہے، سوز ہے اس کے ہزار روپ ہیں مگر تاحال سربستہ راز ہے۔ اس پر ہزاروں دیوان لکھے گئے مگر پھر بھی اسے کوئی سمجھ نہیں پایا ہے۔ وہ ازل سے تشنہ لب ہے شاید ابد تک رہے گی۔ جو سرگزشت میں ارسال کررہی ہوں یہ کسی ایک بنتِ حوا کی ہوتے ہوئے بھی ہر ایک کی ہے کیونکہ یہ سب کا عکس ہے اسے عام سچ بیانیوں سے ہٹ کر لکھی ہے اس لیے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

زویا اعجاز
(لاہور)

ٹی وی لاونج میں بے دلی سے چینل بدلتے میری بیزار نگاہیں بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ میرے گرد پھیلے سناٹے کا شور اعصاب کے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں مخصوص صوتی انداز میں اپنے مدار میں رقصاں تھیں۔ میں نے ریموٹ غصے سے پٹخا اور وہیں صوفے پر نیم دراز ہوگئی لیکن سامنے دیوار پر موجود فریم میری نمی فزوں تر کرگیا۔ آنکھوں میں انتظار کی جلن لیے جانے کس لمحے نیند مہربان ہوئی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے خفگی سے ابرو اچکائے اور ایک جتاتی ہوئی نظر دیوار گیر کلاک پر ڈالی جہاں تہجد کا وقت ہو چلا تھا۔ میرے لبوں سے بے اختیار شکوہ برآمد ہوا۔ ”یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا؟ یہ گھر ہے کوئی سرائے تو نہیں جہاں آپ محض نیند پوری کرنے آتے ہیں۔“

”میں نے میسج بھیجا تو تھا کہ آج دیر ہو جائے گی۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت پر سر رکھے نیم دراز ہوگئے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ میں ان کے جوتے، جرابیں اور ٹائی اتاردوں مگر میں آج کسی بھی حکم کی بجا آوری نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے تیکھے چتونوں سے بولی:

”یہ میسج آپ ہفتے میں چار سے پانچ مرتبہ تو کرتے ہی ہیں۔ کبھی کسی کی ڈیوٹی سر لے لیتے ہیں تو کبھی کسی ایمرجنسی کا بہانہ۔“

”بس کردو حبیبہ! خدارا بس کردو! اتنے سال ہوچکے ہماری شادی کو مگر تم آج بھی الہڑ دوشیزاؤں جیسے ہی تیور دکھاتی ہو۔ ڈاکٹر ہوں میں...... مسیحا ہوں۔ بہت بھاری ذمہ داریاں ہیں میرے کندھوں پر مگر تم نہ جانے کس مٹی کی بنی ہو؟ سمجھتی ہی نہیں۔“ ان کے دبے ہوئے لہجے میں پوشیدہ انتباہ مجھے بخوبی محسوس ہو رہی تھی۔ میں غصے سے پاؤں پٹختی بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔ شوہر کی تھکن، کھانا، دلاسہ اور پیار بھری گفتگو سب کچھ فراموش کردیا اور جلتی کلستی بچوں کے بستر پر جالیٹی۔

”جب میری خواہشات تسلیم نہیں کرسکتے تو میں کیوں ان کے آگے پیچھے پھروں؟“ میری دلائل کی پٹاری سے خود ساختہ شکوؤں کے ناگ پھن پھیلائے میری سوچیں مزید زہر آلود کرنے لگے۔ اور میری خواہشات تھیں ہی کیا؟ شوہر کی مکمل توجہ اور محبت۔ بس!

☆☆☆

"کمبخت لوکے! کیا کر رہی ہے اتنی دیر سے اندر۔ کچھ ہوش ہے تجھے کہ تیرا مجازی خدا آیا بیٹھا ہے کام سے تھکا ہارا۔" صحن میں ابا کا شکایتی پروگرام شروع ہو چکا تھا۔

"کھانا بنا رہی ہوں میں۔ فارغ نہیں ہوں۔" امی کی آواز میں بیزاری کی جھلک واضح تھی۔

"او! دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کرآ کے۔ کوئی دکھ سکھ کی سن لیا کر میری۔"

"ملازم رکھ دے درجن بھر۔ سارے کام وہ نمٹا دیا کریں گے اور میں تیرے سرہانے بیٹھی رہا کروں گی۔"

"رکھ دوں گا ملازم بھی۔ حالات ٹھیک ہونے دے بس۔" ابا نے دلاسہ دیا۔

"یہ سنتے ہوئے مجھے زمانے بیت گئے۔" امی نے صاف گوئی سے کہا۔ "تیرا دل کام میں لگا کبھی اور نہ ہمارے حالات بدلے۔ بس ان چونچلوں میں ہی خوش رہنا۔ ہونہہ۔"

"بس طعنے ہی دیتی رہنا مجھے۔ کبھی جو دو میٹھے بول بولے ہوں میرے ساتھ۔" ابا نے بڑبڑاتے ہوئے ٹی وی کی جانب توجہ مبذول کر لی۔ کمرے کے کونے میں اسکول کی کتابوں اور کاپیوں میں الجھے میرے ذہن نے ہمیشہ کی طرح ایک ایک بات بغور سنی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زوجین کا مثالی رشتہ صرف بیوی کے ناز و انداز اور محبت میں پنہاں ہے۔

اور یہ بات تو طے ہے کہ زیست کے اس کارخانے میں عورت جس امر کی بابت کوئی اندازہ قائم کر لے، اس کی سوچ کی تبدیلی ناممکن قرار پاتی ہے۔

☆☆☆

"اری او جیبہ! چھوڑ دے اس ٹی وی کی جان۔ کبھی گھرداری کی طرف بھی دھیان دے لیا کر۔" امی کی تیز آواز نے مجھے کوفت زدہ کر دیا تھا۔

"کیا ہے اماں؟ ہر وقت ایک ہی رٹ لگائے رکھتی ہو۔" میں دسویں جماعت کے امتحانات کے بعد فارغ تھی اور اپنا زیادہ تر وقت ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں گزار رہی تھی۔ میرا تعلق متوسط طبقے سے تھا جہاں والدین معاشی چکی میں پس کر اپنی اولاد کی ضروریات پوری کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں اور حاصل ضرب کے طور پر جمالیاتی حس سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اولاد کسی خودرو پودے کی طرح پروان چڑھتی ہے جنہیں بچپن ہی سے خواب گٹھی میں پلا دیے جاتے ہیں۔ خواب زدہ بوجھل آنکھیں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ہمیشہ انجان بنی رہتی ہیں اور ایک تصوراتی دنیا میں کھوئے رہنا ہی ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ میں بھی اپنی ایک الگ دنیا میں بستی تھی جہاں ہر سو محبت اور چاہت کے پھول کھلے رہتے تھے۔ مجھے گھرداری میں ذرہ بھی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا اس وقت بھی میں نے امی کی بات سنی ان سنی کر دی اور پھر سے ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی جہاں ایک خوبرو ہیرو سونے، چاندی اور محلوں کی عدم دستیابی کی اطلاع دیتے ہوئے ایک محبت بھری، ہنستی کھلکھلاتی زندگی دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ میرے کچے ذہن نے مزید خواب

بجنے شروع کر دیے۔ نئی نئی ڈرامے اور فلمیں ایک خمار کی طرح میرے ذہن پہ چھائی رہتی تھیں اور میری زندگی میں شادی کے سوا کوئی مقصد حیات نہ تھا۔ اور شادی شدہ زندگی میرے نزدیک تھی ایک الف لیلہ تھی۔

پڑھائی سے دلچسپی بھی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن گھر میں رہ کر امی کی روک ٹوک بھی قبول نہیں تھی۔ ابا میرے مکمل حمایتی تھے، انہوں نے اپنی بساط کے مطابق مجھے ایک قریبی سرکاری کالج میں داخل کروا دیا۔ خواب گزیدہ آنکھیں، تصورات میں مخمور ذہن اور بے نام ونشان منزل کی طرف ایک مسافت۔ ایسے میں کتابوں میں دل لگتا بھی تو کیسے؟ ڈراموں اور فلموں میں کپڑوں کے نت نئے ڈیزائن دیکھ کر پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔ زندگی میں بس ایک ہی کمی تھی۔ خوابوں میں بسنے والے اس شخص کی جو کسی چکور کی طرح میری تمنا کرے، پروانے کی طرح مجھ پہ نثار ہو۔ اور جس کے لیے میری ذات سے بڑھ کر کوئی اہم نہ ہو۔ ان معاملات میں میری سوچ بہت عملی اور دور اندیش تھی اور میں بخوبی جانتی تھی کہ ایسا شخص مجھے کسی من وسلویٰ کی مانند تو بالکل نہ ملے گا۔ اپنی منزل تک رسائی کے لیے مجھے خود ہی رستے تلاشنے تھے اور میں بڑی تندہی سے اپنی تلاش میں مگن تھی جب امی نے یکدم میرے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی۔

☆☆☆

''خدا کا خوف کریں امی جی! یہ کوئی رشتہ ہے جس پہ آپ ریجھ گئی ہیں۔'' میں نے تنتناتے ہوئے تصویر زور سے پٹخی۔

''کیوں؟ کیا برائی ہے آخر اس میں؟'' امی کی بے نیازی مجھے مزید تپا گئی۔

''اچھائی تو مجھے بھی کوئی نظر نہیں آ رہی۔ بال ابھی سے اڑ چکے ہیں۔ رنگت دیکھیں اس کی ذرا۔ اچھی خاصی عمر کا ہے یہ انسان۔ اور آپ نے اپنی اکلوتی اولاد کے لیے اسے منتخب کیا ہے۔'' میرے صدمے کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

''مرد کی شکل وصورت کوئی نہیں دیکھتا! مرد کماؤ ہی اچھا لگتا ہے۔ کماؤ مرد غیرت اور عزت کا رکھوالا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہے یہ بچہ۔ اپنے بل بوتے پر پڑھائی کر کے بہن بھائیوں کی شادیاں کی ہیں اس نے۔''

''بچہ! بچہ تو نہ کہیں اسے۔ اچھا خاصا عمر رسیدہ مرد ہے یہ۔'' میں چڑ کر بولی۔

''بس کر دے حبیبہ! کس بات پہ اتنا مان ہے تجھے؟ تیرا باپ کون سا منسٹر ہے کہیں کا؟ میں تو شکر کرتی نہیں تھک رہی کہ اتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے گھر بیٹھے۔ ورنہ کسی پلمبر، مکینک یا مزدور ہی کے ساتھ بیاہ دیتا تیرا نکلا باپ تجھے۔'' وہ سفاکی کی حد تک صاف گو تھیں۔

''کیوں؟ مجھے کیوں نہیں مل سکتا اچھا رشتہ؟ کس چیز کی کمی ہے مجھ میں آخر؟'' میرے نازک دل کو اچھی خاصی ٹھیس لگی تھی۔

''میں تجھ جیسی کوڑھ مغز سے بحث نہیں کرنا چاہتی۔ شادی تو کرنی ہے اور ہر صورت کرنی ہے۔ تیرے ابا نے تو تجھے آزادی دے کر آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ کبھی موبائل، کبھی سہیلیاں تو کبھی کالج میں کلاسوں کا بہانہ۔ سب نظر آتا ہے مجھے یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے۔''

''مگر میں کالج میں واقعی پڑھائی کے لیے رکتی ہوں۔'' میں نے تیزی سے اپنے دفاع میں کہا۔

''ہاں وہ تو مجھے تیرے پرچوں کے شاندار نتیجے سے ہی نظر آتا ہے۔ ایک کلاس میں دو دو سال لگا کے کون سا مقابلے کا امتحان پاس کرنا ہے تو نے۔'' انہوں نے بلا لحاظ مجھے آئینہ دکھایا۔ ''ایک ہفتے کا وقت دے رہی ہوں میں تجھے۔ اپنا ذہن بنا لے اس شادی کے لیے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

میرے سر پر ایکدم پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور فوری طور پر ایک ایکشن پلان ترتیب دے دیا۔ رات ہوتے ہی میں موبائل لیے اپنے کمرے میں چلی آئی اور کچھ لمحے سوچ بچار کے بعد ایک اداس سی غزل احمد کو بھیج دی۔ حسب توقع اس نے فوری کال کر دی اور بیتابی سے پوچھا۔ ''کیا ہو گیا حبیبہ؟ بھئی اتنی اداس کیوں ہو؟ تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا۔''

''نہیں! ہوا تو کچھ نہیں۔ بس تمہاری یاد آ رہی تھی بہت۔'' میں نے اٹھلا کر کہا تو وہ مزید ریشہ خطمی ہو گیا۔

''اوہو! آج تو کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔''

''تو مانگ لوناں۔ کیا پتا مل ہی جائے۔'' میں نے اسے مزید شے دی۔

''تو کل مل لو مجھ سے۔ تم سے دور رہ ہی نہیں سکتا میں۔'' وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں آ چکا تھا لیکن میں نے دانستہ تغافل سے کہا۔ ''کل تو میری کلاس ہے ایکسٹرا۔ لیکن چلو اگر تم اصرار کر رہے ہو تو ٹھیک ہے...... کچھ

سوچ لوں گی۔"

"بہت شکریہ جناب...... خاکسار آپ کا مشکور رہے گا۔" اس کا یہ فریفتہ انداز مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کی نوید سنا رہا تھا۔

☆☆☆

احمد میری ایک کلاس فیلو کا چچازاد تھا۔ اب یہ بتانے کی ضرورت کہاں مجھے کہ ہماری دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کیسے اور کس طرح پروان چڑھی ہوگی۔ یہ سب اسرار و رموز تو ہمیں ٹی وی ڈرامے اور فلمیں اوائل عمر میں ہی سکھا دیتے ہیں اور ہر انسان اپنی ذاتی صلاحیتوں کے تحت انہیں اپنی زندگیوں میں لاگو کر لیتا ہے۔

اگلے روز میں کالج بیگ میں موجود میک اپ سے اپنے چہرے کو متورم اور اداس بنا کے احمد سے ملنے چلی گئی اور نتیجہ میری توقعات کے عین مطابق رہا۔

"یا خدا! کیا ہو گیا ہے تمہیں حبیبہ؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" احمد کے ہر انداز سے بے تابی اور تشویش جھلک رہی تھی۔

"ہوں! بس ٹھیک ہے۔" میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں نہیں مانتا۔ تم ضرور کچھ چھپا رہی ہو۔ مجھے بھی نہ بتاؤ گی۔ اتنا پرایا کر دیا مجھے؟"

"میری شادی طے ہو رہی ہے احمد۔ میری مرضی کے خلاف۔ مجھ سے کئی سال بڑے ایک شخص سے۔ مگر میں تمہارے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تم ہی بتاؤ کیا کروں میں؟"

"کک۔ کیا؟ شادی؟ مگر اتنی جلدی کیوں؟ ابھی تو تم پڑھ رہی ہو ناں۔" وہ یکدم بوکھلا گیا۔

"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ تم ہی کرو کچھ اب۔ اپنے گھر میں بات کرو۔ اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے کیا ہوگا؟"

"مگر اتنی جلدی کیا ہے آخر؟ کچھ سال گزار لو کسی طرح۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اگر نہ گزار سکوں تو؟" مجھے بھی اب غصہ آنے لگا تھا۔

"تو...... کچھ نہیں...... دیکھو حبیبہ! ابھی مجھ سے بڑی دو بہنوں کی شادی ہونی ہے۔ میں خود ابھی بے روزگار ہوں۔ میرے والدین کو بے جا تکلیف دے گا میرا یہ مطالبہ۔"

"اوہ! تو ٹھیک ہے پھر۔ میں بھی اپنے والدین کو بے جا تکلیف سے بچائے لیتی ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ارے ٹھہرو یار کوتو۔ بھئی ہم ہمیشہ دوست بھی تو رہ سکتے ہیں۔" اس نے ایک اور پینترا بدلا لیکن میرے پاس ابھی کئی حکم کے اکے موجود تھے لہٰذا بے اعتنائی سے وہاں سے چلی آئی۔

☆☆☆

پھر ہوا یوں کہ میرے خوابوں کا محل تاش کے پتوں کی طرح بکھر گیا۔ ہم تھے جن کے سہارے وہ ہوئے نہ ہمارے۔ احمد کے بعد میں نے بلال، طلحہ، وسیم اور رضی کو بھی آزما لیا لیکن سبھی کسی نہ کسی مجبوری میں جکڑے تھے۔ کسی کو روزگار کا مسئلہ تھا تو کوئی سرے سے شادی کا قائل ہی نہ تھا۔ ہر بار ایک جیسے جملوں کی تکرار اور ایک ہی انجام۔ گھنٹوں ہونے والی فون کالز، ملاقات کے لیے تڑپنے والوں اور وعدوں کے انبار لگانے والوں نے یکدم کینچلی بدل لی۔ تھک ہار کر میں نے امی سے شادی کی ہامی بھر لی۔ وہ میرے چہرے پر پھیلی مایوسی اور حسرت کے سائے دیکھ کر اداسی سے بولیں۔ "میں نے دنیا دیکھی ہے حبیبہ! میں تیرے لیے بھی غلط انتخاب نہیں کروں گی۔ ہیرا صفت آدمی ہے عثمان۔ قدر کرنا اس کی۔ وہ تجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں دے گا۔"

مگر میرے ذہن پر عثمان کی کم روئی اور اپنی مظلومیت کی ایسی چادر تنی تھی کہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی۔ شادی کی رسومات کافی سادگی سے انجام پائیں۔ شادی کے حوالے سے میرا ہر تصور، ہر ارمان مسمار ہوتا چلا گیا اور میرے وجود پر ایک کہر سا چھا گیا۔ مجھے میرے خوابوں کی موت نے بے حال کر دیا تھا۔

☆☆☆

"اٹھ جاؤ حبیبہ! تمہارے گھر والے آتے ہی ہوں گے ملنے۔" عثمان میرے سامنے بالکل تیار کھڑے تھے۔

"اتنی جلدی نہیں آئیں گے وہ۔ میں نے کہا تھا انہیں کہ دوپہر سے پہلے مت لائیے گا ناشتا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"ناشتا لانے سے میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔ اب تمہاری ہر ذمہ داری میرے سر ہے۔ ان پر بوجھ کیوں لادوں؟"

"تو آنے سے بھی منع کر دیتے انہیں۔ شام کو ولیمہ پر

ہی مل لیتا۔" میرے دل میں ابھی بھی ان کی اس عجلت اور شادی پر بہت خلش تھی۔

"اوہو! کیوں منع کروں میں ان کو؟ حق ہے ان کا تم پر۔" ان کا حقوق و فرائض پر تبلیغی لیکچر یوں ہی پچھلی رات سے جاری تھا۔ میں شاید دنیا کی واحد لڑکی تھی جس کے شوہر نے شادی کی پہلی رات اس کی خوبصورتی کو نظر بھر کے بھی نہ دیکھا تھا اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مستقبل میں پیش آنے کے لیے ایک ہدایت نامہ جاری کرتے ہوئے ایک ایک بات کئی کئی بار دہرائی تھی۔

"میں نے کسی ہم پیشہ لڑکی سے شادی اسی لیے نہیں کی حبیبہ کہ ملازمت کی الجھنوں میں پھنس کے وہ گھریلو ذمہ داریاں نظر انداز نہ کر بیٹھے۔ میرے اس گھر کو تم نے ہی جنت نظیر بنانا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔" میں حیرانی سے اپنے دولہا کو دیکھ رہی تھی جو جانے کون سے قصے لے بیٹھا تھا۔

"شادی یوں بھی ہوتی ہے کیا؟ کوئی مجھ سا بدقسمت بھی ہوگا بھلا؟" میں نے انتہائی مایوسی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

"سنیے! ہمیں ہنی مون پہ نہیں جانا کیا؟" میں نے ان کی مسلسل خاموشی اور بے نیازی سے اکتا کر آج خود ہی پوچھ لیا تھا۔ شادی کو دو ماہ ہونے والے تھے مگر ان کی مصروفیات اور خاندان میں ہونے والی دعوتوں نے میرے اس خواب کی تعبیر بھی تا حال مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

"ہاں! کیوں نہیں؟ چلیں گے جلد ہی۔ میں نے اگلے ہفتے کی چھٹی کا کہہ رکھا ہے اسپتال میں۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بولے۔

"ارے واقعی! مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے؟" میں جوش سے اچھل ہی پڑی۔

"دھیرج رکھو حبیبہ! اتنا بلند والیم مجھے پسند نہیں ہے۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح مجھے نرمی سے ٹوکا۔ "میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا بس۔"

"آپ کو یہ کام بھی کرنے آتے ہیں؟ کمال ہے بھئی۔" میں نے ہنسی اڑائی۔

"ہر کام اور ہر بات کا ایک طریقہ اور وقت ہوتا ہے پہلے یا بعد میں وہ کام اچھے نہیں لگتے۔"

"میں آپ کی فلسفیانہ گفتگو سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ اس سے بہتر ہے میں جا کر پیکنگ کر لوں۔"

میں بدمزگی سے کہتی ہوئی اٹھ گئی۔ میرے ذہن پر اس وقت شمالی علاقہ جات کی حسین برف پوش وادیوں میں فلمائے گئے مختلف مناظر سوار تھے اور جوش سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ لیکن ہوا وہی جواب تک میرے ساتھ ہوتا آیا تھا۔ میں سدا کی بدقسمت تھی۔

☆☆☆

"تم اس لباس میں چلوگی میرے ساتھ باہر؟" عثمان نے کڑی سنجیدگی سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں اس وقت شیفون کی ایک باریک اور دیدہ زیب ساڑی میں ملبوس تھی اور مجھے علم تھا کہ اس لباس میں دیکھنے والی کوئی بھی نظر میرے سراپا سے ہٹ ہی نہیں سکتی۔

"کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟ اچھی نہیں لگ رہی کیا؟"

"اچھے لگنے کا معیار یہ فضول اور بے ہودہ لباس ہرگز نہیں ہے۔ یہ نہ تو موسم کے مطابق ہے اور نہ میری غیرت گوارا کرتی ہے کہ تم ایسے چلو میرے ساتھ کہیں۔ فوری تبدیل کرواسے۔" ان کا لہجہ مزید سخت ہوگیا تو میں پاؤں پٹختے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔

"دقیانوس! مردم بیزار! بے حس کہیں کے!" میرا ذہن لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔

ہنی مون کے دورانیہ کے لیے میں نے جتنے منصوبے بنا رکھے تھے سب ایک ایک کر کے منتشر ہوتے جا رہے تھے۔ تیسرے روز تو حد ہی ہوگئی تھی۔ مال روڈ پہ گھومتے ہوئے جب عثمان کو خبر ہوئی کہ یہاں ایک بس حادثے کا شکار ہوگئی ہے تو ان کے پیشہ ورانہ فرائض فوری طور پر شوہرانہ فرائض پر حاوی ہوگئے اور انہوں نے وہاں کے اسپتال میں اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کر دیں۔ میرے مزاج کا سورج سوا نیزے پر پہنچ چکا تھا لیکن ان پہ اثر ندارد۔

"انسانیت سے بڑھ کر کوئی فرض نہیں ہوتا حبیبہ! میں کسی کی جان کے عوض اپنی ذات کے لیے خوشیاں کشید نہیں کر سکتا۔" ان کا موقف دوٹوک تھا۔

واپسی کے بعد دعوتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو زندگی مزید سست روی کا شکار ہوگئی۔ ان کے بھی بہن بھائی علیحدہ رہتے تھے۔ روزمرہ کے کام کاج نمٹانے کے بعد میں اکیلی بولائی بولائی پھرتی۔ کچھ عرصہ مزید گزرا تو میں تنگ آکر عثمان سے الجھ پڑی۔

"کچھ تو خیال کرلیں میرا۔ سارا دن کسی بدروح کی طرح بھٹکتی رہتی ہوں گھر میں۔"

"تو اپنی سرگرمیاں تبدیل کرلو۔ اسٹڈی روم میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں ان سے استفادہ کرو۔ تمہارے ذہن پر چھایا جمود ٹوٹ جائے گا۔ یا اپنی پڑھائی کا سلسلہ شروع کرلو دوبارہ۔" ان کی تجاویز نے مجھے مزید کوفت زدہ کردیا۔ "مجھے کتابوں سے دلچسپی ہے نہ ڈگریوں سے۔ مجھے بس آپ کا وقت درکار ہے۔ جب میں چاہوں اور جتنا بھی میں چاہوں۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو حبیبہ! اچھی خاصی سمجھدار عورت ہو۔ پھر بھی ایسی فضول ضدیں۔" وہ بیزاری سے بولے۔

"ضد ہے تو ضد ہی سمجھیں آپ۔ میں نے کہہ دیا ہے بس۔"

"اوہو! اچھا کرتا ہوں کچھ۔" وہ ایک بار پھر مجھے ٹال گئے۔

اگلے کچھ ماہ میں انہوں نے باہر ڈنر اور سیر و تفریح کے کئی مواقع فراہم بھی کیے لیکن پھر انہیں کسی نہ کسی ایمرجنسی کے سلسلے میں اپنے پیشہ وارانہ فرائض یاد آجاتے اور میرے ارمان کہیں پس پشت چلے جاتے۔ مجھے تو محض اپنے شوہر کے وجود اور زندگی پر مکمل اور بلا شرکت غیرے تصرف درکار تھا۔ کوئی انوکھی یا غیر فطری خواہش تو نہ تھی یہ میری۔ لیکن پھر اولاد کی آمد کی خبر نے مجھے گھر میں پابند کردیا۔

☆☆☆

"اپنی غذا پر خصوصی توجہ دو حبیبہ! گھر میں کسی چیز کی تو نہیں ہے۔ کام کاج کے لیے اس نے ملازمہ رکھ دی ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟" امی مجھے سمجھاتے ہوئے زچ ہو چکی تھیں۔ بچے کی ولادت میں اب کچھ ہی ماہ کا عرصہ رہ گیا تھا اور میرا چڑچڑا پن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے پاس ہی رہیں، میری نظروں کے سامنے۔"

"بہت خوب۔ صدقے جاؤں تیری اس خواہش کے۔ وہ ہر وقت سامنے رہے تو کمائے اور کھلائے گا کہاں سے؟ یہ جو مہارانیوں جیسے عیش ہیں ناں تیرے، یہ اسی کی خون پسینے کی کمائی کی بدولت ہیں۔ سدھر جا حبیبہ! سدھر جا۔ ایسے چونچلے فلموں، ڈراموں میں ہی جچتے ہیں۔ زندگی کوئی کھیل تماشا نہیں ہے بے وقوف لڑکی۔"

> **رائی (Mustard)**
>
> ایک ایسا پودا ہے جس کا بیج عموماً مسالوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پودے کی لمبائی تقریباً چھ فٹ ہوتی ہے اور اس میں چار پتیوں والے، پیلے رنگ کے پھولوں کے گچھے لگتے ہیں۔ بیجوں کی پھلی یا ڈوڈا ایک انچ لمبا ہوتا ہے۔ اس پودے کا وطن ایشیا ہے اور اسے سیاہ رائی کہتے ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا ایک پودا یورپ میں کاشت کیا جاتا ہے جو سفید رائی کہلاتا ہے۔ رائی کے بیجوں کو پیس کر اور پانی اور آٹا ملا کر پلاسٹر بھی بناتے ہیں۔ نیز اس سفوف کو چاروں میں بھی ڈالا جاسکتا ہے۔ مسکن درد ہے۔ یعنی چوٹ کے درد پر لگایا جائے تو درد کھینچ لیتا ہے۔
>
> مرسلہ: فراز حیدر، علی پور چٹھہ

"آپ تو اسی کی طرفداری کریں گی۔ آپ ہی کی بخشی ہوئی سوغات جو ہیں۔ بے کیف خیالات کے مالک۔ گھر اور بیوی تو نظر آتی ہی نہیں انہیں۔"

"بیوی اور گھر ہی کے لیے اس نے دن رات ایک کر رکھے ہیں۔ اپنی سوچ بدل لے حبیبہ! ورنہ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ یہ ٹھوکروں میں لا کے سمجھاتا ہے اور پھر کوئی مداوا نہیں رہتا۔"

"توبہ ہے امی جی! بددعائیں تو مت دو اب۔" میں مزید چڑ گئی۔

"بددعائیں نہیں دے سکتی میں تجھے۔ ماں ہوں تیری، تیری ہدایت کے لیے بس دعا ہی کرسکتی ہوں۔" وہ گہری سانس بھر کے اٹھ گئیں۔

وقت یونہی گزرتا رہا۔ حمزہ کی پیدائش نے زندگی کو ایک نیا پیراہن عطا کردیا۔ عثمان کی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے بیٹے کے شاندار عقیقہ کا اہتمام کیا اور مجھے سونے کا سیٹ تحفہ میں دیا۔ ان کے بہن بھائیوں نے بھی تحائف کے انبار لگا دیے۔ تو مولود کی آمد نے مصروفیت بڑھا تو دی تھی لیکن دل کے نہاں خانوں میں چکور جیسی چاہت کی تمنا اب بھی موجزن تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

حمزہ کی پیدائش کے دو سال بعد ہانیہ کی ولادت نے

عثمان کو مسرتوں سے نہال کر دیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کئی طلائی زیورات مجھے تحفہ میں دیے۔ ہمارا ایک منزلہ گھر دو منزلہ بنوا کر اسے مکمل تزئین و آرائش سے آراستہ کر ڈالا۔ میرے رشتہ دار احباب بھی میری قسمت پر رشک کرتے تھے، اپنی بیٹیوں کے لیے عثمان جیسی شرافت، ذمہ داری اور اخلاقی اقدار کی دعائیں کرتے تھے لیکن کوئی مجھ سے بھی تو دریافت کرتا کہ میں کتنی تشنہ تھی۔ مجھے ان کے الفاظ اور وارفتگی کی چاہ تھی۔ میری روح میں ہمہ وقت ایک پیاس موجزن رہتی تھی۔ ستائش کی پیاس، محبت کی پیاس اور اپنی من پسند زندگی سے محرومی کا قلق۔ میرے دکھ ان تمام آسائشوں پر بھاری تھے جو عثمان نے مجھے عطا کر رکھی تھیں۔ انہیں شادی کے آٹھ سال بعد بھی اپنے پیشہ وارانہ فرائض سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو آٹھ بج چکے تھے۔ میں نے دستک نظر انداز کر دی اور کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ لمحوں بعد عثمان کی تھکاوٹ سے چور آواز آئی۔ ”اگر دماغ ٹھکانے آگیا ہے تمہارا تو ناشتا بنانے کی زحمت کر لو باہر آ کے۔“

”ہاں بس یہی کام تو رہ گئے ہیں میرے۔ مفت کی نوکرانی سمجھ رکھا ہے۔“ میں بڑبڑاتی ہوئی ان کے ناشتے کی تیاری کے لیے کچن میں چلی گئی۔

پچھلے کچھ عرصہ میں ملکی حالات کے باعث ان کی مصروفیات میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ آئے روز ہونے والے دھماکوں اور حادثات کی وجہ سے ہر وقت ایمرجنسی کا نفاذ رہتا تھا۔ میں ان سے کوئی شکوہ کرتی تو وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے۔ ”میں انسانیت کی قربانی دے کر اپنے فرض سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اللہ پاک نے مجھے دست مسیحائی عطا کر کے جو ذمے داریاں عائد کی ہیں، مجھے ان کی جواب دہی سے بہت خوف آتا ہے۔“

میری نا آسودہ خواہشات اب بے لگام ہوتی جا رہی تھیں اور وجود ایک خاردار کیکر بننے لگا تھا۔ دل و دماغ پر ایک عجیب سی گھٹن اور بیزاری کا غلبہ رہتا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں نے ناشتا میز پر رکھا تو عثمان نے نرمی سے مجھے مخاطب کیا۔ ”کیوں خوامخواہ اپنے ذہن کو شیطانی کارخانہ بنا رکھا ہے؟“

”تو کیا کروں اور میں؟“

”اپنے لیے کوئی مثبت اور تعمیری سرگرمیاں تلاش کرو۔ کبھی خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو تو سہی۔ شاید تمہیں احساس ہو جائے کہ میں کس کرب سے دوچار رہتا ہوں۔“ وہ اداسی سے بولے۔

”ہونہہ! مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟“

”آس پڑوس کی فیملیز سے میل جول بڑھاؤ۔ وقت نہ کٹنے کی تمہاری شکایت بھی دور ہو جائے گی۔ آج صبح ساتھ والے شیرازی صاحب کے مکان میں کسی نئی فیملی کا سامان آتے دیکھا ہے۔ انہیں کھانا اور چائے وغیرہ پہنچا دینا کچھ دن باقاعدگی سے۔ ہمسایوں کے اتنے تو حقوق پورے کر ہی سکتے ہیں ہم۔“

”سبھی کے حقوق پورے کرنے کا خیال ہے۔ میری ہی پروا نہیں انہیں۔“ میری سوچ میں احساسِ محرومی کے ناگ پھر سے کلبلانے لگے۔

☆☆☆

دن کی سنہری دھوپ دوپہر کی تمازت میں ڈھلنے لگی تو میں کھانا بنا کر فارغ ہو چکی تھی۔ عثمان نے ہمسایوں کے گھر کھانا بھیجنے کی جو رٹ لگا دی تھی اسے مکمل کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے بریانی اور قورمہ کی اچھی خاصی مقدار ڈشز میں منتقل کی اور ملازمہ کو بچوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر شیرازی صاحب کے گھر چلی گئی۔ مرکزی دروازے سے ہی اندر موجود مکینوں کی افراتفری اور مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائے بغیر اندر جانا مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک بتیس، تینتیس سالہ آدمی باہر آیا اور مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”معاف کیجیے! ہمیں کوئی خریداری نہیں کرنی آپ سے۔“

میں یکدم ہونق ہو گئی اور ہکلا کر کہنے لگی۔ ”میں...... وہ...... یہ...... ساتھ...... کھانا۔“

اس آدمی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”آپ تو کنفیوز ہی ہو گئیں بھئی۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آیئے اندر آ جایئے۔“

گھر کے اندرونی حصوں میں بھی سامان منتشر تھا۔ تمام مکینوں نے بڑی خوشدلی سے میرا استقبال کیا۔ اس فیملی کی سربراہ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ تین بیٹے، دو بہوئیں اور ایک بیٹی پر مشتمل سبھی افراد خانہ بہت ملنسار اور بے تکلف تھے۔ مجھے ان کے ساتھ وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ میرے بنائے ہوئے کھانے کی سب نے

دل کھول کر تعریف کی تو میرے مزاج پر چھائی کلفت فوری دور ہوگئی۔ میں نے انہیں ڈنر کی دعوت دینے میں بالکل تامل نہ کیا۔ اس روز پہلی بار مجھے کسی ہمسایہ فیملی سے ملاقات اور گفت وشنید نے لطف دیا تھا۔

اس رات بھی عثمان کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ بچوں کو صبح اسکول جانا تھا سو انہیں جلدی سلا دیا اور کھانے کی ڈشز لیے ریحانہ آنٹی کے یہاں جا پہنچی۔ دروازہ اس بار بھی کاشف نے کھولا۔ ''ارے! آپ کو کہا تو تھا ہمیں کوئی خریداری نہیں کرنی۔ آپ پھر آگئیں۔''

''مسٹر چوکیدار! گھر سے کسی بڑے کو بلایئے۔ ہم بھی ملازمین کے منہ نہیں لگتے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا تو وہ محظوظ ہو کر بے تحاشا ہنستا چلا گیا۔

''بہت خوب جی! بہت خوب۔ آیئے ناں اندر۔ میں تو منتظر تھا آپ کے ڈنر کا۔''

اس رات بھی دیر تک گفتگو چلتی رہی۔ ریحانہ آنٹی ایک بیوہ خاتون تھیں۔ سب سے بڑا بیٹا اور بہو دبئی میں مقیم تھے اور ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ کاشف بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ اس کی بیوی کافی خاموش طبع معلوم ہوتی تھی۔ سب سے چھوٹا بیٹا ابھی غیر شادی شدہ تھا اور ملازمت کے سلسلے میں دارالحکومت میں رہتا تھا۔ ان کی بیٹی عنبر بھی منگنی شدہ تھی۔ بہت بھلے لوگ تھے۔ میری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آ ہی گئی تھی۔

☆☆☆

''حبیبہ میرے لیے عنبر ہی کے جیسی ہے بیٹا! میں اگر اس کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اسے اپنے پاس وقت بے وقت بلوا لیا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔'' ریحانہ آنٹی نے بڑے سبھاؤ سے عثمان کے سامنے اپنے مدعا بیان کیا۔ انہیں وہاں شفٹ ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے اور ہمارے مابین کافی بے تکلفی پروان چڑھ چکی تھی۔

''کیوں نہیں خالہ جی! بلکہ میرے لائق بھی کوئی خدمت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' انہوں نے انکساری سے کہا تو وہ ان کی بلائیں لیتی چلی گئیں۔

''عنبر کے لیے کوئی اچھا سا تحفہ لے آنا۔ اور خود بھی دھیان رکھنا اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو۔'' ان کے جاتے ہی وہ مجھے لیکچر دینے لگے۔ پھر کسی خیال کے تحت بولے۔ ''ویسے ایک بات کافی حیران کرتی ہے مجھے۔ گھر اور کام اچھا خاصا ہوتے ہوئے بھی ان کی بہو جاب کیوں کرتی ہے؟''

''اپنی تعلیم اور قابلیت کا گھمنڈ ہے بس اسے۔ گھر میں دل ہی نہیں لگتا اس کا۔ بچے کو ساس کے حوالے کر کے چلی جاتی ہے بڑکیں ناپنے۔'' میں نے ریحانہ آنٹی اور کاشف سے وقتاً فوقتاً سنے فقرات من وعن دہرا دیے۔

''خیر! یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ وہی بہتر جانیں۔ مجھے آج تھوڑی دیر ہو جائے گی۔ ملازمہ کو روک لینا اگر چاہو تو۔'' ان کی بات پر میرا موڈ بری طرح آف ہوگیا۔

اس رات عنبر کی شادی کے لیے ڈھولک رکھی گئی تھی لیکن میرے دماغ پر تو وہی غبار اور گھٹن طاری تھی جو کسی بھی پل مجھے سکون نہیں لینے دیتی تھی۔ رات گیارہ بجے جب ہنگامہ تھما تو میں آنٹی سے اجازت لے کر آگئی۔ لان سے گزرتے ہوئے میری نظر ایک ہیولے پر پڑی جو بینچ سے کمر ٹکائے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے بالکل دقت نہ ہوئی۔ وہ کاشف تھا جسے دیکھتے ہی میرے قدم بے اختیار اس کی جانب بڑھ گئے اور میں نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ رات کے اس پہر یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟''

''کون سی طبیعت کی بابت پوچھ رہی ہیں آپ؟ ظاہری یا باطنی؟'' وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''دونوں ہی بتا دیجیے آپ۔''

''آپ جیسی ہی ہے طبیعت۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔'' اس کا انداز بہت معنی خیز تھا۔

''کک۔ کیا مطلب؟'' میں گڑبڑا سی گئی۔

''تیرا غم، میرا غم اک جیسا صنم۔ ہم دونوں کی ایک کہانی۔'' وہ گنگناتے ہوئے بولا۔

''یہ دعویٰ آپ کیونکر کر سکتے ہیں بھلا؟'' میری دلچسپی اس کی باتوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔

''وہ! ایسے محترمہ کہ جس طرح مریم کو اپنی جاب زیادہ عزیز ہے اور وہ اس وقت بھی فرائض پس پشت ڈالے سونے جا چکی ہے، ویسے ہی آپ کے شوہر نامدار کو بھی اپنی جاب سے بڑھ کر کچھ نہیں۔'' وہ بڑے تیقن سے کہنے لگا۔ ''اکثر دیکھتا ہوں میں انہیں، رات گئے لوٹتے ہیں وہ۔''

''اب تو عادت سی ہے مجھ کو ایسے جینے میں۔'' میں نے اسی کے انداز میں جوابی گنگناہٹ سے کہا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ ''یہی ادا تو مجھے پسند ہے آپ کی۔ آیئے ناں بیٹھیے تھوڑی دیر پلیز۔'' اس کا ملتجی انداز میں ٹال نہ

سکی۔ اس رات دو گھنٹے ہم نے خوب باتیں کیں بلکہ باتیں کیا تھیں اپنی محرومیوں کی کہی ان کہی داستانیں تھیں۔ رات کی تاریکی بھی اپنا فسوں طاری کر رہی تھی، میں نے چاروناچار گھر جانے کی بات کی تو کاشف نے بڑے مان بھرے اصرار سے میرا موبائل نمبر لینے کی فرمائش جڑ دی جس کی تکمیل میں مجھے ذرا بھی تامل نہ ہوا۔

شادی کی رسومات کے دوران بھی اس کی نظریں میرا ہی طواف کرتی رہیں۔ عثمان صرف برات ہی میں شریک ہو پائے تھے لیکن اب میرے ارتکاز کی ڈور اپنے محور سے بھٹکنے لگی تھی۔ کاشف کی بے باک نظریں، معنی خیز گفتگو اور پیار بھرا لہجہ مجھے بے خود کر دیتا تھا۔ کسی نامحرم سے دوستی میرے لیے انوکھی بات تو نہ تھی لیکن اب شادی اور اولاد کی بیڑیوں نے مجھے ماضی کی نسبت بہت محتاط بنا دیا تھا۔ دوسری طرف کاشف کی پیش قدمی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور مجھے اپنی گھٹن زدہ زندگی کو معطر کرنے کے لیے بالآخر ایک روزن میسر آ گیا تھا۔

☆☆☆

عنبر کی شادی کو ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ اس روز شام کو میں اپنی الماری ترتیب دے رہی تھی جب موبائل پہ میسج ٹون نے مجھے چونکایا۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

کاشف کی طرف سے یہ دوسرا پیغام مجھے روح تک سرشار کر گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد میں نے اسے جوابی میسج بھیجا۔ ”ویری نائس، ورسٹ آئیڈیا۔“ وہ تو جیسے جواب ہی کا منتظر تھا فوری اگلا میسج بھیج دیا۔

”کیا کر رہی ہو؟“

”کچھ خاص نہیں۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام بس۔“

”تو کچھ خاص کر لو ناں۔“

”آہاں! کیا خاص کروانا چاہتے ہو بھئی؟“

”آج تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کا دل چاہ رہا ہے۔“

”تو کر لو ناں باتیں...... میں نے کب روکا؟“

”اونہوں! ایسے نہیں ناں۔“

”تو پھر کیسے بھلا؟“ میں اب اس کی بے تابی سے محظوظ ہونے لگی تھی۔

”تم سے ملنا چاہتا ہوں میں۔ پلیز۔“

”مریم کے سامنے مجھ سے ملو گے کیا؟ اچھا نہیں لگتا میرا روز روز تمہارے گھر آنا۔“ میں نے اسے طرح دی۔

”اس کا نام بھی مت لو میرے سامنے۔ وہ میکے گئی ہوئی ہے کل سے اپنے بھائی کی شادی کے لیے۔“

”تو پھر اب۔“

”میری زندگی میں بہت تنہائی ہے حبیبہ! مریم کو اپنے میکے اور اپنی جاب کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ وہ مجھے سمجھ ہی نہیں سکی تھی۔“ میں ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئی یہی غم مشترک تو مجھے اس کے قریب لے آیا تھا۔ اس کی نرم گرم گفتگو کے سامنے میں موم کی طرح پگھلنے لگتی تھی۔

”خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو۔“ اس کے میسج نے مجھے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

”کیسے ملیں گے۔ یہی سوچ رہی ہوں۔“

”بہت آسان ہے۔ ذرا سی ہمت تو کرو۔“

”اچھا وہ کیسے؟“ میں ذرا الجھ سی گئی تھی۔ اس نے جواب میں فوری کال کر کے اپنا منصوبہ سمجھا دیا۔ ”اف! کیا دماغ پایا ہے تم نے کاشف۔ مان گئی میں۔“ میں نے ہنستے ہوئے فون آف کر دیا۔

☆☆☆

رات دس بجے کے قریب میں نے ملازمہ کو چھٹی دے دی اور اپنی سب سے دیدہ زیب ساڑی زیب تن کر کے ہلکے پھلکے میک اپ کے بعد کاشف کے نمبر پر مسڈ کال دے دی۔ اس نے بھی فوراً اپنی آمد کا گرین سگنل دے دیا۔ میں دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک دروازہ موجود تھا جو ہمیشہ لاکڈ رہتا تھا۔ میں نے احتیاط سے وہ دروازہ اندر سے کھول دیا۔ ہمارے گھر کی چھتیں باہم ملی ہوئی تھیں اور درمیان میں تھی ایک پانچ فٹ کی دیوار حائل تھی جسے عبور کرنا کاشف کے لیے کون سا مشکل تھا بھلا؟

دس منٹ بعد وہ اوپری منزل کے بیڈ روم میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی خوبروئی، وجاہت اور خوش کلامی نے مجھے بری طرح اس کا اسیر کر دیا تھا۔ وہ بلاشبہ میری زندگی میں آنے والا خوبصورت ترین مرد تھا۔ اس کے خوبصورت الفاظ اور محبت بھرے لہجے نے میری تیاری کو اس قدر والہانہ انداز میں سراہا کہ میرا وجود ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ انھی الفاظ اور وارفتگی کی چاہ میں عثمان سے کرتی آئی تھی لیکن انہیں میری کوئی قدر ہی نہ تھی۔

ہماری ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور فاصلے ختم

ہوتے گئے۔ وقت کو تو گویا پر لگ گئے تھے۔ چھ ماہ کا عرصہ پلک جھپکنے میں ہی گزر گیا تھا۔ اس کی ستائش اور محبت اب میرے لیے چاہت سے کہیں زیادہ ایک ضرورت اور ایک نشہ بن چکی تھی جس سے رہائی میرے لیے ممکن نہ رہی تھی۔ اس کا حقیقی اندازہ مجھے تب ہوا جب عثمان نے اپنے تئیں مجھے خوشخبری سناتے ہوئے اپنی نائٹ ڈیوٹی کے شیڈول کی تبدیلی کی اطلاع دی۔ میں نے انتہائی روکھے لہجے میں کہا۔

''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔''

''تمہاری ناراضگی اب طویل خاموشی میں ڈھلنے لگی تھی، شکوہ تک کرنا چھوڑ دیا تھا تم نے۔ تو اور پھر کیا کرتا میں؟'' وہ مسکرا کر بولے تو میں نے نظریں چرالیں۔ وہ جسے میری ناراضگی اور خاموشی محمول کر رہے تھے، حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو میری بے وفائی تھی لیکن ان کی فطری شرافت اور سادگی اس معاملے کی تہہ تک پہنچ ہی نہ سکتی تھی۔

کاشف سے ملاقاتوں میں خلل نے مجھے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ مصائب کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کاشف اس وقت دہری آزمائش کا شکار تھا۔ مریم کی چھٹی حس نے شوہر کے بدلے تیور اور رجحانات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا اور وہ لڑ جھگڑ کر اپنے بیٹے سمیت میکے جا بیٹھی تھی۔ تھک ہار کر ایک روز کاشف فون پر مجھ سے الجھ پڑا۔

''یہ سلسلہ کب تک یونہی چلے گا حبیبہ؟''

''کیا ہو گیا ہے کاشف تمہیں؟ حوصلہ رکھو پلیز۔'' میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے شادی کرلو حبیبہ۔ میں اب مزید برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کاشف؟ مریم اور عثمان......'' اس نے میری بات فوراً کاٹتے ہوئے درشتی سے کہا ''مریم کی مجھے کل پرواہ تھی نہ آج۔ جب کہو گی میں اسے طلاق دے دوں گا۔ تم بتاؤ کب چھوڑو گی عثمان کو؟'' اس نے ساری راہیں یکدم مسدود کر دیں۔ میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑا سی گئی۔ بچوں سے علیحدگی کے تصور نے دل کی دھڑکنیں پل بھر کے لیے ساکت کر دیں اور میں خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ دے سکی۔

''ٹھیک ہے مسز عثمان! مل گیا مجھے آپ کا جواب۔ رہیں ناں آخر وہی کمزور عورت۔'' اس نے غصے سے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

کاشف کا غصہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے میرے میسج کے جواب میں خاموشی تان لی تھی۔ دن میں کئی کئی بار میں اسے کال کرتی لیکن وہ فون اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے میں نے اس کے گھر بھی کئی چکر کاٹے لیکن اس نے مجھے مکمل نظرانداز کیے رکھا۔ اس کا یہ برتاؤ میری برداشت کا پیمانہ لبریز کر رہا تھا۔ میں نے اپنا وقار اور عزت نفس اس کے پاس رہن رکھوا دی تھی۔ مرد تو ہمیشہ ہی اقرار محبت سن کے آقا بن جایا کرتا ہے۔ جو سلوک چاہے روا رکھ سکتا ہے، اور کاشف بھی یہی کر رہا تھا۔

دو ماہ بعد میں بے بسی کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ عثمان ایک میڈیکل کانفرنس کے سلسلے میں دو روز کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میرے ضبط کا یارا نہ رہا تو کاشف کو میسج بھیج دیا۔ ''میری سزا ختم کر دو کاشی۔ پلیز۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔''

''دروازہ کھولو۔ میں آ رہا ہوں۔'' اس کا یہ چند حرفی جواب میرے تن میں نئی روح پھونک گیا۔ اسے اپنے سامنے پا کر میرے اندر موجود لاوا آنسوؤں کی صورت بہہ نکلا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر وہی مطالبہ دہرایا۔

''کب طلاق لو گی عثمان سے؟''

''جلد ہی... بہت جلد'' میں نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

''مگر تم اب مجھ سے خفا نہیں ہو گے۔''

''کتنی جلد؟ ایک ہفتہ، ایک ماہ، دو ماہ، مجھے حتمی جواب دو۔'' اس نے میری بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میرا بس چلے تو ایک دن بھی نہ رہوں عثمان کے ساتھ۔''

''تو ٹھیک ہے وہ جیسے ہی واپس آئے اس کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دو۔''

''مگر مریم کا کیا کرو گے تم؟''

''وہ میرا دردِ سر ہے تمہارا نہیں۔'' اس کے انداز کی بے رخی مجھے ہولا رہی تھی۔ ''میں آج آخری بار کہہ رہا ہوں تمہیں! چھوڑ دو عثمان کو ورنہ ہماری راہیں جدا ہو جائیں گی۔ ہمیشہ کے لیے۔''

''مم...... مگر میرے بچے۔''

''ان کی کسٹڈی کے لیے کیس فائل کر دیں گے۔ عدالت تمہارے ہی حق میں فیصلہ سنائے گی۔'' اس کا اطمینان دیدنی تھا۔ خوابوں کے جگنوؤں کے تعاقب میں لپکتے ہوئے مجھے ایک پل کے لیے بھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ ایک

شادی شدہ عورت کو اس کے بچوں سمیت اپنانے کے لیے کیونکر رضا مند تھا؟ مجھے خیال تھا تو محض اتنا کہ میں اب اس سے الگ نہیں رہ سکتی تھی۔ کاشف نواز میری بہت بڑی کمزوری بن چکا تھا۔

☆☆☆

"تمہارا دماغی توازن تو خراب نہیں ہو گیا حبیبہ؟ یہ کیا بے ہودہ مذاق ہے؟" عثمان حلق کے بل چلا کر بولے۔ میرے مطالبے پر وہ بری طرح بھڑک اٹھے تھے۔

"کیوں؟ کیا کچھ انوکھا کہہ دیا میں نے؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم...... پاگل ہو گئی ہو شاید۔ تم نے سوچ بھی کیسے لی اتنی بڑی بات؟" ان کی بے یقینی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

"اب کچھ نہیں سننا مجھے...... ہر صورت طلاق چاہیے مجھے آپ سے۔" اگلے ہی پل ان کا زوردار تھپڑ میرے چودہ طبق روشن کر گیا۔ "آج تک میں تمہاری ہر فضول بات نا بھی گردان کر نظرانداز کرتا آیا ہوں۔ مگر آج تم نے بے حسی کی ہر حد پار کر لی ہے۔ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ میرے کندھوں پر کتنی ذمہ داریاں عائد ہیں۔" ان کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔

"تو آپ نبھایئے ناں اپنی ذمہ داریاں۔ جب آپ کو بھی میرا احساس نہیں ہوا تو میں کیوں کروں؟ دیا ہی کیا ہے آپ نے مجھے؟" میں نے بھی سب لحاظ بالائے طاق رکھ دیے۔

"تمہاری یہی سوچ تمہیں اپنا غلام بنا چکی ہے۔ اپنی طمع کے دائرے سے نکل کر دیکھو تو اندازہ ہو کہ عزت، سکون، آسائشیں کیا کچھ نہیں دیا میں نے تمہیں؟ میرا نہیں تو اولاد ہی کا خیال کر لو۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

"رہ لے گی اولاد بھی میرے ساتھ ہی ...... نہیں چھوڑوں گی میں انہیں آپ کے پاس۔ آزاد ہو جائیں گے آپ اپنے بھی فرائض کی ادائیگی کے لیے۔"

انہوں نے یکدم میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور ایک زوردار جھٹکا دے کر بولے۔ "کون ہے وہ؟"

"چھوڑیں مجھے۔ کیا جہالت ہے یہ؟" میرے لبوں سے سسکاری نکلی۔

"جب تک کسی عورت کو کوئی متبادل راہ نظر نہ آئے وہ اس فیصلے کا تصور بھی نہیں کر سکتی کبھی۔ بتا دے مجھے کس کی شہ پر اتنی اچھل کود کر رہی ہو۔" وہ بالکل جنونی ہو رہے تھے۔

"یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ نہیں رہنا مجھے آپ کے ساتھ۔" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"کر لیتا ہوں تمہارا علاج میں۔" وہ مجھے دھکا دے کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

دوپہر کو امی جی کی متوقع آمد نے مجھے کاشف کی دوراندیشی کا مزید قائل کر دیا۔ انہوں نے بھی آتے ہی میرے خوب لتے لیے اور اس احمقانہ فیصلے کے اثرات پر اپنے مخصوص انداز میں لیکچر دینا شروع کر دیا لیکن میں کاشف کے ساتھ طے شدہ حکمت عملی کے باعث مکمل خاموش ہو چکی تھی۔ وہ میری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھ کر ذرا دھیمی پڑ گئیں اور آنسوؤں بھرے لہجے میں بولیں۔ "اس بڑھاپے اور میرے سفید سر کا ہی خیال کر لے۔ اس میں خاک نہ ڈلوانا۔ تیرے باپ کے بعد میں نے زندگی میں بہت مشکلیں سہی ہیں۔ شوہر کا گھر بہت بڑی نعمت اور سائبان ہوتا ہے حبیبہ! یہ چھن جائے تو عورت راہ کا پتھر بن جاتی ہے جسے ہر کوئی اپنی ٹھوکروں کی زد میں رکھتا ہے۔ تو تو سدا کی نا سمجھ ہے۔ چھوڑ دے اپنی یہ ضد۔" انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں خاموشی سے اٹھ کر کچن میں کھانے کی تیاری میں مشغول ہو گئی۔

☆☆☆

"کیا ہوا؟ مانا یا نہیں؟" شام ہوتے ہی کاشف کا پیغام موصول ہوا تھا۔

"نہیں! وہ تو بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا ہے۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ پلان 'بی' پر عمل شروع کر دو فوری۔ اپنا خیال رکھنا بہت سا...... میرے لیے۔" اس کی یہی دیوانگی مجھے نفع و نقصان سے بے نیاز کیے ہوئی تھی اور میں خوابوں کی تتلیوں کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔

عثمان اس روز جلد ہی واپس آ گئے۔ ان کے چہرے پر ثبت گہری سنجیدگی مجھے کسی انہونی کی خبر دے رہی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کی فوری تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ امی جی سے مخاطب ہو کر بولے۔ "میں نے اسپتال سے استعفیٰ دے دیا ہے فوری۔"

"آئے ہائے! مگر وہ کیوں؟ گھر بیٹھ کر کیا کرو گے اب؟"

"ضروری سامان پیک کروایئے آپ۔ کل دوپہر کی گاڑی سے یہاں سے چلنا ہے ہمیں۔ ہمیشہ کے لیے۔"

پھر ایک توقف سے بولے۔ "آپ چلیں گی ناں ہمارے ساتھ؟ کچھ عرصہ وہیں رہ لیجیے گا، جب تک اس کے سر پر سوار بھوت نہیں اتر جاتے۔" انہوں نے قہر برساتی نظروں سے مجھے گھورا۔

"مجھ اکیلی جان کا کیا ہے بیٹا؟ یہاں بھی اکیلی ہی رہتی ہوں۔ تم سب کے ساتھ دل لگا رہے گا۔"

"کل صبح میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے گھر لے چلوں گا۔ اپنا سامان وغیرہ بھی لے لیجیے گا۔" وہ یہ کہہ کر بچوں کے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے کاشف کی دور اندیشی پر رشک آنے لگا تھا۔ اس نے ان تمام ممکنات پر حفاظتی بند پہلے ہی باندھ رکھے تھے۔ مجھے اپنے انتخاب اور اس کی شدید چاہت پر فخر ہونے لگا تھا۔ رات ہوتے ہی میں نے بظاہر عثمان کی ہدایات پر عمل شروع کر دیا تھا لیکن درحقیقت اپنے حصے کا 'اصل کام' میں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ نیند کی گولیوں کا ہلکا سا سفوف ملا کھانا انہیں کئی گھنٹے تک غافل کرنے کے لیے کافی تھا۔

رات گئے ان کی نیند کا یقین ہوتے ہی میں نے کاشف کو مسڈ کال دی۔ اوپری سیڑھیوں کا دروازہ میں پہلے ہی کھول چکی تھی۔ "چلیں ملکہ عالیہ!" اس نے بے انتہا وارفتگی سے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیے۔

"جی چلیے بادشاہ سلامت!" میں نے بڑی شوخی سے جواب دیا۔ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر یکدم سنجیدگی سے پوچھا۔ "کوئی ملال تو نہیں تمہارے دل میں؟ یہ سفر آسان نہیں ہوگا حبیبہ! ایسا نہ ہو تمہیں پچھتاوے گھیر لیں۔"

"مجھے بس بچوں کا خیال ہے کاشی۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "وہ کیسے رہیں گے میرے بغیر۔"

"وہ کیوں رہیں گے تمہارے بغیر بھلا؟ جلد ہی وہ تمہارے پاس ہوں گے۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔ مجھے دیکھو! میں بھی تو کچھ عرصہ رہوں گا عبداللہ کے بغیر۔" اس کی سنجیدگی نے ماحول مزید بوجھل کر دیا۔ کچھ لمحات یوں ہی خاموشی سے سرک گئے۔ دفعتاً اس کے موبائل کی گھنٹی نے ہم دونوں ہی کو اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

"تیار رہو بس۔ اس علاقے کی بجلی ایک بجے جاتی ہے۔ تم ڈیڑھ بجے گاڑی لے آنا۔ بالکل دروازے کے سامنے۔" وہ کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ "میں نہیں چاہتا ہمیں کوئی ایک ساتھ دیکھے۔ اس لیے اندھیرے میں نکلیں گے۔ میرا ایک دوست اپنی گاڑی لے آئے گا۔"

"اور گھر میں سب؟ ریحانہ آنٹی۔"

"امی عنبر کے یہاں موجود ہیں۔ بیٹے کی ولادت ہوئی ہے اس کے گھر۔ کچھ دن وہ وہیں گزاریں گی۔ اور میں نے بھی یہاں سب کو یہی بتا رکھا ہے کہ میں نے عاصم کی کمپنی میں جاب کا آغاز کر دیا ہے۔ سو تم بے فکر رہو۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ کسی کو رتی بھر بھی شک نہیں ہوگا۔" اور میں واقعی بے فکر ہو گئی۔ میں اپنی ارضی جنت کو بڑے مان اور تنفر سے الوداع کہہ کر پہلے سے پیک شدہ اپنے تمام تر زیورات، جمع شدہ رقم اور کپڑے لیے اپنی محبت کے ساتھ ایک نیا جہان بسانے کی آرزو لیے چل دی۔

☆☆☆

"آپ رہائش و قیام کی فکر کیوں کرتے ہیں بھائی؟ میں نے کر دیا ہے سب بندوبست پہلے سے ہی؟" عاصم نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ہم کچھ دیر قبل ہی اس کے پاس پہنچے تھے اور اس کی گرمجوشی و خوشدلی نے میرے بھی خدشات ہوا کر دیے تھے۔ "مری میں میرے ایک دوست کا ریسٹ ہاؤس نما گھر ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو چکا ہے۔ گھر کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہے۔ آپ لوگ جب تک چاہیں وہاں رہ سکتے ہیں۔"

"بہت شکریہ یار! تم نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا۔" کاشف پرسکون ہو گیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم چاہو تو فون کر لو ایک بار گھر۔"

"جی! میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔" میں تو پہلے ہی اشارے کی منتظر تھی۔

"ایک منٹ بھابی! رکیے!" عاصم نے مجھ سے فون چھین لیا۔ "اپنے نمبر سے مت کریں کال۔"

"لیکن کیوں آخر؟" میں حیران تھی۔

"آپ کو اپنا فون آن کرنا ہی نہیں چاہیے ابھی۔ ورنہ آپ دونوں کی لوکیشن ٹریس بھی کی جا سکتی ہے۔ میرے نمبر سے کر لیجیے بات۔ اس کی کالر آئی ڈی بلاکڈ ہے۔ کوئی ٹریس نہیں کر سکتا۔" میں اپنی قسمت کی اس یاوری پر مسرتوں سے نہال ہو رہی تھی۔ تمام تر مسائل کے چٹکی بجاتے حل اور عاصم کا مجھے "بھابی" کہہ کر اپنائیت سے بات کرنا میرے لیے کسی خزانے کی دستیابی سے کم نہ تھا۔ کاشف کی فیملی کا مجھے فوری قبول کر لینے کا تصور ہی بہت جاں فزا تھا۔

میں نے بے تحاشا دھڑکتے دل سے عثمان کا نمبر ملایا۔

انہوں نے خلاف توقع بڑے ٹھنڈے انداز میں بات کی اور سرد آواز میں بولے۔ ”تم نے وہی قدم اٹھایا جو ایک کم عقل، کم ظرف اور احمق عورت اٹھا سکتی ہے۔ میں اتنے سال ایک ناگن کو دودھ پلاتا رہا۔ میرا شک ٹھیک ہی تھا۔ اتنی جلدی یہاں سے فرار میں جو بھی تمہارے ساتھ ملوث ہے، دن میں تارے ضرور دکھائے گا تمہیں۔“

”ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ کبھی بھی نہیں۔“ میں تڑپ کر بولی۔

”میں تمہارے ناپاک وجود کے ساتھ اپنا نام اب قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بقائمی ہوش وحواس تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اپنے بچوں پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ غلاظت کی زندگی مبارک ہو تمہیں۔“ انہوں نے فون بند کر دیا۔

میرے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں دیکھ کر کاشف نے مجھے گھرکتے ہوئے کہا ”کیوں اتنی فکر مند ہو رہی ہو؟ کہا تو ہے تمہیں کہ بچوں کی کسٹڈی کے لیے کیس فائل کر دیں گے ہم۔“

”لیکن اگر وہ انہیں لے کر کہیں غائب ہو گیا تو؟“ میں نے بے چینی سے اپنے ہاتھ مسلے۔

”نہیں غائب ہو سکتا بھابی وہ۔“ عاصم نے اسی اپنائیت سے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہم نے ایک دوست کی ذمہ داری لگا رکھی ہے، وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اور یہ گھر کی چابیاں تھامیں۔ ایک نئی زندگی آپ کی منتظر ہے۔“

طلاق جیسے اہم مسئلہ سے اس قدر آسان رہائی مجھے اپنے بخت کی بلندی معلوم ہو رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کاشف اپنے ساتھ ایک مولانا اور چار افراد کو لے آیا۔ میں اس کی جلد بازی پر بے حد حیران تھی۔ ”میری عدت تو مکمل ہونے دو کاشی! اتنی جلدی نکاح کیسے ممکن ہے؟“

”ممکن کیوں نہیں ہے؟ میں نے مولانا صاحب سے تصدیق کروالی ہے۔ بحالتِ مجبوری نکاح کر سکتے ہیں ہم۔ اب جلدی آؤ باہر۔ دیر مناسب نہیں۔“

”مجھے احکام دین کی مکمل جانکاری نہیں تھی۔ وہ جو کہتا میں یقین کر لیتی۔“

میرے لیے یہ سب کسی خواب کی مانند تھا۔ اتنی جلدی عثمان سے چھٹکارا اور کاشف سے نکاح میرے خوابوں کی حسین ترین تعبیر تھی۔ میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتی، کم تھا۔ شادی کے بعد کاشف کا والہانہ پن اور فریفتگی بڑھتی جا رہی تھی اور میں گویا ساتویں آسمان پر اڑ رہی تھی۔ وہ ہر شام مجھے سیر و تفریح کے لیے لے جاتا۔ میرے لباس پہلے سے مزید چست اور بے باک ہونے لگے اور اس کی ستائش بھرے الفاظ، جذبے لٹاتی نظریں، شدت پسندی میری رگ و پے میں بجلی دوڑا دیتی تھیں۔ اس کے بہت سے شناسا اور دوست ہمیں اکثر باہر ملتے اور میری تعریف میں ذرا بھی بخل نہ کرتے۔

بچوں کی طرف سے بھی اک اطمینان بھری خبر نے دل و دماغ پُرسکون کر دیے۔ عاصم کے مبینہ دوست نے بہت تندہی سے ان پر نظر رکھی تھی۔ عثمان بچوں اور ان کی نانی سمیت کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ اس نے میری التجا پر ان کی مختلف زاویوں سے تصاویر لے کر کاشف کے موبائل پر بھیج دیں۔ سکون کی اک لہر کے ساتھ بے عنوان کسک بھی دل میں سرایت کر گئی۔ زندگی نے خوشیوں کا ایک نیا پیراہن اوڑھ لیا تھا۔ کاشف...... میں...... مری کی حسین برف پوش وادیاں...... ہمارا ریسٹ ہاؤس...... اور ہر سو سانس لیتی محبت۔ مجھے فلک کا ہر ستارہ اپنی دسترس میں محسوس ہوتا تھا۔ دو ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ بلند فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے میں نے اپنے قدموں تلے زمین چھوڑ دی تھی اور موم جیسا وجود لیے سورج کے پاس جا پہنچی تھی۔ پگھل کر بدہیئت روپ میں تو آنا ہی تھا۔

☆☆☆

”کاشی! ہم کب تک یہاں رہیں گے؟“ وہ بازو سر تلے رکھے بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟ اکتا گئی ہو کیا میرے ساتھ رہ کر؟“

”نن...... نہیں! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ اب میں اسے کیسے بتاتی کہ بچوں کے بغیر مزید رہنا دشوار تر ہو رہا تھا اور ان وادیوں کے حسین مناظر بھی اب یکسانیت کا شکار لگ رہے تھے۔

”تھوڑا وقت اور صبر کر لو۔ پھر تو چلے ہی جانا ہے۔“ وہ سرسری سے انداز میں بولا۔ اس کے انداز میں آج کچھ بے چینی سی جھلک رہی تھی۔

”کیا ہم وہیں رہیں گے؟ اسی گھر میں؟“

”ہاں شاید۔ ابھی کچھ فائنل نہیں کیا۔“

”مریم کو طلاق نامہ بھیج دیا تم نے؟“ میں نے اپنے دل میں مچلتے خدشوں کو زبان دی۔ اس کی بار بار گھڑی اور موبائل پر اٹھتی نظریں بہت عجیب تاثر دے رہی تھیں۔ اگلے ہی پل اس کے موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے برق رفتاری سے کال ریسیو کرلی۔ ”اتنی دیر کیوں لگا دی؟ اچھا...... ہاں مال تیار ہے۔ ڈلیوری لے لو آکے۔“ اس کی مبہم گفتگو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا لیکن وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”میں ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔ ضروری کام ہے مجھے۔“ وہ عجلت میں کہتا ہوا نکل گیا۔ پندرہ منٹ بعد کمرے میں ایک چالیس، بیالیس سالہ آدمی داخل ہوا اور بڑے ٹھسے سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں ہق دق رہ گئی اور تڑخ کر بولی۔

”ایکسکیوزمی مسٹر! یہ کیا حرکت ہے؟ آپ اندر کیسے آگئے؟ غلط جگہ آگئے ہیں آپ۔“

”نہیں میڈم! میں بالکل صحیح جگہ اور صحیح شخص کے پاس آیا ہوں۔“ اس کا اطمینان دیدنی تھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔

”مطلب صاف ہے میڈم! آپ کی آج کی یہ رات اس خاکسار کے نام ہے۔“ وہ آنکھ دبا کر بولا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟ تم غلط جگہ پر آگئے ہو۔ نکلو یہاں سے ابھی۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی۔“

”اب اتنا بھی مت بنیے میڈم!“ اس نے اپنے موبائل سے کال ملا کر اسپیکر آن کردیا۔ کاشف کی آواز سنتے ہی مجھے پتنگے لگ گئے۔

”کیا ہوگیا ہے کھوسہ صاحب! مال پسند نہیں آیا کیا؟“ اس کے الفاظ نے میرا ذہن بھک سے اڑا دیا۔

”اجی! پسند کیوں نہیں آیا۔ پسند تھا تو آپ کو ادائیگی کی تھی۔ مگر یہ تو کچھ لاعلم محسوس ہوتی ہیں۔“ وہ کیلی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

”لاعلمی بھی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے کھوسہ صاحب! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ ابھی وہ آپ سے لاعلم ہے تو آپ اسے اپنے علم سے مستفید کیجیے۔ خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔“ کاشف کے الفاظ مجھے پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل رہے تھے۔

”سن لیا محترمہ آپ نے؟ کاشف نے تو آپ کو بتایا نہ ہو شاید مگر میں بتائے دیتا ہوں۔ وہ لڑکیوں کا بہت پرانا سپلائر ہے۔ کمال ہے وہ دو ماہ آپ کو ساتھ لیے اپنے کسٹمرز سے ملواتا رہا اور آپ کو علم ہی نہیں۔ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!“ میرا دل چاہا زمین پھٹے اور میں اندر سما جاؤں۔ میری منت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مجھے پامال کرتا رہا۔ خوابوں کی کرچیاں میری آنکھوں میں چبھتی رہیں۔ تتلیاں اپنی حسرتوں پہ بے موت مر گئیں۔ زمین پھٹی، نہ آسمان ٹوٹا لیکن میرا وجود بے مول ہوگیا۔

☆☆☆

اگلی دوپہر کاشف بڑے مطمئن انداز میں گنگناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو میرا ضبط ختم ہوگیا میں اس پر پل پڑی۔ ”گھٹیا! رذیل! کم ظرف انسان! یہ تھی تمہاری محبت اور چاہت؟“ میں نے اس کا چہرہ نوچ لیا۔

”کون سی محبت؟ کیسی چاہت؟ یہ تو میرا بزنس ہے مائی ڈیئر۔“

”میں تمہارے نکاح میں ہوں بے حیا انسان! کوئی اپنی بیوی کے ساتھ یوں بھی کرتا ہے کیا؟“ شدت غم سے میری آواز پھٹنے لگی۔

”نکاح تو تم نے عثمان سے بھی کیا تھا جب اس وقت عقد نکاح کی پاسداری نہ کی تو اب یہ ڈھکوسلے کیوں؟ اور یہی سب تو چاہتی تھیں ناں تم...... اپنے حسن کی پرستش اور شمع محفل...... میں نے تو تمہاری خواہش پوری کی ہے بس۔“ اس کے الفاظ تیزاب کے چھینٹوں کی مانند میری روح گھائل کررہے تھے۔ ”اور بائی دا وے! ایسے نکاح تو میں نے جانے کتنی بار کیے ہیں۔ اگر تم اسے نکاح سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو۔ دل کے بہلانے کو غالب خیال اچھا ہے۔“ اس کے خوبصورت چہرے پہ پڑا نقاب آج تار تار ہوگیا تھا اور اس مکروہ روپ سے مجھے گھن آنے لگی تھی۔

”میں تمہارے ہاتھوں کٹھ پتلی نہیں بنوں گی کمینے انسان! میں قانون کی مدد لوں گی۔ چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں۔“

”آہا...... قانون...... او کے تمہاری یہ تمنا بھی پوری کیے دیتا ہوں۔“ اس نے موبائل پر ایک نمبر ڈائل کرکے اسپیکر آن کردیا۔

”کیا حال چال ہیں چیمہ صاحب؟ حضور ایک چھوٹی سی زحمت دینی تھی آپ کو۔“

”بولو بادشاہو! کیا خدمت ہے ہمارے لائق؟“

ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''حضور! آپ کی آمد تو ویسے اگلے ہفتے ہونی تھی یہاں مگر آج ہی آپ کی ضرورت آن پڑی ہے۔ آتے ہوئے اپنا سرکاری کارڈ لیتے آیئے گا۔ یہاں کسی نے میرے خلاف رپورٹ درج کروائی ہے۔''

''ہاہاہا! کیوں نہیں۔ بس سمجھو رپورٹ درج ہوگئی اور تمہیں پھانسی بھی ہوگئی۔'' اس نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ میرا اس وقت وہی حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

اور پھر وہی ہوا جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ میرا ہر حربہ اور ہر دھمکی ناکام رہی۔ ہر رات ایک نئی سیج سجائی جاتی۔ میرے حسن کی بارگاہ میں ایک نیا درباری در آتا اور مجھے غلاظت کی متعفن وادیوں میں اپنے ساتھ دھکیل لیتا۔

☆☆☆

''جی امی! لگاتا ہوں چکر میں جلد ہی۔ آپ فکر نہ کریں۔'' ریحانہ آنٹی سے بات کرتے ہوئے کاشف کی نظریں مجھ پہ ہی گڑی تھیں۔ ''ہاں جی! ٹھیک ہے وہ بھی۔ میرے شکنجے سے آج تک کوئی نکل سکا ہے کیا جو یہ نکل جاتی؟'' وہ ایک ذومعنی قہقہہ لگا کر بولا۔

''اب کہاں کوچ کا ارادہ ہے؟'' فون بند ہوا تو میں پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

''ایک نئے جہان کی دریافت میں۔ کسی اور حبیبہ کے خوابوں میں رنگ بھروں گا۔'' وہ کمینگی سے ہنسا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں کاشف؟ کیا تمہاری ماں بھی شامل ہے اس سب میں؟''

''ہاں بالکل! میرا تو فیملی بزنس ہے یہ۔ اور شرم کیسی؟ سماجی خدمت کررہے ہیں ہم۔ تمہارے خواب پورے کردیے اب کسی اور کا حق مارنے پر کیوں تلی ہو؟''

''میں تو اندھی ہوچکی تھی جو سمجھ ہی نہ سکی کہ کیوں اتنے مہربان ہیں تمہارے گھر والے مجھ پہ۔'' میں نے اپنے دانت پیسے۔ ''لیکن تمہاری بیوی؟ وہ کیوں نہ بولی کچھ؟ اسے بھی اپنے کاروبار کا حصہ نہیں بنا رکھا؟''

''میری بیوی واحد عورت ہے جسے میں نے اس سماجی خدمت کا ذریعہ نہیں بنایا۔''

''اور اس کی وہ نوکری؟''

''وہ میری کمائی اپنی ذات پر خرچ کرنا نہیں چاہتی۔ سو خواہ مخواہ خود کو ہلکان کرتی رہتی ہے۔''

''طلاق تو نہیں دی ہوگی تم نے اسے یقیناً؟'' میں

## راشد منہاس شہید

(1971-1951) نشانِ حیدر حاصل کرنے والے پائلٹ آفیسر۔ کراچی میں پیدا ہوئے۔ منہاس (راجپوت گوت) گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ 1968 میں سینٹ پیٹرک اسکول کراچی سے سینئر کیمبرج کیا۔ خاندان کے متعدد افراد پاکستان کی بری، بحری اور فضائی افواج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے بھی اپنا آئیڈیل فوجی زندگی ہی کو بنایا اور اپنے ماموں ونگ کمانڈر سعید سے جذباتی وابستگی کی بنا پر فضائیہ کا انتخاب کیا۔ تربیت کے لیے پہلے کوہاٹ اور پھر پاکستان ایئر فورس اکیڈمی رسالپور بھیجے گئے۔ فروری 1971ء میں پشاور یونیورسٹی سے انگریزی، ایئر فورس لاء، ملٹری ہسٹری، الیکٹرونکس، موسمیات، جہاز رانی، ہوائی حرکیات وغیرہ میں بی۔ ایس۔ سی کیا۔ بعدازاں مزید تربیت کے لیے کراچی بھیجے گئے اور اگست 1971ء میں پائلٹ آفیسر بن گئے۔

20 اگست 1971ء کو راشد کی دوسری تنہا پرواز تھی۔ وہ ٹرینر جیٹ طیارے میں سوار ہوئے ہی تھے کہ ان کا انسٹرکٹر سیفٹی فلائٹ آفیسر غدار مطیع الرحمن، خطرے کا سگنل دے کر، کاک پٹ میں داخل ہوگیا اور طیارے کا رخ بھارت کی سرحد کی طرف موڑ دیا۔ راشد نے ماری پور کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا تو انہیں ہدایات دی گئیں کہ طیارے کو ہر قیمت پر اغوا ہونے سے بچایا جائے۔ اگلے پانچ چھ منٹ راشد اور انسٹرکٹر کے درمیان کشمکش میں گزرے اور اسی کشمکش کے دوران طیارہ زمین پر گر کر تباہ ہوگیا۔ راشد نے شہادت کا درجہ پایا اور انہیں اس عظیم کارنامے کے صلے میں سب سے بڑا فوجی اعزاز نشانِ حیدر دیا گیا۔ مدفن کراچی میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان میں ہے۔

مرسلہ: زاہد فاروق، کراچی

نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"میں پاگل ہوں جو اسے طلاق دوں۔ تمہیں وہاں سے نکالنے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا گیا تھا۔" وہ اطمینان بھرے انداز میں انکشاف کرتا گیا۔ خوابوں کے چمکیلے اندھیروں میں بھٹکتی نہ جانے کتنی حوا کی بیٹیاں اس کے الفاظ کے جال میں پھنس کر اپنا نادانیوں کا تاوان ادا کرتی رہی ہوں گی۔

"میں ایک ہفتہ بعد آؤں گا اب۔ اپنا خیال رکھنا...... میرے لیے۔" اس نے انتہائی خباثت سے کہا۔

"اچھا اور اس ایک ہفتے کے بعد؟"

"پھر تمہیں رمیز کے پاس دبئی بھیج دوں گا۔ ہماری اس سماجی خدمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دبئی میں غریب الوطن اور پردیسیوں کی خدمت کرنا اور دعائیں لینا۔" اس کا سرسری انداز میرے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہا تھا۔ میں ایک قفس سے نکل کر دوسرے قفس میں قید ہونے والی تھی۔ میری کم عقلی اور خیانت نے مجھے ایک ہولناک دلدل میں پھنسا دیا تھا۔ میری سوچ میں ایک منصوبہ کلبلانے لگا لیکن اس کے شاطر دماغ نے شاید میرا ذہن فوری پڑھ لیا اس لیے بڑی درشتی سے بولا۔

"یہاں سے کسی صورت خلاصی ممکن نہیں تمہاری۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اگلے ہی دن تمہاری بیٹی کو کراچی سے یہاں لا بٹھاؤں گا۔ چیمہ صاحب کے ساتھ گزارو گی تم یہ ایک ہفتہ۔" اس جلاد کے تصور سے میری روح فنا ہونے لگی۔ فرار کی بھی راہیں مسدود تھیں۔ صیاد بہت شاطر تھا اور پنچھی انتہائی نادان۔ زخم دکھاتی بھی تو کسے؟ عرضی دیتی بھی تو کسے؟

☆☆☆

کاشف کو گئے وہ تیسرا روز تھا جب چیمہ کچھ پریشان دکھائی دینے لگا۔ پانچویں روز وہ بہت زیادہ بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ اس نے بے تابی سے موبائل پر کال ملائی اور ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

"کاشے! جلدی پہنچو ادھر.......... ہاں ذرا مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرے فوری ٹرانسفر آرڈر آگئے ہیں۔ اب نئے افسر سے خود ہی معاملات نمٹانا۔ میری اس سے پرانی رقابت ہے۔ میں اس بار درمیان میں معاملات طے نہیں کروا سکتا...... میری مان تو اسے دبئی روانہ کر دے فوری۔ نئے شکاری کی آمد تک یہاں سے 'آف' رہے گا تیرا تو بہتر ہے۔"

اس نے فون بند کیا تو مجھے اپنے سامنے دیکھ کر آنکھوں میں خباثت سموئے بولا۔ "ہاں؟ کیا مسئلہ ہے؟"

"میرے معدے میں بہت سخت تکلیف ہے۔ دوائی نہ لی تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔" میں نے نقاہت سے کہا۔

"اب رات کے اس پہر میں تجھے کون سے ڈاکٹر کے لے کر جاؤں؟ صبح ہر نیوز چینل اور اخبار پر میری تصویریں چل رہی ہوں گی۔"

"تو کسی ملازم کے ساتھ بھیج دو۔ یا مجھے وہ دوائی ہی منگوا دو جو میں پہلے استعمال کرتی رہی ہوں۔ پلیز رحم کرو مجھ پہ۔"

اس نے ملازم کو آواز دی اور کہا۔ "یہ جو دوائی لکھ کر دے لا دینا اسے۔ اگر اسٹور والا نسخہ مانگے تو میرا نام لے دینا۔" میں نے ممنونیت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

☆☆☆

"حالات کچھ موافق نہیں رہے کاشے! ہو سکتا ہے تجھے انڈر گراؤنڈ بھی ہونا پڑے کچھ دن۔" چیمہ کاشف سے مخاطب تھا۔

"خیر ہے چیمہ صاحب! ایسی اتھل پتھل سال دو سال میں آہی جایا کرتی ہے۔ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔"

"خیر میرا کام تھا تجھے خبردار کرنا۔ تو اپنا بھلا برا خود سوچ سکتا ہے۔" وہ اپنی چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "رابطے میں رہنا شہزادے! اچھا وقت گزرا تیرے ساتھ۔" دونوں خوشدلی سے قہقہے لگاتے بغلگیر ہو گئے۔ چیمہ کے جانے کے بعد کاشف بیڈ روم میں نیم دراز ہو گیا اور زیر لب ایک گالی دے کر بولا۔ "اناڑی سمجھتا ہے مجھے۔ اتنا مال کھانے کے بعد بھی اپنی کمیشن کے چکروں میں پڑا ہے۔" پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"کل تیار رہنا۔ تمہارے پاسپورٹ کے لیے اسلام آباد چلیں گے۔ نئے گھر کا سودا بھی ہو گیا ہے۔ تمہیں روانہ کرتے ہی نئی مہم پہ روانگی ہو گی میری۔ اور پھر سے کوئی اچھے دل اور گھر کے دروازے میرے لیے وا کر دے گی۔" میں ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی۔ اسے جانے کیوں میری جھک بہت سکون دیتی تھی۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا کی کیفیت طاری تھی۔

رات کے پچھلے پہر کاشف نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

"تحریم! اٹھو...... جلدی...... ڈاکٹر کو بلاؤ...... میری طبیعت

بہت خراب ہو رہی ہے۔" اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور آواز بدقت تمام نکل رہی تھی۔ گھر میں سوئی ہی نہ تھی تو اٹھنے کا کیا سوال؟ میں خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ اٹھو جلدی کرو۔" اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل اٹھایا لیکن فون اس کی گرفت سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ میں بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

"میں کچھ کہہ رہا ہوں تم سے۔ سنائی نہیں دے رہا کیا؟" وہ بے طرح ہانپ رہا تھا۔

"سب دکھائی دے رہا ہے اور سنائی بھی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ اس کا جسم اب لرزنے لگا تھا۔ "بس کچھ لمحوں کی بات ہے۔ ٹھیک ہو جاؤ گے پھر ہمیشہ کے لیے۔" اس کی آنکھوں میں اترنے والا خوف مجھے بہت سکون دے رہا تھا۔

"کک...... کک...... کیا...... مم...... مطلب۔"

"مطلب صاف ہے کاشف نواز! تمہاری اور چیمہ کی چائے میں کچھ دوائیوں کا سفوف ملا دیا تھا میں نے۔ جس کا ردعمل اب سامنے آرہا ہے۔" میں نے بڑے سکون سے کہا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں لاکھ کم عقل سہی لیکن ایک ڈاکٹر کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اتنا تو علم رکھتی ہوں کہ کس دوائی کے کیا نقصانات ہیں۔ اور فکر نہ کرو...... زیادہ نقصان نہیں ہوگا تمہیں۔ بس تمہارا یہ وجود اور زبان مفلوج ہو جائیں گے اور ہاتھوں پہ رعشہ طاری ہو جائے گا۔ لیکن فکر نہ کرو۔ موت نہیں آئے گی تمہیں۔"

"تت...... تم...... بب...... بچ نہیں سکو گی۔" اس کی آنکھیں خوف سے ابل رہی تھیں۔

"ہاں میں جانتی ہوں...... میں بچ نہیں سکوں گی۔ میں نے زندگی بھر گناہ کیے کاشی! شادی سے پہلے والدین کے اعتماد کو روندتی رہی۔ شادی کے بعد شوہر کی نافرمانی اور ناشکری کرتی رہی۔ لیکن اپنے وجود کو یوں بے مول نہیں کیا تھا میں نے۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنی گناہ گار زندگی کی بہت اچھی سزا ملی۔ اللہ کی حدود پامال کرتی رہی میں۔ بچ کیسے سکتی ہوں سزا سے؟ میں تو تیار ہوں کفارہ کے لیے۔"

☆☆☆

کاشف اور چیمہ کی یکساں حالت اور صاحب فراش ہونے کی وجوہات پر سطحی سی تفتیش بھی میرے گرد قانون کا شکنجہ جکڑنے کے لیے کافی تھی۔ ان دونوں کا باہم گٹھ جوڑ اور اس گھر وہ دھندے کے لیے 'بڑی پھوپھو' کی پشت پناہی بھی میرے لیے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اپنی بے وقعتی کے انتقام سے کہیں زیادہ کٹھن مرحلہ اب میری بقا تھا۔

اس اندھیری رات میں نقدی اور ضرورت کا تھوڑا سا سامان بیگ میں ٹھونس کر میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ منزل معلوم تھی نہ اپنی قسمت پہ بھروسا۔ ذہن میں ایک ہی سودا سمایا تھا کہ میرا وجود مزید متعفن نہ ہو سکے۔ ہر لمحہ ایک دھڑکا طاری تھا۔ ہلکی سی آہٹ سے بھی دل اچھل کر حلق میں آجاتا تھا۔ اس رات کے ہر اک پل میں، میں نے صدیوں کی مسافت جھیلی۔ لاہور پہنچ کر میری اذیت کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اپنے گھر اور بچوں کی یاد نے آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگا دی لیکن میں اب راندہ درگاہ تھی۔ معافی مانگتی بھی تو کس برتے پر؟ چہرے کو چادر کے نقاب سے ڈھکے میں بغیر سوچے سمجھے ایک ٹرین پر سوار ہو گئی۔ کسی بھی جنکشن پر گاڑی رکتے ہی میں بیت الخلا میں چھپ جاتی اور لرزتی ٹانگوں اور کانپتے دل سے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچنے کی التجائیں کرتی۔

اس ٹرین کی منزل ملتان شہر تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر جانے کتنی دیر میں پیدل چلتی رہی۔ ایک اور رات اپنی ہولناکی سمیت کسی عفریت کی مانند منہ کھولے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرے ضبط و ہمت کے تمام تر بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ ٹانگیں بے جان اور حلق میں پیاس کے نوکیلے کانٹے جب ناقابل برداشت ہونے لگے تو شومئی قسمت ایک مزار پہ نظر پڑ گئی۔

وہ مزار ایک کھلے احاطے میں واقع تھا جس کے داہنی کونے میں لگا پانی کا ایک نل مجھے آب حیات محسوس ہوا۔ جی بھر کے پیاس بجھائی تو ایک کرخت نسوانی آواز سماعت میں پڑی۔

"کون ہے تو؟ کتھوں آئی ہیں؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو الجھے ہوئے بالوں، میلے کچیلے چہرے اور جا بجا پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس ایک بھکارن، مجھے برے کی سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میری خاموشی پر اس نے ایک معنی خیز مسکراہٹ لیے کہنے لگی۔

"اتھاں کیویں آئی ہیں؟ شوہر گھر توں کڈھ چھوڑے یا کہیں دھوکا ڈتے؟" (یہاں کیسے آنا ہوا؟ شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے یا کسی نے دھوکا دیا ہے؟)

مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس کی جہاندیدہ نظریں بھی میری بے بسی محسوس کر چکی تھیں۔ وہ مجھے مزار کے

شمالی حصے میں لے گئی جہاں اس جیسی ہی کئی بھکارنیں موجود تھیں۔

"اے کھن! اے کھا جا!" الفاظ نامانوس تھے لیکن اس کے ہاتھ میں چاولوں کی ایک گندی پلیٹ مجھے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم محسوس ہوئی۔ میں ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ ان عورتوں کی معنی خیز ہنسی اور دبے دبے قہقہے نظر انداز کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ان بدبودار کپڑوں اور میلی کچیلی عورتوں کے مابین گزرنے والا ہر اک پل اپنے گھر اور سائبان کی وقعت کا احساس دلواتا روح کو تار تار کر رہا تھا۔ تھکاوٹ سے چور بدن، بے آرام آنکھیں اور چکراتے سر نے میری قوت برداشت ختم کر دی اور میں ایک الگ تھلگ کونے میں بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔

میری اس غفلت نے ایک بار پھر مجھے بہت کاری ضرب لگائی۔ مزار میں موجود نوسر بازوں اور نشے کے عادی ایک گروہ نے میرے باقی ماندہ مال و متاع کے ساتھ مجھے بھی مال غنیمت کی طرح خوب لوٹا کھسوٹا اور ادھ موئی حالت میں وہیں پھینک کر چل دیے۔ تاروں بھرے شفاف آسمان تلے نیم برہنگی اور بے بسی کے عالم میں آنسو کسی آتشیں سیال کی طرح میرا تن من جھلسا رہے تھے اور پہلی بار میں سر پٹخ، پٹخ کر روتی چلی گئی۔ جانے وہ آنسو ندامت کے تھے، پچھتاوے یا احساس زیاں کے؟ لیکن میرا کرب نا قابل برداشت ہو چلا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔

اور پھر واقعی مجھے موت نے آلیا۔

☆☆☆

"کیا حال ہے تیرا دھی رانی اب؟" ایک نرم سی آواز میں کسی نے مجھے مخاطب کیا۔ بدقت تمام آنکھیں کھول کر دیکھا تو دھان پان سے وجود کے حامل ایک بزرگ مجھے تک رہے تھے۔ ان کی نظروں سے جھلکتے فکر اور شفقت کے رنگوں نے میرے وجود میں اذیت کی نئی لہریں برپا کر دیں۔ بے بسی آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے برسنے لگی۔

"حوصلہ کر میری دھی! تو میرے گھر میں ہے اب۔ روتی کیوں ہے؟" ان کا ہمدردانہ لہجہ مجھ پہ تازیانے برسا رہا تھا۔ اگلے چند دن انہوں نے خلوص نیت سے میری خوب تیمارداری کی۔ وہ اسی مزار کے مرقد کی صفائی ستھرائی کے علاوہ مجاوروں اور زائرین کے علاج معالجہ پہ مامور تھے۔ ان کی سادہ لوحی اور درویشی سے بیزار ہو کر بیوی نے شادی کے چند سال بعد ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ شاید وہ بھی میری ہی طرح خوابوں کی تتلیوں اور جگنوؤں کی پکار پر لبیک کہہ کر زندگی کی نئی راہیں متعین کر چکی تھی۔ مجھے وہاں رہتے ہوئے غالباً وہ دسواں روز تھا جب بابا امام دین نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا سوچا ہے تو نے اب اپنے بارے میں؟"

"میں کسی سوچ سمجھ کے قابل نہیں رہی۔ اپنی جنت سے نکل کر زندگی میرے لیے ایک دائرہ بن گئی ہے جس میں میرے لیے ایک ہی سزا متعین ہے۔" میری آواز لڑکھڑا گئی۔

"میں چاہ کر بھی تجھے سدا اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ تیری حفاظت میرے بس کا روگ نہیں۔ یہاں مزار سے بھی اکثر لوگ دوا دارو لینے آجاتے ہیں۔ میں کسی کی بھی میلی آنکھ اور بدنیتی سے نمٹنے کا اہل نہیں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم خم باقی نہیں رہا۔" وہ اداسی سے گویا ہوئے۔

"پھر ایک احسان کر دیجیے مجھ پہ۔" میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نہ دھیے نہ! مرنے کی بات سوچنا بھی مت، کفر ہے یہ کفر۔" وہ لرز گئے۔

"مرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں تو بس جینے کے لیے آپ سے آسانیوں کی طلب گار ہوں۔ اپنے حالات میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ بس ایک احسان کر دیجیے مجھ پہ۔ ایک آخری احسان۔" میں ان کے پاؤں پڑ گئی۔

"بڑا جگرا چاہیے اس کے لیے بھی۔ برداشت کر لے تو اپنی شناخت کی نابودی۔"

"کرلوں گی برداشت میں لیکن اب مزید اپنے وجود کے ساتھ کھلواڑ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" میں نے التجا کی۔

بہت منتوں اور واسطوں کے بعد بابا امام دین نے میرا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اپنی خصوصی جڑی بوٹیوں کے استعمال سے میرے چہرے و جسم کے کھلے حصوں کو ایک نیا سیاہی مائل اور قدرے کراہت آمیز روپ دے دیا۔ خوبصورت، طرحدار اور نک چڑھی حبیبہ کی جگہ ایک بدصورت اور بے ڈھنگی فریدہ نے لے لی۔

اس روز وہ بہت بے کل تھے اور بار بار ایک ہی بات دہراتے۔

"رب سوہنڑا مجھے معاف کرے۔ میں نے اس کی

تخلیق کے ساتھ یہ بگاڑ پیدا کر کے بڑا گناہ کمایا ہے۔"

"آپ نے مجھے جینے اور اپنے اعمال کی درستگی کی ایک راہ دکھائی ہے بابا جی! آپ پر سوہنا رب اپنی رحمتیں نازل فرمائے گا۔" میں اب بہت پُرسکون ہو چکی تھی۔

"اب کہاں جائے گی تو؟ یہ دنیا تو بھیڑیوں سے اٹی پڑی ہے۔ کیسے گزارے گی اتنی لمبی حیاتی؟"

"میری بس ایک ہی تمنا ہے اب۔ جتنی بھی زندگی باقی بچی ہے۔ ایک گھر اور چار دیواری میں گزار سکوں۔ ٹوٹا پھوٹا ہی سہی لیکن گھر کا سکون مل جائے مجھے بس ایک بار۔ ساری زندگی شکرانے کے سجدے کروں گی میں۔" ناتمام حسرتیں میرے لہجے میں زخمی پرندے کی طرح کرلا رہی تھیں۔

"ایک کام کر سکتا ہوں میں تیرے لیے۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "شجاع آباد میں میرے ماے کا گھر ہے جو پچھلے ماہ سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔ ان کے ڈھور ڈنگر اور گھر والے سبھی پانی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ میرے ماے کا ایک پوتا اور اس کی بوڑھی نانی ہی بچ سکے ہیں بس۔ تجھے کل ان کے پاس لے چلتا ہوں۔ رب تجھے اپنی امان میں رکھے۔" وہ بوجھل آواز میں کہتے اٹھ گئے۔

☆☆☆

"امام دینا! پرائی لڑکی کی ذمہ داری میرے سر پہ کیوں ڈال رہا ہے تو؟ چریا تو نہیں ہو گیا اس عمر میں۔" سفید براق بالوں اور گندمی رنگت والی اس عورت نے بیزاری سے کہا۔ ہم کچھ دیر پہلے ہی ملتان کی اس نواحی بستی میں پہنچے تھے۔ بابا امام دین نے میرا تعارف اپنے ایک مرحوم دوست کی بیٹی کہہ کر کروایا تھا۔ ان کے ماے کی سمدھن اصل مدعا جان کر جھٹ سے اکھڑ گئی تھی۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اپنے پاس ہی رکھ لیتا بھین جنتے! کس کا دل نہیں چاہتا کہ اسے بڑھاپے میں منجی پہ بیٹھے خدمت گزاری ملے مگر وہاں کا ماحول بھی تیرے علم میں ہے۔ میں اس کی حفاظت نہیں کر پاؤں گا۔"

"تو میں کیسے اس کی حفاظت کر سکتی ہوں؟ میں بھی ٹھہری کمزور عورت ذات۔" اماں جنتے نے دامن بچانے کی ایک اور کوشش کی۔

"نمبردار کی بے بے تو جنتے! اور کیا میں نہیں جانتا یہاں لوگ کتنی قدر کرتے ہیں تیری پھر بھی اگر تیرا دل نہیں

مانتا تو ٹھیک ہے۔ اس کی قسمت میں جو ٹھوکریں لکھی ہوں گی میرے ساتھ رہ کے بھگت لے گی۔" افسردگی ان کے بشرے سے عیاں تھی۔ مجھے اس بے لوث بوڑھے کی انسانیت نے ساکت کر دیا تھا۔

"میں اسے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھنے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گی۔ اس کے طور طریقے مجھے پسند آئے تو ہی ٹک سکے گی یہ میرے گھر۔ ورنہ اس کا بندوبست خود ہی کر لینا کہیں۔" انہوں نے نیم دلی سے کہا تو بابا امام دین پُرسکون ہو گیا۔

"فکر نہ کر، تیری بہت خدمت کرے گی یہ۔ تجھے اپنے فیصلے پر کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہو گا۔" وہ مجھ پہ دعاؤں کے انمول خزانے لٹاتا جنتے سے کہہ کر چلا گیا۔

☆☆☆

آئینے سے منعکس ہوتے سیاہی مائل چہرے سے نظریں چرا کر میں پھر سے اس نیم کے نیچے صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔ تلافی کا یہ سفر جانے کتنی مدتوں سے جاری تھا۔ اماں جنتے کے گھر لمحوں کا قرض چکاتے اب وقت کا حساب کتاب رکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس بستی کی ایک ہر دلعزیز ہستی تھی۔ عورتیں اس کے پاس اپنے گھریلو مسائل کا دکھڑا رونے آتیں تو بچیاں کلام پاک کے اسباق لینے۔ رفتہ رفتہ میں نے ان بچیوں کو اسکول کی ابتدائی تعلیم دینی شروع کر دی۔ بستی کے مکینوں نے ایک بدصورت اور کم گو فریدہ کا وجود تسلیم کر ہی لیا تھا۔ زندگی کی گاڑی کا پہیا سست روی سے چلنے لگا۔ بے قرار راتوں میں اپنے بچوں کا تصور کرتے ہی میری روح قطرہ قطرہ پگھلنے لگتی۔ ہر رات میرے ضبط کی طنابیں ٹوٹ جاتیں۔ ماضی کی گناہ گار زندگی میری ہستی کا شیرازہ بکھیر دیتی اور ہر صبح ایک نئے عزم سے مشقت کی بھٹی میں اپنا وجود جھوک دیتی۔ بنت حوا کی تشنہ طلبی اسے اپنے اصل مقام کی شناخت بھلا کر اندھی وادیوں کی متعفن گزرگاہوں کا پتھر بنا دیا کرتی ہے۔ اور یہاں ہر سو حبیبہ جیسی نادان اور خواب گزیدہ حوا کی بیٹیاں تھیں جنہیں اپنے مدار و محور میں سمیٹے رکھنا میں نے حاصل زیست مان لیا تھا۔

دور فضا میں پروردگار کی کبریائی کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھوں میں بسی نمی پونچھتے ہوئے صحن میں پڑی چٹائی سیدھی کی اور سبق کے لیے آنے والی بچیوں کا انتظار کرنے لگی۔

# جھولا

جناب مدیراعلیٰ
السلام علیکم
میں نے آج ایک ایسے واقعے پر قلم اٹھایا جو میں لکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس واقعے پر پردہ پڑا رہنا ہی مناسب تھا۔ گزشتہ سال جب میں پاکستان گیا تھا اور ماہ نور صاحبہ کے حالاتِ زندگی ٹکڑوں میں سنے تھے تو میں حیران رہ گیا تھا اللہ کی قدرت پر، اللہ تعالیٰ کیسے وسیلے فراہم کرتا ہے۔ آج جب نور صاحبہ سے فون پر بات ہوئی تو ایک ہفتے پرانی خبر غم نے ایک نئی شکل اختیار کرلی اور میں نے قلم اٹھا لیا گو کہ نور صاحبہ کا اصل نام حذف کردیا ہے پھر بھی دل پر چھایا درد کم نہیں ہورہا ہے۔

ارشد علی ارشد
(دمام، سعودی عرب)



وہ گم صم تنہا بیٹھی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ اس کی نظریں بھی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا جیسے وہ وہاں موجود نہیں۔ یا اگر ہے تو جسم سے روح پرواز کرگئی ہے اور اب اس کا بے جان جسم اپنی جگہ ساکت پڑا ہے۔ دفعتاً اس کا آٹھ سالہ بیٹا بھاگتا ہوا آیا۔

"مما...... مما...... منی جاگ گئی ہے......" بیٹے نے داخل ہوتے ہی اعلان کیا جسے سن کر اس کے مردہ جسم میں جان

آئی اور اس نے چونک کر بیٹے کو دیکھا جواب اس کے بالکل قریب آچکا تھا۔

"ممامنی جاگ گئی ہے اور بہت رو رہی ہے۔" اس نے اعلان میں ایک نئی اطلاع کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ منی کی عادت سے وہ بخوبی واقف تھی۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی اسے چند پل کے لیے ہی سہی مگر ماں کی بانہیں درکار ہوتی ہیں۔ اس نے بیٹے کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"قاسم تو یہاں بیٹھ میں آتی ہوں۔" اس نے اس محبت کے جواب میں فرمانبرداری کا مظاہرہ... کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر ریموٹ اٹھالیا۔

اس نے باہر جاتے ہوئے ٹی وی پر ایک نظر پھر ڈالی۔ بریکنگ نیوز ہنوز چل رہی تھی۔ بیڈ روم منی کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ اس نے فوراً منی کو اٹھایا گالوں پر پیار کیا۔ دو تین بار بانہوں میں جھولے دیے تو منی کے فرشتوں جیسے معصوم چہرے پر شادمانی کے نئے پھول کھل اٹھے۔ ممتا کی محبت بھری بانہوں اور لاڈ پیار کی پچکاریوں سے اس کے ننھے وجود میں خوشی کی نئی سوتیں پھوٹ پڑی تھیں۔ کچھ دیر کی اٹھکیلیوں کے بعد ماں کے سینے سے چپک چپک دودھ پیا تو یوں لگنے لگا جیسے جنت میں دودھ کی نہروں سے قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیے گئے ہیں۔ وہ ماں کی گود میں اچھلنے لگی۔ اس نے پچکار کر منی کو قریب رکھے ہوئے جھولے میں لیٹا دیا۔ اسے معلوم تھا وہ اس جھولے میں بہت راحت محسوس کرتی ہے۔ اب کوئی اس کے پاس نہ بھی ہو تو جھولے میں ہاتھ پاؤں... اچھالتے ہوئے کھیلتی رہے گی۔ اس طرف سے بے فکر ہو کر وہ باہر آئی اور آیا کو آواز دے کر منی کے بارے میں ہدایت دی۔ شوہر والدین کے ساتھ کسی تقریب میں مدعو تھا ورنہ یہ کام تو اس کی ساس ماں ہی کیا کرتی تھی۔ وہ واپس ٹی وی ہال میں آئی۔ قاسم یکسوئی سے کارٹون دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پا کر چہرہ گھما کر ماں کو دیکھا۔

اس نے تپائی پر رکھا ہوا ریموٹ اٹھاتے ہوئے بیٹے سے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"قاسم بیٹا مجھے نیوز سننی ہے تم اپنے کمرے میں جا کر پلے اسٹیشن پر گیم کھیلو۔"

"اف...... مما! آپ اور پاپا ہر وقت نیوز سنتے ہو۔"

"بیٹا تم جو ہر وقت کارٹون دیکھتے ہو۔"

"کارٹون میں تو اچھل کود ہے۔ آنکھ مچولی ہے۔ نیوز میں کیا ہے مما۔ ایک ہی بندے کو ایک گھنٹا ایک ہی اسٹائل میں بیٹھے ہوئے دیکھنا، مما آپ لوگ بور نہیں ہوتے۔" قاسم نے ناک چڑاتے ہوئے بے زار لہجے میں کہا۔ وہ بہت ہوشیار اور ذہین بچہ تھا۔ کبھی کبھی انہیں بھی لاجواب کر دیتا تھا۔

"اچھا اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ جاؤ شاباش۔" اس نے کہتے ہوئے چینل تبدیل کر دیا۔ قاسم نے لحہ بھر سر کھجایا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ عام حالت میں وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتی مگر اس وقت اس کا ذہن بری طرح انتشار کا شکار تھا۔ نیوز چینل پر اسی بریکنگ نیوز کے ساتھ کچھ تبصرے بھی شروع ہو چکے تھے۔ اس بار دل و دماغ اس میں ایسے گم ہوا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کچھ دیر آنکھوں کے جھرنے سے یہ موتی گرتے رہے۔ پھر وہ ہچکیاں لینے لگی۔ دل کچھ ہلکا ہوا تو صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگا۔ وہ حال کی بالکونی میں کھڑے ہو کر ماضی کی ویران سڑکیں دیکھنے لگی۔

☆☆☆

وہ کراچی کے غیر معروف، گنجان آباد علاقے کی ویران سڑک تھی۔ سڑک کے اطراف میں اوسط درجے کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان کے بیچوں بیچ چند گلیاں آگے جا کر مزید آبادی کو اس سے جوڑ رہی تھیں۔ گھروں سے گندہ پانی جا بجا نکل کر گندے جوہڑ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس طرف نکاسیٔ آب کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ نہ ہی آباد کار لوگ صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ جا بجا کچرے کے ڈھیر تھے۔ لوگوں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ ایسے ہی کسی ماحول کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ بہت سی باتیں از خود اخذ کرلی جائیں تو پھر ان کا حصہ بننے میں نہ قباحت ہوتی ہے نہ احساسِ شرمندگی۔ اس لیے وہاں لوگ جگہ جگہ بے خوف اور دھڑلے سے کچرے کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ ان کی اپنی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کچرے کے ڈھیر کے پاس کوئی کھڑا ہو جائے تو دونوں میں تفریق کرنا محال ہو جاتا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ اندھیرا سناٹے سے بوس و کنار کر رہا تھا۔ اسٹریٹ لائٹس تو تھیں نہیں کہ ان کے آفرین لمحات میں مخل ہوتیں۔ سناٹا اس قدر جوان تھا کہ قریب گھر سے خراٹوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ ایسے میں اندھیر گلی سے ایک ہیولہ نمودار ہوا۔ اندھیرے کے باوجود اس نے چہرہ کپڑے سے چھپا رکھا تھا۔ وہ عقابی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا روڈ کے پار کچرے کے ڈھیر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک گٹھڑی تھی جسے وہ احتیاط سے

اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے روڈ ایسے پار کیا جیسے اس پر ٹریفک کا بے تحاشہ رش ہو۔ محتاط روی سے چلتا ہوا وہ ڈھیر کے پاس پہنچا اور ایک طرف گٹھڑی رکھ کر مڑنے والا تھا کہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ وہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں جنہوں نے اسے بانہوں میں دبوچ لیا تھا۔ پتا نہیں یہ گاڑی والا کہاں اس طرف راستہ بھٹک کر آ گیا تھا وہ بھی اس وقت۔ پچھلے کئی دنوں سے سرد ہوائیں چل رہی تھیں جس کے باعث لگ رہا تھا کہ شہر میں دسمبر اترا ہوا ہے۔ ایسے میں مکین اپنے اپنے خانوں میں بند سردی کمبل اور نیند کے مزے لے رہے تھے۔ یہ گاڑی والا پتا نہیں کیوں موسم کی پروا کیے بنا آ گیا۔ شاید گاڑی والے نے بھی اسے مشکوک حالت میں تاڑ لیا تھا کیونکہ گاڑی اس کے قریب آ کر رک گئی مگر وہ بہت تیز نکلا اس نے فوراً قریبی گلی میں دوڑ لگا دی۔ گلی اتنی کشادہ نہیں تھی کہ بمع گاڑی اس کا تعاقب کیا جاتا مگر صاحب گاڑی پر پتا نہیں کیا خبط سوار تھا وہ باہر نکل کر اس کے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ ہیبت ناک سناٹے میں ان کی قدموں کی شپ شپ دور تک سنائی دینے لگی۔ گلی میں ایک دو گھروں کے مکین یہ صدائے بے محل سن کر جاگ اٹھے تھے۔ مگر کسی نے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ پرائی آگ میں کون چھلانگ لگاتا ہے۔

گاڑی والا تو راستہ بھٹکا ہوا تھا مگر اسے یہ گلیاں یہ کوچے ازبر تھے وہ لمحوں میں اندھیرے کی گود میں چھپ گیا جبکہ گاڑی والا نصف گلی میں ہی ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس نے لعنت بھیجی اور اٹھ کر گاڑی کی طرف واپس مڑا۔ کچرے کے ڈھیر کے قریب سے گزرنے لگا تو کسی نومولود کے رونے کی باریک آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک گیا۔ گلی میں بری طرح گرنے سے دماغ کے پرزے ٹائٹ ہو گئے تھے اس لیے وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ مشکوک شخص کا پیچھا کیوں کیا تھا۔ رونے کی آواز اس کے قریب سے ہی آ رہی تھی۔ گاڑی کی تیز لائٹس سے وہ حصہ روشن تھا۔ جہاں وہ مشکوک شخص جھکا ہوا تھا وہاں اس نے ایک متحرک گٹھڑی دیکھی۔ مزید دھیان دینے پر پتا چلا رونے کی آواز بھی اسی سے آ رہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے کھولا۔ توقع کے عین مطابق اس میں نومولود بچہ تھا جس کی عمر شاید چند گھنٹے رہی ہو گی۔ شاید اس سے پہلے بچہ سویا ہوا تھا۔ بچہ اٹھائے وہ اپنی کار کی جانب بڑھا۔ اس کا نام راشد تھا۔ پرائیویٹ کالج میں لیکچرار تھا۔ اس طرف وہ واقعی راستہ بھٹک کر نکل آیا تھا۔ وہ ایک پارٹی سے واپس گھر جا رہا تھا۔ کسی ہنگامے کی سبب روڈ بند تھا۔ اس لیے وہ دوسرے راستے کی تلاش میں گلیوں اور لنک روڈ سے ہوتا ہوا اس طرف آ گیا تھا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر وہ پُرسوچ انداز میں کھڑا رہا۔ وہ جانتا تھا اس پورے محلے میں اب اس بچے کا دعوے دار نہیں ملے گا۔ کچرے کے ڈھیر سے ملنے والے بچے لاوارث ہوا کرتے ہیں۔ چند لمحوں بعد اس نے کندھے اچکائے اور فرنٹ سیٹ پر بچے کو لیٹا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ مرکزی شارع پر آ کر اس نے علاقہ پہچاننے کی کوشش کی اور قریبی تھانے کی جانب گاڑی موڑ دی۔ تھانے میں روشنی کے باوجود پُراسرار قسم کی خاموشی اور سناٹا تھا۔ گاڑی صحن میں پارک کر کے اس نے بچے کو اٹھایا اور عمارت میں داخل ہو گیا۔ جب تک گاڑی چلتی رہی بچہ اس میں جھولے کی طرح جھولتا رہا اور چپ تھا مگر اب وہ پھر سے باریک آواز میں رونے لگا تھا۔ وہ ویران راہداری میں داخل ہوا جہاں بچے کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے چلتے ہوئے ابتدائی کمروں کا جائزہ لیا مگر وہ خالی تھے۔ وسطی کمرے سے ایک سپاہی نے باہر جھانکا شاید رونے کی آواز اس تک پہنچ گئی تھی۔

''جی صاحب کدھر؟'' سپاہی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کے بوجھل لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اونگھ رہا تھا کمرے میں۔

''مجھے تھانیدار سے ملنا ہے۔''

''وہ تو اس وقت نہیں ہیں صاحب......'' سپاہی اس کی پرسنالٹی کے سبب کچھ مہذب انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''اس وقت ڈیوٹی انچارج کون ہے؟''

''وہ بھی گشت پر نکلے ہوئے ہیں۔''

''پورے تھانے میں ایک آپ ہی ہو۔'' اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

''محرر صاحب بیٹھے ہیں......'' سپاہی نے اطلاع دی۔ پھر اس میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ کمر سیدھی کر رہے ہیں......اور اس پوزیشن میں کسی سے ملتے نہیں۔''

''مجھے ان کا بیڈ روم دکھاؤ میں خود مل لیتا ہوں۔'' اس نے بچے کو ہلکا سا ہاتھوں سے جھولا دیتے ہوئے کہا تاکہ اس کا رونا بند ہو جائے۔ اس کے اعتماد پر سپاہی بولا۔

''آپ رکو۔ کرتا ہوں اطلاع۔'' وہ بیزاری سے کہتا ہوا جانے لگا۔ تین چار کمروں کے بعد موڑ سے ایک اور کانسٹیبل نمودار ہوا۔ پل بھر رک ان میں کھسر پھسر ہوئی پھر دونوں مڑ گئے۔ وہ بھی بچے کو پچکارتا ہوا موڑ کی طرف جانے لگا۔ وہ قریب پہنچا ہی تھا کہ وہی سپاہی آ کر بولا۔ ''آئیں جی محرر صاحب جاگ رہے ہیں۔''

"جی فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟" محرر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔

"سر اس بچے کو ایک شخص وہاں کچرے کے ڈھیر کے پاس پھینک کر بھاگ گیا۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا مگر نکل گیا۔"

"تو......؟" محرر صاحب نے اسے سخت نظروں سے گھورا۔

"تو یہ کہ آپ لوگ میرے ساتھ چلیں محلہ اتنا بڑا نہیں ہے تھوڑی سی محنت سے ہم بچے کو ماں باپ کے حوالے کر سکتے ہیں۔" اس کی بات سن کر محرر زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی پیروی میں دونوں کانسٹیبل بھی ہنس رہے تھے اور وہ ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔

"حلیے سے تو آپ پڑھے لکھے اور سمجھدار لگتے ہو۔ مگر باتیں کیسی احمقانہ کرتے ہو۔ جن بچوں کو کچرے کے ڈھیر میں پھینکا جاتا ہے ان کے ماں باپ نہیں ہوتے سمجھے۔"

"ہوتے ہیں۔ ماں باپ ہوتے ہیں، بس ضمیر مر جاتے ہیں ان کے۔ ان کے ضمیر جگانے کی ضرورت ہے۔ ہم جا کر انہیں احساس دلائیں گے۔" اس کی بات کاٹ کر محرر بولا۔

"ضمیر کس کے جگاؤ گے۔ وہاں کی گلی محلہ کا اس کچرے کے ڈھیر کا جہاں سے اسے اٹھایا ہے۔ آپ سمجھتے نہیں ہو جب کوئی دعوی دار ہی نہیں بنے گا تو دستک کہاں دو گے۔"

"آپ لوگ تھوڑی سی کوشش کریں تو مل جائیں گے اس کے والدین۔ چھوٹا سا محلہ ہے اور چند گھنٹے پہلے کی ولادت ہے۔"

"یار تم جاؤ یہاں سے اپنا اور ہمارا وقت برباد مت کرو۔"

"مگر یہ بچہ......؟" وہ بوکھلا کر بولا۔ اس کی حالت پر محرر نے مسکرا کر قریب کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا۔

"یہ بچہ تو لے لے عظمت سنا ہے تجھے بچے بہت پسند ہیں۔"

"اوہ نہ جی نہ صاحب جی......میرے تو پہلے ہی بچے پانچ اور بیوی ایک ہے۔"

"کھی کھی کھی......" اس کی بات سن کر اور روہانسی صورت دیکھ کر محرر زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنسنے سے اس کی بھاری بھر کم توند مٹکے میں پانی کی طرح ہچکولے کھانے لگی۔

"کیوں صاحب آپ کی بیوی بھی ایک اور بچے پانچ ہیں؟" اس کے تمسخرانہ لہجے پر اسے بہت غصہ آیا مگر برداشت کر گیا......وہ سمجھ گیا کہ یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ واپس پلٹا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے میں اسے کافی پریشانی کا سامنا رہا کہ بچہ بار بار رو رہا تھا۔ وہ تیز رفتاری سے گھر پہنچا تو بیوی کو منتظر پایا۔ اس نے دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"کہاں رہ گئے تھے۔ بندہ اطلاع ہی کر دیتا ہے۔ میں پریشان ہو رہی تھی۔ کب سے کہہ رہی ہوں گھر میں فون لگا لو ضرورت پڑ جاتی ہے۔" مرکزی دروازہ کھول کر وہ آگے چلتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔ بچہ اس بیچ شاید سو گیا تھا۔ "ہائے ہائے......یہ بچہ کس کا ہے۔" کمرے میں پہنچ کر وہ جونہی پلٹی اس کی نظر بچے پر پڑی......اس نے ترش لہجے میں کہا۔ "یہ کس کا گند اٹھا لائے ہو۔"

"بتاتا ہوں پہلے اسے دودھ وغیرہ دو۔ پورے راستے روتا آیا ہے۔" اس نے بچہ بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا مگر وہ اپنی جگہ جمی رہی اور سابقہ لہجے میں بولی۔

"اس وقت میں کہاں سے لاؤں دودھ اور یہ ہے کس کا۔"

"اپنا دودھ پلاؤ اسے تم......"

"ہائے پاگل ہو گئے ہو پروفیسر صاحب۔ ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں نے اسے جنا ہے اور میرا دودھ اترا ہوا ہے۔" بیوی کی بات سن کر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے گٹھڑی صوفے پر رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"اچھا ابھی تو سویا ہے شاید جب جاگ جائے تو پلا دینا اسے۔" وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ نومولود رونے لگا۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں ہو کس کا بچہ ہے اور کہاں سے ملا ہے۔"

"ادھر ایک محلے میں کچرے کے ڈھیر سے ملا ہے اور..."

"دیکھو پروفیسر صاحب میں کہہ رہی ہوں اگر بات کچھ اور نکلی تو قسم خدا کی زمین آسمان ایک کر دوں گی۔" اس بار بیوی کے لہجے میں شک کا ناگ پھن پھیلائے محسوس ہو رہا تھا۔

"خدا کا خوف کرو۔ مجھے اللہ نے اولاد کی نعمت سے نواز رکھا ہے۔ تم اٹھاؤ اسے اور چپ کراؤ۔"

"میں تو اس ناجائز اولاد کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں......" وہ کچھ اور دور سرک گئی۔

"شائستہ تم بھی اولاد والی ہو۔ اللہ سے ڈرو اس معصوم

پر تنوع تحریروں اور خوب صورت سلسلوں سے سجا اکتوبر 2016 کا دلپذیر پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
انجم انصار اور رفعت سراج ...... کے قسط وار ناولوں کی دلفریب اقساط
در ثمین بلال کا سلسلے وار ناول ...... اے عشق ترے ہیں کھیل عجب کا خوب صورت اختتام
خوب صورت عنوان اور پراثر بیان لیے سحر ساجد کا دلنشین ناولٹ ...... من جانبازم
سیما رضا ردا کی دلکش تحریر ...... ہم کو عبث بد نام کیا منی ناول کی صورت
محرم الحرام کی مناسبت سے فلسفۂ شہادت پر اختر شجاعت کا پرفکر مضمون
نزہت اصغر ......
وہ آئے بزم میں ...... ملاقات کرائیں گی معروف
رائٹر ثمینہ عظمت علی سے
اس کے علاوہ
شگفتہ شاہ، نیلم احمد بشیر کی خصوصی تحریروں کے ساتھ، سات پڑھیے ام ایمان،
عقیلہ حق، عنیزہ سید، ہاجرہ ریحان، فرحین اظفر، نادیہ احمد،
صدف آصف، ودیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین کاوشیں

پر رحم کھاؤ۔" اس بار اس کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بیوی نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھا لیا۔

"یہ بچی ہے......اس نے گود میں لیتے ہی اعلان کیا۔"

"اچھا......" پروفیسر نے کافی طوالت سے لفظ اچھا کہا۔ یہ سن کر کر تو مولو بچی ہے اس کا تاسف بھی بڑھا اور ذہنی سوچ میں تبدیلی بھی آئی۔ شاید وہ معاملہ نہ ہو جو اس نے سوچ رکھا تھا بلکہ کچھ اور ہو۔ بچی اس کی بیوی کی بانہوں میں جاتے ہی چپ ہو گئی تھی۔ وہ بولا۔

"دیکھا کیسے تیرا لمس پاتے ہی راحت میں آ گئی ہے جیسے ماں مل گئی ہو۔"

"مجھے مسکا لگانے کی ضرورت نہیں۔ میں جن کی ماں ہوں وہ ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے ہیں۔" بیوی نے بچی کو صوفے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے وہاں کیوں لٹا رہی ہو بیڈ پر......"

"ذرا سانس لے لو پروفیسر صاحب کیا ہو گیا ہے۔ قیمتی بیڈ شیٹ ہے پہلے اس پر کچھ بچھانے تو دو۔" بیوی نے بات کاٹ کر کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔ بیوی باہر جاتے ہوئے بولی۔

"صرف آج کی رات ذمہ داری لیتی ہوں......صبح یہ میرے گھر نظر نہ آئے۔"

رات نصف سے زیادہ ڈھل چکی تھی پھر بھی بچی نے ان کا خوب امتحان لیا خاص کر پروفیسر کا۔ اس کی بیوی تو سو گئی مگر وہ بچی کے ساتھ سوتا اور جاگتا رہا۔ صبح بیوی نے بچوں کو تیار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھے بھلے باپ تھے ماں بننے کی کوشش میں لگ گئے ہو وہ بھی کسی کی ناجائز اولاد کے۔"

"شائستہ کچھ تو خیال کرو بچوں کے سامنے کیا کہہ رہی ہو۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا بس کالج جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"میں آج کالج نہیں جا رہا۔ بچوں کو اسکول چھوڑ کر واپس آتا ہوں۔" اس کی بات سن کر بیوی نے اسے استفہامیہ نگاہ سے دیکھا مگر وہ خاموش رہا۔ بچوں کو چھوڑ کر آیا تو بیوی جلی بھنی منتظر تھی۔

"سچ بتاؤ پروفیسر صاحب بچی کی حقیقت کیا ہے۔" اس نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہی حقیقت ہے جو رات میں بتا چکا ہوں۔ زیادہ بحث مت کرو مجھے بتاؤ اس کے پینے کے لیے کیا لاؤں۔"

"کچھ مت لاؤ......میرا گلا کاٹ کر میرا خون پلا دو اسے۔" بیوی کی بات سن کر اس نے طویل سانس خارج کی۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"دن کے اجالے میں اس معصوم جان کا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ رات ہوتے ہی دو وعدہ رہا، لے جاؤں گا۔"

"کہاں لے جاؤ گے۔"

"یہ تمھارا مسئلہ نہیں۔"

"بتاؤ مجھے۔" وہ ڈھیٹ بن گئی۔

"وہ چوتھی گلی میں کبیر ہے نا......دس سال ہو چکے ہیں شادی کے مگر اولاد جیسی نعمت سے محروم ہے۔ اس سے بات کروں گا۔"

"تا کہ وہ پورے محلے کو بتا دے کہ پروفیسر راشد نے اپنی ناجائز اولاد اس کے متھے مارنے کی بات کی ہے۔"

"کیا بک رہی ہو شائستہ......ہم میری......"

"پروفیسر صاحب ساری دنیا آپ جیسی صاف نیت نہیں۔ اچھا......کبیر کو ہی دو مگر بات کر کے نہیں بلکہ رات میں اس کی پھر وہ سانس لے کر بولی۔ چوکھٹ پر دھر آنا......خود ہی......"

"شائستہ بچی مر جائے گی......"

"زندگی ہوئی تو نہیں مرے گی اور مر گئی تو سمجھ لینا اتنی ہی زندگی لائی تھی۔" اس بار وہ خاموش رہا۔

☆☆☆

کبیر نے ایک کروٹ لی پھر دوسری لی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھنا چاہا مگر بیڈ کو خالی پا کر بری طرح چونک پڑا۔ وہ رات بیوی کے پہلو میں سویا تھا مگر اب بیڈ خالی تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور بیوی کو آوازیں دینے لگا۔

"ارم......ارم......ارے بھئی کہاں ہو؟" واش روم، ٹیرس اور کمرا۔ ارم کہیں نہیں تھی۔ اس نے پریشان نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا پا کر وہ تیز قدموں سے باہر لپکا۔ ابھی وہ کوریڈور میں داخل ہوا ہی تھا کہ ارم آتی دکھائی دی۔ اس کے بازوؤں میں کچھ اٹھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس نے دھیان کیا تو احساس جاگا کسی بچے کے رونے کی خفیف سی آواز اس کی سماعت پر دستک دے رہی ہے۔ وہ حیران تھا کہ اس کے گھر میں بچہ...... یہ سب خیالات کے گھوڑے بس چند سیکنڈوں میں سرپٹ بھاگ گئے تھے۔ اس دوران اس کی بیوی قریب آ چکی تھی اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش نمایاں تھا۔ اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

"کبیر دیکھو تو خدا نے ہماری سن لی۔ کتنی خوبصورت بچی کو ہماری دہلیز پر پہنچا دیا۔" بیوی کی بات سن کر وہ بری طرح چونک پڑا۔ وہ پریشان و حیران نظروں سے کبھی بیوی اور کبھی اس کے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی نومولود بچی کو دیکھ رہا تھا۔ ارم بات کر کے بچی کو باہنوں میں جھولا دینے لگی۔

"یہ کیا تماشہ ہے ارم؟" اس نے نسبتاً غصے میں کہا۔ "تم اس وقت یہ بچی کس کی اٹھا لائی ہو؟"

"یہ بچی میں نہیں لائی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بھیجی گئی ہے۔"

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں خیر سے تین ماہ پہلے ہی اُمید سے کر دیا ہے...... یہ جیتی جاگتی بچی کہاں سے مل گئی ہے۔"

"میں گہری نیند میں تھی کہ اچانک کسی نامعلوم وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ آپ کو دیکھا تو گہری نیند میں پایا۔ میرے اندر عجیب سی بے چینی دوڑنے لگی۔ میں نے تپائی سے پانی کا گلاس اٹھا کر پانی پیا اور اپنی کیفیت کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک خفیف سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بہت دھیان دینے پر احساس ہوا جیسے کوئی بچہ رو رہا ہے۔ میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ کوریڈور میں یہ آواز کچھ واضح ہو گئی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر کے دروازے کے باہر سے آواز آ رہی ہے۔ پہلے آپ کو جگانے کا ارادہ کیا مگر اس دوران رونے کی آواز میں شدت در آئی تو صبر نہ ہوا۔ دروازے کے پاس پہنچی میری بے صبری انتہا کو پہنچ چکی تھی اس لیے جیسے ہی یقین ہوا کہ آواز ہمارے گھر کے باہر سے آ رہی ہے میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے پہلی سیڑھی پر اس معصوم کو روتے پایا۔"

"اوہ ہو...... ارم تم بھی نا...... یہ کیا بے وقوفی کی ہے تم نے۔" کبیر نے اپنے بال نوچتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

بیوی نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

"کیا ہوا آپ پریشان کیوں ہو گئے ہیں۔"

"ارم...... ارم...... تم کسی کا حرام خون اٹھا کر اپنے گھر لے آئی ہو اور پوچھتی ہو کہ میں پریشان کیوں ہوں۔"

"ضروری نہیں کہ حرام ہی ہو۔ سو سبب ہو سکتے ہیں اس واقعے کے پیچھے۔ اور جو بھی ہو اس میں اس معصوم کا کیا قصور...... ہمیں تو خدا نے بچی دے دی ہے۔ میں اسے ماں بن کر پا لوں گی۔"

"تم تو ٹھہری عورت ذات۔ تیرے عقل کی چولیں ویسے ہی ڈھیلی ہیں۔ ارے بھئی ہمارے سماج میں اتنا آسان نہیں ہے کہ حرام کے بچے کو سہولت سے اپنا لیا جائے۔"

"آپ بار بار حرام کا کیوں کہہ رہے ہیں...... ہو سکتا ہے اس کے والدین کی پہلے سے پانچ چھ بچیاں ہوں اور مفلسی کی گاڑی میں بیٹھنے کی مزید گنجائش نہ ہو اس لیے۔"

"دس بھی ہوں نا تو والدین اتنے پتھر دل نہیں ہوتے کہ اپنے خون کو کسی اور کے گھر کی چوکھٹ پر ڈال کر سکون کی نیند سو سکیں۔ ایسا گھٹیا کام وہی کرتے ہیں جنھیں اپنا گناہ چھپانا مقصود ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھنڈے دماغ سے صرف یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ہماری چوکھٹ تک ہی کیوں لایا ہے؟"

"کیوں لایا ہے؟"

"ہمارے لیے تحفہ ہے اس کی جانب سے۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو تم؟"

"یہی کہ یہ چند دنوں کی معصوم جان ہے اسے ہمیں دل و جان سے قبول کر لینا چاہیے اور......"

"خبردار ارم......" کبیر نے درشت لہجے میں اسے ٹوک دیا۔ "تم اُمید سے ہو اور اللہ تعالیٰ کا وہی اصل تحفہ ہے ہمارے لیے۔ اسے دوبارہ اپنانے کی بات میرے سامنے مت کرنا۔" کبیر نے دو ٹوک الفاظ میں اسے متنبہ کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے سوچا شاید کل کا سورج طلوع ہو تو کبیر کی سوچ میں بھی تبدیلی آ جائے مگر مزید دو دنوں کے بعد بھی اس نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا۔ ارم نے اسے تیسری رات کہا۔ "جاؤ پھر آپ بھی اسے کسی کی چوکھٹ کے سامنے دھر آؤ۔ ہمیں نہیں تو شاید کسی اور کو اس کی ضرورت ہو۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اپنے گلے کی پریشانی کسی اور کے گلے میں نہیں ڈال سکتا۔"

"پھر کیا کرو گے اس کا۔"

"وہ مین روڈ پر عبدالستار ایدھی کا سنٹر ہے نا...... وہاں جھولا رکھا گیا ہے ایسے بچوں کے لیے، وہاں ڈال آتا ہوں۔"

ارم جواب میں چپ رہی۔ کبیر نے وہی وقت مقرر کیا جو راشد نے کیا۔ وقت رخصت ارم نے بچی کو بے تحاشہ چوما تھا۔ وہ بہت اداس تھی اور کبیر کے چلے جانے کے بعد ہچکیوں میں روئی تھی۔

کبیر بچی کو جھولے میں ڈال کر جوں ہی پلٹا جھولے کے رکھوالوں کو بچی کے رونے کی آواز آ گئی۔ وہ بھاگتے ہوئے جھولے کے پاس پہنچے اور روتی بلکتی بچی کو اٹھا کر سنٹر میں لے گئے۔ سنٹر میں موجود لوگوں پر جیسے بہار آ گئی۔ عورتوں نے

اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسے پیار کیا اور اسے خوراک دے کر نرم بستر پر سلا دیا۔ اگلے روز ایدھی بابا کو بلایا گیا۔ انھوں نے بچی کو گود میں اٹھا کر اسے دیکھا اور گجراتی لہجے میں بولے۔

"بہت خوبصورت ہے۔ بالکل چندا جیسی۔"

اس کی چاند جیسی خوبصورت بوسکی جیسی نرم و ملائم جلد اور کھلکھلاتی رنگت دیکھ کر ایدھی بابا نے کہا۔ "اس کا نام ماہ نور ہے۔"

پہلی بار بچی کو نام ملا تھا وہ ایدھی بابا کی گود میں اچھلنے لگی۔ ایک پچاس پچپن سال کی عورت نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ ماہ نور وہاں چار ماہ گھر جیسے ماحول میں رہی۔ اسے وہاں ماں کی گود اور باپ کی باہیں میسر ہوئیں تو مزید نکھرنے لگی۔ لگ بھگ چار ماہ کے بعد ڈیفنس سے ایک جوڑا سینٹر کے آفس میں ایدھی بابا کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی عمریں بالترتیب چالیس اور پینتیس سال تک ہوں گی۔ مرد کہہ رہا تھا۔

"ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ دولت عزت شہرت...... گاڑی بنگلا نوکر سب...... مگر اس ذات نے ہمیں اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا۔ ہم نے یورپ تک میں جا کر اپنے ٹیسٹ کروالیے۔ ہم دونوں میں سے کسی میں بھی کوئی کمزوری نہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حکم نہ ہو تو بندہ عاجز کیا کر سکتا ہے۔"

"درست فرمایا......"

"ہم یہاں کوئی بچی گود لینے آئے ہیں۔"

"بچی ہی کیوں......؟ لوگ تو بیٹا لینے آتے ہیں......؟"

"ہم دونوں کی محبت کی شادی ہے۔" مرد نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہماری محبت کی سب سے بڑی وجہ ہم دونوں کی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ہمیں بیٹے سے زیادہ ہمیشہ بیٹی کی تمنا رہی ہے۔"

"آپ دونوں طبعی لحاظ سے ٹھیک ہو۔ کل کو آپ کی اپنی سگی اولاد ہو جائے تو کیا گارنٹی ہے کہ گود لی ہوئی بچی تحفظ میں رہے گی۔"

"ہم ابھی سے اپنی نصف جائیداد بچی کے نام کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

چند مزید سوال و جواب کے بعد ماہ نور ان کی گود میں ڈال دی گئی۔

جواد صاحب اور ان کی بیگم مہوش نے ماہ نور کی پرورش سگی اولاد سے بڑھ کر کی۔ وہی ان کی کل کائنات تھی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی اور جب شادی کا وقت آیا تو ماہ نور کی خواہش پر ایک غریب پڑھے لکھے اور شریف انسان زبیر قیصر سے اس کی شادی کر دی گئی۔ زبیر قیصر کو جواد صاحب نے گھر داماد بنا لیا اور اسے اپنے کاروبار میں شامل کر لیا۔ اب وہ دونوں آفس چلے جاتے تھے اور مہوش بیگم بچوں میں گم ہو جاتی تھی......

☆☆☆

ماہ نور کو یہ ساری کہانی اس کے گھر کی پرانی ملازمہ نے چپکے چپکے سنائی تھی۔ سماج نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ مگر ایک درویش کے جھولے نے اسے پناہ دے دی تھی اور اب وہی درویش فانی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی ہوئی تھی جہاں یہ بریکنگ نیوز بار بار دہرائی جا رہی تھی۔ پاکستان میں ایک فرشتہ تھا جواب نہ رہا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ اس نے خود کو باور کروایا کہ کسی گھر کے مصلے پر کوئی کوثر اشکوں کے بیچ سجدہ ریز ہوگی۔ کوئی گیتا بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہوگی۔ کوئی ثریا سینے پر صلیب بنا رہی ہوگی۔ اور ایک درویش چاند ستاروں کی محفل میں مسکرا کر کہہ رہا ہوگا۔

"میں تمہارے فتوؤں کی پہنچ سے بہت دور ہوں......"

اور کوئی بہشت میں اس کا استقبال کر رہا ہوگا۔ مگر پھر بھی اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو رہا تھا۔ چشم تصور میں اس نے جھولے کو سختی سے پکڑا اور پھر چھوڑ دیا۔ جھولا ہولے ہولے جھولنے لگا۔ اب وہ خالی نہیں تھا۔ سفید رنگت اور بوسکی جیسی نرم و ملائم نومولود بچی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اسے اٹھانے کی ناکام کوشش کی جھولا پھر سے خالی تھا۔ سر کو جھٹکا دیا اور حال میں لوٹ آئی۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گھپ اندھیرا ہو گا۔ گہرا بہت گہرا اور گہرا۔ کسی گھر کی چوکھٹ پر لرزہ طاری ہو گا۔ کوئی دبے قدموں نکلے گا۔ گھبرایا ہوا۔ خوف زدہ آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کچرے کے ڈھیر پر پہنچے گا اور اس ڈھیر میں ایک گٹھڑی کا اضافہ کرتا ہوا منہ چھپا کر اندھیرے میں گم ہو جائے گا۔ صبح ٹاؤن کمیٹی کی گاڑی آئے گی کچرا اٹھائے گی اور...... وہ لرز اٹھی۔ کیا اب کوئی ماہ نور اس کی طرح خوشحال زندگی نہیں گزار سکے گی۔ سوچ کی تیز لہر وجود کے آر پار ہو گئی۔

اس نے کھڑکی کے کواڑ بند کیے اور دوڑ پڑی۔ لان سے جھولا اٹھایا اور گھر کے باہر رکھ دیا۔

# استاد جی

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت
سلام مسنون
یہ ایک کہانی نہیں سبق ہے۔ دنیا والوں کے لیے بھرپور سبق۔ ہوتل کنگ اور چھیما کی زندگی کا عکس بہت بڑا سبق ہے۔ میں نے اس واقعے کو اپنے انداز میں لکھا ہے قارئین کو ضرور پسند آئے گا۔

شمیم غوری
(کراچی)

آج میں اس زندگی کا ایک خفیہ گوشہ عیاں کر رہا ہوں جسے بیگم کی وفات کے بعد ہی لکھنے کی ہمت ہوئی ہے۔ اس گوشے سے عیاں ہوگا کہ ظالم پیٹ مجھے کہاں کہاں لے گیا اور کیا کیا مجھ سے کرایا۔ کس کس گھاٹ کا پانی پیا۔ کیا کیا دھندے کیے تو آئیں اس کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔

میرے ایک کلاس فیلو میرا پتا پوچھتے پوچھتے اپنی سرکاری جیپ میں میرے گھر چلے آئے۔ بیگم کسی شادی کے سلسلے میں اپنی اماں کے گھر گئیں۔ یہ دوست فوج میں تھے

اور اب میجر ہو گئے تھے۔ اسلام آباد میں مقیم تھے اور ملیر چھاؤنی میں کسی سرکاری کام سے آئے تھے۔ مجھ سے ملاقات ہوتے ہی انہوں نے ڈرائیور کو واپس بھیج دیا اور میرے مکان میں رک گئے۔ کوئی چھ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ رات بھر پرانے قصے، کلاس فیلوز کی باتیں، شکار کی باتیں۔ بچپن کی حماقتوں لڑائیوں کی باتیں بہت ساری یادیں تازہ ہوتی رہیں۔ بیچ بیچ میں ایک بات کرتے رہے کہ یار ایک لڑکی کو ٹیوشن پڑھانی ہے انکار نہ کرنا۔ اتنی مرتبہ اصرار کیا کہ میں نے ہاں کرلی اور پکا وعدہ کرلیا کہ بھائی پڑھا دوں گا پڑھا دوں گا۔ صبح میری ففٹی پر بیٹھے اور کہا ادھر چلو۔

ادھر چلو ادھر چلو کرتے کرتے وہ مجھے نگار سینما سے آگے جونا مارکیٹ کے بازار حسن میں لے گئے۔ جہاں گئے اس عمارت کا نام تھا بلبل ہزار داستاں بلڈنگ۔ یہ عمارت لیمارکیٹ کو بندر روڈ سے ملانے والی سڑک پر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہزار کمرے ہیں۔ نظر تو نہیں آئے لیکن بلڈنگ بڑی کشادہ و وسیع و عریض تھی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں چھیماں نامی طوائف سے مجھے ملوایا۔ چھیماں کیا تھی زندہ طلسمات تھی۔ حسن ملکوتی کا شاہکار، قلوپطرہ کے سفید رنگ پر گلابی شیڈ، بھری بھری گردن ایسی کہ قطرے گرتے تو پھسلتے چلے جاتے۔ خوبصورتی جسے کہتے ہیں شاید وہ اس پر ختم تھی۔ اس کی طوائفانہ ادائیں اور محبت بھری نگاہیں، کوئی جان ہی نہیں سکتا کہ اصلی ہیں یا اداکاری، مکاری کہاں سے شروع ہوکر معصومیت میں ڈھل گئی یا معصومیت کہاں سے مکاری میں تبدیل ہوگئی، کچھ پتا نہیں چلتا تھا اس لیے کہ بناوٹ کہیں سے پکڑ میں نہیں آتی تھی۔ بولے تو لگتا کہ جلترنگ بج رہی ہے لیکن تھی پنجابی جلترنگ۔ بہرحال اس سے ملنے والا مرد اگر اس کا اسیر نہ ہو تو وہ مرد ہی نہیں۔ کیا ملا اور کیا مومن کیا، شیخ اور کیا برہمن ایک بار دیکھ لے تو بار بار دیکھے گا۔ ایک بار مل لیا تو بار بار ملنے کی تمنا کرے گا۔ غالب اسے دیکھ لیتے تو ان کی شاعری کا اسلوب ہی اور ہوتا۔ شراب بھول جاتے یا شراب میں ڈوب کر مرجاتے۔ یہ جو شاعر گریباں چاک کا ذکر کرتے ہیں اس کا تو مطلب مجھے اب سمجھ آیا۔ حد ادب مجھے مزید کچھ لکھنے سے روک رہی ہے، بہرحال چھیماں کا گریباں حد ادب کی حدود کو کچھ زیادہ ہی بے ادبی سے پار کیے ہوئے تھا۔ اگر دس دوستوں کو حضرت زلیخا کی طرح چھری پلیٹ اور پھل دے کر بٹھا دیا اور چھیماں وہاں آجاتی تو سب پھلوں کی جگہ انگلیاں کاٹ لیتے اور اس کے جانے پر چھریاں اپنے دل میں مار لیتے۔ نا معلوم کتنے اس کی آرزو میں خودکشی کر گئے ہوں گے۔

میجر صاحب کے کسی دوست نے ان کے ذمہ یہ کام لگایا تھا کہ چھیماں کی چھوٹی بہن بے بی کو ایک استاد دلا دیں جو اسے اردو سکھا دے۔ ان صاحب کے تعلقات چھیماں سے کیا تھے مجھے نہیں معلوم۔ اب مجھے پتا لگا کہ اتنے وعدے کیوں لیے جارہے تھے۔ یہ سن 1977 کی بات ہے جب مجھے سرکار کی جانب سے مبلغ تین ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔ میرا کام ہی پارٹ ٹائم ٹیوشن پڑھانا تھا۔ دو تین سو روپے میں میں گھر گھر جا کر اکاؤنٹس کی ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ بے بی گھر پر نہ تھی۔ چھیماں کو دیکھ کر اور اس کی پیار بھری استدعا سن کر کون کافر ہوگا جو انکار کردے۔ اس وقت میں ساتویں سے اوپر کوئی آسمان ہوتا تو اپنے آپ کو اس پر پاتا تھا کہ ایسی حسین پری اور میری منتیں کررہی ہے کہ بے بی کو پڑھا دیں اور میں نخرے کررہا ہوں کہ بہت دور ہے اور وقت بھی بہت لگے گا آنے جانے میں۔ یہاں رش بھی بہت ہوتا ہے۔ نیچے سے بائیک نہ چوری ہوجائے وغیرہ وغیرہ۔ تقریب کچھ تو بہر گفتار چاہیے۔ بہرحال میجر صاحب سے کیا ہوا وعدہ نبھایا وقت طے ہوگیا۔ معاوضہ طے کرنے کی اس حسین ساحرہ کے آگے تاب نہ تھی کہ آتش جوان تھا۔ سو دل بے قابو کو قابو کرتے ہوئے لوٹ آیا۔

اگلے دن ٹھیک دن کے ایک بجے میں اپنی ففٹی پر جیسے ہی بلبل ہزار داستاں بلڈنگ پہنچا تو ایک آدمی نے آگے بڑھ کر میری بائیک سنبھالی اور فٹ پاتھ کے اوپر باٹا کی دکان کے ساتھ کھڑی کرکے اس پر بیٹھ گیا اور مجھے کہا کہ استاد جی آپ بے فکر ہوکر اوپر جائیں، میں اس کی دیکھ بھال کروں گا۔ یہ حکم بے بی کا ہے۔

دوسرا آدمی مجھے لے کر اس طرح اوپر گیا کہ جس کمرے کے سامنے سے گزرتا انہیں اشارہ کرتا کہ استاد جی آرہے ہیں اور وہاں خاموشی چھا جاتی۔ طبلے سارنگی کی جو پریکٹس ہو رہی ہوتی وہ خاموش ہوجاتی۔ ایسا لگتا تھا کہ استاد جی نہیں شہنشاہ اکبر تشریف لارہے ہیں، جن کے آگے آگے چوبدار اعلان کرتا جارہا ہے کہ باادب باملاحظہ ہوشیار، شہنشاہ عالم پناہ، ظل سبحانی تشریف لارہے ہیں۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں اور کیا میری اوقات۔

اندر گیا تو جھیما اور اس کی چھوٹی بہن بے بی نے کھڑے ہوکر کورنش بجالانے کے ساتھ استاد جی سلاملیکم کہا اور "ی" کو بہت لمبا لالوکھیت تک کھینچا۔ میرا خیال تھا کہ بے بی کوئی آٹھ دس سال کی لڑکی ہوگی۔ وہ تو پندرہ سال کی، چھ فٹ قد کی، دیکھنے میں بیس سال کی لگی۔ اس نے کہا کہ مینوں اردو پڑھا دیو۔ پنجابی اردو مکس کرکے اس نے بتایا کہ میں ماڈلنگ کروں گی مجھے اردو بولنا اور لکھنا سکھادیں۔ اتنے میں حلوا پوری کا ناشتا آگیا۔ اس بازار میں رات بھر گانا بجانا کرکے جو سوتے ہیں تو ان کا ناشتا دو بجے تک ہوتا رہتا ہے۔ اور ناشتا فروش بھی حلوا پوری دو بجے تک بناتے رہتے ہیں۔ استاد جی نے ناشتا کیا۔ استاد جی اوپر صوفے پر اور شاگرد نیچے قالین پر۔ ایسا قالین جو استاد جی کو ابھی تک نصیب نہیں ہوا تھا۔ جھیما نے کہا استاد جی بسم اللہ کرکے دو لفظ زبانی پڑھادیں تاکہ اپنی رسم پوری کرلیں۔

میں نے اسے بسم اللہ پڑھادی۔ اب رسم شروع ہوئی ایک من مٹھائی آئی اور پوری بلڈنگ میں بانٹی گئی۔ سارے دلال لگ گئے مٹھائی بانٹنے میں۔ اس کے بعد اس بلڈنگ کی سب سے معمر کوئی سو سال کی ایک ریٹائر طوائف تین بڑی عمر کی طوائفوں کے ساتھ آئی، تینوں نے سرپوش سے ڈھکے ہوئے خوان اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے ایک طوائف سے گلاب کے پھولوں کا ہار لے کر میرے گلے میں ڈالا۔ دوسری نے نوٹوں کا ہار لے کر ڈالا جو ایک ہزار روپے مالیت کا تھا۔ تیسری سے اس نے ایک اورنج رنگ کی پگڑی لے کر میرے سر پر باندھی، جس پر مجھے اپنا دولہا بننا یاد آگیا۔ اس کے بعد ایک بڑا سا رومال جیسا دیہاتی اپنے کندھے پر ڈالتے جسے پونا کہتے ہیں میرے کندھے پر ڈال دیا۔ اس وقت میں پورا پورا کارٹون بلکہ دولہا والا گھوڑا لگ رہا تھا جو ہر طرف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد بے بی نے میری قدم بوسی کی، یہ بھی کوئی رسم ہوگی اس قبیلے کی۔ ناشتا تو میں کر چکا تھا اس پر مٹھائی اور چائے کچھ زیادہ ہی ہوگیا۔ جھیما نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں میری فیس تھی۔ ایک لفافہ اور دیا اور کہا کہ اس میں بے بی کی کتابوں کاپیوں کا خرچ ہے، کل لیتے آئیے گا تاکہ کل سے پڑھائی شروع ہوجائے۔

اس وقت تک شاپر ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ میں نے پگڑی اتاری جھیما نے تہہ کرکے ایک اخبار میں لپیٹ دی۔ میں نے نوٹوں کا ہار اتارا، اس نے وہ بھی اخبار میں رکھ دیا۔ پھولوں کا ہار بھی اسی طرح پیک کردیا۔ پونا میں نے

## چودھری شجاعت حسین

معروف سیاست دان، صنعت کار وہ ممتاز سیاسی رہنما چودھری ظہور الٰہی کے فرزند ہیں۔ انہوں نے گجرات میں آنکھ کھولی۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایف سی کالج لاہور سے 1967ء میں بی اے کیا پھر صنعتی شعبے میں تربیت حاصل کرنے کے لیے انگلستان کا رخ کیا وہاں سے انہوں نے انڈسٹریل مینجمنٹ میں ڈپلوما لیا۔ پہلی مرتبہ 1977 کے انتخابات میں پاکستان قومی اتحاد کے امیدوار نامزد ہوئے۔ 1985ء، 1988ء، 1997ء اور 2002ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی جانب سے پانچ مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1982ء میں کوریا کی حکومت نے انہیں اعزازی قونصل جنرل نامزد کیا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے دور حکومت میں 1982ء سے 1985 تک مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ 2 جنوری 1986ء سے 20 دسمبر 1986 تک وزیر اطلاعات اور 1987ء سے 1988 تک وزیر صنعت رہے۔ میاں نواز شریف کے پہلے دور میں 1990ء سے 1993ء تک وزیر داخلہ 1993ء تا 1997 سینیٹ کے رکن رہے اور دوسرے دور میں 1997ء تا 1999 وزیر داخلہ اور نارکوٹکس کنٹرول کے وزیر بنے۔ دسمبر 2002ء میں قومی اسمبلی میں مسلم لیگ (ق) کے پارلیمانی لیڈر منتخب ہوئے جب کہ جنوری 2003ء میں انہیں مسلم لیگ (ق) کا صدر اور جون 2004ء میں انہیں متحدہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی مستعفی ہوئے تو انہیں وزیراعظم کے عہدے پر نامزد کیا گیا اور جون 2004ء میں پاکستان کا وزیراعظم منتخب کرلیا گیا۔ 30 جون 2004ء کو چند مہینے وزیر اعظم رہنے کے بعد شوکت عزیز کے وزیراعظم بننے کے حق میں دستبردار ہوگئے۔

مرسلہ: تہمینہ پروین، لاہور

کندھے پر ہی رکھا۔ ہمارا سامان ایک دلال میرے ساتھ لے کر نیچے آیا اور میری بائیک کی ٹوکری میں رکھا۔ بائیک والا دلال مستقل میری بائیک پر بیٹھا تھا۔ یہاں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس پوتنے سے لوگ مجھے بھی کوئی نیا دلال نہ سمجھ لیں، جلدی سے اتار کر فنٹی کی ٹوکری میں رکھا۔
اب مسئلہ یہ تھا کہ میں ان نوٹوں اور پھولوں کے ہار کا کیا کروں۔ جانا مجھے اپنے سسرال جیکب لائنز تھا کیونکہ بیگم وہاں تھیں۔ اپنا گھر بہت دور تھا۔ راستے میں کہیں نوٹوں کا ہار کھول نہیں سکتا تھا۔ اتنی بڑی رقم کا کوئی جواز بھی بیگم کو بتانے کا نظر نہیں آرہا تھا۔ عجب مخمصہ تھا۔ مجبوراً ایک جاننے والے کے گھر لیاقت آباد گیا وہاں جا کر ہار سے نوٹوں کو الگ کر کے گنا تو ایک ہزار تھے۔ لفافے میں پانچ ہزار فیس تھی اور کتابوں کے ایک ہزار تھے۔ میں تو ہزار ڈیڑھ ہزار بیگم کو دینے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا اب یہ تو اتنے ہو گئے۔ بے بی 6 ماہ کے لیے لاہور سے کراچی کمانے آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ 6 ماہ کی اکٹھی فیس دے دی کافی سے زیادہ ہے۔ سات ہزار روپے لے کر سسرال گیا۔ بیگم کو 6 ہزار روپے دیئے تو سوال ہی سوال اور سوال در سوال۔ ساری زندگی نیک بخت نے گھر آنے پر کھانا دینے سے پہلے کبھی کوئی سوال نہ کیا، اس دن بس اس کو کھانا بھی بھول گیا۔ جھوٹ سچ بول کر اسے مطمئن یا غیر مطمئن کیا۔ ہماری برادری میں رواج ہے کہ مرد تمام کمائی اپنی بیوی کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ بیگم حیران تھی کہ ایسے کون لوگ ہیں جو پگڑی اور جوتا بھی دیتے ہیں۔ اگلے دن جب باقی رقم کتابوں کی واپس کی تو انہوں نے اپنا رواج بتایا کہ کنجر کے ہاتھ سے جو گیا وہ واپس نہیں ہوتا آپ رکھ لیں۔ لفظ کنجر سن کر مجھے پسینے آگئے۔
ایک روز بے بی کو پڑھا رہا تھا کہ حد ادب کے اوپر ایک خوبصورت نیکلس چم چم کرتا نظر آیا۔ بار بار اس کی چمک پر نظر پڑتی تھی۔ میں نے پوچھ لیا کہ کہاں سے آیا اتنا خوبصورت نیکلس۔ بتایا کہ باجی کے بندے نے لا کر دیا ہے۔ جب اٹھنے لگا تو ایک پیکٹ میں اسے پیک کر کے مجھے دے دیا کہ یہ استانی جی کو دے دینا۔ میں نے بہت منع کیا اور لینے سے انکار کیا۔ اس نے جھیما کو بلا لیا اور اس نے زبردستی وہ نیکلس مجھے دے دیا اور کہا کہ استاد جی آپ ہماری دی ہوئی کسی چیز کو منع نہ کیا کریں۔ ہم استاد جی کی قدر ماں باپ سے زیادہ کرتے ہیں، یہاں گھر میں ڈھنگ کی چارپائی نہیں اور میں کس منہ سے بیگم کو بتاؤں کہ تمہارے لیے سونے کا تحفہ لایا ہوں۔ بیگم کو جھوٹی کہانی گھڑ کر دے دیا اور کہا دیکھو بہت بڑے لوگ ہیں اور انہوں نے دیا ہے، ان کی بیٹی کو پڑھاتا ہوں۔ لیکن برا ہو عورت کی نفسیات اور اس کی جھوٹ پکڑنے والی مشین کا کہ کوئی شوہر بیوی سے جھوٹ بولے تو بیوی کو کوا کاٹ جاتا ہے نامعلوم کون سی خوبی اللہ تعالیٰ نے بیویوں کو دی ہے۔
یہ باجی دا بندہ کون تھا۔ اس کا نام چوہدری فرض کر لیں وہ بوتل گلی میں بوتل کنگ کہلاتا تھا۔ اس کے باپ کی کورنگی میں شیشے کی فیکٹری تھی اور وہ جدید پلانٹ پر اعلیٰ معیار کی بوتلیں بناتے تھے۔ تمام فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو وہیں سے بوتلیں بنا کر دی جاتی تھیں۔ ان کی بوتلیں فرانس کی خوشبویات کی فیکٹریوں میں بھی جاتی تھیں۔ وہ بوتل کنگ ہی جھیما کے پورے گھرانے کے اخراجات برداشت کرتا تھا۔ ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کے اخراجات وہی دیتا تھا۔ جھیما کے مجرے پر پابندی نہ تھی ویسے وہ اس کے لیے مخصوص تھی۔ کس قدر خرچ تھا مجھ جیسے غریب کنگلے کی سوچ سے بھی زیادہ۔ میرے ایک ماہ کے خرچ سے ان کے ایک دن کا خرچ زیادہ تھا۔ اس زمانے میں چھوٹی سوزوکی کار ایف ایکس ساٹھ ہزار کی آتی تھی۔ بوتل کنگ نے زیرو میٹر کار لا کر نیچے کھڑی کی اور چابی لا کر جھیما کو دی تو اس نے کار دیکھ کر کہا مجھے یہ نہیں چاہیے دینی ہے تو ڈھنگ کی کار دو۔ میں اس ڈبے میں کیا بیٹھوں گی۔ فلموں میں دیکھتے تھے کہ کس طرح طوائفیں نوابوں کو لوٹتی ہیں۔ اب اپنی آنکھوں دیکھ رہا تھا۔
ایک روز بوتل کنگ مجھے نیچے مل گئے۔ میں نے کہا کہ بھائی تم کیوں اتنا خرچ کرتے ہو۔ تباہ ہو جاؤ گے۔ کہنے لگے ماسٹر صاحب میں اس بات کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں مجھے پتا ہے کنجر کسی کے نہیں ہوتے لیکن یار گندی وی تے چنگی اے نا۔ روز توبہ کرتا ہوں پھر آ جاتا ہوں۔
بلبل ہزار داستان میں فلیٹ کرائے پر ملتے تھے اور لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ سیڑھیوں سے اوپر چڑھ کر جس فلیٹ میں جانا ہوتا ایک تنگ سی راہداری سے گزرتے ہوئے جاتے۔ اس دوران تمام فلیٹوں کے دروازے کھلے ہوتے اور سب کو جھانکتے جانے میں کوئی عار نہیں تھی۔ پردے کھلے ہوتے تھے۔ سازندوں اور گانے والیوں کے ریاض کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ پڑوس میں کوئی نئے کرایہ دار آئے تھے۔ جھیما نے ایک دلال کو کہا کہ پتا کرکے

آؤ کہ پڑوس میں کون آیا ہے۔

وہ گیا اور واپس آیا، آکر بڑے افسوس سے بتایا، "باجی اے تو کوئی ایویں ای نے، کنجر نیں نے"۔ یعنی وہ تو کوئی ایسے ویسے ہیں کنجر نہیں ہیں۔ اس پر جھیما نے کہا ہائے ہائے اب انہیں رہنے کے آداب سکھانے میں بھی وقت لگے گا۔

نا معلوم پڑوس میں رہنے کے وہاں کے آداب کیا تھے جو غیر کنجر کو نہیں آتے۔ غیر کنجر ہونے پر انہوں نے ناگواری کا اظہار کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ان کو کنجر ہونے پر ناز اور فخر تھا۔

میرا خیال تھا کہ پہلے لفافے میں پانچ ہزار فیس چھ ماہ کی پیشگی ہے۔ اگلے ماہ جب دوبارہ ایک لفافہ ملا اور اس میں پانچ ہزار پھر برآمد ہوئے تو میرے ہاتھوں کے توتے اڑنے ہی تھے۔ بیگم کو پچھلے ماہ چھ ہزار دے کر کہا تھا کہ یہ چھ ماہ کی پیشگی فیس ہے۔ سو سوال ہوئے تھے۔ اب تو ہزار سوال ہوئے۔ لاکھ سمجھایا کہ نیک بخت بڑے لوگ ہیں۔ میجر صاحب کے دوست ہیں۔ جو جی چاہا دے دیا۔ لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی۔ کہنے لگی مجھے ان کے پاس لے چلو میں بھی دیکھوں کہ کتنے بڑے لوگ ہیں۔ کیا سرکار سے بھی بڑے ہیں؟ سرکار تین ہزار دیتی ہے اور یہ پانچ ہزار۔ تم سیدھے سیدھے کیوں نہیں بتاتے کہ اصل بات کیا ہے۔ پھر وہی جھوٹ پکڑنے کی مشین۔ جھوٹ میں بولوں اور کوا انہیں کاٹ جائے۔ وہی کائیں کائیں۔ شکر ہے کہ میجر صاحب نے اپنے اگلے چکر میں بیگم کو مطمئن کر دیا کہ یہ انگلینڈ کے ہائی کمشنر کی بیٹی کو پڑھاتے ہیں۔ وہ اپنے حساب سے پانچ سو پاؤنڈ دیتے ہیں جو پاکستان کے پانچ ہزار بن جاتے ہیں۔

ایک روز جھیما ایک بہت خوبصورت چھوٹی سی گھڑی باندھے ہوئے تھی۔ اس کی چمک دمک خوبصورتی کی وجہ سے میں نے اس کو دو تین دفعہ سرسری نظر سے دیکھ لیا۔ جھیما نے میری نگاہوں میں حسرت، بیچارگی، ہوس یا آرزو کو پڑھ لیا۔ جاتے وقت ڈبہ پیک تھا" اور یہ ساڈی استانی جی نوں دے دینا۔"

انکار کی گنجائش کنجری کے سامنے بدتہذیبی تھی، سو رکھ لی۔ لے جا کر بیگم کو دی کہ لو تمہارے لیے صدر سے تحفہ لایا ہوں۔ اسی روپے کا ہے۔ بہت خوش ہوئیں۔ ایک مرتبہ تو جھوٹ موٹ کہا کہ کیوں اتنا خرچا کرتے ہو لیکن خوش ہوئیں۔ انہوں نے اسے کپ میں رکھ دیا اور بھول گئیں۔ کئی ماہ بعد بیگم کے بھائی دبئی سے آئے تو بیگم نے تیار شیار ہو کر سرمہ، مسی مساک لگا کر نئے کپڑے پہنے اور وہ گھڑی بھی پہن لی۔ بیگم نے ساری عمر اپنے بھائیوں رشتہ داروں وغیرہ کے لیے ہی سنگھار کیا تھا، اپنی باری کبھی نہیں آئی۔ خیر سے ہم دونوں تھے ہمیشہ کے بیچارے، ان کے بھائی نے گھڑی دیکھی اور کہا کہ باجی بند گھڑی پہنی ہوئی ہے۔ چابی تو دے لیا کرو۔ انہوں نے اسے دے دی اور کہا کہ چابی دے کر ٹائم ملا دو۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ راڈو ہے۔ اپنے وقت کی قیمتی ترین گھڑی۔ کہنے لگا باجی یہ راڈو کہاں سے آئی۔ کہا تمہارے بھائی لائے تھے صدر سے اسی روپے کی۔ اب انہوں نے اس کو دوبارہ دیکھا فرش پر رگڑا اور چیک کر کے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کبھی راڈو کا نام بھی نہ سنا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ تو بہت قیمتی گھڑی ہے۔ اسے ٹال دیا لیکن جھیما کی سخاوت کا اندازہ وہ ٹیوشن چھوڑنے کے بعد ہوا۔ بیگم کو اس کی اصلیت کا اندازہ کبھی نہ ہوا اور وہ گھڑی کپ میں پڑی پڑی کوئی تیس سال تو نظر آئی پھر کہیں گم ہو گئی۔

ہر ماہ ایک جوڑا دے دینا، کبھی خواہ مخواہ ہزار پانچ سو دے دینا۔ کبھی لیڈیز جوڑا دے دینا ان لوگوں کا معمول تھا۔ عیدی کے نام پر بہت کچھ دے دینا۔ میں ٹیوشن کو سب سے گھٹیا پیشہ سمجھتا ہوں، اکثر شرفاء آخری ایک آدھ ماہ کے پیسے مار لیتے تھے۔ اکثر کا رویہ اہانت آمیز ہوتا تھا لیکن کنجروں نے کمال کر دیا۔ اس قدر عزت اور اس قدر فراخ دلی۔ چھ ماہ بعد جب بے بی واپس لاہور جانے لگی تو مزید پانچ ہزار اور نامعلوم کیا کیا تحفے استاد جی کی نظر کیے۔ ان کا کیا جاتا تھا خرچا تو بوتل گنگ کا تھا یا رات کے راہیوں کا تھا۔ لیکن ان کا دل سخی تھا۔

وقت گزرتا رہا کشمکش زندگی مجھے کھینچ کر ایک دن بوتل گلی لے آئی، یہ سن دو ہزار بارہ کی بات ہے۔ کلینک کے لیے بوتلوں کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے بوتل گنگ یاد آگئے۔ پوچھا کہ ایسا کوئی نام کسی کو یاد ہے۔ ایک صاحب نے ایک بڑے میاں کو بلایا اور کہا کہ ان سے پتا کرو۔ میں نے مدعا بیان کیا تو کہا کہ ہاں ہے ایک ایسا آدمی۔ وہ مجھے لے کر بوتل گلی کے پچھلے حصے میں لے آیا جو کچی آبادی لگتا تھا۔ یہاں ایک بوڑھا ایک کھولی میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے کہا جھیما کی چھوٹی بہن بے بی کا استاد شمیم غوری۔ بوڑھا ایک آہ بھر کر کھڑا ہو گیا۔

گلے ملا اور کہا کہ بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اپنی داستان شروع کردی۔ شاید اب اس کی تباہی کی داستان سننے والا اور ان کرداروں کو جاننے والا میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ یہ بوتل کنگ جس کی ایف ایکس کو جھیما نے انکار کیا تھا۔ کسمپرسی کے عالم میں ایک کھولی میں پڑا تھا۔ پُرتکلف کھانا آگیا۔ داستان چلتی رہی۔

اس نے دو لاکھ روپے دے کر جھیما کی منہ بولی ماں سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ شادی ہوگئی۔ الگ بنگلا لے کر اس میں رہنے لگے۔ اس پر باپ نے اسے گلاس فیکٹری سے نکال باہر کیا۔ بیوی اور بیٹیوں نے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ اب اس کے پاس جو جمع شدہ تھا وہ ایک طوائف کو کتنے دنوں کے لیے کافی ہوتا۔ اس نے بوتل کنگ سے شادی کی تھی کسی ایسے ویسے سے نہیں۔ اِدھر اُدھر سے ادھار پکڑ کر کچھ بزنس کیا۔ بنگلا فروخت کر کے اس میں لگایا۔ لیکن کہاں بہترین گلاس فیکٹری اور کہاں چھوٹی موٹی بھٹی۔ چند سال کچھ کر پایا لیکن آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ جھیما واپس اپنے بلبل ہزار داستاں کے فلیٹ میں آگئی۔ پھر کبھی واپس نہ آئی۔ بوتل کنگ کبھی کبھار چلے جاتے مل آتے۔ خالی جیب والے کی کیا وقعت۔ رویہ دیکھ کر جانا چھوڑ دیا۔ کوئی پندرہ سال سے دیکھا بھی نہیں۔ جیب سکڑتی گئی تو اس کھولی میں جو انہوں نے اچھے وقت میں اپنے مزدوروں کے رہنے کے لیے خریدی تھی شفٹ ہو گئے۔ کچھ عرصہ تو کچھ آمدنی رہی پھر وہ بھی ختم۔

برے وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ ایک بیٹی ان کے حالات سن کر آئی اور اس نے اس سے معافی مانگی۔ ساری اولاد اور بیوی کو معافی کا کہلوایا لیکن کوئی نہ آیا۔ اب وہ بیٹی جو کسی فرم میں کسی اچھے عہدے پر ہے ہر ماہ ان سے ملنے آتی ہے اور کچھ خرچا دے جاتی ہے۔ بوتل کنگ کے فون پر ایک ٹیون لگی تھی

"بہاریں چار دن کی پھر خزاں ہے محبت کی بس اتنی داستاں ہے۔"

جب کبھی جانا ہوتا مل آتا۔ ایک بار گیا تو پتا چلا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ میرے نام ایک لفافہ سامنے کی دکان پر چھوڑ گئے۔ میں نے وہ لفافہ لیا۔ اس میں میرے نام ایک پرچہ تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ جھیما سے اسی فلیٹ میں ملو اور اسے کہو کہ مجھے معاف کردے میں اسے خوش نہ رکھ سکا۔ میں ایک ماہ اسی کشمکش میں رہا کہ کیا جاؤں لوگ کیا کہیں گے بڑے میاں کہاں جا رہے ہیں۔ ایک دن ہمت کر کے چلا گیا۔ جھیما اب اس فلیٹ میں نہیں تھی۔ پوچھا تو پتا چلا کہ وہ نگار سنیما سے آگے بائیں جانب کچی آبادی میں رہتی ہے کچھی ٹریڈرز کی گلی میں سیدھے ہاتھ کا کچا مکان ہے۔ میں ڈھونڈتا ہوا پہنچ گیا۔ ایک بچے نے اندر جھانک کر کہا کہ جھیما آنٹی کوئی آیا ہے۔ اس نے کہا اندر بھیج دو۔ مجھے دیکھ کر بیٹھی رہی۔ میں نے سلام کیا اور کہا میں بوتل کنگ کا پیغام لایا ہوں۔ میں شمیم غوری ہوں بے بی کا استاد۔ ادب سے کھڑی ہوئی۔ پیر پکڑ کر پہلے کھڑے نہ ہونے پر معافی مانگی۔ میں نے وہ پرچہ دیا اور پڑھ کر سنایا۔ اور بتایا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ سن کر رونے لگی کہ میں بیوہ ہوگئی۔ اس کا حال یہ تھا کہ جس نے اسے جوانی میں نہیں دیکھا وہ مان ہی نہیں سکتا کہ یہ کبھی خوبصورت بھی تھی۔ میں حیران کہ پندرہ سال سے ملاقات نہیں ہوئی اور اب رو رہی ہیں۔ بے بی کا پوچھا تو بتایا کہ وہ لاہور میں اسی زمانے میں قتل ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ گزارہ کیسے ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا شوکیس دکھایا جس میں کچھ انگوٹھیاں اور نگینے رکھے تھے۔ کہنے لگی سامنے مارکیٹ سے خرید کر مزاروں پر چلی جاتی ہوں، گزارہ چل جاتا ہے۔ کبھی ٹھٹھہ تو کبھی شاہ نورانی کبھی شاہ عقیق کبھی سہون شریف۔ میں نے اجازت چاہی تو کہا کہ استاد جی اتنے سال بعد آئے ہو۔ کچھ دیر تو بیٹھو۔ کولڈ ڈرنک منگائی پھر کہا کہ میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ مجھے کون معاف کرے گا۔

میں نے کہا اللہ سے معافی مانگو۔

چلتے وقت ایک عقیق کی انگوٹھی مجھے تحفے میں دی اور معذرت کی کہ اگر اچھا زمانہ ہوتا تو اور کچھ خدمت میں پیش کرتی۔

میں نے ابھی پچھلے سال صدر میں واقع ایک انسٹیٹیوٹ سے جیمز آئیڈینٹیفکیشن کا کورس کیا تو خیال آیا کہ جھیما سے بھی جیمز کی کچھ معلومات کی جائیں۔ وہ جیمز مارکیٹ کے قریب ہی رہتی ہے اور ان کا کاروبار بھی کرتی ہے۔ گیا تو پتا چلا کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ شاہ عقیق گئی تھی دل کے دورے سے انتقال ہو گیا اور مجاوروں نے وہیں دفنا دیا۔

ہر عروج را زوال

# المیہ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
اس بار جو سچ بیانی پیش کررہی ہوں یہ کسی مسلمان لڑکی کی نہیں ہے اور نہ پاکستان کی ہے لیکن اس میں جو درس ہے وہ اچھوتے انداز کا ہے اس لیے میں نے اسے اپنے الفاظ کا پیرہن دیا ہے تاکہ پڑھنے والے کہیں اسے غلطی سے ترجمہ نہ سمجھ لیں۔

دانیہ صدیقی
(کراچی)

کمرے میں شام کا ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹی نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی جب... دروازے پر امی کی مخصوص دستک ابھری۔ میں اک دم چوکنا ہوگئی مگر اٹھ کر دروازہ کھولنے کی بجائے ویسے ہی دم سادھے پڑی رہی۔ امی کافی دیر تک دروازہ بجاتی رہیں پھر مایوس ہو کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی اور منہ پر پانی کا چھپا کا مار کر کمرے کی کھڑکی پر آ کھڑی ہوئی۔

میری کھڑکی کے عین سامنے ہی چیری کے خوبصورت پیڑوں سے ڈھکی ایک سفید اور سلیٹی رنگ کی شاندار سی عمارت تھی۔ اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے اس کی تمام لائٹس کھول دی گئی تھیں اور عمارت کے اوپر جلی حروف میں لکھا اس کا نام جگمگا رہا تھا 'دی ہوپ ہاسپٹل'۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نرسز کی شفٹ ختم ہوئی تھی چنانچہ وہ ٹولیوں کی صورت میں باہر آرہی تھیں۔ کچھ نئے اور کچھ وہی پرانے مختلف رنگ و نسل کے چہرے تھے۔ کئی نرسز نے مجھے دیکھ کر خیر سگالی کے طور پر اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے، جواباً میں نے بھی زور و شور سے ہاتھ ہلا کر انھیں جواب دیا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا کہ میں نرسز کی ڈیوٹی آف ہونے کے ٹائم پر کھڑکی میں آکر جم جاتی تھی اور انھیں رشک سے دیکھا کرتی تھی۔

نرسز بھی میری اس روٹین سے واقف تھیں بلکہ کبھی کسی وجہ سے دو تین روز متواتر کھڑکی میں نہ کھڑی ہوتی تو وہ باقاعدہ گھر کی بیل بجا کر امی سے میری خیر خیریت دریافت کرتیں۔

نرسز کے چلے جانے کے بعد سڑک پر پہلے کی طرح سناٹا چھا گیا۔ اب صرف اِکّا دُکّا لوگ اسپتال کے اندر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ میں ایک گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹ گئی اور اپنے لیپ ٹاپ پر فلم لگا کر بیٹھ گئی۔ گو میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اور بھوک کے مارے میرا برا حال تھا مگر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ امی سے اپنی بات منوا کر ہی دم لوں گی اور جب تک وہ میری بات نہیں مانیں گی میں اسی طرح اپنے کمرے میں بغیر کچھ کھائے پیے بند رہوں گی۔ یہ میرے لیے بہت بڑی آزمائش تھی کیونکہ کھانا پینا میری کمزوری تھی اور بچپن ہی سے دن میں تین مرتبہ کھانا... کھانے کی عادت اس قدر پختہ تھی کہ اگر میں کسی مصروفیت کی وجہ سے ایک وقت کا کھانا بھی چھوڑ دیتی تو بھوک سے میری حالت غیر ہو جاتی اور چکر آنے لگتے جبکہ آج تو میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

رفتہ رفتہ رات گہری ہوتی چلی گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔ امی بھی میری اس کمزوری سے اچھی طرح واقف تھیں اسی لیے کئی بار دستک دے کر جا چکی تھیں۔ ابھی دس منٹ پہلے ہی وہ مجھے منانے کی ایک اور ناکام کوشش کر کے گئی تھیں۔ یکے بعد دیگرے تین فلمز دیکھنے سے میری آنکھیں الگ دُکھنے لگی تھیں اور اب تو بھوک کی زیادتی سے دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ ناچار میں نے لیپ ٹاپ اٹھا کر ایک جانب رکھا اور کمرے میں کھانے کی کوئی چیز ڈھونڈنے لگی۔ الماری سے لے کر بک شیلف تک کھنگال ڈالی مگر کچھ نہ ملا۔ ناچار میں نے بستر پر اپنا ہینڈ بیگ الٹ دیا اور بڑی آس سے چیزیں ہٹا ہٹا کر کچھ کھانے کے لیے تلاش کرنے لگی۔ بالآخر بڑی مشکلوں سے ایک مڑی تڑی سی چیونگم برآمد ہو ہی گئی جو میں نے بیقراری سے کھول کر اپنے منہ میں ڈال لی اور جلدی جلدی چبانے لگی۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس وقت مجھے یہ چھوٹی سے چیونگم بھی کسی نعمت سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ میں دوبارہ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت ایک ایمبولینس آکر اسپتال کے دروازے سے لگی اور اس کا دروازہ کھول کر جلدی جلدی اس میں سے مریض کو اتارا جانے لگا۔ ایمبولنسز کا آنا جانا روز کا معمول تھا مگر میں ہر بار ایسی دلچسپی سے دیکھتی جیسے پہلی دفعہ یہ ساری کارروائی دیکھ رہی ہوں۔ دو میل نرسز نے سہارا دے کر مریض کو اسٹریچر پر لٹا دیا، اتنی دیر میں ہاتھ میں گلوکوز کی بوتل تھامے، سفید رنگ کے بے داغ یونیفارم میں ملبوس اور نرسز کی مخصوص ٹوپی پہنے ایک نرس بھی دوڑتی ہوئی اسپتال کے دروازے سے برآمد ہوئی۔ اس نے انتہائی ماہرانہ طریقے سے سیکنڈوں میں مریض کے ڈرپ چڑھائی اور جلدی جلدی ان میل نرسز کو ہدایات دینے لگی۔ میں اس نرس کو گہری دلچسپی سے دیکھ رہی تھی، اس کے کھڑے کھڑے نقوش، براؤن بالوں اور کھلتی ہوئی سانولی رنگت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ امریکی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اسپین یا میکسیکو سے ہے۔

مریض کو وہ لوگ بہت جلد اندر لے کر چلے گئے اور ایک مرتبہ پھر سے سکوت چھا گیا تو میں اپنے خیالات سے چونکی۔ میں نے پلٹ کر گھڑی کی جانب دیکھا تو وہ گیارہ بجے کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ امی آدھے گھنٹے بعد ڈیوٹی پر روانہ ہو جائیں گی پھر میں آرام سے کچن میں جا کر پیٹ پوجا کر سکتی تھی۔ دراصل میری امی ایک ڈرگ اسٹور کی مالک تھیں، ویسے تو رات کی ڈیوٹی عموماً سائمن کی ہوتی تھی مگر اس نے ایک مہینے کے لیے نائٹ ڈیوٹی سے آف لیا ہوا تھا اسی لیے مجبوراً امی کو وہاں رات بھر رہنا پڑتا تھا اور صبح ایملی کے ڈیوٹی پر آجانے کے بعد وہ سات بجے تک واپس آجایا کرتی تھیں۔

میں اپنی امی کے ہمراہ امریکی ریاست ویسٹ ورجینیا کے ایک پُرسکون شہر ڈنبر میں رہتی تھی جبکہ میری پیدائش نیو یارک میں ہوئی تھی۔ میری امی وہاں ایک اسپتال میں سینئر

نرس کے عہدے پر کام کرتی تھیں اور والد ٹیکسی ڈرائیور تھے۔ امی کا تعلق ایران سے تھا جبکہ میرے ابو پاکستانی تھے۔ ایک روڈ حادثے میں جب ابو شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچے تو میری امی نے ایک تارک وطن کا غم سمجھتے ہوئے ان کی جی جان سے خدمت کی اور گھر والوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اس کے نتیجے میں دونوں کے دلوں میں محبت کا پودا پھلتا پھولتا گیا اور ابو کے صحت یاب ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے اور شادی کے دوسرے ہی سال میں بھی ان کی زندگی میں شامل ہوگئی۔ میرے والدین مجھ پر جان چھڑکتے تھے مگر شاید پھر ہمارے چھوٹے سے کنبے کو کسی کی نظر لگ گئی۔ جب میں محض چار سال کی تھی تو ابو پر اچانک فالج کا اٹیک ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابو کے علاج معالجے پر خاصی بھاری رقم خرچ ہوئی تھی اور کھانے پینے کے لالے پڑ گئے تھے مگر میری امی نے ان مشکل حالات میں بھی عدت کے دن پورے کیے اور برے حالات کا بھرپور مقابلہ کیا۔ امی کو کبھی بھی نیویارک کی شور شرابے والی زندگی پسند نہیں آئی تھی اسی لیے کچھ عرصہ بعد ہم ڈنبر منتقل ہو گئے۔ امی نے یہاں بھی اپنی نرسنگ کا پیشہ جاری رکھا مگر چند ماہ قبل ہی ڈرگ اسٹور خریدنے کے بعد انہوں نے اپنی نوکری چھوڑ دی۔ میں نے شروع ہی سے امی کو آئیڈیالائز کیا تھا۔ میرے نزدیک وہ دنیا کی عظیم ترین خاتون تھیں جنھوں نے کبھی بھی تقدیر سے شکوہ کیے بغیر برے سے برے حالات کا بہادری سے مقابلہ کیا اور مجھے زمانے کی ہر سرد و گرم سے محفوظ رکھا۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی میری امی نے میرے سامنے مشکل حالات کا رونا رویا ہو یا میری کسی خواہش کی تکمیل نہ کی ہو۔ میں نے ہمیشہ بہترین سے بہترین کپڑے اور جوتے پہنے اور جب جوانی میں قدم رکھا تو کاسمیٹکس اور جیولریز کا کریز سر پر سوار ہو گیا مگر مجال ہے جو کبھی امی نے مجھے میرے اس مہنگے شوق پر ٹوکا ہو بلکہ اکثر وہ مجھے خود سے بھی برانڈڈ کاسمیٹکس وغیرہ لا کر دیا کرتی تھیں۔

میری امی میرے لیے سب کچھ تھیں اور اسی لیے میں نے انہی کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے جب نرسنگ کا پیشہ اپنانے کا سوچا تو میری توقعات کے برعکس انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ مجھے حیرت تو ہوئی کیونکہ میں نے بچپن سے لے کر آج تک امی کو ایک مہربان مسیحا کے روپ میں دوسروں کے کام آتے اور مذہب اور نسل سے بالاتر ہو کر صرف انسانیت کی خدمت میں مگن دیکھا تھا۔ اپنی ملنسار اور حلیم طبیعت کے باعث وہ اپنے... مریضوں میں اور ساتھی اسٹاف میں بہت مشہور تھیں، یہاں تک کہ کتنی ہی بار ایسا ہوتا تھا کہ ڈسچارج ہونے کے بعد مریض خاص طور پر امی سے ملنے اور ان کا شکریہ ادا کرنے ہمارے گھر آتے تھے۔ اس وقت مجھے فخر ہوتا کہ میں ایسی ماں کی بیٹی ہوں جس سے لوگ اتنے متاثر ہیں۔ خود مجھے بھی وہ اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ مستحق لوگوں کی بے لوث خدمت کرنے کی تلقین کیا کرتیں، ان کی اسی تربیت کے زیر اثر میرے اندر بھی خدمت اور ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی جذبے سے سرشار ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میرا ارادہ بھی امی کی طرح نرس بننے کا تھا مگر امی کے منع کرنے پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھے صاف کہا کہ میں نرس بننے کا خیال ذہن سے نکال دوں اور اگر انسانیت کی خدمت ہی کرنی ہے تو کوئی اچھی سی این جی او جوائن کرلوں۔ اس وقت میں نے ان کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ میں اپنے امتحانوں میں الجھی ہوئی تھی مگر اس کے کچھ عرصے بعد جب میں نے اخبار میں ایک معتبر نرسنگ اسکول میں ایڈمیشنز شروع ہونے کی خبر پڑھی تو مجھے اپنا دیرینہ خواب پایہ تکمیل تک پہنچتا محسوس ہوا۔

میں اگلے ہی روز جا کر فارم وغیرہ لے آئی اور پُر کر کے خوشی خوشی امی کے پاس سائن کروانے لے گئی مگر اس وقت مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب سدا انسانیت کی خدمت کا درس دینے والی میری امی نے سختی سے انکار کرتے ہوئے وہ فارم اٹھا کر اپنی الماری میں لاک کر دیا۔ اس روز میں نے پہلی دفعہ امی سے اونچی آواز میں بات کی۔ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ امی خود بھی نرس ہوتے ہوئے مجھے کیوں یہ پیشہ اپنانے سے روک رہی تھیں۔ شاید اس میں کمائی کے مواقع کم تھے اور محنت زیادہ تھی اور پھر اس پیشے کو اپنانے کے بعد آپ کو اپنا سکھ چین سب دکھی انسانیت کی خدمت میں تیاگ دینا پڑتا ہے مگر مجھے کبھی بھی اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کیونکہ میں نے تو آنکھ کھولتے ہی اپنی امی کو فرشتے کے روپ میں سب کے کام آتے دیکھا تھا بلکہ امی کی چند گنی چنی نرس سہیلیاں بھی انہی کی طرح حلیم الطبع اور خدمت کے جذبے سے سرشار تھیں۔

رات کے سناٹے میں اچانک امی کی گاڑی اسٹارٹ

ہونے کی آواز آئی تو میں اپنے خیالات کے بھنور سے نکل آئی۔ میں نے گھڑی کی جانب دیکھا تو وہ پونے بارہ کا اعلان کر رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں کتنی ہی دیر سوچوں میں گم رہی تھی، شاید تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ میں جلدی جلدی بستر سے اٹھی تو نقاہت کے مارے چکر سا آ گیا۔ میں گزشتہ رات سے بھوکی تھی، امی سے میری بحث کل شام کی چائے پر ہوئی تھی اور تب سے میں اپنے کمرے میں بند تھی۔ پچھلی رات تو کسی نہ کسی طرح کمرے میں پڑے چپس اور بسکٹس کھا کر گزارا کر لیا تھا مگر آج تو بھوک نے میرے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ دروازہ کھول کر میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کچن کی طرف بڑھی۔ کچن میں اندھیرا تھا اور اوون پر کھانا تیار حالت میں ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔ امی نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے دل میں شرمندگی کی ایک لہر سی اٹھی مگر میں نے اسے دبا دیا۔

اب کھانا کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ورنہ امی بھانپ لیتیں۔ اسی لیے فریج کھول کر دودھ کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں دودھ کا پورا گلاس چڑھا گئی۔ دوسرا گلاس بھر کر ابھی ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ کھٹ کی آواز کے ساتھ کچن میں روشنی پھیل گئی۔ میں بری طرح سے اچھل پڑی پھر کچن کے دروازے پر امی کو کھڑا دیکھ کر دودھ کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ کھسیاہٹ کے مارے مجھ سے کچھ نہ بن پڑا تو میں ان کی طرف پیٹھ کر کے بے مقصد فریج کا دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ دل ہی دل میں خود کو بے نقط سنائیں کہ واہ ثمن بی بی، بس یہی تھی تمہاری ضد اور اپنی منزل کو پالینے کا جنون؟ ایک ہی دن میں بادِ مخالف کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ چلی ہو انسانیت کی خدمت کرنے!

مجھے کھٹر پٹر کی آواز آئی تو میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ امی کھانا گرم کر رہی تھیں، میں دم سادھے اسی پوزیشن میں کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے کھانا سرو کر کے مجھے آواز دی۔ نجانے کیوں میں امی کو انکار نہیں کر سکی اور فریج بند کر کے کسی روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی میز کی طرف آئی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ امی نے میری پلیٹ میں کھانا نکالا پھر خود بھی چپ چاپ کھانا کھانے لگیں۔ ہم دونوں نے بالکل خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانا ختم کر کے میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو امی نے اشارے سے منع کیا اور برتن سمیٹنے لگیں۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں کافی کا مگ تھامے لاؤنج میں بیٹھے تھے، امی کسی گہری سوچ میں ڈوبی بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ خاموش تو میں بھی تھی مگر مجھے امی کے اس گمبھیر انداز سے بے چینی ہو رہی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں بے چین ہو کر کچھ بولتی، امی گویا ہوئیں۔ ”یاد ہے ثمن، تمہاری ساتویں سالگرہ پر میں نے تمہیں خرگوشوں کی ایک جوڑی گفٹ کی تھی؟“

امی کے اس بے موقع سوال پر میں اپنی حیرت نہیں چھپا سکی اور بولی۔ ”جی امی یاد ہے! مگر اس وقت آپ کو اچانک وہ خرگوش کہاں سے یاد آ گئے؟“

امی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ”پھر تو تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کی مادہ نے ایک بار بچے کو جنم دیا تھا مگر نر نے ہماری لاعلمی میں اس ننھے منے بچے کو مار دیا تھا۔ تم کتنا روئی تھیں اور پھر تم نے غصے میں اس نر خرگوش کو لے جا کر جنگل میں چھوڑ دیا تھا؟“

میرے دل میں اس واقعے کو یاد کر کے ایک ٹیس سی اٹھی اور میں نے خفگی سے امی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”امی آپ کو مجھے اذیت دینے میں مزہ آتا ہے کیا؟ کیوں مجھے وہ واقعہ یاد دلا رہی ہیں؟“

مگر امی میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولتی رہیں۔ ”اور یاد ہے ابھی دو سال پہلے ہی تم نے کتنے شوق سے بلبل کی جوڑی پالی تھی۔ ایک دن ان کے پنجرے کی صفائی کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر تمہارے ہاتھ سے اس کا انڈا ٹوٹ گیا تھا جس میں موجود نامکمل بچے کو دیکھ کر تمہاری حالت رو رو کر غیر ہو گئی تھی اور اس کے بعد تم پورے دو دن بخار میں مبتلا رہیں۔“

امی کے یاد دلانے پر وہ منظر دوبارہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اس واقعے کے بعد سے میں نے خود سے یہ عہد کر لیا تھا کہ کبھی پالتو جانور نہیں پالوں گی۔ میرے لیے یہ سب سہنا بہت اذیت ناک تھا مگر نجانے امی کو آج کیا ہو گیا تھا جو مجھے پے در پے ایسی باتیں یاد دلا کر مزے لے رہی تھیں۔ میں نے غصے سے کافی کا مگ اٹھا کر ایک طرف رکھا اور وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ امی نے میرا ارادہ بھانپ کر تحکمیہ لہجے میں کہا۔ ”بیٹھ جاؤ ثمن، تم یہی سوچ رہی ہو گی ناں کہ مجھے اچانک کیا ہو گیا ہے اور کیوں تمہیں میں وہ قصے یاد

دلا رہی ہوں جنہیں تم بھلا دینا چاہتی ہو۔ میں تمہیں اس کی
وجہ بھی بتاتی ہوں مگر وعدہ کرو کہ تم یہ سب صبر وضبط سے سنو
گی۔" میں نے بیچارگی سے امی کی طرف دیکھا اور واپس
بیٹھ گئی۔ یہ میری طرف سے رضامندی کا اظہار تھا۔

امی چند لمحے خاموش رہیں جیسے کہنے کے لیے ہمت
مجتمع کر رہی ہوں پھر بولیں۔ "سب سے پہلے یہ سن لو کہ
مجھے تمہارے نرس بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ مجھے یہ
جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ تم بھی اس عظیم پیشے کو اپنا کر
انسانیت کا کام آنا چاہتی ہو لیکن مجھے ایسا لگتا ہے نرسنگ کا
پیشہ تمہارے لیے ناموزوں ہے۔" میں نے سوالیہ نگاہوں
سے ان کی طرف دیکھا مگر وہ بات جاری رکھتے ہوئے
بولیں۔ "جب میں ایران سے نرسنگ کی تعلیم مکمل کر کے
یہاں نوکری کی تلاش میں آئی تھی تو جوش وولولے سے بھرپور
تھی۔ میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ کوئی اسپتال جوائن
کر کے جلد از جلد خلق خدا کے کام آؤں اور اللہ اور اس کے
رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق ایک با مقصد زندگی
گزاروں۔ بہت جلد نیویارک کے ایک نامور اسپتال میں
نوکری مل گئی اور میں نے وہاں بطور نرس اپنی خدمات انجام
دینی شروع کر دیں۔ ابتداء میں مجھے نئی زبان سیکھنے اور نئے
ماحول میں گھلنے ملنے میں کچھ مشکل ہوئی مگر اپنے سینیئرز کے
شفقت آمیز رویے اور ساتھیوں کے تعاون سے میں رفتہ
رفتہ اس نئے ملک اور نئی روٹین کی عادی ہو گئی۔

میں ہنسی خوشی اپنی نوکری جاری رکھی ہوئی تھی۔ انتظامیہ
... میرے کام سے بہت خوش تھی اور اس نے مجھے ٹریننگ پر
شکاگو بھی بھیجا جہاں سے آنے کے بعد میری تنخواہ میں اضافہ
کر دیا گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری تمہارے ابو
سے تازہ تازہ ملاقات ہوئی تھی، وہ ایکسیڈنٹ کے بعد گزشتہ
ایک ماہ سے اسپتال میں داخل تھے اور وطن اور اپنوں سے
دوری کا غم مشترک ہونے کی وجہ سے میں ان سے عجیب سی
اُنسیت محسوس کرنے لگی تھی۔ اکثر میں آف ہونے کے بعد
ہوسٹل واپس جانے کے بجائے بیٹھی ان سے باتیں کرتی
رہتی۔ ایک دفعہ ڈیوٹی آف ہو جانے کے بعد میں ان سے
باتوں میں اتنی محو ہوئی کہ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔
مجھے وقت کا احساس ہوا تو میں ان کو خدا حافظ کہہ کر جانے
کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت اسپتال میں سناٹا چھایا
ہوا تھا، میں وارڈ سے نکل رہی تھی جب میں نے ایک جانب
کمبل کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی بنی دیکھی۔ تجسس کے
مارے میں نے آگے بڑھ کر کمبل کو ذرا سا اٹھا کر دیکھا تو اس
کے اندر ایک چھوٹا سا وجود کلبلایا۔ میں یہ دیکھ کر بھونچکی رہ گئی
کہ اس میں ایک بہت چھوٹی سی نومولود بچی لیٹی ہوئی تھی۔
۔ اس کی جلد جھلسی ہوئی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شقی
القلب نے اس معصوم کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈبکی دی
ہو۔ میں نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ دھیمے دھیمے
سانس بھی لے رہی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر میں بتا سکتی
تھی کہ وہ ایک پری میچور بے بی تھی۔

میرے پیچھے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے پلٹ
کر دیکھا تو انجلا کھڑی تھی، وہ میری سینیئر ہونے کے ساتھ
ساتھ بہت اچھی دوست بھی تھی۔ اس نے اچک کر میرے
ہاتھ میں دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ میں
جذبات کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی اس لیے کچھ کہنے کی
بجائے کمبل کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ بچی کو دیکھ کر اس
کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا گزر گیا مگر پھر وہ فوراً خود کو
سنبھال کر بولی۔ "ہاں یہ ابارٹڈ بے بی ہے۔ اس کی ماں نے
ابارشن (اسقاط حمل) کروایا ہے۔" میں کچھ سمجھ نہ سکی۔ "مگر یہ
تو زندہ ہے اور سانس بھی لے رہی ہے اور پھر یہ اس طرح
جھلسی ہوئی کیوں ہے؟" انجلا کندھے اچکا کر بے پروائی سے
بولی۔ "بے بی تم بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ اکثر خاص
کیسز میں ابارٹڈ بچے زندہ بھی پیدا ہوتے ہیں مگر ان کا بعد
میں زندہ رہنا ناممکن ہوتا ہے اسی لیے انہیں ایک طرف مرنے
کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور رہی اس کی جلی ہوئی جلد کی بات
تو تم خود بھی جانتی ہو کہ آج کل اسقاط حمل کروانے کے لیے
مائیں سیلائن (seline) کے انجکشن لگوا لیتی ہیں۔ یہ محلول
ماں کی کوکھ میں بنتے بچے تک پہنچتا ہے۔ بچہ اس محلول میں
سانس لیتا ہے تو اس کے پھیپھڑے جل جاتے ہیں اور اس کی
جلد جھلس جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ سسک سسک کر کوکھ میں ہی
دم توڑ دیتا ہے۔ یہ بچی سخت جان تھی جو یہ وار سہہ گئی مگر اب
اس کو بچایا نہیں جا سکتا کیونکہ سیلائن تو بہرحال اس پر اثر انداز
ہو چکا ہے اور قانون بھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا
کہ ہم ایک ابارٹڈ بچے کی جان بچائیں۔ وہ ان چاہا بچہ جس
کی ضرورت اس کی ماں کو بھی نہیں ہے۔"

انجلا کے منہ سے یہ سب سن کر مجھے وہ سارے
لیکچرز یاد آنے لگے جس میں ہمیں ابارشن کے مختلف طریقے
سمجھائے گئے تھے۔ ایک طریقہ سیلائن انجکشن کا بھی تھا اور
پیکنگ میں نے اس میں وہی باتیں جانی تھیں جو انجلا نے

ڈبرائی تھیں مگر اس عمل کا ایسا دردناک نتیجہ میں نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طریقے سے یہ ننھی جانیں اتنی کربناک اذیت سے گزرتی ہوں گی۔ اینجلا تو اپنی بات مکمل کر کے چلی گئی مگر میں اس نومولود بچی کو تھامے کتنی دیر تک سسکتی رہی۔ اس کی جلی ہوئی شکل دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی اس لیے میں نے اسے کمبل سے ڈھک دیا تھا۔ اس لمحے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے آس پاس آگ کے شعلے رقصاں ہوں اور ان میں اس معصوم جیسے کئی اور جسم اس کا ایندھن بن رہے ہوں۔ رو رو کر فریاد کر رہے ہوں، اپنے خالق سے انصاف کی بھیک مانگ رہے ہوں۔ مجھے لگا بس اب کچھ ہی دیر میں ان معصوموں کی دلخراش چیخوں سے زمین پھٹ جائے گی اور انسان اپنی تمام درندگی سمیت اس میں دفن ہو جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور میں کتنی ہی دیر اس بچی کو تھامے بے آواز روتی رہی۔

کچھ دیر بعد کمبل سے آہستہ آہستہ زندگی کی حرارت معدوم ہوگئی۔ میں نے ہلکا سا کمبل سرکایا، دو چھوٹے چھوٹے ادھ جلے ہونٹ نظر آئے اور ان پر پھیلی فرشتوں سی مسکراہٹ! موت نے ننھی پری کو اس درد و کرب کے جہنم سے نجات دلوا دی تھی۔ اب تک تو فرشتے اسے اپنے پروں میں سنبھال کر جنت کے باغوں میں بھی پہنچا چکے ہوں گے، جہاں حوروں نے لپک کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہوگا اور پروردگار کے حضور سر جھکا کے التجا کی ہوگی کہ ایسا بھرپور حسن انہیں بھی عنایت ہو۔ میں نجانے کتنی ہی دیر تک اس بچی کے بے جان لاشے کو سینے سے لگائے یہ سب سوچ کر روتی رہی، پھر میں نے ایک فیصلہ کر کے اسے احتیاط سے ایک جانب لٹا دیا۔“

اتنا بتا کر امی کچھ دیر کو رکیں تو میرا انہماک ٹوٹا۔ اسی وقت مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے دھیرے سے اپنے چہرے کو چھوا تو اندازہ ہوا کہ بے خبری میں آنسو میری آنکھوں سے لڑھک لڑھک کر میرا چہرہ بھگو رہے تھے۔ میں نے ٹشو پیپر سے آنسو پونچھے تو امی نے غور سے میری جانب دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔ چند لمحے کمرے میں ایسے ہی سناٹا رہا پھر امی نے اپنا سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا۔ ”اگلے روز میں نے انتظامیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ انہوں نے مجھے بتیرا روکنے کی کوشش کی، اینجلا جو اس کے پس منظر سے واقف تھی اس نے مجھے بہت سمجھایا کہ ایسا ہونا تو امریکا اور دنیا بھر کے تمام اسپتالوں میں عام ہے اور میں ذرا سی بات کو وجہ بنا کر اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر نہ جاؤں۔ میں نے تمہارے ابو سے بھی مشورہ کیا، انہوں نے بھی سب سننے کے بعد یہی رائے دی کہ مجھے ایسی جگہ سے فی الفور رخصت ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے وہ نوکری چھوڑ دی اور دوسرے اسپتالوں میں اپلائی کر دیا۔ کچھ ہی عرصے میں مجھے اپنے تجربے اور ماضی میں بہترین کارکردگی اور نیک چال چلن رکھنے کی بنیاد پر نیو یارک کے ہی ایک اور بہترین اسپتال میں بطور ہیڈ نرس نوکری مل گئی۔ یہاں میری تنخواہ بھی ڈگنی تھی اور دیگر مراعات بھی شامل تھے۔

انہی دنوں میں نے تمہارے ابو سے شادی بھی کر لی اور ہم لوگ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ منتقل ہو گئے۔ یہ تمہاری پیدائش کے کچھ عرصے بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک میں اس اسپتال میں اپنی دھاک بٹھا چکی تھی اور وہاں ہر کوئی میری فرض شناسی اور خدمت گزاری کے گن گاتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے پہلے دن سے نظر رکھی تھی کہ کہیں یہاں پر بھی تو ابارشنڈ بچوں کے ساتھ پچھلے اسپتال والی پالیسی تو نہیں اختیار کی جاتی تھی مگر مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ یہاں پر ایسا کوئی کیس دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ یہاں پر ڈاکٹرز کو انتظامیہ کی جانب سے سخت تاکید تھی کہ اسقاط کے لیے سیلائن انجکشن کا استعمال ہرگز نہ کریں۔

اس روز صبح ہی سے آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی طوفانی بارش شروع ہونے کی پیشگوئی تھی۔ میں معمول کے مطابق وارڈز کا راؤنڈ لے رہی تھی اور مریضوں کے حال چال دریافت کر رہی تھی جب میرے پاس یوجانا می ایک نئی نئی جوائننگ کرنے والی نرس ہانپتی کانپتی آئی اور مجھے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ میں اس کے انداز سے گھبرا کر اس کے ساتھ ہی چل پڑی۔ وہ مجھے نرسری سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جہاں ہم بچوں کے ڈائپرز اور دیگر ادویات وغیرہ رکھتے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے کونے میں رکھے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس طرف دیکھا تو ٹیبل کے اوپر سفید تولیے میں لپٹی کوئی چیز کلبلا رہی تھی۔ اچانک ماضی کا وہ اذیت ناک حادثہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ میں لپک کر اس ٹیبل تک پہنچی تو میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔ تولیے میں ایک گہری گلابی رنگت والا نوزائیدہ بچہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ بار بار سانس لینے کی کوشش

میں اس کے سینے میں ننھا سا گڑھا پڑ رہا تھا اور اس کا جسم اکڑ رہا تھا۔ تجربے کی بنیاد پر میں بغیر اسٹیتھس اسکوپ لگائے اور وزن کیے بغیر بتا سکتی تھی کہ اس بچے کے پھیپھڑے نامکمل رہ گئے تھے اور اس کی عمر کم از کم بھی تئیس ہفتے تھی۔ پوجا تھوک نگلتے ہوئے جلدی جلدی بتانے لگی۔ ''یہ اس سات نمبر والی طاہرہ کا بچہ ہے۔ اسے کینسر ہے اور وہ کئی بار کیموتھیراپی کے عمل سے گزر چکی تھی جب اسے پتہ چلا کہ وہ تین ماہ کی حاملہ ہے۔ ڈاکٹرز نے تجویز کیا کہ وہ اسقاط کروا لے مگر وہ نہ مانی لیکن جب انہوں نے خبردار کیا کہ اس کے پاس کیموتھراپی کے نتیجے میں معذور یا انتہائی بے ڈھنگے جسمانی خدوخال رکھنے والے بچے کی پیدائش کے امکانات روشن ہیں تو وہ ڈر گئی اور اس نے گھر والوں سے مشورہ کر کے اسقاط کروالیا۔ میڈم اس وقت میں وہاں موجود تھی جب یہ پیارا سا بچہ اس دنیا میں آیا۔ یہ نارمل بچوں کی طرح رویا بھی اور دیکھیں یہ ہاتھ، پیر بھی چلا رہا ہے۔ اس جیتے جاگتے بچے کو میں کیسے سرد خانے کے منتظم کے حوالے کر دیتی؟'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے پوجا کی آواز رندھ گئی۔

میں نے اس بچے کی جانب دیکھا جو سانس لینے کی کوشش میں بار بار جھٹکے لے رہا تھا۔ ہر جاندار کی طرح اسے بھی جینے کی چاہ تھی، وہ بھی جینے کے ازلی حق کے ساتھ اس دنیا میں آیا تھا۔ اس کا وزن کسی طرح بھی دو پاؤنڈ سے کم نہ تھا یعنی دیگر الفاظ میں وہ کمزور ہونے کے علاوہ ایک مکمل نارمل بچہ تھا۔ میں نے پوجا کو تسلی دی اور اس بچے کو لے کر گائنی وارڈ کی جانب بھاگی جہاں اس ننھے فرشتے کی زندگی کو بچانے کا بندوبست کیا جاسکتا تھا۔ میں دیوانہ وار بھاگتی ہوئی وارڈ کے اندر پہنچی تو اسٹاف نے مجھے حیرت سے دیکھا مگر سب مجھے جانتے تھے اسی لیے کسی نے مجھے نہیں ٹوکا۔ میں دستک دیے بغیر ہی سیدھی ڈاکٹر نارمن کے کمرے میں داخل ہو گئی جہاں اتفاق سے اس وقت اسپتال کے سب سے سینیئر سرجن اور بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے ایک ڈاکٹر اسمتھ بھی موجود تھے۔

دونوں حضرات یقیناً کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھے۔ مسٹر اسمتھ کے چہرے پر ایک لمحے کو برہمی کے آثار نمودار ہوئے مگر مجھے دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ڈاکٹر نارمن میرے ہاتھ میں زندگی کے لیے جنگ لڑتے بچے کو دیکھ کر بھاگتا ہوا آیا اور بستر پر لٹا کر جلدی جلدی اس کی ہارٹ بیٹ اور بلڈ پریشر چیک کرنے لگا۔ ڈاکٹر اسمتھ بھی

### راغب مراد آبادی

مراد آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اصل نام سید جعفر حسین تھا۔ بچپن اور لڑکپن کا زمانہ مراد آباد، شملہ اور دہلی میں گزارا۔ انہوں نے بی اے، ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات طبیہ کالج دہلی سے پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سپلائی کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور محکمۂ محنت حکومتِ پاکستان کی ملازمت اختیار کرلی۔ 1980ء میں جب ریٹائر ہوئے تو وہ حکومت سندھ میں افسر تعلقات عامہ تھے۔ وہ مسلم لیگ کے فعال رکن تھے۔ انہوں نے شملہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان دنوں میں انہیں حضرت قائداعظم محمد علی جناح کو دیکھنے اور ان کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ قیام پاکستان کے بعد وزیراعظم لیاقت علی خاں نے وفاقی حکومت کے ملازمین کو منظم کرنے کا فریضہ سونپا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کم و بیش پچیس کتابیں لکھیں جن کے موضوعات نعت، نظم، غزل اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ شاعری میں وہ شاعر مشرق علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ دیگر تصانیف میں شامل ہیں۔ (1) گل صد برگ (1942ء) (2) عزم وایثار (3) ہمارا کشمیر... (4) نذر شہدائے کربلا.... (5) تحریک (6) ترغیب (7) مدحت خیر البشر (8) محنت کی ریت۔ جون 1996ء میں انہیں پاکستان آرٹس کونسل کی پبلی کیشن کمیٹی نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے نشان سپاس پیش کیا۔ ان کا تخلص ان کے ایک دوست بھٹناگر نے تجویز کیا تھا۔

مرسلہ: زاہد سلیم، کراچی

اٹھ کر ہمارے پاس آ کھڑے ہوئے تھے اور تشویش زدہ سے لہجے میں پوچھنے لگے۔ ”مائی گاڈ، کیا ہوا اس نوزائیدہ کو؟ مجھے لگتا ہے اس کے پھیپھڑے ٹھیک کام نہیں کر رہے۔ نارمن تم اسے فوراً انکیوبیٹر میں شفٹ کرو۔ اور ہاں سسٹر فاطمہ یہ بچہ کیا اسی اسپتال میں پیدا ہوا ہے؟“

ڈاکٹر اسمتھ کو اپنی طرف متوجہ پا کر میں نے جلدی جلدی انھیں وہ ساری کہانی سنائے جو پوجا کی زبانی مجھے پتا چلی تھی۔

پس منظر جاننے کے بعد نجانے کیا ہوا کہ بچے کی جان بچانے کے لیے تیزی سے کارروائی کرتے ڈاکٹر نارمن کے ہاتھ رک گئے اور وہ چپ چاپ ڈاکٹر اسمتھ کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں ڈاکٹرز کی جانب دیکھا اور بے اختیار چلائی۔ ”کیا ہوا ڈاکٹر نارمن؟ اس بچے کو جلد از جلد طبی امداد کی ضرورت ہے ورنہ یہ مر جائے گا۔“

”یہی اس کے مقدر میں لکھا ہے۔“ ڈاکٹر اسمتھ کی سرد آواز کمرے میں گونجی تو میں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

”کیا بات کر رہے ہیں آپ ڈاکٹر اسمتھ، آپ تو مسیحا ہیں۔ آپ نے تو جیسے بھی بن پڑے انسانی جانوں کو بچانے .... کا حلف اٹھایا تھا پھر......“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہوں نے کاٹ دی۔ ”سسٹر فاطمہ یہ نارمل کیس نہیں بلکہ ابارشن کا کیس ہے۔ قانون ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایسے ان چاہے اور ضائع کیے گئے بچے کی جان بچائیں۔“

میں یہ سن کر تڑپ اٹھی۔ ”مگر ڈاکٹر اس میں اس معصوم بچے کا کیا قصور ہے؟ کیا یہ قانون اس سے پوچھ کر بنایا گیا تھا؟ میں پوچھتی ہوں کہ دنیا کا کون سا قانون یہ اجازت دیتا ہے کہ مرتے ہوئے انسان کو یونہی مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے کہ ایک نہ ایک دن وہ مر ہی جائے گا۔ میں مانتی ہوں کہ یہ ابارٹڈ بے بی ہے مگر یہ بچہ مرا ہوا پیدا نہیں ہوا، یہ ابھی زندہ ہے اور اسی لیے یہ ہمارا فرض ہے۔“

”سسٹر فاطمہ آپ ہمیں ہمارے فرائض یاد دلانے اور قانون پڑھانے کی کوشش مت کریں۔“ اس مرتبہ ڈاکٹر اسمتھ کے لہجے میں درشتی تھی۔ ”براہ مہربانی آپ اس بچے کو یہاں سے اٹھائیں اور سرد خانے کے منتظم کے حوالے کر دیں۔“ میں نے آخری امید کے طور پر ڈاکٹر نارمن کی طرف دیکھا تو وہ بھی بیچارگی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ میں نے بھرائی ہوئی... آنکھوں سے اس ننھے سے انسانی وجود کی جانب دیکھا جو سانس

سینے کے پنجرے میں سر پٹخ رہا تھا اور پھر مزید کوئی بحث کیے بغیر اسے سینے سے لگائے کمرے سے باہر آ گئی۔ اسپتال میں وہی معمول کی چہل پہل تھی مگر میرا دل رو رہا تھا۔

وہ بچہ میرے سینے سے چمٹا ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُف! وہ آنکھیں آج بھی میرے خوابوں میں آ کر مجھے پریشان کرتی ہیں۔ ان کالی سیاہ آنکھوں میں ہزاروں شکوے مچل رہے تھے۔ ماں کی بے اعتنائی کا شکوہ، مسیحاؤں کی نارسائی کا شکوہ، زمانے سے ٹھکرائے جانے کا شکوہ! میں اسے یوں ہی سینے سے بھینچے اسی کمرے میں آ گئی جہاں پوجا بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ لپکتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ ”کیا ہوا سسٹر فاطمہ، آپ اسے واپس کیوں لے آئیں؟ او گاڈ! یہ تو ابھی تک ویسے ہی رک رک کر سانس لے رہا ہے۔“ میں نے سسکتے ہوئے اسے بتایا کہ ڈاکٹر اسمتھ نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کیا کہا ہے۔

یہ سن کر وہ بھونچکی رہ گئی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ بڑی مشکلوں سے اس کے منہ سے یہی جملہ نکل سکا۔ ”تو یہ بچہ؟“

اس مرتبہ میں نے..... حتی المقدور آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے پوجا۔ جب اس کی ماں کو ہی اس کی ضرورت نہیں ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنی ڈیوٹی کرو۔“

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا مگر مجھے اپنی آواز خود ہی کھوکھلی محسوس ہوئی۔ پوجا نے بے یقینی سے میری جانب دیکھا اور اپنے آنسو چھپاتی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں ضبط کے تمام بندھن چھوڑ بیٹھی اور اس بچے کو سینے سے چمٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آہ! کتنی بے بس تھی میں، انسانیت کی خدمت کرنے کے اونچے اونچے دعوے کرنے والی آج کتنی مجبور تھی کہ ایک ننھا بچہ اس کے ہاتھوں میں لیٹا بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اور وہ اسپتال کی انتظامیہ کو اس کی جان بچانے پر آمادہ بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے اپنے پیشے سے کراہیت محسوس ہوئی۔

اچانک میری گود میں سانس کے لیے مچلتے بچے کی لرزش میں تیزی آ گئی۔ اس کا جسم اب بری طرح جھٹکے لے رہا تھا جیسے دیا بجھنے سے پہلے آخری کوشش کے طور پر زور سے پھڑپھڑاتا ہے۔ میں نے اس بچے کے جسم پر سے کمبل ہٹا دیا اور اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے گئی۔ ”اللہ اکبر اللہ

اکبر اشھد ان لا الہ الا اللہ" یہ اعتراف ہے اس دو جہانوں کے مالک کی بڑائی کا جو اس کی، میری اور ہم سب کی زندگیوں کا مالک ہے۔ اذان سننے کے بعد جیسے اس کے مچلنے میں ٹھہراؤ سا آگیا، جیسے اسے یقین ہوگیا ہو کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں میں جانے والا ہے جہاں کسی درد اور غم کا شائبہ تک نہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی سانسیں دھیمی پڑنے لگیں، میں رندھی ہوئی آواز میں اس کے کان میں بولتی رہی۔ "مما تم سے بہت پیار کرتی ہیں بیٹا، جاؤ بچے تمہیں اللہ کے حوالے کرتی ہوں۔ وہاں تم ہمیشہ خوش رہو گے میری جان، بس اپنی مما کو معاف کر دینا بیٹا، وہ انجان ہیں۔ میرا پیارا بیٹا، میرا بہادر بیٹا!" یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کی دھڑکنیں معدوم ہوتے ہوتے بالکل تھم گئیں اور اس کے پھولتے پچکتے سینے کو قرار آگیا۔ میں نے اس کے ماتھے کو آخری بار چوما اور پھر اس ننھی سی لاش کو کمبل میں لپیٹ کر پتھرائے ہوئے دل کے ساتھ سرد خانے پہنچا دیا۔"

امی اپنی بات مکمل کر کے سسکنے لگیں جبکہ میں تو پہلے ہی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ کیا واقعی انسان اتنا شقی القلب ہو سکتا ہے؟ میں مانتی ہوں کہ کبھی ایسی مجبوری ہو جاتی ہے کہ ابارشن کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا مگر کسی مخصوص کیس میں کوئی ایسا بچہ دنیا میں آجائے جسے بچایا جانا ممکن ہو تو اسے مرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ ان چاہا ہوتا ہے؟ کیا وہ اپنی مرضی سے کوکھ چنتا ہے؟ اگر ابارشن ناگزیر نہ ہو تو پھر کیوں ان ننھی جانوں کو محض اپنے مفاد کے لیے ضائع کر دیا جاتا ہے؟ اسے اس دنیا میں آنے دیں اور کسی مستحق جوڑے کے حوالے کر دیں یا ایسے کسی معتبر ادارے کو دے دیں جو اس کی مناسب پرورش کر سکے۔ میرے ذہن میں یہ سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ امی نے دوبارہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس بار میں نے استعفیٰ نہیں دیا کیونکہ میں سمجھ چکی تھی کہ یہ اس کا حل نہیں ہے بلکہ مجھے ان واقعات کی روک تھام کے لیے عملی اقدامات کرنے پڑیں گے۔ یہ خیال مجھے اکثر بے چین کر دیتا کہ روزِ محشر جب یہ دونوں بچے مجھ سے سوال کریں گے کہ میں نے سب جانتے بوجھتے ان کو اور ان جیسے دوسرے بچوں کو بچانے کے لیے کیا کیا تو میں انھیں کیا جواب دوں گی۔

میں نے اس کی ابتداء اپنے اسپتال سے کی، پوجا اور دیگر نرسز سے میں نے ان کے تجربات پوچھے اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ اس طرح کے کیسز کتنے عام ہیں کہ ابارٹڈ بچے اکثر نہ صرف سانس لے رہے ہوتے ہیں بلکہ اگر کوشش کی جائے تو انھیں بچایا بھی جا سکتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اتنے عرصے کی نوکری اور اتنے ابارشنز ہینڈل کرنے کے باوجود میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا تھا اسی لیے میں اس حقیقت سے اب تک ناواقف ہی رہی تھی۔

پوجا نے مجھے بتایا کہ بھارت میں تو یہ معمول ہے کہ پانچویں مہینے میں جنس کا تعین ہونے کے بعد لڑکی ہونے کی صورت میں عورتیں اپنی مرضی سے یا سسرال والوں کے دباؤ میں آکر ابارشن کروا لیتی ہیں اور زیادہ تر یہ بچیاں زندہ ہی پیدا ہوتی ہیں کیونکہ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ کوکھ میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں سخت جان ہوتی ہیں۔ یہ سن کر میں تھرا اٹھی کہ جس بھارتی اسپتال میں پوجا نوکری کیا کرتی تھی انہوں نے یہ طریقہ اپنایا ہوا تھا کہ وہاں ابارٹڈ بے بی کے زندہ پیدا ہونے کی صورت میں انھیں ایک بالٹی میں ڈال کر اس پر ڈھکن کس دیا جاتا تھا جس میں یہ ننھی جانیں گھٹ گھٹ کر مر جایا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک اور غیر انسانی طریقہ یہ تھا کہ ابارشن کے بعد ایسے مخصوص بچوں کے دل میں زہر کا انجکشن لگا دیا جاتا تھا تاکہ وہ اس دنیا سے جلد از جلد رخصت ہو جائیں۔

دیگر کئی نرسز نے مجھے بتایا کہ وہ ابارشن کے کیسز ہینڈل کرتے ہوئے دعا کرتی ہیں کہ بچہ مرا ہوا ہی پیدا ہو کیونکہ سانس لیتے اور جیتے جاگتے بچوں کو سرد خانے پہنچانا ایک انتہائی تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ یہ وہ بچے ہوتے ہیں جنھیں یہ نہیں پتا ہوتا کہ وہ اس دنیا میں کیوں لائے گئے، یہ نہیں جانتے کہ ماں کی آغوش کی گرمی کیا ہوتی ہے، ان کی سالگرہ کبھی نہیں منائی جائے گی۔ یہاں تک کہ ان بدنصیبوں کو نام تک نصیب نہیں ہوتا۔ ایک ماں تو اس کربناک عمل سے زندگی میں ایک آدھ بار ہی گزرتی ہے مگر نرسز کو اپنی زندگی میں کئی مرتبہ ایسے کیسز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک ہی کمرے میں دو پری چہرہ بے بی موجود ہوتے ہیں، ایک ابارٹڈ اور دوسرا نارمل کیس۔ ڈاکٹرز اس بچے کو بچانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں جو نارمل کیس ہوتا ہے، من چاہا ہوتا ہے۔ ابارٹڈ بے بی کیونکہ ٹھکرایا ہوا اور ان چاہا ہوتا ہے اسی لیے وہ ایک طرف پڑا اپنی سانسیں پوری کرتا رہتا ہے اور اکثر تین چار گھنٹوں تک موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد دم توڑ دیتا ہے۔ یہ سب

جاننے کے بعد میرا دل چاہتا تھا کہ میں نرس کی نوکری چھوڑ دوں۔ اس سفید، بے داغ یونیفارم کے پیچھے کیسی داغدار حقیقت چھپی ہوئی تھی اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا۔

اسی زمانے میں تمہارے ابو چل بسے اسی لیے مجھے مجبوراً اپنی نوکری جاری رکھنی پڑی مگر میں اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا تہیہ کر چکی تھی اسی لیے میں نے اپنی ہم خیال ساتھی نرسوں کی مدد سے ایک تنظیم بنانے کا سوچا جو ان بچوں کی جان بچانے کے لیے عملی اقدامات کر سکے۔ ہم نے چند این جی اوز سے رابطہ کیا جو اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتی تھیں۔ انہوں نے ہمارے اس اقدام کو بہت سراہا اور مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے مختلف اسپتالوں میں کام کرنے والی نرسز سے رابطہ کیا اور انھیں اپنی تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ظلم کے خلاف ایسے خیالات رکھنے والی میں اکیلی نہیں تھی۔ میری حمایت میں کئی نرسز اٹھ کھڑی ہوئیں، این جی اوز کے منتظمین کی مدد سے ہم نے کئی اسپتالوں کی انتظامیہ تک رسائی حاصل کی اور کئی سالوں کی انتھک محنت اور لگاتار میٹنگز کے بعد ان میں سے بہت سے اسپتالوں کو اس بات پر قائل کر لیا کہ وہ ایسے ان چاہے نوزائیدہ بچوں کو مرنے کے لیے چھوڑنے کے بجائے ہماری تنظیم کے حوالے کر دیں گے۔ جہاں ہم اسے مکمل طبی امداد دیں گے اور اس کے بعد قانونی طریقے سے متعلقہ این جی او کے حوالے کر دیں گے۔ یہ ساری کارروائی مکمل راز میں ادا کی جاتی، ان اسپتالوں کے نام صیغۂ راز میں رکھے جاتے اور اسپتال انتظامیہ کسی کو جواب دینے کی مجاز نہ ہوتی۔ آہستہ آہستہ ہماری اس تنظیم کا دائرہ کار پھیلتا چلا گیا۔ انٹرنیٹ پر کافی لوگوں نے ہمیں مالی اور اخلاقی مدد کی پیشکش کی یوں میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر، لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

یہ سچ ہے کہ ان بچوں کو بچائے جانے کا تناسب بہت کم ہے۔ ہم دس میں سے بمشکل دو بچے ہی بچا پاتے ہیں... نکہ وہ زیادہ تر نامکمل ہوتے ہیں یا بے انتہا کمزور ہونے کے باعث جی نہیں پاتے ہیں لیکن ایسے بچوں کو ہم بالکل بے نام ونشان نہیں رہنے دیتے ہیں۔ وہ جب تک زندہ رہتے ہیں ہم ان کی مکمل نگہداشت کرتے ہیں اور انھیں بچانے کی جان توڑ کوششیں کرتے ہیں اور بدقسمتی سے اگر انھیں بچا نہیں پاتے تو پھر اسپتال انتظامیہ سے ان کے ماں باپ کی مکمل معلومات لی جاتی ہیں اور اس لحاظ سے ان بچوں کا نہ صرف نام رکھا جاتا ہے بلکہ ان کی آخری رسومات بھی ادا کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بچا لیے جانے والے کئی بچے معزز گھرانوں نے ایڈاپٹ کر لیے ہیں اور آج وہ بچے صحت مند اور نارمل زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ سکون سے اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میں گنگ بیٹھی امی کے منہ سے یہ سب سن رہی تھی۔ یہ سب جاننا میرے لیے تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خوشگوار تھا کہ ان بچوں کی جانیں بچانے کا بیڑا اٹھا کر میری امی نے صرف معاشرے کی ایک ذمہ دار شہری ہونے کا فرض نہیں نبھایا ہے بلکہ اپنے پیشے کی بھی لاج رکھ لی ہے۔ میں بے اختیار اٹھ کر امی سے لپٹ گئی۔ ”امی مجھے معاف کر دیں، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ کس کرب سے گزری ہیں لیکن آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں یہ سب سہہ نہیں پاؤں گی۔ میں ایک بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہوں اور اب تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں نرس ہی بنوں گی اور آپ کی تنظیم میں شامل ہو کر معاشرے سے اس برائی کا خاتمہ کروں گی۔“

آج امی سے کیے گئے اس عہد کو نبھاتے ہوئے میں ایک نرس ہونے کے ساتھ ساتھ امی کی تنظیم کی ایک فعال رُکن بھی ہوں۔ اب تو ہماری کوششوں سے اس کا نیٹ ورک امریکا سے نکل کر دوسرے ممالک تک پھیل گیا ہے اور پاکستان اور بھارت سمیت دیگر ممالک میں بھی ہمارے سرگرم کارکن اسپتالوں سے رابطے میں رہتے ہیں اور جہاں بھی کوئی ایسا کیس رپورٹ ہوتا ہے ہماری ٹیم فوراً وہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں نے ابو کے نام سے پاکستان میں ایک اولڈ ہوم بھی قائم کیا ہے جہاں اولادوں کی جانب سے ٹھکرائے جانے والے بوڑھے والدین کو رہنے کی مفت جگہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دیکھ بھال بھی کی جاتی ہے۔ یہ معاشرے کا ایک اور توجہ طلب المیہ ہے۔

اپنے آس پاس نظر دوڑا کر دیکھیے، کتنے ہی المیے آپ کی ایک نظرِ کرم کے منتظر ہوں گے۔ المیوں کو نظر انداز کرنے سے ہی جرائم جنم لیتے ہیں۔ آپ بھی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر معاملے کو حکومت اور انتظامیہ کی نااہلی کے کھاتے میں ڈالنے کے بجائے آگے بڑھ کر اس کی روک تھام میں اپنا کردار ادا کیجیے۔ یقین جانیے جو مزہ دوسروں کے کام آنے میں ہے وہ دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں۔ اگر یقین نہیں آتا تو خود ہی آزما کر دیکھ لیجیے۔

# کلہاڑی

محترم و مکرم معراج رسول
السلام علیکم
ایک بار پھر ایک نئی سرگزشت کے ساتھ دوبارہ آگیا لیکن یہ بتا دوں یہ سرگزشت میری نہیں ہے میرے دوست خورشید کی ہے جسے میں نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔ یعنی مزاح میں۔ پلیز پھر لیکچر مت کردیجیے گا لوگ مزاح پڑھنا چاہتے ہیں اس لیے اس انداز میں بھی کسی کو لکھنا چاہیے۔

ظفر عابدی
(کراچی)



رات کے شاید دو بجے تھے۔ جب ابا کی کرخت آواز کانوں میں آئی۔ ''ابے اٹھ جا، جلدی کر۔''

میں چونک کر اٹھ گیا۔ ''کیوں ابا، خیریت تو ہے نا، اس وقت کیوں اٹھا دیا؟''

''ابے تجھے شادی کرنی ہے۔'' ابا نے بتایا۔

''وہ تو خیر کرنی ہے ابا، شادی تو ہر لڑکے کی ہوتی ہے۔''

''تجھے ابھی کرنی ہے۔ اسی وقت۔''

''کیا کہہ رہے ہو ابا۔ میری تو نیند اڑ گئی تھی۔'' اس حج

وقت شادی کیسے ہوگی؟''
ہو جائے گی۔ سارے انتظام ہو چکے ہیں۔

''ابا! کچھ تو سوچو اب اتنی رات گئے شادی کیسے کرلوں۔''

''ابے یہ بہت دردناک کہانی ہے۔'' ابا نے کہا۔

''تو اس دردناک کہانی میں میرا ذکر کہاں سے نکل آیا۔''

''بیٹا! میرا بچپن کا دوست ہے شاکر۔''

''تو اس دوست سے شادی کرنی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ابے ستارہ، ایک تھپڑ ماروں گا تو ساری مستی باہر آجائے گی۔'' ابا بھنا کر بولے۔ ''مجھ پر شاکر کے بہت احسانات ہیں۔ اس نے بہت میرا ساتھ دیا ہے۔''

''ابھی تک بات سمجھ میں نہیں آئی ابا۔''

''بات یہ ہے کہ اس کی ایک بیٹی ہے۔ ستارہ نام ہے اس کا تو آج اس کی شادی تھی۔''

''سمجھ گیا تو تم شادی میں وہیں گئے ہوئے تھے۔''

''ہاں میں وہیں گیا تھا۔'' ابا نے بتایا۔ ''لیکن وہاں تو آفت ہی آگئی۔''

''کیسی آفت ابا۔''

''ابے اس لڑکے نے عین وقت پر کوئی تگڑا مطالبہ کردیا۔'' ابا نے بتایا۔ ''بہت گرما گرمی ہوگئی۔ اب خود سوچ۔ سارے مہمان بکھرے ہوئے اور وہ کم بخت برات لے کر واپس چلا گیا۔''

''یہ تو بہت برا ہوا ابا۔''

''بیٹا، شاکر کی حالت دیکھی نہیں جارہی ہے۔'' ابا نے کہا۔ ''ظاہر ہے یہ کتنی بڑی قیامت ہے پورا گھر ماتم کررہا ہے۔''

''تو پھر ابا سوال یہی ہے کہ میں بیچ میں کہاں سے آگیا؟''

''تو بیچ میں اس طرح آیا ہے کہ اب اس بچی کی شادی تجھ سے ہوگی۔'' ابا نے کہا۔ ''میں پورے گھر والوں کو تسلی دے کر آیا ہوں۔ مہمان بٹھا کر رکھے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب بھی تیار بیٹھے ہیں۔ اب تو جلدی سے چل اور نکاح پڑھوالے۔''

''لیکن ابا یہ تو سوچ کہ یہ کیسا ظلم ہے۔ میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں۔ میری بھی کچھ خواہشات ہیں۔ کچھ خواب ہی میرے ۔۔۔ میں اس طرح کیسے شادی کرلوں؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ لڑکی کیسی ہے؟ کیا ہے؟''

''ابے میں نے بھی شادی سے پہلے تیری ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ بس میرے ابا نے کہا اور میں نے ہاں کردی۔''

''ابا وہ زمانہ اور تھا۔'' میں نے کہا۔ ''آج کے حالات کچھ اور ہیں۔''

''کچھ بھی ہو میں زبان دے کر آیا ہوں۔ تیرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ بس جلدی سے کوئی اچھا سا جوڑا پہن لے اور میرے ساتھ چل۔''

''ایک منٹ ابا، ایک منٹ تم مجھے صرف آدھا گھنٹا دے دو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

''کیا گھر چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں ابا، گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں گا میں آرہا ہوں واپس۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جب تک لڑکی والوں کو روکے رکھتا ہوں لیکن یاد رکھ اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی تو میں گولی ماردوں گا تجھے۔''

ابا سے اجازت ملتے ہی میں نے امجد کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کا گھر دوسرے محلے میں تھا لیکن زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

وہ ایک بدقسمت ٹائپ کا نوجوان تھا۔ ایک جگہ جاب بھی کررہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کی دو بار شادی کینسل ہوچکی تھی۔ لڑکی والوں نے عین وقت پر شادی سے انکار کردیا تھا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ اپنے چہرے کی بناوٹ سے مار کھا گیا تھا۔ بالکل کسی بڑے بندر جیسا چہرہ تھا اس کا۔

نہ جانے کس نسل کا انسان تھا لیکن بہت ہنس مکھ اور مخلص قسم کا۔

میں نے جب اس کے دروازے پر دستک دی تو اس نے بوکھلا کر دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ ''ابے خورشید خیریت تو ہے ناں؟ رات کے اس وقت! کیا تیرے ابا دنیا سے چل دیے۔''

میں اس کی بکواس سن کر جل کر رہ گیا۔ ''ابا تو خیریت سے ہیں لیکن میں تیرے لیے ایک بہت زبردست خبر لے کر آیا ہوں بس تو جلدی سے تیار ہوجا۔''

''تیار ہو جاؤں ...... ! کس لیے؟''

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"شادی کے لیے۔" میں نے بتایا۔ "میں تیری شادی کا بندوبست کرکے آگیا ہوں۔"

"کیا بکواس کررہا ہے، کیسی شادی؟"

"بھائی تیری شادی! تجھے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب لوگ انتظار کررہے ہیں۔ مولوی صاحب بھی نکاح پڑھانے کے لیے بیٹھے ہیں۔ سارا خرچہ لڑکی والے اٹھارہے ہیں۔ دوچار دنوں کے بعد ہم سب مل کر تیرا ولیمہ بھی کروادیں گے بس جلدی سے تیار ہوجا۔"

"خورشید! تو مجھے بتا تو سہی کیا چکر ہے؟"

میں نے ابا والی ساری کہانی بتادی لیکن یہ نہیں بتایا کہ ابا نے اس شادی کے لیے مجھے آفر دی تھی۔

"ابے یہ تو بہت عجیب کہانی ہے۔" امجد نے کہا۔

"ہاں یار! مجھے اس لڑکی پر افسوس ہورہا ہے تو یقین نہیں کرسکتا کہ وہ کتنی اچھی ہے۔" میں نے کہا۔ "انتہائی خوب صورت، پڑھی لکھی۔ ابے اس سے شادی کرکے تیری تقدیر ہی بدل جائے گی۔"

"کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟"

"دس دفعہ۔" میں نے کہا۔ "بتایا تھا کہ ابا کے دوست کی بیٹی ہے۔ آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔"

"اگر وہ ایسی ہے تو خود تو کیوں نہیں شادی کرلیتا۔"

"یار! تجھے بتا چکا ہوں کہ مجھے ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔ تو بھی دیکھ چکا ہے اس کو۔"

"ابے میں نے کب دیکھی ہے، صرف تجھ سے اس کا ذکر سنا ہے۔"

"ہاں یار لیکن یقین کر جس لڑکی سے تیری شادی ہونے والی ہے وہ میری پسند سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔"

"یار! میں تو عجیب مخمصے میں پڑ گیا ہوں۔"

"میری جان ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ ایک زبردست چانس تیرے انتظار میں ہے۔ بس جلدی سے تیار ہوجا اور تجھے ویسے بھی کسی سے اجازت وغیرہ تو لینی نہیں ہے۔ اکیلا آدمی ہے۔"

"یہ تو ہے۔"

"ایک بات بتا۔ کیا وہ میرے ساتھ خوش رہے گی۔"

"ابے یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے اس سے شادی تو کرلے۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی تیار ہوجاتا ہوں۔"

میں اس کو لے کر ابا کے پاس پہنچ گیا۔ جو بہت بے چینی سے میرا انتظار کررہے تھے۔

"ابے اتنی دیر لگادی اور یہ کون ہے؟" ابا نے پوچھا۔

"ابا یہ امجد ہے میرا دوست۔" میں نے بتایا۔

"اچھا تو اسے اپنی شادی میں شرکت کے لیے لایا ہے۔"

"نہیں ابا، بلکہ میں اس کی شادی میں شرکت کروں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"ابا! آپ کے دوست کی بیٹی سے میرا یہ دوست نکاح کرے گا۔"

"کیا بکواس کررہا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں ابا۔ بہت پڑھا لکھا اور سعادت مند قسم کا نوجوان ہے۔ ایک دفتر میں اچھی ملازمت کرتا ہے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ آپ کے دوست کی بیٹی عیش کرے گی۔"

"لیکن اس کی صورت تو دیکھ بالکل کسی بندر جیسی ہے۔"

"ابا یہ اپنے بزرگوں پر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈارون کی تھیوری کے مطابق ہمارے آباؤ اجداد بندر ہی ہوا کرتے تھے تو اس نے اپنے آباؤ اجداد کی صورت پائی ہے۔"

"لیکن میں تو لڑکی والوں سے یہ کہہ کر آیا ہوں کہ میں اپنے بیٹے سے شادی کروں گا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ابا، تم اس کو بھی اپنا بیٹا ہی سمجھو۔ بیٹے کا دوست بھی تو بیٹے ہی جیسا ہوتا ہے۔"

"اب پتا نہیں لڑکی والے مانیں گے یا نہیں۔"

"کیوں نہیں مانیں گے ابا۔ ایمرجنسی میں تو ایسی ہی شادی ہوتی ہے۔ اب جلدی چلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مولوی بھاگ جائے۔"

ابا چونکہ پھنس چکے تھے اور اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہامی بھرلی اور ہم لڑکی کے گھر پہنچ گئے۔

وہاں واقعی شادی کا پورا ماحول تھا۔ مہمان جمع تھے۔ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کھانوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ اسٹیج پر مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی کا باپ بہت

بے چینی سے ابا کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔
ابا کو دیکھتے ہی لپک کر ابا کے پاس آگیا۔ "بہت دیر کردی قریشی صاحب۔"

"ہاں بھائی، دولہا کو تیار کرنے میں دیر ہوگئی۔" ابا نے بتایا۔" پھر امجد کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہے وہ لڑکا آپ کا ہونے والا داماد۔"

"یہ آپ کا بیٹا ہے نا؟"

"نہیں یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ میرے بیٹے کا دوست ہے۔" ابا نے بتایا۔ "بہت نیک اور نمازی پرہیز گار قسم کا نوجوان ہے۔ اس عمر میں دو بار عمرہ کر آیا ہے۔" ابا نے امجد کا کیس مضبوط کرنے کے لیے یہ اپنی طرف سے کہہ دیا تھا۔ وہ میرے ہی ابا تھے۔

"ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ۔" ابا کے دوست نے امجد کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نام کیا ہے بیٹا۔"

"امجد۔" امجد نے بتایا۔

"قریشی صاحب آپ کا بیٹا کیوں تیار نہیں ہے۔" ابا کے دوست نے پوچھا۔

"نالائق ہے کم بخت۔" ابا نے غصے کا اظہار کیا۔ "اب جاکر اپنی شادی کا راز ظاہر کیا ہے۔"

"اپنی شادی......؟"

"ہاں بھائی، اس نے ابھی بتایا ہے مجھے۔ پچھلے مہینے مجھ سے چھپ کر کورٹ میں جاکر شادی کر چکا ہے۔ اب خود سوچو میں تمہاری بچی کو کسی سوتن کے حوالے کیسے کر سکتا تھا۔"

ابا اس وقت بے تکان جھوٹ بولے چلے جارہے تھے۔

"چلو اگر تمہیں اس کی طرف سے اطمینان ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ ویسے بھی اتنی دیر ہو چکی ہے۔" ابا نے کہا۔ "لڑکے کی طرف سے ہم لوگ وکیل اور گواہ ہیں۔"

امجد کو اسٹیج پر پہنچا دیا گیا۔ مولوی صاحب تو بھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی نکاح پڑھوا دیا۔ مبارکبادیوں کا شور ہوا اور کھانا کھلا دیا گیا۔ پھر میں گھر آکر سوگیا۔ ابا نے خوامخواہ نیند حرام کروادی تھی۔

لیکن ایک ہی رات میں بہت بڑا کام ہوگیا تھا۔ بے چارہ امجد کسی ٹھکانے لگ گیا تھا۔

مجھے ابا کے دوست کی بیٹی سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میرا معاملہ کچھ اور تھا۔ ایک لڑکی مجھے پسند آگئی تھی۔

بعض حسن ایسا ہوتا ہے کہ بس ایک نگاہ میں آنکھوں سے اتر کر دل میں راج کرنے لگتا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔

کہتے ہیں کہ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ انسان کا کردار اور اس کا مزاج بھی بتا دیتا ہے۔ اس لڑکی کے خوب صورت اور روشن چہرے نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ نہ صرف شکل کی اچھی ہے بلکہ دل کی بھی اچھی ہے۔

میں نے اسے ایک اسکول سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس اسکول سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہوا یوں کہ میں دوپہر کے وقت اپنے گھر کی طرف جارہا تھا کہ میرے ایک دوست مل گئے۔ بہت دنوں کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

وہ شادی شدہ تھے اور دو بچوں کے باپ۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "یار! بہت دنوں کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ چلو میرے ساتھ۔ میں بچوں کو اسکول سے لینے جارہا ہوں۔ وہیں گپ شپ ہوتی رہے گی۔ پھر بچوں کو گھر پہنچا کر تمہارے ساتھ کوئٹہ ہوٹل میں آجائیں گے۔"

مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت مجھے کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اس لیے میں ان کے ساتھ ہولیا۔

وہیں مجھے وہ لڑکی دکھائی دی۔ وہ چھٹی ہو جانے کے بعد بچوں کے ساتھ گیٹ سے باہر آئی تھی۔ اس کے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ میرے دوست نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دیتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"یہ میرے بچے کی کلاس ٹیچر ہے۔" میرے دوست نے بتایا۔

اس دوران اس کا بچہ بھی باہر آچکا تھا۔ میرے دوست نے اپنے بیٹے کا بستہ اٹھالیا۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن میں تو اس ٹیچر کو دیکھ کر ٹرانس میں آگیا تھا۔ کیا لڑکی تھی!!

"مس شاہینہ بہت اچھی ہے۔" میرے دوست کا یہ جملہ مجھے سنائی دیا۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"یار! عبید کی کلاس ٹیچر کی بات کر رہا ہوں۔" میرے دوست نے کہا۔ "بہت ہی خیال رکھنے والی لڑکی ہے۔"

اس طرح روا روی میں اس کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ شاہینہ اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جان سکا تھا۔ ظاہر ہے یہ باتیں میں اپنے دوست سے تو معلوم نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی اسے یہ بتا سکتا تھا کہ تمہارے بیٹے کی کلاس ٹیچر تو مجھے پہلی نظر میں پسند آگئی ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ اس سے ملنے کا راستہ کیا نکالا جائے۔

میں روز روز اسکول تو نہیں جا سکتا تھا۔ کیا بہانہ کر کے جاتا۔ ایک کام یہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے گھر تک پہنچ جاؤں اور اس کے گھر کے راستے میں کھڑا رہوں لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔

وہ ایک استانی تھی اور ظاہر ہے میرے اس چھچھورے فعل کو پسند نہیں کرتی۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ میں اپنے دوست ہی کے ذریعے اس تک رسائی کی کوشش کروں۔

میں جان بوجھ کر ایک بار پھر ان سے اس وقت ٹکرا گیا جب وہ اپنے بچے کو لینے اسکول جا رہے تھے۔

''ہاں بھائی شوکت صاحب کیا پھر ڈیوٹی پر جا رہے ہو؟''

''ہاں بھائی۔'' وہ ہنس پڑے۔ ''یہ ڈیوٹی سب سے زیادہ سخت ہے۔ دفتر کی ڈیوٹی سے زیادہ۔''

''تو کیا بچے کے چکر میں آفس جانا چھوڑ دیا ہے؟''

''نہیں بھائی! اتفاق سے میرا دفتر چار بجے سے دس بجے رات تک کا ہے۔'' شوکت نے بتایا۔ ''بچے کو گھر پہنچا کر کھانا وانا کھا کر آرام سے تین بجے گھر سے نکلتا ہوں۔ اور تم...... تم نے کیا جاب چھوڑ دی ہے؟''

''نہیں تو، میں آج کل دو مہینوں کی چھٹیوں پر ہوں۔'' میں نے یوں ہی بتا دیا۔

''اگر فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو، بچے کو لینے جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' میں جلدی سے بول پڑا۔ میری تو خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔

ہم گیٹ پر آکر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن میرا دھیان اس کی طرف کہاں تھا، گیٹ کی طرف تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی ٹیچرز دوستوں کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرا دوست اپنے بچے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب کہ میں اس لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔

آج اس نے میرا نوٹس لے لیا تھا۔ وہ ایک بھرپور نظر ڈالتی ہوئی برابر سے گزر گئی۔ میں اسے اس طرح دیکھے جا رہا تھا جیسے کوئی سحر زدہ شخص ہو۔

میرے دوست شوکت نے میری کیفیت محسوس کر لی۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کیا بات ہے کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی؟''

''کہیں نہیں۔'' میں خفیف سا ہو گیا تھا۔ ''بس یوں ہی۔''

''چلو چلتے ہیں۔ راستے میں باتیں ہوں گی۔''

''شاہینہ اچھی ہے ناں؟'' شوکت نے چلتے چلتے پوچھا۔

''کون شاہینہ؟''

''یار اب اتنے بھی معصوم نہ بنو۔ میں بیٹے کی کلاس ٹیچر کی بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں بھائی، بہت اچھی ہے۔'' میں نے اعتراف کر لیا۔

''اگر کہو تو تمہاری بات چلائی جائے۔'' شوکت نے کہا۔

''کیا تم اس کے اور اس کے گھر والوں کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جانتا تو نہیں ہوں لیکن معلوم ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔'' شوکت نے کہا۔

''یار سچ یہ ہے کہ یہ لڑکی مجھے پسند آئی ہے۔ خوب صورتی اپنی جگہ لیکن اس میں جو شرافت ہے نا وہ اس کے چلنے کے انداز سے پتا چل جاتی ہے۔''

''یہ بات تو ہے، چلو میں اس کے گھر والوں کا معلوم کر کے بتاتا ہوں تمہیں۔ پھر اس کے قریب ہونے کا کوئی راستہ نکالتے ہیں۔''

اس کے بعد تین چار دنوں تک میں شوکت کی طرف نہیں جا سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکولوں میں چار پانچ دنوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ نہ تو شوکت کا بچہ اسکول جا رہا ہوگا اور نہ ہی شاہینہ اسکول آرہی ہوگی۔

پھر اس دوران وہ واقعہ ہو گیا وہی جس میں ابا زبردستی میری شادی کرا رہے تھے اور میں نے امجد کو بھڑا کر اپنی جان بچائی تھی۔

مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ امجد کس حال میں ہے۔ ایسی شادی کے بعد اس پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک بار ابا نے مجھ

سے پوچھ لیا۔ ''دیکھ اب تو صاف صاف بتا دے تو نے میرے دوست کی بیٹی سے شادی کیوں نہیں کی۔ کیا راز ہے اس میں؟''

''نہیں ابا، راز کیا ہونا ہے، کوئی راز نہیں ہے۔''

''دیکھ، میں تیرا باپ ہوں تیری رگ رگ سے واقف ہوں، یہ بتا کیا کسی کو پسند کر چکا ہے؟''

اب ابا سے کچھ چھپانا بے سود تھا۔

''ہاں ابا، ایک لڑکی پسند آگئی ہے۔''

''تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' ابا نے پوچھا۔

''پہلے اس موضوع پر بات ہی کہاں ہوئی ہے ابا۔'' میں نے کہا۔ ''اب بات نکلی ہے تو بتا رہا ہوں۔''

''نام کیا ہے اس کا؟''

''شاہینہ نام ہے اس کا۔'' میں نے بتایا۔

''ہوں، نام تو اچھا ہے۔ اب ذرا اس کا جغرافیہ بھی بتا دے۔ اس کے گھر والوں کے بارے میں پتا۔ اب میں خود تیرا رشتہ لے جاؤں گا۔''

''ابا! فی الحال تو میں نے اپنے ایک دوست کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر کے بتا دے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جب وہ بتا دے تو مجھے بتا دینا۔ میں خود اس کے گھر جاؤں گا۔''

ابا سے گفتگو کے بعد ایک طرف سے اطمینان ہو گیا تھا کہ ابا اس رشتے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے بلکہ الٹا میرا ساتھ دیں گے۔

اس شام کو امجد میرے پاس آگیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''ہاں بھائی! بتا کیسی گزر رہی ہے شادی شدہ زندگی۔'' میں نے پوچھا۔

''میرے دوست میں تیرا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تیری وجہ سے میری زندگی بدل گئی ہے۔''

''چل یار تو اگر خوش ہے تو یہی بہت ہے۔''

''خوش......! خوش ہونا تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے یار۔ تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ چل میرے ساتھ میں تجھے اس سے ملواتا ہوں۔''

''یار پھر کبھی، پہلی بار دیکھوں گا اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ اس کے لیے کوئی تحفہ لے لوں۔''

''ارے چھوڑ اس تکلف کو۔ میرے ساتھ چل۔ میں تیرا احسان کبھی نہیں بھلاؤں گا یار۔ آجا۔''

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

کہاں اس کا گھر اجاڑ حالت میں رہتا تھا۔ ہر طرف کاٹ کباڑ لیکن اب انتہائی سلیقے سے سجا ہوا۔ کچھ چیزیں نئی بھی دکھائی دے رہی تھیں جو ظاہر ہے اس لڑکی کے گھر والوں نے دی ہوں گی۔

''واہ یار تیرا ڈرائنگ روم تو چمک رہا ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''یہ سب اسی کی محنت ہے یار، اس نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ تو بیٹھ میں اسے لے کر آتا ہوں۔''

میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ امجد کچھ دیر بعد اپنی بیوی کو لیے ہوئے داخل ہوا۔ نئی نویلی دلہن شرم سے سمٹی ہوئی، ٹھکتی ہوئی۔

اور جب میں نے اس کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پورا پہاڑ گرا دیا ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے چھانے لگے تھے۔

یہ وہی تھی شاہینہ۔

شوکت کے بیٹے کی کلاس ٹیچر۔ جس کو دیکھ کر میں پاگل ہو گیا تھا۔ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے سپنے دیکھ رہا تھا۔

جس کے ساتھ میری شادی ہونے جا رہی تھی لیکن میں نے اس سے جان چھڑاتے ہوئے اسے امجد کے حوالے کر دیا تھا۔

اسے کہتے ہیں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا۔

میں نے اپنی حماقت سے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی تھی۔ امجد مجھ سے اس کی تعریفیں کرتا رہا لیکن میں کچھ بولنے اور سننے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔

اس کے بعد شوکت جب مجھ سے ملتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو اسکول لینے کے لیے جا رہا ہے تو میں بہانہ کر کے کسی اور طرف نکل جاتا ہوں۔

ویسے شوکت بے چارے کو اس بات کا دکھ ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ میری بات چیت چلاتا اس کلاس ٹیچر کی شادی ایمرجنسی میں کہیں کر دی گئی تھی۔

اب میں اسے کیا بتاتا کہ وہ ایمرجنسی کیا تھی اور میں کیسا بدقسمت ہوں۔ کیا خیال ہے؟ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا صحیح مفہوم میری اس کہانی کے بعد آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔

# بے چارہ

مکرمی جناب
السلام علیکم
میں کوئی بہت زیادہ پڑھا لکھا بندہ نہیں ہوں۔ جتنا علم ہے اسی کے مطابق میں نے اپنی حالاتِ زندگی لکھی ہے اگر املا وغیرہ میں کوئی غلطی نظر آئے تو اسے درست کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

چھپن چھری
(حیدر آباد)

میں کون ہوں مجھے تب صحیح سے یاد نہ تھا۔ بس مجھے ہلکا ہلکا سا یاد ہے۔ میں کراچی دیکھنے آیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی بہت بھیڑ دیکھی تھی۔ بھیڑ ہی کی وجہ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا تھا اور میں انسانی سمندر میں بہتا چلا گیا تھا۔ میں جس کے ساتھ آیا تھا وہ پتا نہیں کہاں چھوٹ گیا۔ اتنی بھیڑ میں کسی کو ڈھونڈنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ میں اللہ بھروسے چلتا چلا گیا تھا۔ چلتے چلتے جب تھک گیا اور ایک بڑا سا کھلا میدان دیکھا جس میں اِدھر اُدھر بہت سے لوگ بیٹھے تھے تو

لیں بھی تھک کر بیٹھ گیا اور مغرب میں ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگا۔

وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک آدمی آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔

"ڈوبتے سورج کو دیکھ رہے ہو؟" اس آدمی نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"جج جی ہاں۔" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"اکیلے ہو۔ ساتھ میں کوئی نظر نہیں آرہا؟"

"میں بچھڑ گیا ہوں۔ میرے ساتھ چاچا تھے وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے۔"

"کچھ کھایا پیا' یا بھوکے ہو؟"

میں نے جواب نہیں دیا تھا۔

"کھانا کھاؤ گے؟" اس شخص نے شفقت سے پوچھا تھا۔

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے رکھا۔

"آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔"

بھوک مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔ میں نے جواب دینے کی بجائے کھڑے ہو جانا ضروری سمجھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

مجھے وہ اجنبی فرشتہ لگا۔ انسان کے روپ میں کوئی آسمانی مخلوق۔ اس شخص نے مجھے ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ کھانا کھا کر کچھ طاقت آئی تو میں نے تشکر بھرے انداز میں اس اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر دوبارہ سے اسی میدان میں آگیا۔

رات کا اندھیرا اب پوری طرح پھیل چکا تھا۔ صرف ایک دو لوگ سامنے رہ گئے تھے۔ اس طرف کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کھمبوں پر لٹکے بلب دور تھے۔ ان کی روشنی وہاں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک نسبتاً سنسان جگہ پر پہنچا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے میرے کپڑوں کو کھینچنے لگا۔ میں نے گھبرا کر اس کے ہاتھ پر دانت جما دیے۔ خوب زور سے کاٹ لیا۔ تکلیف سے اس نے ہاتھ ہٹایا تھا کہ میں راحت سے بھر اٹھا۔

منہ سے ہاتھ ہٹتے ہی میں نے زور کی چیخ ماری۔ میری چیخ سنتے ہی کئی لوگ دوڑے۔ اتنے لوگوں کو نزدیک آتے دیکھ کر وہ اٹھ کر بھاگا۔

آنے والوں میں سب سے آگے کوئی اور نہیں یہی منی بیگم تھا۔ اس نے مجھے سنبھالا اور اپنے نزدیک کر کے میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "ائے ہے.... کتنا خوبصورت بچہ ہے... گھر کہاں ہے رے... کہاں سے آیا ہے تو؟"

"پتا نہیں..... میں جس کے ساتھ آیا تھا وہ مل نہیں رہا۔"

"یہاں رہے گا تو ایسے ہی لوگ ٹکراتے رہیں گے... چل میرے ساتھ چل......" کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی کوٹھری میں آگیا۔ اس نے بتایا وہ بھی کراچی گھومنے آیا ہے مگر صبح ہی وہ لاہور لوٹ جائے گا۔ پھر اس نے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو گھر کا پتا یاد ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اگلے دن اس نے پوچھا "تم میرے ساتھ چلو گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جب لاہور جانے کے لیے چلا تو میں بھی اس کے ساتھ لاہور آگیا۔ اس سے پہلے میں اس قبیل کے لوگوں سے کبھی ملا نہیں تھا۔ بس دور دور سے دیکھا تھا۔ پہلی بار قریب سے دیکھنے' ان کی باتیں سننے' ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا۔

وہ لوگ مجھے نہایت اچھی اچھی چیزیں کھلاتے' میرے آرام آسائش کا پورا پورا خیال رکھتے۔ مگر گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ میں خود بھی کراچی والی بات سے ڈر گیا تھا کہ پھر کوئی ایسا آدمی نہ ٹکرا جائے۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک صبح منی بیگم نے کہا۔ "چل تیاری کر لے آج تجھے پھوپھو دادی کے پاس لے جانا ہے۔"

راستے میں چلتے چلتے میں نے پوچھا کیا پھوپھو دادی اس کی دادی ہے تو وہ ہنس کر خاموش ہو گیا۔ مگر جب میں پھوپھو دادی کے یہاں پہنچا اور اسے دیکھا تو وہ مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ سر پر ایک بھی بال نہیں تھا مگر وہ زنانہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ منہ پوپلا تھا۔ اس نے میرے جسم کو اس طرح ٹٹولا تھا جیسے وہ کوئی قصاب ہو اور میں بکرا۔ پھر وہ منی بیگم سے بولا تھا۔ "ارے او ری تُوں نے تو ہیرا ڈھونڈھا ہے۔ بڑھاپا بڑے آرام سے گزرے گا۔ بڑا کمیاں رکھیو اس

کا۔" پھر اس نے دس کا نوٹ نکال کر اپنے ایک ساتھی کو دیا اور بولا۔ "ارے او رے...... جا رے مٹھائی لے آ۔"

وہ روپیا لے کر مٹکتا ہوا چلا گیا۔ باقی سب مجھے دیکھ دیکھ کر آپس میں نیچی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں سب کا منہ تک رہا تھا۔ مٹھائی آئی تو لچھو نے ایک رکابی میں رکھ کر اپنے سر پر رومال لپیٹا اور فاتحہ کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ایک لڈو اٹھایا اور میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

"مبارک ہو۔" سب نے ایک آواز میں مبارک باد دینا شروع کر دیا۔ ان کی آوازوں سے پورا کمرا گونجنے لگا تھا۔

"شروع کرو جی۔" لچھو نے تیز آواز میں چیخ کر کہا۔

شروع اس طرح ہوا کہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میرے کپڑے پھاڑنا شروع کر دیا۔ میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر میری ایک نہ چلی اور میرے کپڑے چندیوں میں بدل گئے۔ اپنی یہ درگت بنتے دیکھ میں رونے لگا۔

"ارے ارے روتی کاہے کو ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم اب ہماری برادری میں آ گئی ہو۔" اس کی بات کچھ سمجھ میں آ رہی تھی کچھ نہیں مگر میں روئے جا رہا تھا۔

اس کے ایک ساتھی نے ٹین کے ایک بڑے ڈبے سے ایک چھوٹا ڈبہ نکالا اور وہیں رکھا پانی سے لبالب بھرا ایک پیتل کا گول لوٹا اٹھا لیا۔ لچھو نے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر سیندور نکالا اور اس سے میرے گرد دائرہ کھینچ کر اس کے درمیان مجھے بٹھا دیا۔ میں ڈر سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لچھو نے کچھ پڑھ کر اس دائرے پر پھونک ماری اور لوٹے کو تھام لیا۔ اس لوٹے کے کنارے کنارے موتیا کے پھول دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔ لچھو نے ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے پانی کا لوٹا میرے سر پر خالی کر دیا۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

"مبارک ہو۔" سب نے پھر ایک بار کورس میں کہا۔

لچھو کے ایک ساتھی نے کوئی فٹ بھر لمبا مگدر آگے کر دیا۔ اس کے سرے پر ربر کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ لچھو نے اسے لے کر میرے پیٹھ سے ذرا نیچے ریڑھ کے نچلے حصے پر مارنا شروع کر دیا۔ گو کے ربر کی وجہ سے چوٹ زیادہ نہیں لگ رہی تھی پھر بھی مجھے ناقابلِ برداشت لگ رہی تھی۔ میں نے چوٹ سے بچنے کے لیے ہاتھ پیچھے لے جانا چاہا تو دوسرے لوگوں نے مجھے کس کر پکڑ لیا اور زمین پر اوندھے منہ گرا دیا۔ پھر جو چوٹ پڑنے لگی وہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی اور میں ہوش و حواس سے بے گانا ہو گیا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں لڑکیوں کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔

"لو بیٹی پی لو۔" لچھو نے گرم دودھ کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ مجھے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ہی سانس میں دودھ پی لیا۔ مجھے دودھ کا ذائقہ کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن خوشگوار تھا۔

اس دن سے لچھو دادی کی نگرانی میں میری ٹریننگ شروع ہو گئی۔ مجھے لڑکیوں کی طرح کمر لچکا کر چلنا۔ اٹھنا بولنا سکھایا جانے لگا۔ وہ مجھے پیاری کے نام سے پکارتے۔ میری کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی میری نگرانی کے لیے موجود ہوتا۔ مجھے گھر سے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ البتہ مجھے کھانے پینے کی مکمل آزادی تھی۔ میں جو چاہتا منگوا کر کھا لیتا۔ میری فرمائشوں کو وہ لوگ فوراً پورا کرتے۔

تین ماہ کی ٹریننگ سے میں بالکل بدل گیا۔ ان کے طور طریقوں کو پوری طرح اپنا لیا۔ اب وہ لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جانے لگے تھے۔ دوسروں کی طرح میں بھی ڈھولک کی تھاپ پر کمر مٹکانے لگا تھا۔

گھروں میں جہاں بچے کی پیدائش کا سنتا ان کے ساتھ پہنچ جاتا۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے میرے ناچ میں ایک نکھار تھا۔ لوگ بہت پسند کرتے۔

ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں اب تک ان کے مذہب کا اندازہ لگا نہیں پایا تھا۔ کیونکہ نماز روزے سے ان کو کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس دن بھی ہم سب ٹولی کی شکل میں ایک مزار پر چادر چڑھانے گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ رہے تھے کہ راستے میں ایک گرو سے ملاقات ہو گئی۔ اس گرو سے میں پہلے بھی مل چکا تھا اس لیے اسے دیکھتے ہی میں نے "سلام" کہا۔ اس نے دعا دے کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا پھر لچھو دادی سے بولا۔ "گرو جی نیگا کب کھلا

رہے ہو؟"

"اگلے جمعہ کو نیگا کرنے کا سوچا ہے۔ نیوتا بھیجنے کا سوچ رہی تھی۔ تم بھی آئیو اور دوسروں کو بھی لے کے آئیو۔"

"جرور جرور ہم اور ہماری ٹولی آئیں گے۔" کہہ کر وہ اپنی ٹولی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

میں نے چھوو ادی سے پوچھا۔ "یہ نیگا کیا ہے۔"

"برادری کے لوگوں کی دعوت کو نیگا کہتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "اب ہماری پیاری کمانے لائق ہو گئی ہے نا اسی لیے سب لوگ کہتے ہیں کہ اب تو نیگا دے ہی دو۔ نیگا کے بعد ہی تم اپنی ٹولی میں آسکو گی، بھی منی بیگم تم کو لے جاسکتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔"

اب میں پہلے جیسا معصوم تو تھا نہیں۔ سب کچھ سمجھنے لگا تھا۔ نیگا کے بعد میں آزادی سے لوگوں کے گھروں میں جا کر نیگ مانگ سکوں گا اور منی بیگم سے بھی مل سکوں گا۔ اس بات نے خوش کر دیا تھا۔

چھو نے پورے شہر اور اس کے آس پاس کے تمام برادری میں نیوتا بھیج دیا تھا۔ شہر سے باہر ایک مقام پر دعوت کا انتظام کیا تھا۔ وہ ان کی برادری میں متبرک مقام مانا جاتا تھا۔ صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی چھو نے مجھے اٹھا دیا میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

ہمارے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ یہ سب چھو کے ساتھی تھے۔ ہم سب ایک رکشا پر سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ وہاں بہت ساری بوسیدہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماضی میں اسے بطور مسافر خانہ استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک کوٹھری میں ان کا بڑا گرو رہتا تھا۔ مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی پھر چھو سے بولا کہ اسے کوٹھری میں پہنچا دو۔

چھو مجھے لے کر ایک دوسری کوٹھری میں پہنچا۔ یہ والی کوٹھری نسبتاً بڑی تھی۔ مجھے اس کوٹھری میں پہنچا کر چھو نے کہا۔ "اور سن اب تُو یہاں سے باہر نہ نکلنا۔ یہاں ہی رسم ہو گی۔"

باہر پہرے کے لیے ایک زنخا کھڑا ہو گیا، باقی سب کہیں چلے گئے۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ ایک کے بعد ایک ٹولی آتی جا رہی ہے۔ سب کے سب بھڑکیلے لباس میں ملبوس تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے عید آگئی ہے۔ کچھ زنخے اندر آئے انہوں نے مجھے زبردستی چٹائی پر لٹا دیا۔ میں تڑپ رہا تھا۔ ہاتھ پیر چلا رہا تھا مگر مجھے قابو میں اس طرح ان لوگوں نے کر رکھا تھا کہ میں چاہ کر بھی انہیں روک نہیں پا رہا تھا۔ پھر انہوں نے میرے جسم پر تیل میں بھگو کر آٹے کے پیڑے کو ملنا شروع کر دیا۔ باقی سب اپنی بھونڈی آواز میں گانا گاتے جا رہے تھے۔ اس رسم سے فارغ ہو کر ان لوگوں نے مجھے سرخ ساڑی پہنا دی۔ پھر بڑے گرو نے کہا۔ "اب چل آخری رسم کے لیے چلتے ہیں۔"

مجھے لے کر وہ سب گاتے بجاتے ہوئے ایک پیڑ تک پہنچے۔ پھر اس بڑے گرو نے چھو سے کہا۔ "اجازت ہے رے؟"

"ہاں ہاں.... منی بیگم بھی اجازت دے رہی ہے......" چھو نے کہا۔

منی بیگم کا نام سن کر میں نے بھیڑ پر نظر ڈالی۔ دور کھڑا منی بیگم مجھے نظر آگیا۔ اسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مجھے مسکراتے دیکھ اس نے دور سے میری بلائیں لیں اور مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے زنخے سے کچھ بولا۔

کیا بولا یہ تو مجھے سنائی نہیں دیا مگر کوئی ایسی بات تھی کہ وہ پریشان ہو گیا۔ اس کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا شخص کچھ بول رہا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر منی کا چہرہ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ پریشانی اتنی دور سے بھی مجھے نظر آرہی تھی۔ میں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اس بڑے گرو نے مجھ سے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ "تجھے بتایا تھا ناں کہ کپڑے اتار کر اس چٹائی پر بیٹھنا ہے۔ جلدی کر۔"

میں نے اس کے بھیانک چہرے اور ڈانٹ سے سہمتے ہوئے ساڑی پھر سے اتار دی اور چٹائی پر اس کے بتانے کے مطابق آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ بڑے گرو نے مجھے جیسا کہا۔ میں نے ویسا ہی کیا۔

"اب آنکھیں بند کر کے دھیان لگاؤ۔" کہہ کر اس نے سرخ کپڑے سے منڈھی ایک کتاب کھول لی اور اس میں دیکھ دیکھ کر کچھ پڑھنے لگا۔ اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ جیسے ہی وہ پڑھ کر فارغ ہوا اس نے نزدیک کھڑے زنخے کو اشارہ کیا۔

اس زنخے نے وہیں رکھی ایک بالٹی اٹھائی اور مجھ پر خالی کر دی۔ شام کی کھلی ہوا میں ٹھنڈ محسوس کرنے لگا مگر خوف اس قدر طاری تھا کہ میں منہ سے کچھ بول نہیں سکا۔ پھر اس نے سیندور کی کٹوری اٹھائی اور میرے سر پر

سے ایک چٹکی سیندور تھما کر دور اچھال دیا۔ پھر اس نے اشارہ کیا تو اسی زنخے نے مجھے چٹائی پر زبردستی لٹا دیا اور میرے دونوں پیروں کو وہاں لگے کھونٹوں سے باندھنے لگا۔ میں نے گھبرا کر چیخ ماری اور پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"چپ چاپ لیٹی رہ۔" اس نے اشارہ سے کہا۔

"بیٹی لیٹی رہ۔" زنخا بولا۔

"مگر میرے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔"

"بس کچھ دیر کی بات ہے۔ اس قسم کے حالات سے ہم سب گزر چکے ہیں۔"

"رسی تو ڈھیلی کر دو۔"

"رسی ڈھیلی کر دی تو تیرے پیر ٹوٹ جائیں گے۔"

تبھی ایک عمر دراز زنخے نے آگے بڑھ کر کہا۔ "منہ کھول بیٹی۔"

میں نے منہ کھول دیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے کپڑے کا گولا میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں پٹخنا شروع کر دیا۔

"اسے سنبھالو۔" بڑے گرو نے کرخت آواز میں کہا۔

کئی زنخوں نے آکر میرے ہاتھ پاؤں پکڑ لیے۔ میں ان کی جکڑ سے نکلنا چاہتا تھا مگر نکل نہیں پا رہا تھا۔ ایک نے میرے سینے پر ہاتھ سے دباؤ ڈال کر مجھے بالکل مجبور کر دیا۔ مجھے اپنی آنکھیں حلقوں سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اے لا جو وقت ہو گیا۔" گرو نے کہا۔

تبھی ایک قد آور زنخا ایک عجیب قسم کا زنبور لے کر آگے بڑھا اور میری دونوں ٹانگوں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ ابھی وہ کچھ کرتا کہ کسی کی کڑکتی ہوئی آواز آئی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس بچے کو کھول دو۔"

وہاں جمع زنخے شور کرنے لگے تبھی وہی آواز سنائی دی۔ "اگر تم لوگوں نے اس بچے کو نہیں چھوڑا تو میں سب کو جیل میں ڈال دوں گا۔"

میں لیٹا تھا اس لیے بولنے والے کو دیکھ نہیں پا رہا تھا مگر اندازہ تھا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔ اس کے کہنے پر ایک زنخے نے میرے ہاتھ پیر کھول دیے۔ بھیڑ کو ہٹاتا ہوا منی آگے بڑھا اور مجھے سینے سے لگا کر بڑے گرو سے بولا۔ "میں ابھی اسے لے کر جا رہی ہوں اگلے چاند کو پھر آؤں گی۔"

پھر وہ مجھے لے کر اس پشتے سے نیچے اتر آیا اور آگے بڑھ رہا تھا کہ وہی پولیس والا چیخا۔ "اے اسے کہاں لے جا رہے ہو۔ اسے تھانے میں پیش کرنا ہے۔"

اس کی آواز سنتے ہی مجھے اٹھا کر منی بیگم نے دوڑ لگا دی۔ ان سب کے بیچ سے نکلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ وہاں ایک رکشا اور وہی زنخا پہلے سے کھڑا تھا جو کچھ دیر پہلے منی بیگم کے ساتھ کھڑا تھا۔ جس کی باتیں سن کر منی کے چہرے پر پریشانی چھا گئی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ "چل جلدی سے اس رکشا میں سوار ہو جا۔ جلدی کر۔ پولیس والا ان سب کو روکے ہوئے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی ادھر آ گیا تو ہمیں روک لے گا۔"

منی کے ساتھ میں بھی رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشے والے نے رکشا اسٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔ کافی دور آنے کے بعد اسی زنخے نے کہا۔ "مجھے اپنی ناکام زندگی یاد آ گئی اسی لیے میں نے پولیس کو خبر دے کر منی کو تھپڑ دے دے کر اس خطرناک کام کے لیے راضی کیا ہے کہ تمہاری زندگی ویران ہونے سے بچ جائے۔ اگر آج کی رسم ادا ہو جاتی تو تم مردوں کی قطار سے نکل جاتے۔ ہماری طرح ویران زندگی ہو جاتی۔"

اس وقت میں چھوٹا تھا اس لیے سمجھ نہیں پایا کہ وہ بولنا کیا چاہ رہا ہے مگر آج غور کرتا ہوں تو اسے دعا دے کر نہیں تھکتا۔

منی مجھے لے کر سیدھے اسٹیشن آیا تھا اور ہم اسی حالت میں کراچی چلے آئے تھے۔ کئی سال تک نگر نگر ہم پھرتے رہے۔ پتا نہیں کتنے شہر کی ہم نے خاک چھانی۔ اس بھاگ دوڑ میں مجھے ہی فائدہ پہنچا۔ میں طرح طرح کے زنخوں سے ملا۔ ان سے فن سیکھا اور ٹھکے سیکھے۔ کراچی کے زنخوں سے وہ گر سیکھا کہ کس طرح اپنے جسم کو۔ چہرے کو خوبصورت بنایا جاتا ہے۔ سکھر کے زنخوں سے ناچنے کے ٹھکے سیکھے۔ اس طرح میں بہت چھوٹی عمر میں بہت کچھ سیکھ گیا۔ تین سال قبل ہم حیدر آباد آ گئے۔ یہاں آکر میں نے اپنی ٹولی بنالی۔

☆☆☆

آج یہاں بھی میں اپنی ٹولی کے ساتھ آیا تھا۔ میں اپنے وہی کمال دکھانے آیا تھا جسے دیکھ کر لوگ سدھ

بدھ کھو دیتے تھے۔ یعنی کہ میں یہاں ناچنے آیا تھا۔ ٹھمکوں کی تھاپ پر گھنگروؤں کی جھنکار میں آنکھ مٹکا کر ادائیں دکھا دکھا کر۔ میں اپنی سعی میں کامیاب رہا۔ ساری رات جانِ محفل بنا رہا۔ لوگوں نے خوب خوب نوٹ لٹائے۔ آوازیں کسیں، چٹکیاں بھریں اور فقرے اچھالے۔ کئی بار میرے دوپٹے کو چھینا، اشارے کیے، گستاخیاں ہوئیں مگر میرے ماتھے پر شکن نہ آئی کیونکہ میں ان سب کا عادی تھا۔ یہ سب میری زندگی کا حصہ تھا اس لیے میں نے نہ کسی کو جھڑکا اور نہ ٹوکا۔ فلمی گانوں پر ناچتا رہا، دوپٹے کو ہوا میں لہراتا رہا۔ فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ ایک موٹے شخص نے جھومتے ہوئے فرمائش کی "مہدی حسن، مہدی حسن۔"

غزل گانا مجھے بھی پسند تھا۔ اس میں تھکن بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ایک جگہ بیٹھ کر سازندوں کے ساز کے ہم آواز ہو کر گلے کا سوز جگاتے رہو، یہ زیادہ آسان تھا۔ مگر کیا کروں کہ میرا دھیان بار بار اس جھروکے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں عورتیں بیٹھی تھیں، درمیان میں پردہ تھا۔ ادھر والیاں ہمیں بہ آسانی دیکھ رہی ہوں گی مگر مردانہ حصے میں بیٹھے لوگ ادھر نہیں دیکھ پا رہے ہوں گے اس لیے کہ پردہ دبیز تھا۔ پھر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں بیٹھی شخصیت میں سے کوئی مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظر مجھے چبھتی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ کون ہے، مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یوں تو پوری محفل کی نظر مجھ پر مرکوز تھی۔ مگر اس نظر میں کوئی اور بات تھی اسی لیے میں چکرا گیا تھا۔ مگر یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا کیوں کہ میرا رقص دیکھنے، میرے گلے کے جادو سے لطف لینے والے لگاتار مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ شخص تو رکے بغیر آواز لگا رہا تھا۔ "مہدی حسن، مہدی حسن۔"

غزل کے الفاظ اس کے سر سے گزر جاتے پھر بھی وہ چیخے جا رہا تھا۔ غزل سننا فیشن جو ٹھہرا۔ امراء و روساء غزل پسند کرتے ہیں اس لیے جاہل بھی خود کو ان کا ہم پلہ قرار دینے کے لیے غزل کی فرمائش کرتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک صاحب آئے اور حسن آرا سے بولے "بڑے سائیں کو محفل میں بلایا ہے، تم چھپن چھری کو لے کر ضرور آنا۔"

چھپن چھری میرا لقب تھا۔ لوگ مجھے اسی نام سے پہچانتے تھے۔ اسی نام سے پکارتے تھے۔ میری ہی وجہ سے میری ٹولی مشہور تھی۔ مگر دعوت قبول کرنے کی ذمے داری حسن آرا کے سر تھی۔ وہی دعوت کے معاملات طے کرتا تھا۔ رقم کے لین دین میں وہ ذرا سخت تھا تا۔ میں تو بس اس کے حکم پر چل دیتا تھا۔ وہ جہاں کہتا ناچنے پہنچ جاتا تھا۔ ہاں جب کوئی مجھ سے کہتا "چھپن چھری تم کیا لو گے" تب میں مول تول کرتا ورنہ حسن آرا کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ وہ اگر صرف گیت کی محفل کی دعوت قبول کرتی تو میں صرف گیت سناتا اور رقص کی دعوت ہوتی تو رقص بھی کرتا۔

وہ محفل بھی حسن آرا نے بک کی تھی جس کی یاد "مہدی حسن، مہدی حسن" کی تکرار سن کر آ رہی تھی۔ حسن آرا نے کہا تھا کہ اس دعوت میں ایک وڈیرا بھی آئے گا۔ میں خوش ہو گیا تھا کہ تب تو بخشش بھی اچھی ملے گی۔ اس دعوت میں واقعی وڈیرا آیا تھا۔ ان کے سامنے مجھے آواز کا جادو جگانا تھا۔ میں نے دیپک راگ میں تان لگائی "سجنوا دل جلے ہے سانجھ ڈھلے۔"

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ دیپک میں تان لمبی ہوتی ہے۔ میں نے ایک ہاتھ کان پر رکھا دوسرے ہاتھ سے "بھاؤ" بتا کر وجد کے عالم میں تان لگا رہا تھا۔ بغیر ہونٹ ہلائے نی پا دھا نی، گلے سے نکال رہا تھا کہ سائیں جو سیب کھا رہے تھے یکایک اٹھے اور ادھ کھایا سیب میرے ہاتھ پر رکھ کر بولے "لے تو کھا۔"

شاید وہ یہ سمجھا تھا کہ میں ہاتھ پھیلا پھیلا کر اس کا سیب مانگ رہا ہوں۔ ایسے لوگوں کے سامنے مجھے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت اس شخص کی فرمائش سن کر مجھے وہی وڈیرا یاد آ گیا۔ مگر کیا کرتا؟ اردو نہ سمجھنے والے کی فرمائش بھی پوری کرنی تھی۔ میں نے بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل "لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں" چھیڑ دی۔

غزل ختم کر کے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اب باری تھی حسن آرا کی وہ درمیانی وقفہ پورا کرتا تھا۔

ایک نوکر نے فوراً صندل کا شربت پیش کیا۔ صندل کے شربت کی ٹھنڈک رگ رگ میں اترتی چلی گئی، میں نے آنکھیں بند کر کے پیٹھ کو گاؤ تکیے سے لگا دیا۔ مگر فوراً ہی اسی احساس نے پھر سے بے چین کر دیا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر پھر ایک بار اس دبیز پردے پر نظر ڈالی مگر کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ میرا تجسس سوا ہو چکا تھا کہ مجھے اس طرح کون گھور رہا ہے۔ میرا تعلق جس صنف سے تھا اسے عورتیں اچھا نہیں سمجھتی تھیں اور پردے کے پیچھے جو بھی تھا وہ مرد تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً عورت ہو گی۔ کوئی

عورت مجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہے کہ مجھے نظروں کی چبھن محسوس ہو؟

جب یہ الجھن نہ سلجھی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پرانے چاہنے والے مسلسل میرا نام لے لے کر آوازیں دے رہے تھے کہ میں ناگن پیش کروں۔ ناگن گاؤں اور طوفانی رقص کروں تو میں ان کی فرمائش رد نہ کر سکا۔ طبلے کی تھاپ پر بجلی بجنے لگا۔ جیسے جیسے ڈھلک نواز کی گت تیز ہوتی' ہاتھ کی رفتار بڑھتی۔ میری کمر بھی بید مجنوں کی طرح لچک لچک اٹھتی بلکہ یوں سمجھیں کہ میں کڑکتی بجلی کی طرح لہرانے لگا تھا۔

یہ سلسلہ اذان تک دراز رہا۔ میں تھک کر چور ہو گیا۔ تھکن سے چور جسم لیے میں اپنے لیے مختص کردہ کمرے میں جا کر پڑ گیا۔ سازندے بھی آ آ کر اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہم سب دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

میری آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ میں انگڑائی لے کر اٹھ گیا اور نیم کی ڈالی سے مسواک کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ یہ کوٹھی جن صاحب کی تھی۔ ان کی بہت زمین اور کاروبار تھا۔

حسن آرا نے ہی یہ دعوت قبول کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بڑے لوگ ہیں اچھی بخشش ملے گی۔ ان دنوں سیاست عروج پر تھی۔ حالات بے قابو ہو رہے تھے۔ اس لیے ہمیں اب کم کم ہی دعوتیں ملتی تھیں۔ کافی عرصہ بعد کسی بڑے کے یہاں سے دعوت ملی تھی۔ یہاں آنے سے قبل مجھے ان صاحب کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ تھا۔ یہاں آ کر ہی پتا چلا کہ یہ پشتینی نواب ہیں اور انڈیا میں بھی بہت کچھ چھوڑ آئے ہیں اسی لیے لوگ انہیں نواب کہتے تھے۔ نواب صاحب کے بیٹے کو باپ بننے کا اعزاز ملا ہے۔ وارث کا وارث آیا ہے اسی وجہ سے ہمیں رات میں بخشش خوب ملی تھی اس لیے اس وقت بلکہ ساری رات تھکن کا احساس نہیں ہوا تھا مگر اب بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اتنی لمبی نیند لینے کے بعد بھی کسلمندی طاری تھی۔ میں مسواک کرتا ہوا ذہن پر چھائی کسلمندی کو دور کرنے برآمدے میں آیا تھا کہ مجھے شاک سا لگا۔ میری نظریں چوبارے پر جم سی گئی تھیں۔ پتھر کی مورت بن گیا تھا میں۔ ہاتھ تک ہلنا بھول گئے تھے۔

چوبارے پر جو کوئی بیٹھی تھی' وہ بھی چونک گئی تھی اور مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی پھر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔

اس وقت مجھے اپنا گلا خشک محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسے جیسے گلے میں کانٹے اگ آئے ہوں۔ میری عقل ماؤف تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ مغالطہ ہے یا حقیقت' یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میرے دل و دماغ میں طوفان سا اٹھنے لگا تھا۔ اپنی ہستی کو میں ڈولتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میرے دماغ کی اسکرین پر بار بار ایک دھندلا سا عکس آتا اور مٹ جاتا پھر اس عکس کی جگہ وہ ہستی لے لیتی جسے میں نے کچھ دیر پہلے چوبارے پر دیکھا تھا۔ میرا ذہن الجھنے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کیوں وہ ہستی مجھے اپنی اپنی سی لگ رہی ہے۔ کیوں اس میں مجھے ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی ہے۔

ابھی میں اسی فکر میں غوطہ زن تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں پھرتی سے پلٹ گیا۔ میرے پیچھے حسن آرا کھڑا تھا۔ اس کے لپ اسٹک پتے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "اے بی بی! کس سوچ میں ڈوبی ہو؟" وہ بولا۔

"اے ہے میں کیوں سوچ فکر میں رہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

"کوئی تو بات ہے' جس کی پردہ داری ہے۔" وہ داہنی آنکھ دبا کر بولا۔ "کسی پر دل آ گیا ہے کیا؟ یہ نواب کی کوٹھی ہے سونے کے توڑے ملیں گے۔"

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور کمرے میں لوٹ آیا۔ میں نے پھولدار فراک پہن رکھی تھی۔ وہی فراک جو میں رات میں پہنے ہوئے تھا' اسی میں سو گیا تھا اس لیے وہ بری طرح مسل گیا تھا۔ شکنوں سے بھر گیا۔ مجبوراً اسے اتار کر ایک نئی میڈم کا دیا ہوا گاؤن پہن لیا اور بستر پر دوبارہ لیٹ گیا اور غور کرنے لگا لیکن ہر طرف اندھیرا سا لگا' کوئی راہ سجھائی نہ دی۔ میں مکمل معلومات کا طلب گار تھا۔ لیکن کس سے پوچھوں' کوئی ایسا بندہ نظر نہ آیا۔

کوئی ایسا ویسا گھرانا ہوتا تو میں اب تک زنان خانے میں جا کر پتا کر آتا' لیکن یہ کوٹھی نواب کی تھی۔ ان کا رعب و جلال میں نے رات ہی میں دیکھ لیا تھا۔ ذرا سی خطا پر انہوں نے ایک صاحب کو کارندوں سے اٹھوا کر باہر پھنکوا دیا تھا۔ یوں بھی ایک نواب کے چہرے پر رعب و جلال نہ ہو' قوت کا مظاہرہ نہ ہو تو سب بے کار ہے۔

میں نے رات میں بھی غور کیا تھا کہ نواب صاحب کا

چہرہ مجھے پہچانا پہچانا سا لگ رہا تھا پھر اس چہرے میں کوئی ایسی بات تھی جو میرے دماغ کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اس حیدرآباد میں ہر قسم کے لوگوں میں فن دکھا چکا تھا مگر اس سے پہلے میں کبھی ایسے کشش و پیچ کا شکار نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار ایسا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میرے سینے میں جو دل ہے اس کی بے قراری کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ لیکن کیوں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"اے ہے بہن! یہ رہ رہ کر تم کس خیال میں ڈوب رہی ہو؟" حسن آرا کی آواز پر میں پھر سے حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

"طبیعت کچھ بھاری بھاری سی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

حسن آرا نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔ "خیر تو ہے؟" اس نے پھر آنکھ دبا دی۔

"خدا کے لیے، بہن، مجھے اکیلا چھوڑ دو، مذاق بھی گراں گزر رہا ہے۔" شاید میری آواز کچھ تیز ہو گئی تھی۔ سازندوں میں سے ایک، انوری نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "کیوں شور مچا رکھا ہے، سونے کیوں نہیں دیتیں۔"

میں نے بھی چادر اوڑھ کر لیٹ جانے میں عافیت سمجھی تبھی نواب صاحب کا نوکر طشت میں انواع و اقسام کے کھانے لے آیا۔

"بھئی اب اٹھ بھی جاؤ، ناشتا لایا تھا مگر تم لوگوں نے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ اب کھانا لایا ہوں تو اسی طرح پڑے اینٹھ رہے ہو۔ دن کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر تمہیں خبر ہی نہیں۔" نوکر نے تیز آواز میں کہا۔

"چل چل اٹھ جو مل رہا ہے کھا لے اور گھر چل۔" حسن آرا نے پھر ٹوکا اور میں اٹھ کر دسترخوان پر پہنچ گیا۔ کھا پی کر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

☆......☆

نواب صاحب کے ہاں سے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ اتنی ہی بخشش ملی تھی۔ ایسے ہی لوگوں کی سرپرستی میں ہم جیسے لوگ زندہ تھے۔ امرا کے دو شوق تھے۔ شکار کھیلنا اور ناچ رنگ کی محفلیں سجانا۔ ایسی محافل کے بھی الگ الگ انداز تھے۔ کوئی طوائفیں بلواتا تو کوئی مجھ جیسی مخلوق کے نام پر محفل سجاتا۔ ہماری محفل ہنسی مذاق کی محفل کہلاتی کیونکہ ہمارے ساتھ بھانڈ بھی ہوتے جو نقلیں اتار کر ہنساتے۔

میری ٹولی حیدرآباد کی سب سے مشہور ٹولی تھی۔ "چھمنا چھری" کے نام سے لوگ ہمیں یاد کرتے تھے۔ شہر میں ہر جگہ میرے قدردان موجود تھے۔ پورے شہر میں میرا طوطی بولتا تھا۔ گھر سہون تک مجھے بلایا جاتا تھا۔ کیونکہ مجھے میری اماں منی بیگم نے اتنا طاق کر دیا تھا کہ بڑی بڑی طوائفیں بھی میرے آگے ٹک نہیں پاتی تھیں۔ کتھک، اوڈیا، پانی پوریم ہر قسم کے کلاسک ناچ میرے لیے آسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی بڑی پارٹیوں میں ہمیں بلایا جاتا تھا۔ میری اماں منی بیگم کا کہنا تھا کہ "ایک دن تو بہت نام کمائے گی۔" اس کا کہنا صحیح ثابت ہو رہا تھا۔

اب منی بیگم گھر سے نکلتا نہیں تھا۔ عمر کی زنجیروں نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس نے مجھے دس سال کی عمر سے پالا تھا اس لیے میری نظروں میں اس کا بڑا احترام تھا۔ اس کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اس نے مجھے ہجڑا بنائے جانے کے عمل سے بچا لیا تھا۔

میرے ماں باپ کون ہیں یہ مجھے پتا نہیں ہے۔ مجھے بھی اس بات کی کھوج نہ تھی اور نہ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس دنیا میں میرا کون کون ہے۔ میں نے تو اماں منی بیگم ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ وہی میری ماں تھا اور وہی باپ۔ اس کے سینے سے لگ کر ہی مجھے نیند آتی تھی۔ خود منی بیگم بھی مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا تھا۔ لیکن جب سے میں نے چوبارے والی ہستی کو دیکھا تھا میرے دل کا عجب حال تھا۔ میں کبھی سوچتا کہ اس سے جا کر پوچھ لوں کہ اسے دیکھ کر میرا دل کیوں کھنچا چلا آتا ہے۔ کیوں مجھے اس میں مقناطیسی کشش محسوس ہوتی ہے؟

اسی کشش و پیچ میں کئی دن گزر گئے۔ اب صبر کا یارا نہ تھا۔ میں اپنے اندر سے اٹھتے ہوئے سوالات سے اتنا گھبرا اٹھا تھا کہ خود کو روک نہ پایا اور گھر سے نکل پڑا۔

باہر جاتے دیکھ کر اماں منی بیگم نے پوچھا۔ "ارے او نگوڑ ماری! کہاں چل دی۔ کسی یار سے وعدہ وعید کر رکھا ہے؟"

"بس اماں، ایک کام یاد آ گیا ہے، اس سے نمٹتے ہی میں لوٹ آؤں گی۔"

"تجھ پر خاک پڑے۔ ارے او کتے کی ٹیڑھی دم، میں پوچھ رہی ہوں کہاں کو جا رہی ہے؟" نور بیگم نے پھر پوچھا۔

"بس اماں، تمہارا کفن لانا ہے۔" میں نے کہا اور قدم تیز کر دیے۔ پیچھے سے منی بیگم کی دہائی آتی رہی۔

میں نے گلی سے نکل کر تھوڑی سے بھاگتی ٹریفک پر نظر ڈالی۔ سب میں گویا دوڑ کا مقابلہ تھا۔ ان سب سے قطع نظر کر کے میں نواب صاحب کی کوٹھی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

کوٹھی پر پہنچی تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں اندر بڑھتی چلی گئی۔ روش کو پار کر کے میں برآمدے میں پہنچی تھی کہ وہی ہستی مجھے پھر نظر آئی اور میں ٹھٹک گیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا سو وہ بھی اپنی جگہ پر پتھر کی مورت کی طرح ایستادہ ہو گئی۔

"اماں......!" میں نے اسے آواز دی تو وہ ایسے چونک گئی جیسے میں نے اسے جھنجوڑ دیا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آ......آ......بیٹھو!"

برآمدے میں دو کرسی پڑی تھی ایک پر میں بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ "شربت منگواؤں؟"

"جی نہیں، میں بس ایک سوال پوچھنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"پوچھو۔"

"آپ میں مجھے اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟"

"اس کا جواب میں ابھی دیتی ہوں۔" کہہ کر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں البم تھا۔ اس نے وہ البم میری طرف بڑھا دیا۔ اس دور میں تصویر کھنچوانا صرف امیروں کا شوق تھا۔ البم تو میں نے بھی پہلی بار دیکھا تھا۔

میں نے البم کھولا۔ البم کھولتے ہی میں ایسے چونک گیا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ پہلے ہی صفحے پر ایک بچے کی بلیک اینڈ وائٹ کئی تصویریں تھیں۔ یہ تصاویر بھی کسی فوٹو گرافر کی بنائی ہوئی تھی اور یہ تمام تصویریں میری جانی پہچانی تھیں۔ ایسی ہی تصویریں میرے پاس بھی تھیں۔ ان تصاویر میں جو بچہ تھا، وہ وہاں والی تصاویر میں بھی تھا۔ اگر کچھ فرق تھا تو بس اتنا کہ ان تصاویر میں بچے کے ساتھ جو عورت تھی وہ کافی بارعب تھی یا پھر انہی صاحبہ کی تصویر تھی جب کہ میرے پاس جو تصاویر تھیں ان میں بچے کے ساتھ منی بیگم تھا۔ میرے پاس منی بیگم والی جو تصویر تھی، وہ بھی ایک صاحب نے اپنے ہاں کی پارٹی میں اتاری تھی۔

میں نے تصویروں پر سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

"اماں! یہ تصویریں کس کی ہیں؟"

"میرے بڑے بیٹے کی جو بچپن میں کھو گیا تھا۔" ان کی آواز میں درد ہی درد تھا۔

"آپ نے اس کی خبر لینے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ جیسے میں جواب دے کر جرم کر رہا ہوں۔

"ابتداء میں بہت کوشش کی پورے حیدرآباد میں تلاش کرایا پھر صبر کر لیا۔"

"اگر وہ آپ کو مل جائے تو؟" میں نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا اور امید بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں وہ اب نہیں ملے گا کیونکہ کچھ دنوں پہلے مصدقہ خبر ملی ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔" انہوں نے مردہ لہجے میں ایسے کہا جیسے وہ کسی کو پرسہ دے رہی ہوں۔ دل کا درد چہرے پر میں نے صاف دیکھ لیا تھا۔

اماں کی بات سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل پر کسی نے چھری ماری ہو۔ میں اندر سے لہولہو ہو گیا۔ تب میں نے سر جھکا کر کہا۔ "نہیں اماں، وہ مرا نہیں ہے۔"

"ہاں، وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔ میں ماں ہوں ناں تو اسے کیسے نہیں پہچانتی۔" انہوں نے آنکھوں پر ہتھیلی پھیر کر کہا۔ آنسو پونچھنے کے بعد بھی نمی نظر آرہی تھی۔

"آپ...... آپ شاید اس کا چہرہ بھول چکی ہیں۔ اسی لیے مغالطہ ہوا۔" میں نے آنکھوں میں بھر آئے پانی کو الٹی ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"آج گھر میں نواب صاحب نہیں ہیں، اسی لیے میں نے تمہیں بٹھا لیا۔ اگر وہ رہتے تو شاید اندر آنے بھی نہیں دیتے۔ میں ماں ہوں ناں اسی لیے تمہیں بلا لیا۔" کہہ کر وہ کھوئی ہو گئیں۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مدوجزر میں گھر گئی ہیں۔ ان کے اندر طوفان سا اٹھ رہا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ٹہلتی رہیں پھر رک کر بولیں۔ "جانتے ہو میں نے تمہیں کل ہی پہچان لیا تھا۔ آدھا دن اور ایک رات میں نے کیسے گزاری، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ بالآخر فیصلہ کر ہی لیا کہ میں تمہیں بیٹا نہیں کہوں گی۔"

"کیوں؟" یہ سوال خود بخود میری زبان پر آ گیا۔

"اس لیے کہ میری ایک بیٹی بھی ہے۔ لڑکیوں کی زندگی تلوار کی دھار ہے۔ ہلکی سی بھی لغزش خواہ والدین کی ہو یا خاندان کے کسی فرد کی، اس کا سیدھا اثر لڑکیوں پر پڑتا ہے اور ان کی زندگی میں اندھیرا اتر آتا ہے۔ میں نہیں

چاہتی کہ میری بچی کی زندگی پر تمہارا کالا سایہ پڑے اور لوگ دوسرے بیٹے کو بھی تمہارے جیسا سمجھنے لگیں۔ اُس کے بچے کی ولدیت سوالیہ نشان بن جائے۔" انہوں نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا اور اندر جانے کے لیے مڑ گئیں۔

میرے اندر ہاہاکار سا مچ گیا تھا۔ چیخ چیخ کر رونے کو دل کہہ رہا تھا۔ مگر میں خود پر جبر کیے بیٹھا تھا۔ وہ جا چکی تھیں۔ برآمدے میں، میں اکیلا تھا۔ میرے اندر اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ میں اٹھ کر کھڑا ہوتا۔ تبھی اندر سے ایک عورت باہر آئی۔ وہ اماں سے بھی زیادہ عمر کی تھی۔ اس نے ٹوٹی کمانی کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی اور میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بغور دیکھنے لگی پھر بولی۔ "میں...... میں نے ہی تجھے دودھ پلایا ہے۔ تو میرے لیے سگے بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔ کاش تو یہ سوانگ نہ بھرتا۔ کاش تو مرد بن کر اس گھر میں آتا۔ بیٹے! ہم سب مجبور ہیں۔ اندر تیری ماں آنسو بہا رہی ہے اور تیری بہن رونے کی وجہ پوچھ رہی ہے۔ اب وہ انہیں کیسے بتائے کہ تمہارا بھائی ہجڑا ہے۔ کل جب تمہاری شادی ہوگی تو تمہیں سسرال والے یہ کہہ کر طعنہ دیں گے کہ تمہارا بھائی ہجڑا ہے۔ صرف بیٹی کی خاطر تجھے سولی پر چڑھایا جا رہا ہے۔ تو جلد سے جلد یہاں سے چلا جا۔ صاحب نے حقیقت جان لی تو وہ اپنی عزت بچانے کی خاطر تجھے گولی سے اڑا دیں گے۔"

موقع کی نزاکت دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا اور وہاں سے چل پڑا۔ اس وقت مجھے اپنا پیر من من بھر کے لگ رہے تھے۔ میں بالکل ہول اٹھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ جب کوئی راہ سجھ نہ آئی تو میں چلتا چلا گیا۔

کافی دور آنے کے بعد مجھے ایک خالی رکشا نظر آ گیا اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ وہ رکشا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر ہم نے محسوس کیا کہ رفتار آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اتنی تیز ہو رہی ہے کہ آس پاس کے مناظر بھی دھندلا گئے تھے۔ برابر سے گزرتے تانگے، رکشا، پیدل چلتے لوگ سب ایک سائے سے نظر آتے اور گزر جاتے۔

"اے!" میں نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "رکشا کو قابو کرو۔"

"بی بی رکشا قابو میں ہے مگر ڈرائیور بے قابو ہے۔"

اس نے شائستہ انداز میں غیر شائستہ بات کہی۔

"میں پوچھتی ہوں یہ کس رفتار سے رکشا بھگا رہے ہو۔ چلو انسان کی طرح شرافت سے رفتار کم کرو۔"

"رکشا میرے دل کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ اگر رفتار کم کر دی تو میرا دل بھی ہلکا ہو جائے گا۔"

"ارے تجھے موت آئے ناس پٹے رکشا روک۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"چیخو خوب چیخو مگر اب یہ رکشا رکنے کا نہیں۔ یہ تبھی رکے گا جب میں چاہوں گا اور فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"تیری قبر میں کیڑے بلبلائیں۔ تیری لچکتی کھاٹ اٹھے۔ روک لے حرامزادے روک لے ورنہ میں چیخ چیخ کر سب کو جمع کر لوں گی۔"

"چیخو خوب چیخو تمہاری چیخ سننے والا کوئی نہیں ہے۔" وہ رسان سے بولا۔ "مگر تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے۔ اتنی بھونڈی ہو گئی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

رکشا رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا مگر کافی دیر بعد اس وقت جب ہم ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد، ہر طرف ویرانی تھی، خاموشی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی قبرستان میں پہنچ گئے ہیں۔ ایسی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو دھماکا سا ہوتا۔ اس خاموشی کو میری چیخ نے تار تار کر دیا۔ میں نے رکشے پر سے چھلانگ لگا دی تھی۔ میں سخت زمین پر گرا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو میں ایک گڑھے میں گرا ہوا تھا۔ مجھ پر سکون چھا گیا تھا اور میں بالکل سکتے کی سی کیفیت میں زمین پر پڑا تھا۔ میرے سامنے ایک نوجوان ہاتھ باندھے باادب کھڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ہی لیے کھڑا ہے۔

"آپ...... آپ کون ہیں؟" میں نے ہکلا کر پوچھا۔

"میں ایک راہگیر ہوں۔ ادھر سے گزر رہا تھا کہ آپ کو یوں سڑک کے کنارے پڑا دیکھا تو رک گیا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

میں نے نظر گھما کر آس پاس دیکھا۔ دور و نزدیک کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ رکشا تھا، نہ ڈرائیور۔ یہ میں کہاں آ گیا۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ آگے

بڑھا دیا تا کہ میں اس کا سہارا لے کر کھڑا ہو جاؤں مگر میں نے سہارا لینا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”یہ...... رکشا کہاں گیا؟“

” رکشا تو مجھے نظر نہیں آیا۔ ہاں آپ نظر آ ئیں سو میں رک گیا۔ ویسے آپ اگر رکشے پر تھیں تو اس گڑھے میں کیا کر رہی تھیں؟“ اس نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”رکشا الٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے میں اچھل کر باہر گری تھی۔“

”اچھا اس رکشے پر آپ تھیں۔ ابھی میں نے دیکھا تھا کہ ایک رکشے والا رکشا سیدھا کر رہا تھا پھر وہ سیدھے چلا گیا۔ ادھر .....“ اس نے اشارے سے بتایا۔

”جی ہاں میں تھا اس رکشے پر۔“ میں نے جواب دیا۔

میری اصل آواز سن کر اس نے بغور مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر کوئی ہمیں دیکھ کر مسکراتا ضرور ہے۔

”لگتا ہے وہ مغالطے میں آ گیا ہوگا۔ اس نے تمہیں لڑکی سمجھا ہوگا۔ آج کل یہاں ایک گروہ گھس آیا ہے جو لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ رکشا والا بھی شاید اسی گروہ کا ہوگا۔“

اس کی بات پر میں دل ہی دل میں خوش ہو گئی کہ واقعی مجھے دیکھ کر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ گویا عام زندگی میں بھی میں لڑکی بن کر لوگوں کو مغالطے میں رکھ سکتا ہوں۔ ابھی تک میں نے اس نہج پر نہیں سوچا تھا مگر زندگی میں یہ جو نیا موڑ آیا تھا اس میں میرا یہ بہروپ کام آ سکتا ہے۔ مگر ابھی زیادہ سوچنے سمجھنے کا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ”اب ہم یہاں سے شہر کیسے جائیں گے؟“

”میں پکّہ قلعہ جا رہا ہوں میرے پاس بائیک ہے تم بیٹھنا چاہو تو بیٹھ لو۔ لوگ ہنسیں گے مگر مجبوری ہے۔“

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس طرح میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ میرے چہرے کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر منی نے پوچھا۔ ”اے ہے بٹی تجھے ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائے گی؟“

”اماں!“ کہہ کر میں اس سے لپٹ گیا۔ میری آنکھوں میں ساون بھادوں کا سماں تھا۔

وہ مجھے سینے سے لگائے کچھ دیر کھڑا رہا' پھر میری پیٹھ تھپک کر بولا۔ ”کیا بات ہو گئی مجھ کو بتائے گی نہیں؟“

”مجھے کچھ کچھ تو یاد ہے پھر بھی تو آج مجھے سچ سچ بتا دے کہ تو مجھے کہاں سے لائی تھی؟“ میں نے منی بیگم سے پوچھا۔

وہ میرا سوال سن کر سوچ میں ڈوب گیا جیسے خیالوں میں وہ خود سے لڑ رہا ہو۔ مجھے حقیقت بتائے یا نہیں' اسی کشمکش میں ہے' پھر شاید اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”میں نے تجھے ایک غنڈے کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ کراچی کے ایک پارک میں تو بیٹھا رو رہا تھا کہ تجھ پر ایک غنڈے کی نظر پڑ گئی۔ وہ تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اتفاقاً میں ادھر جا نکلا۔ تیرے رونے پر میں بوکھلا اٹھا اور ان غنڈوں سے بھڑ گیا۔ ہم بھی پانچ۔ جم کر ہم نے فائٹ کی اور اسے بھگا کر دم لیا۔ اس طرح تم ہمارے پاس آئے۔ ہاں تمہارے گھر کے بارے میں جب میں نے پوچھا تو تم نے بتایا کہ کراچی تمہیں تمہارا چچا لے کر آیا ہے۔ وہ تمہیں بھیڑ میں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔“ منی نے کہا۔

”تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اپنے خاندان کو جان لیا ہے۔“ میرے انکشاف پر وہ حیرت سے گویا اچھل پڑا۔ اس نے خود کو مجھ سے دور کر لیا تھا اور اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ سکتے کے عالم میں کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تو کیا تو مجھے چھوڑ دے گی؟ اس بڑھاپے میں مجھے اکیلا کر جائے گی؟“

اس کی حالت دیکھ کر میں آگے بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ بے چینی کو کم کرنے کا مجھے ایک یہی طریقہ سوجھا تھا۔ میں نے اس کے گلے لگ کر اس کے آنسوؤں کو پونچھ کر کہا۔ ”نہیں اماں' میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔“

”پھر...... پھر...... تو نے یہ کیوں کہا کہ اپنے خاندان کو ڈھونڈ چکی ہے۔“

”ہاں' یہ بھی سچ ہے مگر یہ بھی تو سوچ کہ میں لاکھ کوشش کر لوں مگر خود کو بدل نہیں سکتی۔ اس حالت میں وہ کیا مجھے قبول کر لیں گے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔ لوگ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔ اپنے لیے گالی سمجھتے ہیں اگر تو ان کے پاس گئی تو دنیا والے اس گھر کو مذاق بنا لیں گے۔ اس طرح نہ صرف تیرا بلکہ اس پورے گھر کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ اگر تو نے ان لوگوں کو جان لیا ہے تو بھی ان سے دور رہ۔“

”کوشش میری یہی ہے۔“ میں نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

# دھوکا

محترمی السلام علیکم
میں سرگزشت کا قاری ہوں۔ عرصہ بیس سال سے پڑھ رہا ہوں۔ بصارت ساتھ چھوڑ رہی ہے لیکن سرگزشت کا چسکا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بصارت مکمل ساتھ چھوڑ جائے اس سے قبل میں اپنا ایک پرانا واقعہ سرگزشت میں چھپا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک عجیب و غریب واقعہ جس کی توجیح آج تک عقل دے نہیں پائی ہے۔ قطب الدین ایک دھوکا تھا تو پھر میرے کام کیوں آرہا تھا؟ کیا وہ میری نیکی تھی جو میں نے ایک بیوہ اور بچیوں پر کی تھی۔ اگر قارئین اس کا جواب دے سکتے ہیں تو میری خلش مٹا دیں۔

ارسلان
(کراچی)



وہ عجیب فاقہ مستی کے دن تھے۔ روزگار ناپید تھا اور مسائل روز بروز بڑھتے جارہے تھے۔ پاکستان کے قیام کو ابھی صرف دو برس ہوئے تھے۔ لوگوں میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ بلکہ جنون موجود تھا۔ میں بھی کچھ کر دکھانے کا عزم لے کر پاکستان آیا تھا۔ میری طرح ہر پاکستانی اس جذبے سے سرشار تھا۔ اس وقت تک کرپشن، رشوت اور قومی خزانے میں خیانت کا مرض لاحق نہیں ہوا تھا۔ ہر شخص اپنے طور پر پاکستان کے استحکام کا خواہاں تھا۔ جس عہدے کے سول اور

اعلیٰ افسران آج کل ایئرکنڈیشنڈ گاڑی کے بغیر گھر سے باہر نکلنا باعث توہین سمجھتے ہیں عالیشان دفتروں اور بیش قیمت فرنیچر استعمال کرنے کے باوجود کام نہیں کرتے، افسران اس دور میں درختوں کی چھاؤں یا خیموں میں بیٹھ کر دن رات کام اور صرف کام کرتے تھے۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور دیگر سہولتوں کی کم یابی کے باوجود وہ صرف کام کرتے تھے۔ میں نے بڑے بڑے سیکریٹریز اور ڈائریکٹرز کو کھلے آسمان تلے کام کرتے دیکھا ہے۔

میں بھی اس نوزائیدہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس ناخوشی میں بھی بہت خوش تھا۔

ان ہی دنوں مجھے علم ہوا کہ آل رضا صاحب کمشنر کراچی بن چکے ہیں۔ آل رضا صاحب سے کچھ پرانی یادیں وابستہ تھیں میں اس زمانے میں بے گھر تھا اور اے بی سینیا لائن کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس کوارٹر میں میرے علاوہ بہت سے خاندان رہتے تھے۔ جی ہاں ایک کوارٹر میں کئی کئی خاندان مقیم تھے۔

میں ایک دن آل رضا صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے بہت سینئر تھے لیکن مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے اور دوستوں کی طرح پیش آئے۔

انہوں نے میرے لیے چائے اور بسکٹ منگوائے اور بولے۔ ”ہاں ارسلان اب بتاؤ کیسے آنا ہوا؟“

مجھے عرض مدعا کرتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ میری طرح اس شہر میں لاکھوں افراد بے گھر و بے در پڑے ہیں۔ آل رضا صاحب میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟

”تم رہ کہاں رہے ہو؟“ انہوں نے یہ پوچھ کر میری مشکل آسان کردی۔

میں نے کہا۔ ”جناب یہ مشکل سوال آپ نے کیوں کردیا۔ میں اے بی سینیا لائن کے ایک کوارٹر میں رہتا ہوں بلکہ صرف رات کو سوتا ہوں۔ اسی کوارٹر میں مجھ جیسے بیس بائیس افراد اور رہتے ہیں۔“

”اوہو!“ آل رضا صاحب کے منہ سے شاید غیر ارادی طور پر یہ لفظ نکل گیا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر ٹیلی فون اٹھایا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولے۔

”میں آل رضا بول رہا ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟ کبھی ہماری طرف بھی چکر لگائیے حضرت! یار آپ سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔ میں ارسلان بھائی کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ میرے دوست اور چھوٹے بھائیوں کی طرح ہیں۔ آپ انہیں کہیں کچھ الاٹ کردیں۔ بڑی نوازش ... ممنون رہوں گا آپ کا۔“ انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا اور مجھ سے بولے۔ ”آپ اسی وقت محکمۂ بحالیات چلے جائیں۔ میں نے ڈائریکٹر صاحب سے بات کرلی ہے، آج ہی آپ کا کام ہوجائے گا۔“

میں ان کا شکریہ ادا کرکے محکمۂ بحالیات کی طرف چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا کام ہر قیمت پر ہوجائے گا۔ یہ آل رضا صاحب کی درخواست نہیں بلکہ حکم تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی وضع داری انہیں حکم صادر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میری توقع کے عین مطابق ڈائریکٹر صاحب نے فوری طور پر ایک فلیٹ مجھے الاٹ کردیا اور اپنے ایک جونیئر افسر کو حکم دیا کہ آپ ارسلان صاحب کو فلیٹ کا قبضہ دلادیں۔

فلیٹ برنس روڈ کے علاقے میں تھا۔ وہ علاقہ ان دنوں اتنا گنجان نہیں تھا۔ صاف ستھری سڑکیں تھیں اور صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ فلیٹ کا بندوبست ہوگیا ہے اب میں انڈیا سے اماں اور بھائیوں کو بھی بلالوں گا۔

فلیٹ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ ہم فلیٹ پر پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں پہلے سے کوئی مقیم ہے ورنہ محکمۂ بحالیات کے افسر صاحب تو اپنے فلیٹ کی چابیاں لے کر آئے تھے۔ وہ بھی یہ دیکھ کر کچھ جھنجلا گئے تھے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی تو بوڑھی سی ایک خاتون نے دروازہ کھولا اور بولیں۔ ”کون صاحب ہیں؟“

”اماں ہم لوگ محکمۂ بحالیات سے آئے ہیں آپ کے پاس اس فلیٹ کا الاٹمنٹ ہے؟“

بڑی بی کی آنکھیں بجھ گئیں۔ انہوں نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بیٹا میرے پاس الاٹمنٹ نہیں ہے۔“

اس وقت سامنے والے فلیٹ میں سے ایک صاحب باہر نکلے۔ انہوں نے اجلا کرتہ اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سر پر جناح کیپ تھی اور پیروں میں سیاہ چمڑے کے شوز، وہ بہت غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔

”دیکھیے اماں اگر آپ کے پاس الاٹمنٹ آرڈر نہیں ہے تو آپ کو یہ فلیٹ خالی کرنا پڑے گا۔“

”بیٹا میرے خاندان کے تمام مرد فسادات میں کام آگئے اب صرف میں اور میری دو پوتیاں باقی ہیں۔ ہم بھی بری طرح زخمی ہوگئے تھے لیکن زندگی تھی اس لیے پہنچ گئے۔

میں اب تک فٹ پاتھوں پر سوتی آئی ہوں اور اس عمر میں مجھ سے دھکے نہیں کھائے جاتے۔ میں اپنی جوان پوتیوں کو لے کر کہاں جاؤں۔ میں نے بحالیات ہی کے ایک کلرک کو سو روپے دے کر یہ فلیٹ حاصل کیا ہے۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ مجھے فلیٹ خالی کرنا پڑے گا۔ بیٹا ٹھیک ہے میں خالی کر دیتی ہوں لیکن مجھے تھوڑا سا وقت تو دو۔ میں شام تک پھر کسی فٹ پاتھ پر ڈیرہ ڈال لوں گی۔''

میرا دل لرز کر رہ گیا۔ میں نے محکمہ بحالیات کے ان موصوف سے کہا۔ ''صدیقی صاحب انہیں اس فلیٹ میں رہنے دیں۔ میں کہیں اور ٹھکانا ڈھونڈ لوں گا۔''

''لیکن جناب وہ ڈائریکٹر صاحب اور کمشنر صاحب کا حکم اور......''

''آپ پریشان نہ ہوں میں کمشنر صاحب سے خود بات کر لوں گا۔''

سامنے والے فلیٹ سے نکلنے والے صاحب اب مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

میں نے واپسی پر ازراہ مروت افسر صاحب کو چائے کی آفر کی جو انہوں نے قبول نہیں کی اور آفس روانہ ہو گئے۔ میں بھی بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان دنوں کراچی میں بسیں بھی برائے نام تھیں۔ ایک ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد بس کی شکل نظر آتی تھی۔ اسٹاپ پر بھی رش نہیں تھا۔

وہاں ایک بڑے صاحب تھے جو فٹ پاتھ پر ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ دو تین لڑکے تھے اور غرارے میں ملبوس ایک خاتون تھیں۔ ان کے ساتھ خوب صورت سی ایک لڑکی بھی موجود تھی۔

اچانک مجھے مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک بس دکھائی دی جس کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بس کا ڈرائیور نشے میں ہو یا پھر بس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بس ان ماں بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی کچل دے گی۔ بس کچھ آگے آئی تو میں نے محسوس کیا کہ بس کی زد میں صرف لڑکی ہے۔

میں نے گھبرا کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس لڑکی کو دھکیلتا ہوا کچھ فاصلے پر جا گرا۔ لڑکی فوراً ہی کپڑے جھاڑ کے اٹھ گئی اس کی والدہ یا جو بھی وہ تھیں پہلے تو مجھے غصے میں گھورتی رہیں پھر چیخ کر بولیں۔ ''شرم نہیں آتی ہے۔ تو نے جان بوجھ کر میری بیٹی کو دھکا دیا۔ میں ابھی تجھے پولیس کے حوالے کرتی ہوں۔''

''خاتون! میرا جرم تو بتائیں میں نے تو آپ کی بیٹی کی جان بچائی ہے۔''

''میں خوب سمجھتی ہوں تم جیسے بدمعاشوں کی چالیں تو جان بوجھ کر میری بیٹی کو لے کر گرا تھا۔ آزادی مل گئی لیکن غلامی کی عادتیں نہ گئیں۔''

اچانک مجھے وہی صاحب نظر آئے جو فلیٹ کے دروازے پر نظر آئے تھے۔ وہ سبز کرتہ پاجامے اور جناح کیپ میں تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ تماشا دیکھنے کو دو چار لوگ اور بھی رک گئے تھے۔ میں اس وقت سے ڈر رہا تھا جب کسی راہ گیر کا جذبہ اسلامی جاگ اٹھے۔ پھر وہ خاتون کی حمایت میں مجھ پر پل پڑتے۔

جناح کیپ والے صاحب میرے اور خاتون کے درمیان آگئے اور خاتون سے بولے۔ ''کیوں اپنا اور اپنی بیٹی کا تماشا بناتی ہو۔ اب بات کو ختم کرو بہن۔''

لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر شاید اس خاتون کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خوامخواہ تماشا بن رہی ہے۔ وہ مجھے گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ٹوپی والے صاحب مجھے اپنے ساتھ سامنے والی چھوٹی سی دکان میں لے گئے۔ دکان میں انڈوں کے کریٹ بھرے ہوئے تھے۔ شاید اس دکان میں انڈوں کی ہول سیل فروخت ہوتی تھی۔

انہوں نے لکڑی کی ایک کرسی میری طرف بڑھائی اسے جھاڑن سے صاف کیا اور بولے۔ ''تشریف رکھیے۔''

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا پییں گے آپ؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''چائے یا لسی؟''

''جی کچھ نہیں، آپ کا بہت بہت شکریہ یہ زحمت نہ کریں۔''

''ارے صاحب زحمت کیسی؟'' انہوں نے کہا اور کسی کو آواز دی۔ چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا دکان کے کسی گوشے سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ انہوں نے اس سے کہا۔ ''دو چائے ملائی والی اور کھارے بسکٹ لے کر آ، پانی بھی لیتے آنا۔'' پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''جناب نام کیا ہے آپ کا؟''

''ارسلان احمد۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں قطب دین ہوں، انڈوں کا کاروبار کرتا ہوں۔'' پھر وہ مسکرا کر بولے۔ ''صاحب آپ نے تو مجھے حیران کردیا۔ اس آپا دھاپی کے دور میں بھی کوئی اتنا بے نیاز ہوسکتا ہے۔ آپ کو اچھا خاصا فلیٹ الاٹ ہوا اور آپ نے ان خاتون کی وجہ سے چھوڑ دیا۔''

''قطب دین صاحب!'' میں نے کہا۔ ''دیکھیے میرا کام تو چل ہی رہا ہے، وہ خاتون اپنی جوان پوتیوں کے ساتھ کہاں جاتیں؟''

''ارے صاحب آپ کی اس بات نے تو مجھے متاثر کیا ہے۔ پھر ابھی آپ نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس لڑکی کی جان بچائی۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بس کی لپیٹ میں تو آپ بھی آسکتے تھے۔''

اس دوران میں لڑکا چائے اور بسکٹ لے آیا۔ میں نے صبح کو ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے تکلف کیے بغیر بسکٹ کھائے، ملائی والی چائے پی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

''میں اب اجازت چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''جی ضرور۔'' قطب دین صاحب نے کہا۔ ''ویسے آپ ملازمت کیا کرتے ہیں؟''

''کہیں بھی نہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں آج کل بے روزگار ہوں۔''

''زیادہ دن بے روزگار نہیں رہیں گے۔'' قطب دین نے کہا۔

میں انہیں سلام کرکے دکان سے باہر آگیا۔

ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ پیچھے سے قطب دین کی آواز آئی۔ ''ارسلان صاحب ذرا ایک منٹ۔''

میں رک کر سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگیا؟

قطب دین تیزی سے میری طرف آئے اور بولے۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو کل ایک ٹائپ شدہ درخواست مجھے دیں کچھ لوگوں سے ہماری بھی سلام دعا ہے شاید آپ کا کام بن جائے۔''

''جی ضرور۔'' میں نے کہا اور تیز قدمی سے آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے قطب دین سے الجھن ہونے لگی تھی۔ آخر وہ چاہتے کیا تھے۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی اور ایک ہی ملاقات میں وہ مجھ سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ مجھے ملازمت دلانے کے درپے ہوگئے تھے۔

میرے ساتھ کمرے میں دوسرے لوگوں کے علاوہ عبدالمنان بھی رہتا تھا۔ میرے اور اس کے حالات یکساں تھے یعنی دونوں ملازمت کی تلاش میں تھے اور دونوں فاقہ مست تھے۔

میں نے اسے قطب دین کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''یار ارسلان! اسے اپنا بایوڈیٹا دینے میں ہرج ہی کیا ہے؟''

''یار! وہ ایک نیم خواندہ شخص ہے۔ انڈے بیچتا ہے۔ وہ بھلا میرے لیے کیا کرسکے گا؟''

''پھر بھی اسے درخواست دینے میں تمہارا کیا جاتا ہے؟''

اس زمانے میں یہ پاؤڈر کاپی اور ڈرائی فوٹو اسٹیٹ کی عیاشی نہیں تھی۔ میں نے اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں نے ملازمتوں کی درخواست سائیکلو اسٹائلڈ کرا رکھی تھیں کہیں سے انٹرویو کال آجاتی تو میں اسے بھیج دیتے تھے۔

میں نے ایک سائیکلو اسٹائلڈ درخواست قطب دین کو دے دی۔

''ارسلان صاحب! اگر آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟'' قطب دین نے پوچھا۔

''میں جہاں رہتا ہوں وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک میڈیکل اسٹور ہے، میں وہاں کا ٹیلی فون نمبر آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ ان تک پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ ویسے میں خود بھی ایک دو دن بعد چکر لگاتا رہوں گا۔''

وہاں سے واپسی پر میڈیکل اسٹور والے نے مجھے آل رضا صاحب کا پیغام دیا۔ میں نے وہیں سے آل رضا صاحب کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے مجھے فوراً آفس پہنچنے کو کہا۔

آل رضا صاحب نے کلفٹن کے علاقے میں میرے لیے ایک بنگلے کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ خاصا وسیع و عریض بنگلا تھا۔ اسے کسی مارواڑی سیٹھ نے تعمیر کرایا تھا۔ آس پاس دور دور تک آبادی تھی۔ شاید اس کی ویرانی دیکھ کر کسی نے وہاں آباد ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بنگلا ویرانے میں تھا لیکن میرے لیے تو اس وقت نعمت تھا۔ میں اسے بھوت بنگلا کہتا تھا۔ سمندر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سمندر کے رخ پر بنگلے میں ایک ٹیرس تھا۔ وہاں سے ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر مجھے مسحور کردیتا تھا۔

عبدالمنان نے بنگلا دیکھنے کے بعد وہاں منتقل ہونے سے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بنگلا شہر سے بہت دور ہے، دور دور تک کوئی بھی مارکیٹ نہیں ہے۔ مارکیٹ تو درکنار کوئی چھوٹی موٹی دکان بھی نہیں ہے۔ مجھے بلیڈ لینے کے لیے بھی صدر جانا پڑے گا۔

میں نے اس بنگلے میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا اور دو دن بعد ہی اس بھوت بنگلے میں منتقل ہوگیا۔ بنگلے میں بڑے بڑے چھ بیڈ رومز تھے۔ بہت بڑا لاؤنج تھا۔ ہال نما ڈرائنگ روم تھا اور سامنے... عقبی رخ پر اتنا بڑا لان تھا کہ وہاں آرام سے کرکٹ کھیلی جاسکتی تھی۔ موٹر سائیکل چلائی جاسکتی تھی اور بہ یک وقت ایک ہزار مہمانوں کی دعوت کی جاسکتی تھی۔ میرا سامان ہی کیا تھا ٹین کا ایک ٹرنک، چھوٹا سا ایک بیگ اور ایک بستر۔ یہ سامان تو ایک بیڈ روم کے کونے میں سما گیا۔ ہاں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ وہاں ٹیلی فون کی لائن موجود تھی اور ٹی اینڈ ٹی والوں کی خوشامد کرکے بحال کرائی جاسکتی تھی۔

میں نے آل رضا صاحب کو پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک دن خود ہی ٹی اینڈ ٹی کے دفتر جا پہنچا۔

میں برآمدے میں داخل ہوا تو مجھے قطب دین نظر آیا وہ اندر سے باہر کی طرف آرہا تھا۔

''ارے ارسلان صاحب!'' قطب دین نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ ''آپ یہاں کیسے؟''

''مجھے کلفٹن کے علاقے میں ایک بنگلا الاٹ ہوا ہے۔ اس کی ٹیلی فون لائن بحال کرانے آیا ہوں۔''

میری بات وہاں سے گزرتے ہوئے ایک بابو نے سن لی اور مجھ سے راز داری کے انداز میں بولا۔ ''صاحب آپ کی لائن چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بحال ہو جائے گی ٹیلی فون سیٹ بھی مل جائے گا۔''

''تو پھر یہ کام کرادیں۔ آپ شاید اس ڈپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں۔''

''بیس روپے ہوں گے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ بیس روپے اس دور میں خاصی خطیر رقم تھی۔ قطب دین نے کہا۔ ''اللہ کے بندے ہم ٹیلی فون کی نئی لائن ڈالنے کی بات نہیں کررہے ہیں۔ پھر یہ تو سرکار کا کام ہے۔ تمہیں کس بات کے پیسے دیں؟''

''تو پھر یہ کام سرکار ہی سے کرالیں۔'' بابو نے بہت بے اعتنائی سے کہا اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔

قطب دین چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر وہ مجھے لے کر ایگزیکٹو انجینئر کے دفتر میں داخل ہوگیا۔

انجینئر بارعب سا ایک شخص تھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر مسکرا کے قطب دین سے بولا۔ ''قطب دین اب کیا ہے؟''

''انجینئر صاحب یہ ارسلان صاحب میرے عزیز ہیں۔ کلفٹن میں رہتے ہیں۔ یہ اپنے بنگلے کی ٹیلی فون لائن بحال کرانا چاہتے ہیں لیکن آپ کے دفتر کا ایک بابو ان سے بیس روپے مانگ رہا ہے۔''

''اچھا! کیا نام ہے اس بابو کا؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''نام تو اس نے نہیں بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

انجینئر صاحب نے مجھ سے بنگلے کا ایڈریس پوچھا۔ پھر ایک کاغذ پر نوٹ کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ قطب دین کے عزیز ہیں تو ہمارے بھی عزیز ہوئے۔ آج چار بجے تک آپ کا کام ہو جائے گا۔'' انہوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اس سے بولے۔ ''ذرا غلام حسین صاحب کو میرے پاس بھیجئے۔''

چند منٹ بعد کمرے میں وہی بابو داخل ہوا جو مجھ سے روپے مانگ رہا تھا۔ ہمیں وہاں دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ انجینئر صاحب نے اسے بنگلا نمبر دے کر کہا۔ ''غلام حسین صاحب! آج شام تک ارسلان صاحب کی ٹیلی فون لائن بحال کرادیں۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' غلام حسین نے فوراً کہا۔

قطب دین کی بدولت میرا اتنا بڑا کام چند منٹ میں ہوگیا ورنہ اس دور میں ٹیلی فون صرف اعلیٰ سول افسران، سرکاری محکموں اور وزیروں سفیروں تک محدود تھا۔

انڈے والا وہیں سے رخصت ہوگیا۔

دو دن بعد میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ارسلان صاحب میں قطب دین بول رہا ہوں۔''

''قطب دین صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں میں نے آپ کی ملازمت کے لیے اصفہانی صاحب سے بات کی تھی۔ آپ آج دس بجے تک ان سے مل لیں۔ میرا حوالہ دے دیجیے گا۔ شاید وہاں آپ کا کام بن ہی جائے۔''

''بہت شکریہ قطب دین صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی نکلتا ہوں۔''

میرے ذہن میں پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ کہاں قطب دین جیسا انڈے بیچنے والا اور کہاں پاکستان کے ایک ممتاز صنعت کار اصفہانی صاحب۔ پھر مجھے عبدالمنان کی بات یاد آگئی یہ آخر جانے میں حرج ہی کیا ہے۔

میں تیار ہو کر مقررہ وقت پر اصفہانی صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ مجھ سے پہلے دس پندرہ ملاقاتی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ میں نے ایک پرچے پر اپنا نام لکھا اور معرفت قطب دین لکھ کر اصفہانی صاحب کی پی اے کو دیا اور بولا۔ ''میری یہ سلپ اصفہانی صاحب تک پہنچا دیں۔''

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب اصفہانی صاحب کی پی اے نے مجھے آواز دی اور بولی۔ ''ارسلان صاحب۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ بولی۔ ''آپ کو اصفہانی صاحب نے بلایا ہے۔''

اصفہانی صاحب بہت شفقت سے ملے اور بولے۔ ''مسٹر ارسلان! آپ پی آئی اے کب سے جوائن کر سکتے ہیں؟''

''سر میں تو کل ہی جوائن کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ خوشی کے مارے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

''او کے۔ میری پی اے آپ کو ڈائریکٹر آپریشنز کے پاس بھیج دے گی۔''

میں ان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

اصفہانی صاحب عملاً اپنی ایئر لائن پاکستان کو دے چکے تھے اور ان کی ایئرلائن اوریئنٹ ایئرویز اب پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن کے نام سے کام کر رہی تھی۔ اب پی آئی اے کے انتظامی معاملات سے اصفہانی صاحب کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ایئر لائن میں ان کی بات کی اب بھی اہمیت ...حاصل تھی۔

دوسرے دن میں نے پی آئی اے میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں نے اس وقت صرف انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ پی آئی اے میں آگے بڑھنے کے لیے مزید تعلیم کی ضرورت تھی۔ میں نے نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔

میں نے بی اے پاس کیا تو مجھے ترقی مل گئی اور اب میرا شمار افسروں میں ہونے لگا۔

ابھی تک میرے پاس ذاتی سواری نہیں تھی۔ میں کسی اچھی سی استعمال شدہ گاڑی کی تلاش میں تھا۔ ایک دن میں برنس روڈ سے گزرا تو یوں ہی ٹہلتا ہوا قطب دین کی طرف چلا گیا۔ قطب دین مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا اور فوراً میرے لیے ملائی والی چائے اور بسکٹ منگوا لیے۔ وہ چائے پیتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی ملازمت کیسی چل رہی ہے؟''

''اللہ کا احسان ہے قطب دین صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''میں بہت مزے میں ہوں۔ اللہ کے بعد یہ کریڈٹ آپ ہی کو جاتا ہے۔'' پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''آج کل میں کسی اچھی سیکنڈ ہینڈ کار کی تلاش میں ہوں۔''

''آپ خوب موقع پر آئے۔ میرے جاننے والے اپنی گاڑی بیچ رہے ہیں۔ انہیں فوری طور پر پیسوں کی ضرورت ہے آپ میرے ساتھ چل کر گاڑی دیکھ لیں۔ پسند آئے تو میں اس کا سودا کرا دوں گا۔''

''قطب دین صاحب! آپ نے پہلے ہی میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے آپ کو زحمت دینا اچھا نہیں لگتا۔''

''زحمت کیسی ارسلان صاحب۔ آپ کو گاڑی کی ضرورت ہے اور میرے جاننے والے کو رقم کی۔ میں تو صرف اپنے شناسا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' قطب دین نے کہا۔

میں نے ٹیکسی پکڑی اور قطب دین کے ساتھ نرسری پہنچ گیا۔ گاڑی کا مالک نرسری میں رہتے تھے۔ میں نے گاڑی دیکھی بہت اچھی کنڈیشن میں تھی۔ ڈاج کا چار سال پرانا ماڈل تھا۔ مالک نے اس کی قیمت ساڑھے تین ہزار بتائی جو میرے لیے بہت زیادہ تھی۔ میرے پاس تو بہ مشکل ڈھائی تین ہزار روپے تھے۔ میں نے گاڑی کے مالک غفور سے کہا۔ ''گاڑی بلاشبہ بہت اچھی ہے لیکن میری حیثیت سے بڑھ کر ہے۔''

''جناب آپ کیا دینا چاہتے ہیں؟''

''میرے پاس صرف ڈھائی ہزار روپے ہیں۔'' میں نے گاڑی کے مالک غفور سے کہا۔

''چلیے ڈھائی ہزار ہی کی لائیے بیعانہ دے دیں۔''

''میں تو آپ کو پوری ادائیگی کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنا بریف کیس کھولا اور ڈھائی ہزار نکال کر ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے گاڑی کے کاغذات اور چابی میرے حوالے کر دی۔

قطب دین کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ میں قطب دین کے ساتھ گاڑی میں روانہ ہوا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ میری گردن فخر و غرور سے تنی ہوئی تھی۔ وہ میری زندگی کی پہلی گاڑی تھی۔ پیدل چلنے والے لوگ مجھے کیڑے مکوڑے لگ رہے تھے۔ پھر میں نے فوراً ہی اپنے دماغ کے اس خناس کو نکال پھینکا۔

ان ہی دنوں ادارے نے مجھے ٹریننگ پر برطانیہ اور امریکا بھیجنے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ مجھے اگلے ہفتے ٹریننگ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کیوں کہ میرے پاس تو سرے سے پاسپورٹ ہی نہیں تھا۔

میں بھارت سے کسی باضابطہ پاسپورٹ پر تو پاکستان آیا نہیں تھا۔ پرانے لوگ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں پاسپورٹ کا حصول کتنا مشکل تھا۔ بہت سفارشوں کے بعد بھی پاسپورٹ کم سے کم ڈھائی تین مہینے میں ملتا تھا۔

میں نے دوسرے دن پاسپورٹ آفس کا چکر لگایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہاں پاسپورٹ حاصل کرنے والوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو کئی مہینے پہلے پاسپورٹ کے لیے اپلائی کر چکے تھے۔ وہاں کئی ایجنٹ بھی تھے جو بہ ظاہر تو پاسپورٹ فارم وغیرہ بیچ رہے تھے لیکن ان کا اصل کام پاسپورٹ بنوانا تھا۔ ایسے میں ایک ایجنٹ نے مجھ سے رازداری میں پوچھا۔ ”صاحب پاسپورٹ بنوانا ہے تو کچھ مال خرچ کرنا ہوگا۔“

”کتنا مال؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر آپ کو آرڈنری پاسپورٹ چاہیے تو پانچ سو روپے خرچ ہوں گے۔ آپ ابھی پیسے دیں فارم بھریں اور اگلے ماہ اسی تاریخ کو مجھ سے پاسپورٹ لے لیں۔“

”ایک مہینا تو بہت ہے مجھے اگلے ہفتے تک پاسپورٹ چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”بن جائے گا۔“ ایجنٹ نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کو دو ہزار روپے خرچ کرنا ہوں گے۔“

”دو ہزار!“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آہستہ بولو صاحب۔“ ایجنٹ نے کہا۔ ”دو ہزار زیادہ تو ہیں لیکن تین دن بعد پاسپورٹ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔“

میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ میرے پاس دو ہزار روپے کی خطیر رقم نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ کل میں اپنے منیجر صاحب سے معذرت کرلوں گا کہ میں ٹریننگ پر نہیں جاسکتا۔ اس کے نتیجے میں میری ترقی نہیں ہو سکے گی تو نہ ہو۔

مجھے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اب تک پاسپورٹ کیوں نہیں بنوایا؟ پاسپورٹ آفس سے قطب دین کے پاس چلا گیا۔ اس کی ملائی والی چائے بہت خوش ذائقہ ہوتی تھی۔

حسبِ معمول قطب دین نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس کی دکان اب پہلے سے کافی بڑی لگ رہی تھی۔ شاید اس نے ساتھ والی دونوں دکانیں بھی لے لی تھیں۔

چائے پیتے ہوئے بھی مجھے ٹریننگ پر نہ جانے کا قلق تھا۔

قطب دین نے اچانک کہا۔ ”ارسلان صاحب! میں بہت دیر سے نوٹ کر رہا ہوں کہ آپ کو کوئی پریشانی ہے۔ مجھے بتایئے شاید اس سلسلے میں، میں کچھ کرسکوں؟“

میں نے سوچا وہ کیا کرسکتا ہے پاسپورٹ کے لیے تو کوئی بہت بڑی سفارش چاہیے اس کے باوجود پاسپورٹ ایک مہینے سے پہلے نہیں مل سکتا۔

قطب دین کے اصرار پر میں نے اسے اپنی مشکل سے آگاہ کردیا۔

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”آپ کے پاس فوٹو تو ہیں؟“

”میرے پاس نگیٹو موجود ہے۔“ میں نے کہا۔ دو مہینے پہلے آفس کے لیے مجھے پاسپورٹ سائز تصویروں کی ضرورت پڑی تھی۔

”آپ پاسپورٹ فارم پُر کر کے مجھے دے دیں۔ ابھی اپنے کسی افسر کو پاسپورٹ کی عدم موجودگی کے بارے میں نہ بتائیں۔“

مجھے پھر اپنے دوست عبدالمنان کی بات یاد آئی کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“

میں نے نگیٹو کے ذریعے اپنی ارجنٹ تصویریں بنوائیں۔ پاسپورٹ آفس سے لے کر فارم پُر کیا اور قطب دین کو دے دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ قطب دین کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے میں اس کی طرف سے زیادہ پُرامید بھی نہیں تھا۔

ٹریننگ کے لیے روانگی میں دو دن باقی تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ کل میں منیجر صاحب سے معذرت کرلوں گا کہ میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔

دوسرے دن غیر متوقع طور پر قطب دین میرے آفس آگیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی چائے کی فرمائش کی۔

”یہاں ملائی والی چائے تو نہیں مل سکے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ کو کافی پلاتا ہوں۔“

کافی پینے کے بعد قطب الدین نے اپنا بستہ کھولا اور پاسپورٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں حیرت سے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

اس وقت منیجر صاحب کا چپراسی آگیا اور بولا۔ ”صاحب بلا رہے ہیں کہ آپ نے ابھی تک اپنا پاسپورٹ نہیں دیا۔ پاسپورٹ مجھے ابھی دے دیں۔ صاحب آج ہی ویزے لگوا دیں گے۔“

میں نے اپنا پاسپورٹ اٹھایا اور چپراسی کے حوالے کر دیا۔ قطب دین کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

میں جب مہینے بعد ٹریننگ سے واپس آیا تو فوراً ہی میری ترقی ہوگئی۔ اس وقت تک پی آئی اے خاصی مستحکم ہو چکی تھی۔ پی آئی اے کی انتظامیہ اور ورکر بھی اپنے کام سے مخلص تھے۔ کرپشن اگر ہوگی بھی تو آٹے میں نمک کے برابر۔ ملازمین کی تنخواہوں اور مراعات میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

میں ابھی تک کلفٹن کے اس بھوت بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ میری فیملی کا کوئی فرد بھی پاکستان آنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ اماں چھوٹے بھائی کے ساتھ پاکستان کا ایک چکر لگا چکی تھیں۔ میں بھی لوٹ کر انڈیا نہیں گیا تھا۔

ان ہی دنوں ہمارے اسٹاف میں ایک لڑکی کا اضافہ ہوا۔ خاصی طرح دار اور پرکشش لڑکی تھی۔ وہ خاصی پڑھی لکھی تھی اور بہت اعلیٰ خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ اس کے ایک چچا پاکستان آرمی میں بریگیڈیئر تھے۔ دوسرے چچا پاکستان نیوی میں کموڈور تھے۔ اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے اس کے انداز میں عجیب سی نخوت پیدا ہوگئی تھی۔

اسٹاف کے دوسرے لوگ بہانے بہانے سے اس سے بات کرتے تھے لیکن میں نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میری ماتحت تھی لیکن کبھی میں نے اپنی اس حیثیت کا فائدہ نہیں اٹھایا۔

ملازمت وہ شوقیہ کر رہی تھی۔ ایک دن لنچ ٹائم پر بھی میں کام میں مصروف تھا کہ وہ دستک دے کر میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ''ارسلان صاحب! آپ لنچ نہیں کرتے؟''

''جب کام زیادہ ہوتا ہے تو نہیں کرتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''لنچ تو ضرور کرنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''کیا نہ کرنے پر چالان ہو جائے گا؟'' میں مسکرا کر بولا۔ ''لیکن آپ کو میرے لنچ سے اتنا انٹرسٹ کیوں ہے؟''

''میں روبینہ ہوں۔'' اس نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے جوائننگ رپورٹ مجھے ہی دی تھی۔''

''دراصل میں تنہا لنچ کرنے کی عادی نہیں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج نسرین چھٹی پر ہیں نا۔'' نسرین منیجر صاحب کی پی اے تھی۔

''آفس میں اتنے لوگ ہیں آپ کسی کے ساتھ بھی لنچ کر سکتی ہیں۔''

''نو۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ لنچ کیا جائے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''آپ نے اس سوال و جواب میں جتنا وقت ضائع کر دیا اتنی دیر میں تو ہم لنچ کر لیتے۔ چلیے لنچ کریں۔''

روبینہ کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں انکار نہ کر سکا۔

پھر تو ہم روزانہ لنچ ایک ساتھ کرنے لگے۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ پھر زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے وعدے بھی کر لیے۔

ایک دن وہ میرے پاس آئی تو بہت مضطرب تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے روبی، تم کچھ پریشان ہو؟''

''گھر والے میری شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور اس سلسلے میں رشتے دیکھ رہے ہیں۔ تم اپنے گھر والوں کو بھیجو نا۔''

''میری اماں انڈیا میں ہیں۔ دور و نزدیک کا کوئی عزیز پاکستان میں نہیں ہے۔''

''تو پھر اپنے دوستوں میں سے کسی کے گھر والوں کو بھیج دو۔'' روبینہ نے کہا۔

''میں منیجر صاحب سے بات کرتا ہوں۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ رشتہ لے کر تمہارے گھر چلے جائیں گے۔''

''جو کچھ کرو، جلدی کرو۔'' روبینہ نے کہا۔ ''ورنہ بعد میں تو میں بھی کچھ نہ کر سکوں گی۔''

میں نے منیجر صاحب سے بات کی تو وہ بولے۔ ''زیادہ خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی ارسلان تم روبینہ کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں جانتے ہو؟''

''جی سر میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کے باوجود تم اس کے گھر رشتہ بھیج رہے ہو؟''

''جی سر اس کے باوجود۔'' میں نے کہا۔

میں انہیں کیا بتاتا کہ روبینہ میرے سلسلے میں راہ ہموار کرے گی۔

''ٹھیک ہے یار۔'' منیجر صاحب نے کہا۔ ''اگر تم میری بے عزتی ہی کرانا چاہتے ہو تو یوں ہی سہی۔''

اسسٹنٹ مینیجر صاحب نے بھی اس قسم کی باتیں کیں۔ میں نے انہیں بھی راضی کر لیا۔

وہ دونوں اپنی اپنی بیگمات کے ساتھ روبینہ کے گھر چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر دونوں کا موڈ بہت خراب تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں ناکامی ہوئی ہے۔ یہ سوچ کر ہی مجھے چکر سا آ گیا کہ روبی اب میری نہیں ہو سکتی۔

''وہ بریگیڈیئر تو دم پر پاؤں ہی نہیں رکھنے دے رہا تھا۔'' مینیجر صاحب نے کہا۔

''ہم بھی کسی گھٹیا خاندان سے نہیں ہیں۔'' اسسٹنٹ مینیجر صاحب نے کہا۔ ''لیکن وہ لوگ تو یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے ان کا تعلق شاہی خاندان سے ہو اور ہم سب ان کی نظروں میں کیڑے مکوڑے ہوں۔''

''سر مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی ذہنی کوفت اور توہین برداشت کرنا پڑی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔''

''ارسلان۔'' ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان لوگوں کی بیمار ذہنیت کا قصور ہے۔''

''میں اب شرط لگا سکتا ہوں کہ روبینہ اب آفس نہیں آئے گی۔''

''وہ اتنی دبو قسم کی لڑکی نہیں ہے کہ گھر والوں کی آنکھیں دکھانے پر گھر میں دبک جائے۔'' مینیجر صاحب نے کہا پھر وہ کچھ توقف کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''ارسلان تمہارا کیا اندازہ ہے؟''

''سر جہاں تک میں روبی کو سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق تو کل وہ آفس ضرور آئے گی۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک مجھے تسلیاں اور دلاسے دیتے رہے لیکن میرے ذہن میں تو آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب چاہے مجھے روبینہ سے کورٹ میرج کرنا پڑے یا اسے لے کر بھاگنا پڑے میں شادی اسی کے ساتھ کروں گا۔

دوسرے دن روبی آفس نہیں آئی اور میرے تمام اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ میری حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ میں نے کئی دفعہ روبی سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ریسیور کسی مرد نے اٹھایا اور میں نے بات کیے بغیر لائن کاٹ دی۔

میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ میں چھٹی لے کر گھر چلا گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے عبدالمنان کو ٹیلی فون کیا اور اس سے کہا کہ تم مجھ سے مل لو۔

عبدالمنان کو میری ملازمت کے فوراً بعد پولیس میں ملازمت مل گئی تھی۔ اب وہ فیروز آباد تھانے میں تھا اور سب انسپکٹر تھا۔ ان دنوں فیروز آباد کا ایس ایچ وہی تھا۔

مجھے امید تو نہیں تھی کہ عبدالمنان میرے لیے وقت نکال سکے گا لیکن تقریباً دو گھنٹے بعد عبدالمنان میرے گھر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا تھا۔ شاید دو ہی دن میں میری حالت تباہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ارسلان خیر تو ہے، یہ تو نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''کچھ نہیں یار، بس ذرا کام کی تھکن ہے۔'' میں نے کہا۔

''بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عبدالمنان نے کہا۔ ''میں ابھی تیرے آفس سے آ رہا ہوں۔ مجھے تو نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ تو گھر پر ہے تیرے مینیجر صاحب نے مجھے تیرے بارے میں بتایا۔ وہ بے چارے بھی تیری طرف سے بہت فکر مند ہیں۔''

''یار! اب فکر کرنے سے کیا فائدہ؟'' میں نے کہا۔

''ابھی ایک راستہ ہے۔'' عبدالمنان نے کہا۔

''کون سا راستہ؟'' میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''تو قطب دین سے بات کر۔'' عبدالمنان نے کہا۔ ''ممکن ہے اس کے پاس اس مسئلے کا بھی کوئی حل موجود ہو۔''

''بھائی میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔'' عبدالمنان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ''تو ایک دفعہ انہیں اپنا مسئلہ بتا دے اگر وہ بھی ناکام رہے تو پھر کورٹ میرج کا آپشن تو تیرے پاس موجود ہی ہے۔'' عبدالمنان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو ان سے آج ہی مل لے۔''

''چل یہ بھی کر لیتا ہوں۔ میں نے کہا۔ ''ورنہ ایک معمولی انڈا فروش بھلا کیا کر سکتا ہے؟''

عبدالمنان کو ایک ضروری کام سے جانا تھا اس لیے وہ مجھ سے معذرت کر کے چلا گیا۔ اس نے مجھ سے اگلے دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی قطب دین کی طرف روانہ ہو گیا۔

قطب دین نے حسبِ معمول میری بات ہمدردی سے سنی اور بولا۔ ''ارسلان صاحب! آپ مایوس مت ہوں میں کوشش کرتا ہوں ویسے آپ کا یہ خیال درست ہے کہ کہاں ایک انڈا فروش اور کہاں اس لڑکی کا عظیم الشان خاندان؟''

''مم...... میں نے...... کب کہا کہ......''

''آپ نے کہا نہیں ہے لیکن سوچ تو یہ ہی ہوگی۔ خیر میں کوشش کیے لیتا ہوں۔''

میں ملائی والی چائے بھی پی چکا تھا اور بسکٹ بھی کھا چکا تھا۔ میں قطب دین سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس وقت شام کے تقریباً سات بج رہے تھے۔

پھر میں گاڑی یوں ہی بلا مقصد سڑکوں پر دوڑاتا رہا۔ میں نے لالو کھیت میں ایک جگہ کھانا کھایا اور دس بجے تک میری گھر واپسی ہوئی۔

پورچ میں پرانی سی ایک فورڈ موجود تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس وقت کون آ گیا؟ میں یہ بھی سوچتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا کہ فورڈ میرے کن کن دوستوں کے پاس ہے لیکن مجھے یاد نہ آ سکا۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو قطب دین کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

''قطب دین صاحب، آپ، آپ نے کیوں زحمت کی؟''

''ارسلان صاحب۔'' قطب دین نے کہا۔ ''مجھے ان لوگوں سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے پہلے آپ کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر خود چلا آیا کہ اتنی بڑی خبر آپ برداشت کر پائیں یا نہ کر پائیں۔''

''قطب دین صاحب! میں ہر قسم کی خبر سننے کو تیار ہوں۔ آپ بتائیں ایسی کون خبر ہے؟''

''مجھے روبینہ کے گھر والوں سے ایسی امید نہیں تھی۔'' قطب دین نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''آپ کو ان لوگوں سے کیا امید نہیں تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہی کہ...... وہ...... لوگ ایک دم راضی ہو جائیں گے۔''

''مجھے تو پہلے ہی توقع تھی کہ وہ انکار......'' میں بولتے بولتے رک گیا۔ پھر خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیا کہا...... کیا کہا آپ نے...... کیا کہا؟''

''میں نے وہی کہا جو آپ نے سنا ارسلان صاحب، اب تو مٹھائی منگوا لو۔''

چلیے میں آپ کو مٹھائی کھلاتا ہوں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا پھر مجھے اس فورڈ کار کا خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ ''آپ نے گاڑی بھی خرید لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''یہ تو میں ایک دوست سے مانگ کر لایا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

ہم نے قطب دین کی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور قطب دین میری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں وہاں سے سیدھا فریسکو پہنچا۔ وہاں کی گرم گرم جلیبیاں اور امرتیاں میں بہت شوق سے کھاتا ہوں۔

ہم لوگوں نے وہیں بیٹھ کر گرم گرم امرتیاں کھائیں، پھر میں نے ایک کلو مٹھائی قطب دین کے گھر کے لیے بھی لے لی۔ پروگرام یہ تھا کہ میں قطب دین کو اس کے گھر ڈراپ کروں گا۔ وہ کل کسی وقت فورڈ کو وہاں سے لے جاتا۔

میں نے اب تک قطب دین کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ اس بہانے میں ان کا گھر دیکھ لیتا۔ وہ اسلامیہ کالج کے نزدیک ہی ایک گھر میں رہتا تھا۔

قطب دین کا گھر سادگی کا نمونہ تھا۔ ڈرائنگ روم میں پرانا سا لیکن صاف ستھرا فرنیچر تھا۔ اس نے مجھے بٹھایا اور بولا۔ ''آپ کی چچی تو اس وقت سو رہی ہوں گی۔ میں چائے بنا لاتا ہوں۔''

''زحمت نہ کریں۔'' میں نے کہا۔ ''میں دوبارہ آؤں گا تو چائے بھی پیوں گا اور کھانا بھی کھاؤں گا۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''ہاں میری چچی کو میرا اسلام کہیے گا۔ یہ مٹھائی میں خاص طور پر ان کے لیے لایا تھا۔''

وہاں سے رخصت ہو کر میں گھر پہنچا تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

ایک ہی ہفتے میں روبی کے ساتھ میری شادی ہو گئی۔

اماں شادی میں شرکت کے لیے انڈیا سے آئی تھیں لیکن وقت پر پہنچ نہ سکی تھیں۔ انہیں بھی روبی بہت پسند آئی تھی۔ ان کے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ میرا گھر اب بھوت بنگلا نہیں رہا تھا۔ بہ قول عبدالمنان کے اب وہ ''چڑیل بنگلا'' ہو گیا تھا۔

میں نے جہیز نہ لے کر روبی کے خاندان والوں کو

حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی بھی کم حیثیت لڑکا دولت مند لڑکی سے صرف دولت کے لالچ میں شادی کرتا ہے۔

زندگی اچانک بہت حسین ہو گئی۔

ان ہی خوشیوں میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا اور اماں کا ویزا ایکسپائر ہو گیا۔

اماں پر پاکستان میں غیر قانونی قیام کا الزام لگ سکتا تھا۔ گھر میں نہ لگتا تو اماں کی واپسی کے موقع پر لگتا یہ ہی ایک صورت تھی کہ اماں کے ویزے کی مدت میں اضافہ کرایا جائے۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے آل رضا صاحب اور دیگر دوستوں سے مدد چاہی۔ سب نے کوشش کی لیکن کام نہ ہو سکا۔

اس موقع پر عبدالمنان نے پھر وہی مشورہ دیا، انڈا فروش والا۔ اس مرتبہ بھی قطب دین نے کام کرا دیا۔

اماں کی روانگی کے بعد ہم بھی ہنی مون کے لیے روانہ ہو گئے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں روبی نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم نے ڈیڈی پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ راضی ہو گئے۔ ورنہ وہ تو تمہارا نام سننے کے بھی روادار نہ تھے۔“

”اس میں سارا کمال انڈے والے کا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم اسے انڈا فروش بھی کہہ سکتی ہو۔“

”میں اس وقت سنجیدہ ہوں ارسلان۔“ روبی نے منہ بنا کر کہا۔

”میں بھی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس انڈا فروش کا نام قطب دین ہے۔“ میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”میں نے اسے تمہارے ڈیڈی کے پاس بھیجا تھا۔“

”لیکن ڈیڈی تو کچھ اور کہہ رہے تھے۔“ روبی نے کہا۔ پھر سر جھٹک کر بولی۔ ”ممکن ہے اپنی سبکی کے خیال سے ڈیڈی نے غلط بیانی کی ہو۔“

قطب دین ہماری شادی میں بھی شریک ہوا تھا۔ میں نے شادی کے البم اٹھائے۔ ان میں کم سے کم پندرہ تصویریں ایسی ضرور ہوں گی جن میں قطب دین نمایاں تھا۔ میں نے باری باری سارے البم دیکھ لیے لیکن ان میں کہیں قطب دین کی تصویر نظر نہ آئی۔ ایک دو تصویریں ایسی تھیں جن کے بارے میں مجھے علم تھا کہ ان میں قطب دین موجود ہے۔ ان تصویروں میں جگہ خالی تھی لیکن قطب دین نہیں تھا۔

اتنے برس میں پہلی دفعہ مجھے قطب دین سے خوف محسوس ہوا۔ آخر وہ کون تھا اور مجھ پر اتنا مہربان کیوں تھا۔

میں کراچی واپس پہنچا تو میں نے عبدالمنان کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ قطب دین تمہیں نہیں پہچانتا ہے۔ تم چھپ کر اس کی نگرانی کرو۔ ہو سکتا ہے اس سے ہمیں کچھ اس کی اصلیت کا علم ہو جائے۔

عبدالمنان نے کہا۔ ”میں اپنا ایک آدمی اس کی نگرانی پر لگائے دیتا ہوں۔“

ایک لمحے کو میرے ضمیر نے ملامت کی کہ میں اپنے محسن کی نگرانی کرا کے اچھا نہیں کر رہا ہوں لیکن میں نے ضمیر کی اس آواز کو تھپک کر سلا دیا۔

دوسرے دن میں ناشتے کے بعد باہر نکلا ہی تھا کہ گیٹ کے پاس مجھے قطب دین نظر آیا۔ وہ بہت تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ میں نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ قطب دین نے سپاٹ لہجے میں کہا اور مجھ سے بولا۔ ”تم نے میری نگرانی کرانے کا حکم دیا ہے۔ میری نگرانی، احسان فراموش وہ دن بھول گیا جب تو فاقے کر رہا تھا اور میں نے تیری مدد کی تھی۔ احسان جتانا مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن تو نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا ہے خود غرض شخص۔“

”میری بات تو سنیں میں......“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔“ قطب دین چیخ کر بولا۔ وہ واقعی بہت غصے میں تھا۔ ”میں نے تیرے ساتھ جو کچھ کیا میں اسے دہرانا نہیں چاہتا ہوں مجھ کو آئندہ تو کسی بری شکل میں دیکھے گا۔“

”قطب دین صاحب...... میری بات......“

”آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

”اچھا آپ بیٹھیں تو سہی ایک کپ چائے پی لیں۔“

”آج کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ میں جا رہا ہوں۔“ کہہ کر میرے روکنے کے باوجود قطب دین گیٹ سے باہر نکل گیا۔

میں نے سوچا اس وقت یہ بہت غصے میں ہے میں بعد میں اسے دکان یا گھر جا کے اسے منا لوں گا۔

میں گیٹ سے واپس آیا تو مجھے روبی نظر آئی۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”تم کس سے باتیں کر رہے

تھے ارسلان؟"

"ارے یہ وہی تھا قطب دین۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہاں تو کوئی نہیں تھا۔ میں تو کافی دیر سے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جیسے آپ ہوا سے لڑ رہے ہوں۔"

میں نے روبی کو کچھ کہنا چاہا لیکن خاموش رہا۔

اس دن میں نے روبی کو آفس چھوڑنے کے بعد عبدالمنان کے تھانے کا رخ کیا۔ اتفاق سے عبدالمنان تھانے میں موجود تھا۔ میں نے اسے قطب دین کے بارے میں بتایا تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگیا۔

میں عبدالمنان کو اپنی گاڑی میں لے کر برنس روڈ پہنچا۔ انڈے والے کی دکان کھلی ہوئی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر سیدھا دکان پر پہنچا وہاں ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے قطب دین صاحب سے ملنا ہے۔"

نوجوان نے الجھے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ "یہاں تو کوئی قطب دین نہیں ہے۔"

"میں اکثر یہاں آتا ہوں۔ ان کے ساتھ چائے پیتا ہوں اور تم کہہ رہے ہو یہاں کوئی قطب دین نہیں ہے۔"

"آپ نے کب یہاں بیٹھ کر چائے پی ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔ اس کی باتیں مجھے غصہ دلا رہی تھیں۔

"ابھی چار پانچ مہینے پہلے۔" میں نے کہا۔

"پانچ مہینے۔" لڑکے نے ہنس کر کہا۔ "میں نے تو یہ دکان دس دن پہلے کھولی ہے۔"

"بکواس کرتا ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں برسوں سے یہاں آرہا ہوں۔"

"دیکھیے آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جو......"

"بکواس بند کر۔" عبدالمنان نے دہاڑ کر کہا۔ "اب جھوٹ بولے گا تو میں تجھے الٹا لٹکا دوں گا۔"

پولیس کے ایک باوردی انسپکٹر کو دیکھ کر نوجوان کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ سمجھا کہ قطب دین ہمیں کسی کیس کے سلسلے میں مطلوب ہے۔ ہماری چیخ پکار سے اردگرد کے دکان دار بھی جمع ہوگئے انہوں نے بھی لڑکے کے بیان کی تائید کی کہ یہ دکان برسوں سے بند پڑی تھی۔ کچھ دن پہلے ہی اس لڑکے نے اسے کھولا ہے۔

عبدالمنان پولیس کے روایتی ہتھکنڈے استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا اور آہستہ سے کہا۔ "ہم قطب دین کے گھر چلتے ہیں۔"

ہم وہاں سے نکلے تو لوگوں نے ہمیں راستہ دے دیا۔

میں عبدالمنان کے ساتھ قطب دین کے گھر پہنچا تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ قطب دین کے مکان پر زنگ آلود بڑا سا تالا پڑا تھا۔ میں نے پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک صاحب باہر آئے میں نے ان سے پوچھا۔ "قطب دین کہاں گئے۔"

"کون قطب دین؟" اس نے پوچھا۔

"یہ آپ کے پڑوسی۔" میں نے اشارے سے اسے بتایا۔

"صاحب یہ مکان تو برسوں سے اجاڑ پڑا ہے۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔"

میں چکرا گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

وہ ازراہ ہمدردی بولا۔ "آیئے اندر آجائیں۔" پھر وہ اصرار کرکے ہمیں اندر لے گیا۔ ایک طرف فریسکو کا مٹھائی کا ڈبا پڑا ہوا تھا۔ ڈبا کافی پرانا تھا۔ لگتا تھا اسے رکھ رکھ کر استعمال کیا گیا ہے۔

"یہ...... مٹھائی کا ڈبا آپ کا ہے۔"

"یہ مٹھائی کا ڈبا!" اس نے آنکھیں جھکائیں۔ پھر بولا۔ "کچھ دن پہلے اسے کسی نے پیچھے والی دیوار سے اچھال دیا تھا۔ ڈبا بالکل پیک تھا، میں نے اسے استعمال کرلیا۔"

میں نے اپنی بات پکی ہونے کی خوشی میں قطب دین کو وہی مٹھائی کا ڈبا دیا تھا۔

عبدالمنان مجھے زبردستی وہاں سے لے آیا اور گھر چھوڑ گیا۔

یہ بات اب بھی مجھے پریشان کرتی ہے کہ قطب دین کون تھا۔ میں نے بعد میں آل رضا صاحب سے اصفہانی صاحب اور ان تمام حضرات سے قطب دین کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی کچھ نہ بتاتا تھا۔

میں اب عمر کی اس منزل پر ہوں کہ سانس کی ڈور کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے لیکن اپنے دل میں یہ خلش لے کر جاؤں گا کہ قطب دین کون تھا۔

میرے بچے جوان ہیں۔ ان کی بھی شادیاں ہوچکی ہیں لیکن مجھے ابھی تک اس بات پر یقین نہیں آیا کہ قطب دین ایک دھوکا تھا اگر وہ دھوکا تھا تو بہت خوب صورت اور خوشگوار دھوکا تھا۔

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
اس بار ایک ایسی سرگزشت ارسال کررہا ہوں جو ہمارے اداروں کا آئینہ ہے کہ اپنی غلطی پر سرکاری ملازم کیسے پردہ ڈالتے ہیں۔
طارق عزیز خان
(رحیم یار خان)

# چال

میرا نام جمیل اختر ہے اور میں محکمۂ انہار پنجاب سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ میری ملازمت کا بیشتر حصہ پنجاب کے طول و عرض میں بہتی نہروں کے درمیان گزرا۔ میں 1980ء میں محکمۂ انہار بہاولپور میں بطور فیلڈ کلرک ملازم ہوا۔ ملازمت کے ابتدائی سال ضلع بہاولپور میں گزرے۔ 1984ء میں میرا تبادلہ دریائے ستلج اور دریائے چناب کے سنگم پر واقع ہیڈ پنجند پر ہو گیا۔ یہ 1985ء کے موسم سرما کا ذکر ہے میں افسرانِ بالا کے ساتھ ہیڈ پنجند سے نکلنے والی نہر عباسیہ کے دورے پر تھا۔ یہ نہر ضلع رحیم یار خان کے علاقوں کو سیراب کرتی ہوئی صحرائے چولستان کی حدود میں ختم ہو جاتی

ہے۔ اس نہر پر چھوٹے بڑے ایک درجن کے قریب ہیڈ ورکس قائم ہیں جہاں سے مزید چھوٹی نہریں نکلتی ہیں۔ محکمہ انہار پنجاب کی طرف سے نہروں کے پشتوں کی دیکھ بھال کے لیے تمام چھوٹی بڑی نہروں کے سنگم پر پکی کرا نما عمارتیں قائم ہیں۔ ان عمارتوں کو بنگلا کہا جاتا ہے جہاں مستقل طور پر ایک بیلدار تعینات ہوتا ہے۔ تاہم افسران کے دوروں یا سیلاب کے دنوں میں پولیس کے ایک دو سپاہیوں کی ڈیوٹی بھی لگا دی جاتی ہے۔

ایک سہ پہر میں افسران کے ساتھ جیپ میں سوار نہر کے پشتے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ ہمارے قافلے میں دو جیپیں تھیں۔ اگلی جیپ میں لاہور سے آیا محکمۂ انہار کا ایک بڑا افسر مقامی پولیس کے انسپکٹر کے ساتھ موجود تھا جبکہ اس کے پیچھے گاڑی میں، میں دو سپاہیوں کے ساتھ سوار تھا۔ نہر کے پشتے کی دیکھ بھال کے لیے کیا جانے والا یہ معمول کا دورہ تھا۔ موسم سرما ہونے کی وجہ سے نہروں میں پانی کا بہاؤ معمول سے کم تھا اور پشتوں پر دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے نہر کے کناروں کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم لوگ گپ شپ لگاتے ہوئے دھیرے دھیرے سفر... جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس دن صبح ہی سے مطلع ابر آلود تھا اور وقفے وقفے سے ہونے والی بارش سے سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ نہر کا کنارہ کچا تھا اور جگہ جگہ کیچڑ بن جانے کی وجہ سے جیپ چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ دورے میں شریک افسران سمیت ہم سب کی خواہش تھی کہ جلد از جلد اپنے سرکاری ٹھکانے پہنچ جائیں۔ سورج غروب ہونے سے قریب ایک گھنٹے بعد ہمارا قافلہ تحصیل خانپور میں نہر عباسیہ پر واقع ایک ذیلی ہیڈ ورکس پر پہنچا۔ اس مقام پر بڑی نہر سے دو چھوٹی نہریں نکل کر جنوب مشرق کی طرف بہہ رہی تھیں۔ ہیڈ ورکس دونوں چھوٹی نہروں کے درمیانی حصے میں واقع ایک دوآبے پر تھا۔ یہاں پر لال اینٹوں سے بنے دو کمرے موجود تھے جن کے آگے ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ یہ ایک زرخیز زرعی علاقہ تھا جہاں چاروں طرف گندم اور گنے کے کھیت واقع تھے جبکہ دونوں نہروں کے کنارے ٹالیوں اور کیکروں کے درخت قطار در قطار سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہیڈ ورکس پر موجود بیلدار شوکت حسین نے ہمارا استقبال کیا۔ جب تک ہم لوگ اتر کر ہیڈ ورکس کا جائزہ لیتے بارش تیز ہو چکی تھی۔ افسران نے جیپ میں بیٹھے بیٹھے طے کیا وہ اگلے دن ہیڈ ورکس کا مکمل جائزہ لیں گے۔ میرے ساتھ ایک سپاہی رفیق کو وہیں ہیڈ ورکس پر رکنے کا حکم دیا۔ جس کے بعد دونوں جیپیں قریبی ریسٹ ہاؤس روانہ ہو گئیں۔

"جوانو، جلدی سے اندر آجاؤ، نہیں تو بھیگ جاؤ گے۔"

بوڑھے بیلدار نے مجھے اور رفیق کو احاطے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم تیز تیز قدم چلتے ہوئے احاطے میں پہنچے اور پھر ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں چارپائیاں موجود تھیں۔ ایک کونے میں کھانا پکانے کے لیے انگیٹھی اور کچھ لکڑیاں رکھی تھیں۔ دوسرے چھوٹے کمرے میں نہر کی دیکھ بھال سے متعلق سامان کم اور کاٹھ کباڑ زیادہ بھرا تھا۔ بیلدار نے افسران کے لیے مقامی دیہاتیوں کی مدد سے کھانے کا معقول بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ سردیوں میں وہاں کرنے کو کوئی خاص کام نہیں تھا۔

"میں تو سارا سارا دن بیٹھا ہاتھ تاپتا رہتا ہوں۔" شوکت نے بتایا۔ محکمہ انہار میں ہونے کی وجہ سے مقامی کسان اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتے تھے اور اس کی زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ اس نے ہم سے کھانے کا پوچھا۔ سچی بات یہ ہے کہ صبح سے اونچے نیچے راستے پر سفر کرتے ہوئے ہماری چولیں ہل گئی تھیں۔ دوپہر کو کچھ خاص نہیں کھایا تھا اور اب تھکان کے ساتھ شدید بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔ شوکت نے یہ بتا کر ہماری بھوک اور بڑھا دی کہ اس نے بھنا ہوا دیسی مرغ بنایا تھا۔ چونکہ افسران کچھ کھائے پیے بغیر ہی آگے روانہ ہو گئے تھے اس لیے اب ہم تینوں کو ہی کھانے کے ساتھ انصاف کرنا تھا۔ ہم نے ہاتھ دھوئے اور کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے بعد ہم نے سگریٹ سلگا لیے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ شوکت نے بتایا کہ وہ خان بیلہ کا رہائشی ہے اور اس کی ریٹائرمنٹ کو ایک سال باقی ہے۔ اس نے اپنے گاؤں میں بھینسیں پال رکھی تھیں۔ ملازمت کے بعد اس کا ارادہ ان کی دیکھ بھال کرنے کا ہے۔ باتوں کے دوران ہی اس نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔

"جب تک چائے بنتی ہے، میں ہیڈ کا ایک چکر لگا آؤں۔" رفیق نے کمبل کی بکل ماری، پرانی رائفل کو کندھے پر لٹکایا اور ٹارچ ہاتھ میں پکڑے باہر نکل گیا۔ رفیق کے جانے کے بعد شوکت نے ہیڈ ورکس سے متعلق کچھ دلچسپ واقعات سنائے۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔

"میری ڈیوٹی زیادہ تر افسران کے ساتھ فیلڈ میں ہی ہوتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"پھر تو تمہارے مزے ہی مزے ہیں۔" شوکت نے

رشک آمیز انداز میں کہا۔

"لیکن افسروں کے ساتھ کام کرنے کے بکھیڑے بھی بہت ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اب یہی دیکھ لو پچھلے ایک ہفتے سے دورہ چل رہا ہے۔ افسران خود تو گرم ریسٹ ہاؤس میں آرام کر رہے ہیں اور ہم یہاں سردی سے......" ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور سپاہی رفیق بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔

"وہ......وہاں ہیڈ کے دروازے میں......" اس نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا اور پھر چارپائی پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ رفیق کی حالت دیکھ کر میں اور شوکت دونوں لپک کر اٹھے۔ ہم نے اسے پینے کے لیے پانی کا گلاس دیا جو اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور خالی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" میں نے رفیق سے پوچھا۔ "اور تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"وہ ہیڈ کے نیچے ایک لاش پھنسی ہوئی ہے۔" رفیق نے سرسراتے ہوئے لہجے میں انکشاف کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ٹارچ سے ہیڈ کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے ہیڈ کے دروازے میں پھنسی ایک لاش دکھائی دی۔

"کوئی بھینس وغیرہ ہوگی۔" شوکت نے اسے تسلی دی۔ عام طور پر دریاؤں اور نہروں کے ہیڈ ورکس میں بہتے ہوئے جانوروں کی لاشیں اور پنجر آ کر پھنس جاتے ہیں۔ سیلابی دنوں میں بعض اوقات جانوروں کی لاشوں کے ریوڑ کے ریوڑ بہتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں لیکن موسم سرما میں جب پانی کا بہاؤ کم ہوتا ہے تو ایسا منظر کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس میں کچھ قصور مقامی دیہاتیوں کا بھی ہوتا ہے جو اپنے جانوروں کے مرنے کے بعد انھیں مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کی بجائے نہروں میں پھینک دیتے ہیں۔ جانوروں کی یہ لاشیں بہتے ہوئے میلوں دور نکل جاتی ہیں اور بالآخر کنارے میں اگی جھاڑیوں میں پھنس کر مچھلیوں، چیلوں اور گدھوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔

"نہیں نہیں وہ ایک انسانی جسم ہے۔" سپاہی رفیق نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ "میں نے خود اسے دیکھا ہے۔"

رفیق کی بات پوری ہونے کے بعد ہم دونوں اس کی راہنمائی میں باہر نکلے۔ باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور بوندا باندی بھی جاری تھی۔ یہ ابتدائی چاندنی راتیں تھیں تاہم آسمان بادلوں سے گھرا ہونے کی وجہ سے چار سو گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ سردی اس قدر تھی کہ انسان تو کجا آوارہ کتے بھی کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ماحول پر چھائے سناٹے میں صرف مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم تینوں کیچڑ اور بارش سے بچتے بچاتے سردی میں کپکپاتے ہیڈ کی طرف بڑھے۔ وہاں بڑی نہر سے وی کی شکل میں شمالاً جنوباً دو چھوٹی نہریں نکل رہی تھیں۔ رفیق نے ٹارچ کی روشنی شمالی نہر کی طرف کرتے ہوئے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم شمالی نہر کی پلی پر پہنچ گئے۔ جس مقام پر بڑی نہر سے دونوں چھوٹی نہریں نکل رہی تھیں وہاں کنکریٹ کے پکے پل پر دونوں نہروں کا پانی کنٹرول کرنے کے لیے ہیڈ بنا ہوا تھا۔ بڑی نہر لگ بھگ تیس فٹ جبکہ دونوں چھوٹی نہروں کی چوڑائی دس سے بارہ فٹ رہی ہوگی۔ ہیڈ کے عین نیچے چھوٹی نہروں کے آٹھ آٹھ فٹ چوڑے دو عدد دروازے موجود تھے۔ ہر دروازے کے درمیان کنکریٹ کا ستون قائم تھا جس سے نہر میں پانی داخل ہونے کے دو راستے بن گئے تھے۔ ہیڈ کے عمودی دروازے مضبوط موٹے لوہے کے تھے جو اس وقت اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ نہر میں پانی کا بہاؤ تین سے چار فٹ بلند تھا جو سیلابی دنوں میں سات فٹ تک ہو جاتا تھا۔ بدقسمتی سے جب ہم تینوں ہیڈ پار کر کے شمالی نہر کے کنارے پہنچے تو عین اس وقت رفیق کی ٹارچ جواب دے گئی اس نے ٹارچ کو زور زور سے ہلایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ غالباً اس میں پانی گھس گیا تھا۔

"اب کیا کریں؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے شوکت کی طرف دیکھا۔

"سوائے ماچس کے اور کچھ نہیں ہے۔" شوکت نے مایوسی سے جواب دیا اور احتیاط سے ماچس نکال کر میرے حوالے کر دی۔ بوندا باندی مسلسل جاری تھی اس لیے میں نے گیلا ہونے سے بچانے کے لیے ماچس کو ہتھیلی میں چھپایا۔ اور دونوں ہتھیلیوں میں چھپا کر تیلی جلائی۔ ہم نے کنارے پر اگی جھاڑیوں میں قدم جماتے ہوئے رفیق کی راہنمائی میں نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔

"وہ اس طرف" رفیق نے کنارے سے پرے ہیڈ کے عین نیچے اشارہ کیا۔ وہ جگہ ہم سے قریب دس فٹ دور اور کنارے سے چھ فٹ گہرائی میں تھی۔ پہلی تیلی فوراً ہی جل کر بجھ گئی۔ میں نے دوسری کوشش کی اور انگلیوں میں تھامی جلتی تیلی کو کچھ آگے کی طرف کیا۔ ہمیں پانی پر تیرتا ایک جسم دکھائی دے گیا۔ اگلے چند منٹوں کے دوران میں نے جلا جلا کر آدھی

ماچس خالی کر دی۔ ہم نے دیکھا کہ لاش کا سر اگلے بازو اور جسم کا پچھلا حصہ مکمل طور پر پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف کندھے اوپر تھے جن پر موٹی اونی جرسی لپٹی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس دوران بارش تیز ہو گئی اور ہم تینوں ہی سردی کی شدت سے کپکپانے لگے۔

''ٹھیک ہے دوستو۔'' میں نے شوکت اور رفیق سے کہا کہ یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں اندر جا کے مشورہ کرتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم تینوں سر جھکائے خاموشی سے اندر بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ واپس گرم کمرے میں آ کر سکون ملا تھا۔ اگر دیکھا جاتا تو میں بلحاظ عہدہ ان دونوں سے زیادہ سینئر تھا اور مجھے ہی کوئی فیصلہ لینا تھا۔ اس وقت تک رات کے دس بج چکے تھے۔ یہ بات صاف تھی کہ بیلدار شوکت حسین اور رفیق میں سے کسی ایک یا پھر دونوں کو نہر کے اندر اتر کے لاش باہر نکالنی تھی۔ رفیق کو صبح ہی سے زکام کی شکایت تھی اور اب لاش دیکھنے کے بعد تو وہ کچھ زیادہ ہی سڑ سڑ کر رہا تھا۔ شوکت بوڑھے کمزور جسم کا مالک تھا اور اکیلے کوئی وزنی شے نہر سے باہر نکالنا اس کے بس سے باہر تھا۔ سچ یہ تھا کہ ہم تینوں ہی اس مصیبت سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھے۔ ان حالات میں کوئی بھی پانی میں اترنے کو تیار نہیں تھا۔ بالفرض اگر ہم اسے کھینچ کھانچ کر باہر نکال بھی لیتے تو کرتے کیا؟ جو کارروائی بھی ہونا تھی وہ افسران کی موجودگی میں صبح ہی ممکن تھی۔ تاہم لاش کو نظرانداز کر کے یہاں کمرے میں رات گزار دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر لاش رات میں بہتی ہوئی آگے نکل گئی اور یہ بات افسران تک پہنچ گئی تو میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔

''ٹھیک ہے دوستو۔'' میں نے ایک طویل سانس لے کر سر اٹھایا۔ ''ہمیں یہ اطلاع ریسٹ ہاؤس پہنچانی ہے۔'' میں نے شوکت اور رفیق سے کہا کہ ہم اس معاملے کو مکمل نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں افسران کو باخبر کرنا ہی تھا۔ شوکت ہیڈ کا انچارج تھا جبکہ سینئر ہونے کے ناطے موقع پر میرا رکنا ضروری تھا۔

''یہ کام تم کرو گے۔'' میں نے رفیق سے کہا۔

''کون سا کام۔'' رفیق نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

''یار میں تمہیں نہر میں کودنے کا نہیں کہہ رہا ہوں۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''تم شوکت کی سائیکل لے کر جاؤ اور ریسٹ ہاؤس میں خبر دو۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

تھوڑی سی بحث مباحثے کے بعد رفیق جانے پر راضی ہو گیا۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے مفلر سے سر اور منہ کو اچھی طرح ڈھانپا۔ پرانی رائفل کندھے سے لٹکائی اور سائیکل لینے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ریسٹ ہاؤس یہاں سے قریب دس کلومیٹر دور تھا۔ اگر رفیق آرام سے بھی جاتا تو ایک گھنٹے میں واپس آ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ موقع کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے کوئی افسر مدد لے کر اس کے ساتھ گاڑی میں آ جاتا۔ رفیق نے سائیکل باہر نکالی اور اس پر چڑھ کر پیڈل گھمایا۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ سپاہی رفیق کے روانہ ہونے کے بعد میرے اور شوکت کے پاس اس کا انتظار کرنے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا دماغ لاش اور رفیق کی واپسی ہی میں الجھا رہا۔ قریب ڈیڑھ گھنٹے بعد باہر کھٹکا سنائی دیا۔ ہم باہر نکلے تو رفیق سائیکل کھڑی کر کے ہماری ہی طرف آ رہا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ مکمل بھیگا ہوا تھا اور سردی سے کپکپا رہا تھا۔ میں نے اسے کمبل اوڑھنے کو دیا اور انگیٹھی کے پاس بیٹھنے کو کہا۔ رفیق نے افسرانِ بالا کی شان میں کچھ نازیبا جملے کہے اور بتایا کہ انسپکٹر صاحب نے لاش کی نگرانی کا حکم دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ صبح آ کر دیکھیں گے۔ نگرانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ موسم کے تیور بدستور بگڑے ہوئے تھے اور باہر سردی بھی بلا کی تھی۔ ہم تینوں میں سے کوئی بھی کسی قیمت پر رات باہر گزارنے کے حق میں نہیں تھا۔ ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور طے یہ پایا کہ لاش کو نہر ہی میں رہنے دیا جائے۔ اب جو بھی ہونا تھا صبح ہی ہونا تھا۔ رفیق کی حالت کے پیشِ نظر شوکت نے اسے ٹرنک سے نکال کر اپنے کپڑے دیے۔ وہ رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ ہم میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ اگلی صبح ابھی سورج کی پہلی ہی کرن نمودار ہوئی تھی کہ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو جگا دیا۔ ہم نے جوتے پہنے مفلر لپیٹے اور باہر کھلے میں نکل آئے۔ سردی اب بھی جوبن پر تھی اور اکا دکا بوندیں پڑ رہی تھیں۔ گہرے سرمئی بادلوں کے عقب میں سورج کی کمزور کرنیں زمین تک رسائی کی کوشش میں تھیں۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے اور دور کھیتوں کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات بھر پانی برسنے کی وجہ سے کوئی جگہ بھی کیچڑ سے خالی نہیں تھی۔ ہم تینوں زمین پر دیکھ بھال کے قدم جماتے ہوئے ہیڈ پار کر کے شمالی نہر کے

کنارے پہنچ گئے۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہیڈ کے قریب نہر کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کناروں اور ہیڈ کے نیچے پانی کی سطح پر بھاپ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں اور شوکت قدم جماتے ہوئے نہر میں کنارے کے ساتھ ساتھ کچھ گہرائی کی طرف اتر گئے۔ پانی ابھی بھی ہمارے قدموں سے نیچے تھا۔ ہم نے ہیڈ کے نیچے، کناروں پر، اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن وہاں لاش کہیں دکھائی نہ دی۔

''لاش کہاں گئی؟'' رفیق نے سرسراتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا۔'' میں نے خفگی سے جواب دیا۔ ''مجھ سے ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میں رات بھر اس کی نگرانی کرتا رہا ہوں۔''

''نہر کے ساتھ ساتھ چل کر تلاش کرتے ہیں۔'' شوکت نے تجویز پیش کی۔

''بے کار کی باتیں مت کرو۔'' میں نے فوراً ہی اس تجویز کو رد کر دیا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ لاش رات کے کسی پہر بہہ کر آگے نکل گئی تھی۔ گو کہ نہر میں پانی کم تھا لیکن ایک پچاس ساٹھ کلو وزن کو دور بہائے جانے کے لیے کافی تھا۔ لاش کی تلاش میں نہر کے بہاؤ کے ساتھ جانا وقت ضائع کرنے والی بات تھی۔ انسپکٹر کے ساتھ محکمہ انہار کے افسران کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والے تھے اور پھر ہمارے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی۔ تاہم اس سے بھی زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ کسی نہ کسی ذریعے سے ہیڈ سے لاش برامدگی کی اطلاع مقامی مارشل لا حکام کو لازمی پہنچ گئی ہوگی اور اب مل ملا کر سارا نزلہ ہم تینوں پر ہی گرنے والا تھا۔ حالات کی سنگینی ہم تینوں سرکاری ملازمین پر روز روشن کی طرح واضح تھی۔ سچ یہ تھا کہ ہمیں حکام کو دکھانے کے لیے ایک لاش کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر قرب و جوار کے علاقے پر نظر ڈالی۔

''وہ ایک قبرستان ہے۔'' شوکت نے میری نظروں کے تعاقب میں نہر کے پار درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ گو کہ بادلوں نے آسمان کو گھیرا ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ اجالا پھیل رہا تھا۔ بیلدار شوکت حسین کی ریٹائرمنٹ میں ایک سال باقی تھا اور وہ کچھ زیادہ ہی گھبرایا ہوا تھا۔ میں اور رفیق بھی جواب دہی کے خوف سے پریشان تھے۔

چند منٹ کے بحث مباحثے کے بعد ہم تینوں ہی اس نتیجے پر پہنچ کر ایک لاش کے بغیر ہماری مشکل حل ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے رفیق کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور شوکت ضروری اوزار لانے احاطے کی طرف نکل گیا۔ ہیڈ سے قبرستان کا فاصلہ قریب سو گز رہا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ہم تینوں درختوں کے جھنڈ میں واقع ایک چھوٹے سے قبرستان میں کھڑے تھے۔ وہاں تیس چالیس قبریں موجود تھیں۔ شوکت نے ایک تازہ قبر کی نشاندہی کی جس کے بعد ہم نے مل کر اس کی مٹی ہٹانی شروع کر دی۔ ہم نے تیز رفتاری سے کام شروع کیا اور جلد ہی پکی سلیب تک پہنچ گئے۔ کچھ مشقت کے بعد مردہ کفن سمیت قبر سے باہر تھا۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے کفن کی گرہیں کھولیں۔ یہ ایک بوڑھا کمزور سا شخص تھا۔ شوکت نے بتایا کہ دو دن پہلے وہ خود اس جنازے میں شریک تھا اور یہ کہ اس کا نام دین محمد عرف چاچا دینو تھا۔ ہم نے کفن قبر کے اندر ہی چھوڑ دیا اور ایک پرانے کپڑے میں مردے کو لپیٹ کر شوکت کے ساتھ لائی ہاتھ ٹرالی میں ڈال دیا۔ تیزی کے ساتھ قبر برابر کر کے مٹی کا ابھار بنا دیا۔ رفیق ہاتھ ٹرالی کو لے کر نہر کی طرف بڑھا جبکہ میں نے اور شوکت نے مل کر وہاں ہماری موجودگی کے نشانات مٹانے شروع کر دیے۔ قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ اسی وقت بارش کچھ تیز ہو گئی۔ ہم جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ہیڈ پر پہنچے۔ ہم نے استغفار کا ورد کرتے ہوئے چاچا دینو کی لاش کو ہیڈ کے دروازے میں ایسے پھنسایا کہ اس کا چہرہ واضح نہیں تھا۔

''کیوں سر جی، اس بے چارے کا حساب کتاب تو ہو چکا ہوگا؟'' رفیق نے نہر میں ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔

''جو تھوڑا بہت رہ گیا ہے۔ آج ہو جائے گا۔'' شوکت نے گرہ لگائی۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' میں نے دونوں کو جھاڑ پلائی۔ ''اور سنو، افسران کے سامنے ذرا بھی اونچ نیچ دکھائی تو نوکری گئی سمجھو۔''

اب ہمارے پاس سوائے افسران کا انتظار کرنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ بارش چونکہ اب بھی ہو رہی تھی اس وقت ہم کنارے ایک گھنی ٹالی کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے مل کر ایک بیان طے کیا جو ہمیں افسران کو دینا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ مسلسل خدا سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگتے رہے۔ قریب ایک گھنٹا انتظار کے بعد کل والی دونوں جیپیں واپس آتی دکھائی دیں۔ آگے کی کارروائی تیزی سے عمل میں آئی۔ پولیس انسپکٹر نے سرسری انداز میں ہمارا بیان لیا۔ ہم تینوں نے بتایا

کہ لاش کی دریافت سے لے کر اب تک ہم اس کے قریب بھی نہیں گئے۔ اس کے بعد لاش نہر سے نکالنے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ میں یہ بتانا بھول گیا لاش نکالنے کی کارروائی کے دوران وہاں ایک درجن کے قریب دیہاتی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ لوگ ہم سے کچھ دور تھے، تاہم انھیں معاملے کی نزاکت کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ کسی انوکھے تماشے کی توقع کر رہے تھے۔ لاش کو کنارے پر رکھا جا چکا تو انسپکٹر نے اشارے سے دیہاتیوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''دیکھو بھئی۔'' انسپکٹر نے قریب آتے دیہاتیوں سے کہا۔ ''کوئی اسے پہچانتا ہے کیا؟''

''مارو چاچو۔'' مجمعے میں ایک بلند آواز گونجی۔ ''یہ تو مارو چاچو ہے۔'' ایک نوجوان دیہاتی لپک کر لاش کے قریب پہنچا۔

''یہ تو دین محمد کی لاش ہے۔'' ایک اور بزرگ دیہاتی نے حیرانی سے کہا۔ ''ابھی دو دن پہلے تو ہم سب نے اس کا جنازہ پڑھا ہے۔''

''تمہارا چاچا......دین محمد......؟'' انسپکٹر نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں جی!'' شوکت چاچا سے پوچھ لو یہ بھی تو وہاں تھا۔'' نوجوان دیہاتی نے بیلدار شوکت حسین کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں ہاں۔'' شوکت نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ ''یہ تو واقعی چاچا دینو ہے۔''

''لیکن یہ یہاں کیسے پہنچ گیا، اسے تو ہم نے وہاں قبرستان میں دفنایا تھا۔'' پہلے والے دیہاتی نے قریبی قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو بھئی، اگر یہ واقعی تمہارا رشتہ دار ہے تو تم اسے لے جا کر دوبارہ دفنا دو۔'' انسپکٹر نے تائیدی نظروں سے محکمہ انہار کے ایک افسر کی طرف دیکھا جس نے سر ہلا کر اپنی منظوری ظاہر کردی۔ حقیقت یہ تھی کہ لاش کی برآمدگی اور نشاندہی کے بعد پولیس اور محکمہ انہار دونوں کے سر سے بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ رپورٹ اور تفتیش کے چکروں سے بچ گئے تھے۔ دیہاتیوں نے احاطے سے لاکر ایک چارپائی وہاں رکھ دی جس پر چاچا دینو کی لاش کو چادر سے ڈھانپ کر رکھ دیا گیا۔ اس دوران بوندا باندی مسلسل جاری تھی۔ انسپکٹر نے احاطے کے کمرے میں بیٹھ کر دو الگ الگ بیان تیار کیے۔ ایک پر ہم تینوں نے دستخط کیے اور دوسرے پر چار معزز دکھائی دینے والے دیہاتیوں سے انگوٹھے لگوائے۔ میں بیان پڑھ کر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ انسپکٹر نے لاش کی دریافت اور نشاندہی سے متعلق تفتیش کار میں اپنی مہارت سے متعلق ایک طویل بیان لکھا تھا۔ دیہاتی لوگ ابھی تک حیران و پریشان تھے کہ چاچا دینو قبرستان سے نہر تک کیسے پہنچا؟ ہر کوئی اپنی اپنی عقل کے مطابق اس واقعے پر تبصرہ کر رہا تھا۔ اس وقت تک دن نکل آیا تھا اور وہاں مزید لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جب تک چاچا دینو کو دوبارہ دفنا یا نہیں گیا ہم لوگ وہیں احاطے میں رکے رہے۔ جس کے بعد ہم شوکت بیلدار سے مل کر آگے روانہ ہو گئے۔

دوپہر کے قریب دونوں جیپوں پر سوار ہمارا قافلہ نہر کنارے کنارے آگے بڑھ رہا تھا۔ کہ اچانک نہر میں تیرتی کوئی شے دکھائی دی۔ قافلہ رک گیا۔ ہم نے نیچے اتر کر دیکھا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے چور نظروں سے سپاہی رفیق کی طرف دیکھا جو آنکھیں پھاڑے نہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی لاش پیٹ کے بل نہر میں بہتی جا رہی تھی۔ اس کے کندھے پر موٹی اونی جرسی لپٹی ہوئی تھی۔ حسب سابق اس کا اگلا اور پچھلا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ وہی جسم تھا جسے ہم نے کل رات ہیڈ میں پھنسا ہوا پایا تھا۔ تاہم اب دن کی روشنی میں سب کچھ واضح تھا۔ درحقیقت وہ ایک بچھڑے کی لاش تھی۔ آپ اسے بھینس کا نوزائیدہ بچہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سردی سے بچانے کے لیے اس کے اگلے کندھوں اور گردن میں ایک پرانی جرسی لپٹی ہوئی تھی۔ جیسا کہ جانور پالنے والے اکثر لوگ سردیوں میں کرتے ہیں۔ بچھڑے کا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے قافلہ دوبارہ چل پڑا۔ میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چاچا دینو کی لاش کی بے حرمتی کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی۔

''ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' اگلی سیٹ پر بیٹھے انسپکٹر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ کیا سر جی؟'' رفیق نے فدویانہ انداز میں پوچھا۔

''یہ چاچا دینو......قبر سے نکل کر نہر میں کیسے پہنچ گیا؟'' انسپکٹر نے خود کلامی کے انداز میں جواب دیا اور جیپ میں بیٹھا ہر شخص اپنی اپنی سوچ کے مطابق قدرت کے انوکھے کارناموں پر تبصرہ کرنے لگا۔

# خودغرض

محترم مدیر

سلام تہنیت

میں نے پہلی بار کسی ڈائجسٹ میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ پتا نہیں کہاں تک کامیاب رہی ہوں لیکن عرصہ سے لوگوں کی کہانیاں پڑھ رہی ہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ اس لیے یقین ہے کہ بہت اچھا نہ صحیح، لیکن بہت برا بھی نہیں لکھا ہو گا۔ اب فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔ ویسے یہ بتا دوں اس میں ایک فیصد ہی جھوٹ شامل نہیں ہے۔ جو کچھ مجھ پر گزری ہے من و عن لکھا ہے پھر بھی جملوں میں کوئی بے ترتیبی نظر آئے تو برائے مہربانی درست کرلیں۔

سعدیہ

(کراچی)

سننے میں آیا تھا کہ میری پیدائش کے وقت ہی خالہ نے مجھے اپنے بیٹے ارشد کے لیے مانگ لیا تھا۔ امی تو مسکرا کر خاموش ہو گئیں لیکن ابو نے خالہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ فی الحال ایسا فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔ خدا جانے میں پچیس سال بعد کیسے حالات ہوں اور یہ بچے بڑے ہو کر کیسے نکلیں۔ اس لیے ان کی رائے جانے بغیر ہم اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر بڑے ہونے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو قبول کرلیا تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یوں وقتی طور پر وہ بات دب

گئی لیکن خالہ نے خاندان بھر میں کہنا شروع کردیا کہ سعدیہ تو میرے ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ وہی میرے ارشد کی دلہن بنے گی۔ کہتے ہیں کہ جب ایک بات تواتر سے کہی جائے تو لوگ اس پر یقین کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میرے بارے میں بھی سمجھا گیا کہ ارشد سے منسوب ہو گئی ہوں۔ خاندان کی اکثر تقریبات میں کزنز مجھے ارشد کا نام لے کر چھیڑتیں تو میں حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگتی کیونکہ میں نے ارشد کو کبھی نہیں دیکھا بلکہ اس کا نام ہی سنا تھا۔ خالو بسلسلہ ملازمت اسلام آباد میں مقیم تھے۔ وہ لوگ شاذونادر ہی کراچی آتے تھے۔ خالہ کسی شادی بیاہ یا غمی میں شرکت کرنے اکیلی ہی آتیں اور دو چار دن رہ کر واپس چلی جاتیں۔

اس روز میں کالج سے واپس آئی تو پورا گھر کھانوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ میں نے ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کالج میں لیکچرار کے طور ملازمت کرلی تھی۔ مجھ سے بڑے بھائی عاشر بینک آفیسر تھے جب کہ چھوٹی بہن عروبہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ ابو کی ملازمت کا یہ آخری سال تھا۔ اس کے بعد وہ بھی ریٹائر ہو جاتے لیکن وہ بڑے دور اندیش واقع ہوئے تھے اور انہوں نے میری پیدائش کے بعد سے ہی بچت شروع کردی تھی۔ امی کا ہاتھ کھلا ہوا تھا اور وہ بے دریغ خرچ کرنے کی عادی تھیں۔ اس کا حل ابو نے یہ نکالا کہ وہ ہر سال اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لے کر اس سے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لیتے۔ قرض کی رقم ان کی تنخواہ سے ہر ماہ قسط وار کٹتی رہتی تھی۔ اس طرح پچیس سال میں انہوں نے اچھی خاصی سیونگ کرلی۔ پھر ریٹائرمنٹ کے بعد فنڈ اور گریجویٹی کی مد میں بھی اچھی خاصی رقم ملتی پنشن اس کے علاوہ تھی۔ اس لیے ابو کو ریٹائرمنٹ کے بعد کسی مالی پریشانی کا اندیشہ نہیں تھا۔

میں سیدھی کچن میں گئی تو امی، روشن آپا کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ ویسے تو روشن آپا کو کپڑے برتن دھونے اور گھر کی جھاڑ پونچھ کے لیے رکھا گیا تھا لیکن جب گھر میں کوئی تقریب ہوتی یا کسی مہمان نے آنا ہوتا تو امی انہیں اپنی مدد کے لیے روک لیتی تھیں۔ روشن آپا کو دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ کسی مہمان کی آمد ہے اور یہ اس کی خاطر مدارات کی تیاری ہو رہی ہے۔ میں نے امی سے پوچھا۔ ''کوئی آرہا ہے کیا؟''

''ہاں۔'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارشد آرہا ہے۔ عاشر اسے لینے ایئرپورٹ گیا ہے۔''

''کون ارشد؟'' میں نے بے دھیانی میں کہا۔

''ایک ہی ارشد ہے ہمارے خاندان میں۔'' امی جھلاتے ہوئے بولیں۔ ''تمہارا خالہ زاد، وہی آرہا ہے۔''

''کس خوشی میں؟'' میں نے امی کو چڑانے کے لیے کہا۔ میں جانتی تھی کہ وہ اپنے میکے والوں پر فدا ہیں۔

''اسے کراچی میں نوکری مل گئی ہے اور جب تک اس کی رہائش کا بندوبست نہیں ہو جاتا، وہ یہیں رہے گا۔'' امی نے کہا۔ ''تم بھی جا کر لباس تبدیل کرلو، وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔''

اس کے آنے کا سن کر میں پریشان ہو گئی۔ ہمارے گھر میں تین ہی بیڈروم تھے۔ ایک امی ابو، دوسرا عاشر بھائی اور تیسرا میرے اور عروبہ کے زیر استعمال تھا۔ عاشر بھائی بڑے ریزرو قسم کے انسان تھے۔ وہ شاید اپنا کمرہ کسی کے ساتھ شیئر کرنا پسند نہ کریں۔ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ جب ہمارے یہاں کوئی مہمان آیا تو مجھے اور عروبہ کو ہی دربدر ہونا پڑتا تھا۔ اکثر یہ ہوتا کہ ہم دونوں ڈرائنگ روم میں قالین پر بستر بچھا کر لیٹ جاتے تھے لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ عروبہ کو رات دیر تک پڑھنا ہوتا تھا۔ اس لیے شاید وہ بھی اپنا کمرا چھوڑنے پر تیار نہ ہوتی۔ اسی خیال کے تحت میں نے امی سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم اسے ٹھہرائیں گے کہاں؟ ہمارے گھر میں تو کوئی فالتو کمرا نہیں ہے۔''

''دل میں جگہ ہونی چاہیے۔'' امی نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے اس کے لیے اوپر والا کمرا تیار کروادیا ہے۔''

یہ سن کر مجھے کچھ سکون ہوا اور میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہاں عروبہ پہلے سے ہی منہ پھلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''باجی تیار ہو جاؤ۔ ہمارے گھر پر اللہ کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔''

''بری بات۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''مہمانوں کے لیے ایسا نہیں کہتے۔ وہ تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔''

''لیکن کبھی کبھی زحمت بھی بن جاتے ہیں۔'' وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ''اب دیکھو نا، میرے ایگزام سر پر ہیں۔ مجھے اپنی تیاری بھی کرنی ہے اس کے آنے سے گھر کا کام کتنا بڑھ جائے گا۔''

''پریشان مت ہو۔ جیسے ہی اس کی رہائش کا بندوبست ہو گا، وہ یہاں سے چلا جائے گا۔''

"تم دیکھ لینا وہ کہیں نہیں جائے گا۔ ایسے مزے اور کہاں ملیں گے اور امی بھی اسے نہیں جانے دیں گی۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔ تم اپنا موڈ ٹھیک کرلو۔ وہ لوگ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

ارشد کو میں نے پہلی بار دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ وہ بے حد اسمارٹ، خوش شکل اور وجیہہ شخص تھا۔ سیاہ پینٹ، سفید قمیص، چمک دار سیاہ جوتے اور سلیقے سے جمے ہوئے بالوں نے اس کی شخصیت کو اور زیادہ پُرکشش بنا دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں خالہ کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ سعدیہ تو میرے ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ وہی میرے ارشد کی دلہن بنے گی۔ میری جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو ارشد کو دیکھتے ہی سپنوں کا نگر آباد کرلیتی لیکن میں کسی رومانی ناول کی ہیروئن نہیں بلکہ ایک پڑھی لکھی میچورڈ کالج لیکچرار تھی جو جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے عقل وشعور سے کام لے کر فیصلہ کرنا جانتی تھی۔ اسی لیے ارشد کو دیکھ کر میرے دل میں کوئی طوفان نہیں اٹھا اور میں نے ارشد کے ساتھ ایک کزن کی طرح برتاؤ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

امی نے حسبِ توقع اپنے بھانجے کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ اسے دیکھ کر صدقے واری ہو رہی تھیں۔ عاشر بھائی تو اسے چھوڑ کر بینک چلے گئے تھے۔ اب ان کی واپسی شام کو ہی ہوتی۔ ابو بھی دفتر گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا اسے کمپنی دینے کے لیے عروبہ اور میں ہی باقی بچے۔ مجھے معلوم تھا کہ کھانا کھانے کے بعد عروبہ بھی پڑھائی کا بہانہ کر کے کمرے میں چلی جائے گی اور اس کے بعد مجھے ہی ارشد کے ساتھ سر کھپانا ہوگا۔

"بیٹا! تم منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔"

"ایکسکیوزمی خالہ جان۔" اس نے بڑے بناوٹی انداز میں کہا۔ "پہلے میں چینج کروں گا۔ باتھ روم کہاں ہے؟ آپ کسی سے کہہ کر میرے کپڑے پریس کروادیں۔"

"باتھ روم۔" امی کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "میں نے تمہارے لیے اوپر کا کمرا ٹھیک کروادیا ہے اس کے ساتھ باتھ روم بھی ہے۔ تم وہیں چلے جاؤ۔ میں تمہارے کپڑے استری کروادیتی ہوں۔"

اس نے اپنے بیگ میں سے ایک جوڑا نکال کر امی کو دیا اور خود اوپر چلا گیا۔ انہوں نے روشن آپا کو کپڑے استری کرنے کے لیے دیے اور کھانا نکالنے کچن میں چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد عروبہ نے کہا۔ ''باجی! تم نے اس پینڈو کے نخرے دیکھے۔ اسے بتا دینا چاہیے کہ ہمارے گھر میں سب لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں۔''

''ہاں کچھ زیادہ ہی اترا رہا ہے۔ شاید اسے سرکاری افسر ہونے کا زعم ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ابھی سترہ گریڈ میں ہے لیکن ایسے پوز کر رہا ہے جیسے بائیسویں گریڈ کا سیکریٹری ہو۔''

''اسلام آباد میں تو گریڈ ایک کا سرکاری ملازم بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ یہ بھی اسی کلچر کی پیداوار ہے۔ کچھ دن کراچی میں رہے گا تو اوقات معلوم ہو جائے گی۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ لباس تبدیل کر کے آ گیا۔ امی نے کھانا لگوایا اور کھانے کے دوران ہمارا تعارف کرواتے ہوئے بولیں۔ ''سعدیہ ایم ایس سی کرنے کے بعد کالج میں لیکچرار لگ گئی ہے اور عروبہ کا یونیورسٹی میں آخری سمسٹر ہے۔''

ارشد نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ نے سی ایس ایس کیوں نہیں کیا؟''

عجیب احمقانہ سوال تھا۔ میں نے جل کر کہا۔ ''اگر سب لوگ سی ایس ایس کرنے لگیں تو دوسرے شعبوں میں کون جائے گا۔ ہمیں صرف سرکاری افسر ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر اور دوسرے پروفیشنل بھی چاہئیں۔''

''پھر بھی سرکاری افسر کے ٹھاٹ ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ بنگلا، گاڑی، نوکر چاکر، ٹی اے ڈی اے اور بہت سی سہولتیں، اسی لیے ہمارے شہر میں سب لوگ یہی خواب دیکھتے ہیں۔''

میں نے اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی پوسٹنگ شماریات ڈویژن میں افسر شماریات کے طور پر ہوئی لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ جیسے کراچی کے کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ بے چارہ نہ جانے کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ جب سارا دن فائلوں اور کمپیوٹر میں سر کھپا کر اعداد و شمار اکٹھے کرے گا اور شام کو منی بس یا کوچ میں دھکے کھاتا ہوا گھر آئے گا تو اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

کھانے کے بعد عروبہ تو اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اخلاقاً اس کے پاس بیٹھی رہی۔ مجھے انتظار تھا کہ ارشد اٹھے تو میں بھی کمرے میں جا کر کچھ دیر کمر سیدھی کر لوں۔

روشن آپا نے کھانے کے برتن سمیٹ لیے تو پھر بھی وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ میری اکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں۔ شام کو ملاقات ہو گی۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے یہاں کھانے کے بعد چائے پینے کا رواج نہیں ہے۔''

''نہیں، آپ کا چائے پینے کا موڈ ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ''میں کھانے کے بعد چائے پینے کا عادی ہوں۔ اس کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔''

''یہ کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔'' میں نے تنگ کر کہا۔ ''ہمارے یہاں صرف صبح اور شام میں چائے بنتی ہے۔ ویسے آپ کو طلب ہو رہی ہے تو میں ایک پیالی بنوائے دیتی ہوں۔''

میں نے روشن آپا کو چائے کے لیے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں دھڑام سے بستر پر گئی۔ عروبہ نے کتاب پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ارے مہمان کو اکیلا چھوڑ کر آ گئیں۔ بے چارہ بور ہو جائے گا۔''

''یار! اس کے تو نخرے آسمان کو چھو رہے ہیں۔ امی نے اتنی محنت سے کھانا بنایا لیکن اس نے جھوٹے منہ کسی چیز کی تعریف نہیں کی بلکہ آتے ہی فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ پہلے کپڑوں پر استری کے لیے کہا اب چائے مانگ رہا ہے۔''

''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟'' وہ گنگناتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔

''مطلب تو بہت صاف اور واضح ہے اگر تم نہ سمجھنا چاہو تو بات دوسری ہے۔'' وہ کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

''چلو تم ہی سمجھا دو۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''دیکھو باجی! یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ خالہ نے پیدائش کے وقت ہی تمہیں اس پینڈو کے لیے مانگ لیا تھا لیکن ابو نے اس وقت انہیں ٹال دیا جس کے بعد ہمارے گھر میں بھی اس بات کا تذکرہ نہیں ہوا لیکن خالہ نے ہر جگہ یہی کہا کہ تم ان کی ٹھیکرے کی مانگ ہو اور وہ تمہیں ارشد کی دلہن بنائیں گی۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ تمہیں ارشد کی منگیتر سمجھتے

ہیں اور یہی بات خالہ نے ارشد کے دماغ میں ڈال دی ہے۔ اسی لیے وہ تمہیں اپنی ہونے والی بیوی اور اس گھر کو سسرال سمجھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے نخروں کی وجہ سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

"خالہ کو کیا حق پہنچتا ہے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا؟" میں نے بھناتے ہوئے کہا۔ "کیا میری کوئی مرضی نہیں ہے؟"

"یہ تو تم خالہ ہی سے پوچھنا۔ البتہ ابو تمہاری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔" وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ "بائی دا وے، ارشد میں کیا برائی ہے۔ اچھا خاصا ہینڈسم اسمارٹ بندہ ہے، اوپر سے گریڈ سترہ کا افسر۔ یعنی کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔"

"اتنی جلدی اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتی، اگر اسے گریڈ سترہ کا زعم ہے تو میں بھی اسی گریڈ میں ہوں۔ امی کو یہ پیغام دے دینا کہ اگر وہ خالہ کا بھانجا بن کر رہیں گے تو ہم اس کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے لیکن اگر اس نے ہونے والا داماد بن کر پھیلنے کی کوشش کی تو اسے یہاں کوئی بھی منہ نہیں لگائے گا۔"

شام کو ابو دفتر سے آئے تو ابو سے اس کی ملاقات ہوئی۔ عاشر بھائی بھی آگئے تھے۔ وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ امی نے چائے کے ساتھ کئی چیزوں کا اہتمام کیا تھا۔ پکوڑے، سموسے، بسکٹ اور مٹھائی۔ ہم لوگ صرف سادی چائے پینے کے عادی تھے لیکن اس نے ہر چیز پر ہاتھ صاف کیا۔ ابو بڑے غور سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے اور ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ارشد انہیں متاثر کرنے میں ناکام رہا ہے۔

چائے ختم کرنے کے بعد ابو نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی دیکھنے لگے۔ یہ ان کی عادت تھی کہ وہ کچھ دیر چینل بدل بدل کر خبریں اور ٹاک شوز وغیرہ دیکھا کرتے تھے۔ عاشر بھائی کو ٹیلی ویژن دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے وہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کسی دوست سے ملنے چلے جاتے یا کوئی ان کے پاس آجاتا۔ اس روز وہ اخلاقاً ارشد کے پاس بیٹھے رہے پھر ارشد اچانک بول پڑا۔ "عاشر بھائی کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ میرا تو گھر میں بیٹھے بیٹھے دم گھٹنے لگا ہے۔"

عاشر بھائی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "سات بج رہے ہیں۔ اس وقت کہاں جاؤ گے۔ سڑکوں پر بہت زیادہ ٹریفک جام ہوگا۔ ویسے بھی کراچی میں سی سائیڈ کے علاوہ اور کوئی تفریحی مقام نہیں ہے، اگر سمندر کا نظارہ کرنا ہو تو چھٹی کے دن چلیں گے۔"

ارشد کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "دراصل مجھے شام میں گھومنے کی عادت ہے۔ گھر میں دل نہیں لگتا۔"

ابو نے عاشر سے کہا۔ "انہیں ماموں کے یہاں لے جاؤ۔ آہستہ آہستہ یہاں کی زندگی کے عادی ہو جائیں گے۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے عاشر بھائی۔ میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

عاشر بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ابو کی وجہ سے چپ ہو گئے۔ ورنہ ماموں کے یہاں جانے سے صاف انکار کردیتے۔ دراصل ان کی بڑی لڑکی روزینہ سے ان کی نہیں بنتی تھی۔ وہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑگئی تھی جب کہ عاشر بھائی اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ اسے اچھے کپڑوں، میک اپ اور جیولری کا شوق تھا۔ فلموں، ڈراموں اور اداکاروں کے بارے میں اسے بہت زیادہ معلومات تھیں لیکن سیاست، شعروادب اور دیگر فنون لطیفہ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ غرض یہ کہ عاشر بھائی اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لیے وہ روزینہ سے دور بھاگتے تھے۔

ارشد نے تیار ہونے میں دس منٹ کی بجائے ایک گھنٹا لگا دیا جب وہ باہر نکلا تو اس کا حلیہ دیکھ کر میری اور عروبہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ابو اور عاشر بھائی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اس نے گرم موسم میں سوٹ پہن رکھا تھا اور سفید قمیص پر سرخ رنگ کی ٹائی لشکارے مار رہی تھی۔ لباس سے کولون کی بھینی بھینی مہک آرہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شادی کی تقریب میں جارہا ہو۔ اس نے عاشر بھائی کو شلوار قمیص میں بیٹھے دیکھا تو بولا۔ "آپ تیار نہیں ہوئے؟"

عاشر بھائی نے اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی اور بولے۔ "مجھے کیا تیار ہونا ہے۔ یونہی ٹھیک ہوں۔ چلو چلتے ہیں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے ابو سے کہا۔ "لگتا ہے کہ امی کا بجٹ تو پندرہ دن میں جواب دے جائے گا۔ مزید پیسوں کا انتظام کرلیں۔"

امی تڑخ کر بولیں۔ "ایک آدمی کے کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی مہمان کے آنے سے گھر میں

برکت ہوتی ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔" میں نے جل کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ روشن آپا کو پورے دن کے لیے رکھ لیں کیونکہ آپ کے لاڈلے بھانجے کا فرمائشی پروگرام پورا کرنا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔"

ابو نے مجھے گھورا اور بولے۔ "تم جیسی پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "وہ تو میں امی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ اکیلی اتنا زیادہ کام کس طرح کریں گی۔"

دوسری صبح ارشد دفتر جانے کے لیے تیار ہوا تو اس کے سوٹ اور ٹائی کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ ناشتے کی میز پر ابو بھی موجود تھے۔ اس لیے میں اور عروبہ کھل کر نہیں ہنس سکتی تھیں۔ وہ بڑے اسٹائل سے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں گاگلز پکڑے نمودار ہوا اور دونوں چیزیں میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "عاشر بھائی! آپ مجھے دفتر ڈراپ کردیں گے؟"

عاشر بھائی نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا اور بولے۔ "تمہارا آفس اور میرا بینک دو مختلف سمتوں میں واقع ہیں۔ تمہیں شاید یہاں کے فاصلوں کا اندازہ نہیں ہے پھر جگہ جگہ ٹریفک جام ہوتا ہے اگر تمہیں چھوڑنے چلا گیا تو دوپہر تک ہی اپنے بینک پہنچ پاؤں گا۔ تم آج ٹیکسی سے چلے جاؤ پھر اپنے لیے کسی وین کا بندوبست کر لینا۔"

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ کراچی میں اتنے مسائل میں تو کبھی یہاں نہ آتا۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

ابو ناشتا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ عروبہ نے ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ارشد بھائی نوکری کا معاملہ ہے جہاں بھیجیں گے وہاں جانا ہوگا۔ آپ انکار تو نہیں کر سکتے۔"

"ہاں یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا پھر اس نے اپنا بریف کیس اور چشمہ اٹھایا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے عروبہ سے کہا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ یہ کراچی میں زیادہ عرصہ رہ سکے۔"

"یہاں رہنا اس کی مجبوری ہے۔" عروبہ بولی۔ "نوکری کا معاملہ ہے۔ وہ صرف ہمارے کندھوں پر سواری کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ وہ ہمارے گھر کو سسرال سمجھ کر زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"اس کی یہ غلط فہمی دور کردینی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ آگے چل کر ہمارے لیے مزید مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔"

"یہ کام صرف تم کر سکتی ہو کیونکہ امی تو کبھی بھی اپنے بھانجے کا دل توڑنا نہیں چاہیں گی۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تم اسے مکمل طور پر نظرانداز کردو۔ اسے یہ احساس دلا دو کہ خالہ کی کہی ہوئی بات کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ناشتے اور کھانے پر ہیلو ہائے کرنے کے علاوہ اس سے کوئی بات نہ کرنا، اگر وہ کسی کام کے لیے کہے تو ٹال دو۔ کہیں جانے کے لیے کہے تو انکار کردو۔ جب اسے اس بات کی سمجھ آجائے گی تو وہ خود ہی یہاں سے چلا جائے گا۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ خالہ اتنی آسانی سے میری جان چھوڑیں گی۔"

"یہ تو تم پر منحصر ہے اگر یہ پینڈو پسند ہے تو ٹھیک ہے ورنہ انکار کردو۔ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

شام کو ارشد گھر آیا تو اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ کوٹ ہاتھوں میں لٹکا ہوا تھا اور ٹائی کی ناٹ بھی ڈھیلی ہوگئی تھی۔ اس نے بیگ سے ایک شلوار قمیص کا سوٹ نکال کر کہا۔ "خالہ! ان کپڑوں پر استری کروادیں۔"

اس کا اشارہ میری طرف ہی تھا۔ مجھے موقع مل گیا اور بولی۔ "ہمارے گھر میں سب لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابو بھی، آج تو میں آپ کے کپڑے استری کردیتی ہوں۔ آئندہ آپ خود کریں گے یا لانڈری سے کروائیں گے۔"

وہ حیران ہو کر میری شکل دیکھنے لگا پھر بولا۔ "کراچی والے بھی بڑے عجیب ہیں۔ میں نے صبح عاشر بھائی کو کپڑے استری کرتے دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ اگر ان کی شادی نہیں ہوتی تو یہ کام بہنوں کا ہے۔ میری بہنیں تو ہمارے کپڑے تک دھوتی ہیں۔"

"ہمارے یہاں ایسا کوئی رواج نہیں۔ عورتیں صرف کھانا پکاتی اور گھرداری کے دوسرے کام دیکھتی ہیں۔ اپنے کپڑے استری کرنا، جوتوں پر پالش کرنا اور اپنی چیزیں سنبھالنا مردوں کی ذمے داری ہے۔ آپ کو بھی یہی طریقہ اپنانا ہوگا۔"

عاشر بھائی بینک سے واپس آئے تو انہوں نے اس سے پہلے دن کی روداد جاننا چاہی تو وہ پھٹ پڑا۔ ”ٹیکسی سے آنے جانے میں چھ سو روپے خرچ ہو گئے۔ دفتر دیکھ کر اور مایوسی ہوئی۔ مجھے کلرکوں کی طرح ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں بٹھا دیا۔ سامنے میز پر ایک کمپیوٹر اور بہت سارے فولڈر رکھے ہوئے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ مجھے کلرکوں کے ساتھ بٹھا دیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سب میری طرح گریڈ سترہ کے افسر ہیں۔ وہاں نہ اے سی تھا نہ پی اے اور نہ کوئی چپڑاسی۔ میرے ذہن میں دفتر کا جو تصور تھا وہ چکنا چور ہو گیا۔ ایک اور عجیب بات یہ دیکھی کہ میرے علاوہ کسی نے بھی سوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ سب پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔“

عاشر بھائی ہنستے ہوئے بولے۔ ”اس گرمی میں سوٹ کون پہنتا ہے بلکہ بعض اوقات تو پینٹ شرٹ میں بھی الجھن ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے بنیان پہن کر کام کرتے رہو۔“

کچھ دیر بعد عاشر بھائی نے کسی کو فون کیا اور کسی سے بات کرنے کے بعد بولے۔ ”میں نے وین والے سے کہہ دیا ہے۔ وہ صبح مین روڈ سے تمہیں پک کرے گا اور شام کو اسی جگہ اتار دے گا۔ مہینے کے چار ہزار مانگ رہا ہے۔“

”کیا کیا جائے مجبوری ہے۔“ وہ ٹی وی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”میں روزانہ تو چھ سو روپے ٹیکسی پر خرچ نہیں کر سکتا۔“

اس دن کے بعد ارشد نے امی سے کپڑے استری کرنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ ہر اتوار کو اپنے کپڑے لانڈری میں دینے لگا لیکن اس کی دوسری فرمائشیں بدستور جاری تھیں۔ مجھ سے وہ موقع بے موقع چائے بنانے کے لیے کہتا تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ میں اسے یہ باور کرانا چاہ رہی تھی کہ خالہ کے بھانجے بن کر رہو۔ داماد بننے کی کوشش مت کرو لیکن وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا اور میرے اکھڑے ہوئے رویے کے باوجود میرا پیچھا لیے رہتا۔ دراصل اس کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی گئی تھی کہ میں اس کی منگیتر اور ہونے والی بیوی ہوں۔ اس لیے اس کا حق ہے کہ وہ مجھ سے اپنے سارے کام کروائے۔

اسی طرح وہ عاشر بھائی سے بھی یہ توقع رکھتا تھا کیونکہ وہ اس کے ہونے والے سالے ہیں۔ اس لیے یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ دفتر سے آنے کے بعد انہیں گھمانے پھرانے اور رشتے داروں سے ملوانے لے جائے۔ ماموں کی بیٹی روزینہ سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ اس لیے کئی بار عاشر بھائی سے ماموں کے گھر جانے کے لیے کہہ چکا تھا لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتے۔ ایک دن اس سے برداشت نہ ہوا اور وہ بول پڑا۔

”میں نے کراچی والوں میں ایک عجیب بات یہ دیکھی ہے کہ آپ لوگ آپس میں نہیں ملتے۔ حالانکہ آپ کا اتنا بڑا خاندان ہے لیکن میں نے آپ لوگوں کو کسی کے گھر جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی آپ کے یہاں آتا ہے۔“

عاشر بھائی بولے۔ ”کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ بلاوجہ ادھر اُدھر جھانکتا پھرے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ چھ سات بجے واپس آتا ہوں اور اتنا تھک جاتا ہوں کہ گھر آنے کے بعد دوبارہ باہر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ چھٹی کے دنوں میں بھی پورے ہفتے کے رکے ہوئے کام نمٹانے پڑتے ہیں۔ اس لیے ہم لوگ تو صرف شادی بیاہ اور خوشی غمی تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”پھر بھی رشتے داروں سے ملتے رہنا چاہیے۔ اس سے محبت بڑھتی ہے اور دلوں کے فاصلے کم ہوتے ہیں۔“

”بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”آپ نے ماموں کو کبھی ہمارے گھر آتے دیکھا ہے جب کہ وہ امی کے سگے بھائی ہیں۔ انہیں نوٹ گننے سے فرصت ہو تو فاصلہ کم کرنے کا خیال آئے۔“

”حیرت ہے۔ ان کی بیٹی روزینہ تو بڑی محبت کرنے والی ہے۔ اس نے میری بڑی آؤ بھگت کی تھی۔“

”تو کس نے روکا ہے آپ کو۔“ عروبہ تڑخ کر بولی۔ ”آپ بھی محبت کا جواب محبت سے دیں۔“

”اوہو، تم لوگ تو ہر بات کو غلط رنگ دیتی ہو۔“ وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”آپ کا جو مطلب ہے وہ ہم خوب سمجھتے ہیں۔“ عروبہ نے کہا۔ ”عاشر بھائی انہیں ماموں کے یہاں لے جائیں تاکہ یہ روزینہ کی آؤ بھگت سے لطف اندوز ہو سکیں۔“

”مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ”میری یہاں بہت اچھی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔“

اسے ہمارے گھر آئے ہوئے چھ مہینے ہو چکے تھے لیکن وہ جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ امی نے تو کہا تھا کہ اسے دو تین مہینے میں سرکاری مکان مل جائے گا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا جیسے خالہ نے امی سے غلط بیانی کی ہو۔ کراچی میں

زیادہ سرکاری مکانات صوبائی حکومت کے ملازمین کے لیے مخصوص تھے۔ وفاقی حکومت کے ملازمین کے لیے مکانات کا کوٹہ بہت کم تھا اور اس پر بھی پرانے لوگ قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ ایسے میں ارشد جیسے انتہائی جونیئر سرکاری ملازم کو مکان کہاں سے ملتا۔ ہمیں ارشد کے رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس کی وجہ سے امی پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہمارے گھر میں ایک ڈش بنتی تھی اور وہی دونوں وقت کھائی جاتی تھی لیکن اب دو تین ڈشیں بننے لگی تھیں۔ ایک تو امی کو خود بھی کھانا پکانے کا شوق تھا۔ دوسرے ارشد ان سے آئے دن فرمائشیں کرتا رہتا۔ کبھی کہتا کہ کوفتے کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ کبھی اسے ہمارے یہاں کی نہاری اچھی لگنے لگتی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ اور امی اس کی ہر فرمائش کو حکم سمجھ کر اس کی تعمیل میں لگ جاتیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اب ان کا پورا دن باورچی خانے میں گزرتا ہے۔

کام کے ساتھ ساتھ کچن کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا اور امی بیس تاریخ کو ہی خالی ہو جاتی تھیں پھر انہیں ابو سے مزید پیسے مانگنا پڑتے اور وہ بھی یہ سوچ کر اضافی خرچ برداشت کر رہے تھے کہ چند دنوں کی بات ہے پھر وہ چلا جائے گا لیکن وہ تو جم کر ہی بیٹھ گیا تھا۔ ایک دن تنگ آکر میں نے امی سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ تو کہہ رہی تھیں کہ ارشد دو تین ماہ بعد چلا جائے گا لیکن وہ تو جانے کا نام ہی نہیں لے رہا۔“

”تمہیں اس کے رہنے سے کیا تکلیف ہو رہی ہے؟“ امی نے ناراض ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے رہنے سے نہیں بلکہ آپ کو صبح سے شام تک کام کرتا دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔“

”اگر اتنی ہی مجھ سے ہمدردی ہے تو میرا ہاتھ بٹا دیا کرو۔ میں تو اس سے جانے کے لیے نہیں کہہ سکتی اور نہ ہی یہ اس کے بس میں ہے۔ جب مکان ملے گا تبھی وہ یہاں سے جائے گا۔“

”بس تو پھر بھول جائیں۔ تین سال سے پہلے تو وہ یہاں سے جاتا نہیں۔ جب تک اس کا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر نہ ہو جائے۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ امی بے بسی سے بولیں۔ ”جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“

میں محسوس کر رہی تھی کہ ارشد آہستہ آہستہ ہمارے رنگ میں رنگتا جا رہا ہے۔ اس کا لائف اسٹائل کراچی والوں جیسا ہو گیا تھا۔ اب نہ وہ موقع بے موقع سوٹ پہن کر اتراتا تھا اور نہ ہی ہم لوگوں سے کسی کام کے لیے کہتا تھا۔ امی اسے خود ہی کھانے کے بعد چائے بنا کر دے دیتیں۔ کپڑے لانڈری میں چلے جاتے اور جوتوں پر پالش بھی وہ شاید خود ہی کر لیتا تھا۔ اس نے عاشر بھائی سے کہیں جانے کے لیے بھی کہنا چھوڑ دیا تھا بلکہ جہاں جانا ہوتا وہ خود ہی چلا جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ شام کو وہ دیر سے گھر آگیا یا چھٹی والے دن کہیں گھومنے نکل گیا۔

ایک اور بات میں نے یہ نوٹ کی کہ وہ امی سے کچھ زیادہ ہی لاڈ پیار کرنے لگا ہے۔ وہ کچن میں کھانا بنا رہی ہوتیں تو ارشد کچن ٹیبل پر بیٹھ کر ان سے باتیں کیا کرتا۔ اس نے مجھ سے بھی فری ہونے کی کوشش کی لیکن اب اس کے انداز میں چھچھورا پن بالکل نہیں رہا تھا اور نہ ہی وہ مجھ سے کسی کام کے لیے کہتا۔ اس لیے میں نے بھی اپنے رویے میں تھوڑی سی نرمی پیدا کر لی۔ اب میں اس سے دو چار باتیں کر لیتی تھی اور اگر امی کسی کام میں مصروف ہوں تو میں اسے کھانے کے بعد چائے بھی دے دیتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے جب میں نے اس کی شخصیت کو پرکھنا شروع کیا تو مجھے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آئی جس کی بنیاد پر اسے مسترد کیا جاتا بلکہ خوبیوں کا پلڑہ بھاری تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ اسمارٹ، ہینڈسم اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا اس نے گریڈ سترہ سے اپنا کیریئر شروع کیا تھا اور گریڈ بائیس تک ترقی کرنے کے امکانات تھے۔ وہ کوئی نشہ نہیں کرتا تھا۔ اسے پان سگریٹ کا بھی شوق نہیں تھا۔ وہ فضول خرچ تھا اور نہ کنجوس بلکہ میانہ روی سے چل رہا تھا۔ اس کی جن حماقتوں پر ہم ہنسا کرتے تھے۔ ان پر وہ قابو پا چکا تھا اور صحیح معنوں میں کراچی والا بن گیا تھا۔ ویسے بھی جو آپ کو اچھا لگنے لگے، اس کی چھوٹی موٹی خامیاں نظر نہیں آتیں۔

بہت غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ میرے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے اگر میرے دل میں بھی جگہ بنالے ۔ اس سے پہلے میں اس کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھی ابھی تک اپنی پسند یا ناپسند کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا...... البتہ اس کی حرکات و سکنات سے یہ تاثر ضرور قائم ہوا تھا کہ وہ مجھے اپنی منگیتر سمجھتا ہے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس نے مجھے پسند کر لیا ہے ۔ شاید وہ جھجک رہا ہو یا مجھے اپنی منسوبہ سمجھتے ہوئے اس کی ضرورت

محسوس نہ کرتا ہو۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ امی کی محبتیں اور عنایتیں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگی تھیں۔ میں بھی اس کارِ خیر میں ان کی شریک بن گئی۔ ہمارے گھر میں ناشتے کے لیے ڈبل روٹی، انڈے اور مارجرین آتی تھی۔ سب لوگ ڈبل روٹی سے ہی ناشتا کیا کرتے تھے۔ ایک دن ارشد نے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ وہ جب سے کراچی آیا ہے اس نے پراٹھا نہیں کھایا بس پھر کیا تھا۔ امی نے دوسرے دن سے ہی پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ بنانا شروع کردیا۔ اسے میٹھی چیزیں مثلاً کھیر، کسٹرڈ اور شیر خورمہ بہت پسند تھے۔ امی نے باقاعدگی سے یہ ڈشیں بنانا شروع کردیں اور ہمارے فریج میں ہر وقت ان میں سے ایک ڈش ضرور رکھی ہوتی۔

ایک سال بعد اسے چھٹی ملی تو اس نے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ جانے سے پہلے اس نے امی سے کہا کہ واپسی میں وہ خالہ کو بھی لے کر آئے گا۔ یہ سننے کے بعد امی کے دل میں اُمیدوں کا جہاں آباد ہوگیا اور وہ یہی سمجھیں کہ خالہ اپنی برسوں پہلے کہی ہوئی بات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آرہی ہیں لیکن انہوں نے ابو اور عاشر بھائی سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ جب تک خالہ خود بات نہ کرتیں۔ اس سلسلے میں کوئی گفتگو کرنا بے کار تھا۔

جب مجھے معلوم ہوا ہے کہ ارشد اپنی امی کو لینے گیا ہے تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ اگر خالہ نے دستِ سوال دراز کردیا تو میرا جواب کیا ہوگا۔ بظاہر اسے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں تھا لیکن دو باتیں مجھے کسی فیصلے پر پہنچنے سے روک رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمارے گھر میں ایک سال رہا گو کہ اس نے اپنی حرکات و سکنات سے یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے صرف خالہ کا گھر ہی نہیں بلکہ اپنی ہونے والی سسرال بھی سمجھتا ہے اور اس نے اپنے ممکنہ داماد ہونے کی حیثیت کا بھرپور فائدہ بھی اٹھایا۔ امی بھی شاید دل ہی دل میں اسے یہ درجہ دے چکی تھیں اور اسی لیے انہوں نے اس کی بیٹے سے بڑھ کر ناز برداری کی لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس نے اشارتاً بھی مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے پتا چلتا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ اس کا یہی مطلب لیا جاسکتا ہے کہ وہ حد درجہ غیر رومانٹک اور اپنے جذبات کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے اطمینان کے لیے کافی تھا کہ اس کی ماں نے مجھے بچپن ہی میں اس کی دلہن بنانے کا عندیہ دے دیا تھا اور وہ مجھے اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔

دوسری چیز جو مجھے فیصلہ کرنے سے روک رہی تھی وہ یہ کہ میرے دل میں ابھی تک اس کے لیے چاہت کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس کو دیکھ کر یا اس کے بارے میں سوچ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ہو۔ ابتداء میں تو اس کے پینڈو پن اور اوچھی حرکتوں کی وجہ سے.... اس سے دور ہوگئی تھی لیکن بعد میں جب ہمارے تعلقات معمول پر آگئے تب بھی میں نے اپنے دل میں اس کے لیے کوئی کشش محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں نے محسوس کیا کہ جب تک دل کی گواہی شامل نہ ہو اس وقت تک اتنا بڑا فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔

لیکن اب میرے پاس وقت نہیں تھا اور مجھے خالہ کے آنے سے پہلے کوئی فیصلہ کرنا تھا تاکہ جب مجھ سے مرضی معلوم کی جائے تو میں انہیں کوئی جواب دے سکوں۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔ اگر انکار کرتی ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیے جبکہ بظاہر اس میں کوئی خامی نہیں تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ وہ تو وہاں پہلے سے براجمان ہے۔ یہ میں نہیں جانتی کہ اس نے یہ نقب کب اور کیسے لگائی۔ اب میرے پاس اسے مسترد کرنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا لہٰذا میں نے دل کی گواہی قبول کرلی اور پُرسکون ہوگئی۔

ایک مہینا گزر گیا اور ارشد اپنی ماں کو لے کر واپس آگیا۔ خالہ بظاہر تو ہم لوگوں سے بہت اچھی طرح ملیں لیکن مجھ سے انہوں نے کوئی خصوصی برتاؤ نہیں کیا۔ رسمی انداز میں گلے لگایا۔ دو چار دعائیں دیں اور بس۔ جب کہ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے اپنی ہونے والی بہو سمجھ کر میری بلائیں لیں گی۔ مجھ پر واری صدقے ہوں گی۔ مجھے اپنے پاس بٹھا کر میٹھی میٹھی باتیں کریں گی اور مجھے کوئی اسپیشل گفٹ دیں گی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ امی نے ان کا سامان اپنے کمرے میں رکھوا دیا اور ابو عارضی طور پر عاشر بھائی کے کمرے میں شفٹ ہوگئے۔

رات کو عروبہ نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ خالہ گڑے مردے اکھاڑنے آئی ہیں۔ اگر انہوں نے ارشد/

بھائی کے لیے تمہیں مانگ لیا تو تمہارا جواب کیا ہوگا کیونکہ ابو تمہاری مرضی جانے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔‘‘

’’تمہارے خیال میں میرا کیا جواب ہونا چاہیے؟‘‘ میں نے اسے کریدنے کے لیے کہا۔

’’مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرو۔ ویسے میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو صاف انکار کردیتی۔‘‘

’’کیوں؟ کیا برائی ہے ارشد میں؟‘‘ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

’’کمال ہے۔ وہ ایک سال سے یہاں رہ رہا ہے اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ اس میں کیا برائی ہے۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آرہا۔ ایک نمبر کا چھچھورا شخص ہے وہ۔‘‘

’’چلو جانے دو۔ ہمیں اس کی شخصیت سے کیا لینا دینا۔‘‘ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ ’’البتہ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی اگر خالہ نے بات چھیڑی اور مجھ سے میری مرضی پوچھی گئی تو سوچ کر جواب دوں گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم جو سوچ رہی ہو ویسا نہ ہو اور خالہ محض ملنے ملانے ہی آئی ہوں۔‘‘

’’نہیں وہ کسی مقصد کے تحت ہی آئی ہیں۔‘‘ عروبہ نے بڑے یقین سے کہا۔

اگلے دن خالہ ارشد کو ساتھ لے کر ماموں سے ملنے چلی گئیں۔ ان کی واپسی کافی دیر بعد ہوئی ان کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ ارشد کی بدن بولی بھی بدلی بدلی لگ رہی تھی اور پہلے والی اتراہٹ نمایاں ہوگئی تھی۔ امی نے کھانے کے لیے پوچھا تو خالہ چہکتے ہوئے بولیں۔ ’’آپا بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔ بھابی نے جانے کے ساتھ اتنی چیزیں سامنے رکھ دیں کہ انہی سے پیٹ بھر گیا۔‘‘

مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ ممانی تو پرلے درجے کی کنجوس واقع ہوئی تھیں اور عام طور پر مہمانوں کو صرف چائے یا شربت پر ہی ٹرخا دیتی تھیں۔ حالانکہ ماموں بہت پیسے والے تھے لیکن خرچ کرتے ہوئے ان کا بھی دم نکلتا تھا۔

میں کمرے میں گئی تو عروبہ نے کہا۔ ’’باجی مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آرہا ہے۔ ممانی تو کسی کو پانی کے لیے نہیں پوچھتیں۔ پھر انہوں نے خالہ کی اتنی خاطر تواضع کیسے کردی؟‘‘

’’شاید اس لیے کہ وہ دوسرے شہر سے آئی ہیں اور وہ بھی کافی عرصہ بعد لیکن تمہیں اتنی فکر کیوں ہورہی ہے؟‘‘

’’اس لیے کہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔‘‘

’’فضول باتیں مت کرو اور مجھے سونے دو۔ صبح کالج بھی جانا ہے۔‘‘

تھوڑی دیر بعد مجھے پیاس محسوس ہوئی تو میں پانی پینے کے ارادے سے باہر نکلی۔ امی کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں وہاں سے گزری تو اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی اور وہیں دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوکر ان کی باتیں سننے لگی۔ خالہ کہہ رہی تھیں۔

’’سچ پوچھو تو میری بڑی خواہش تھی کہ سعدیہ کو اپنی بہو بناؤں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس کی پیدائش کے وقت ہی میں نے اسے تم سے مانگ لیا تھا لیکن بھائی صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب بچے بڑے ہوجائیں تو ان کی مرضی معلوم کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ اس وقت تو میں خاموش ہوگئی لیکن دل میں ٹھان لیا کہ سعدیہ ہی میرے ارشد کی دلہن بنے گی۔ ہمارے گھر میں ہر وقت سعدیہ کا ہی ذکر ہوتا تھا اور سب لوگ اس کا نام لے کر ارشد کو چھیڑتے تھے۔ اس طرح اس نے بھی اپنے دل میں سعدیہ کو بسا لیا اور ذہنی طور پر اسے اپنی منگیتر سمجھنے لگا۔ میں نے بچپن سے ہی اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ سعدیہ کو حاصل کرنے کے لیے دل لگا کر پڑھنا ہوگا کیونکہ تمہارے خالو تعلیم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اسے بھی اپنا مستقبل بنانا تھا چنانچہ اس نے بڑی محنت کی اور سی ایس ایس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جب اس کی

**شمارہ ستمبر 2016ء کی منتخب سچ بیانیاں**

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆اول: شیرو... محمد ظفر حسین (کراچی)

☆دوم: فائیو پرسنٹ... اختر شہاب (کراچی)

☆سوم: مسافر... اشرف عباس (العین، یو اے ای)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

پوسٹنگ کراچی ہوئی تو میں نے اسے خاص طور پر تمہارے گھر رہنے کی تاکید کی۔ میں چاہتی تھی کہ اس طرح یہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں سمجھ لیں اور اگر ان کی مرضی ہو تو دونوں کا رشتہ طے کر دیا جائے۔

میں تمہاری احسان مند ہوں کہ تم نے ارشد کا بیٹوں سے بڑھ کر خیال کیا اور اسے ماں جیسی شفقت دی۔ وہ بھی تمہاری بہت تعریفیں کیا کرتا تھا لیکن تمہارے تینوں بچوں کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ خاص کر سعدیہ سے اسے بہت توقعات وابستہ تھیں۔ وہ اسے ہونے والی بیوی کے روپ میں دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے۔ وہ اس گھر میں تمہارا بھانجا نہیں بلکہ داماد بن کر آیا تھا۔ شاید تم بھی ایسا ہی سمجھ رہی تھیں۔ اس لیے تم نے ضرورت سے بڑھ کر اس کی خاطر داری کی لیکن تمہاری اولاد کا رویہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ اس نے گھر میں پل کر پانی بھی نہیں پیا۔ اس کے سارے کام میں ہی کرتی تھی۔ کپڑے دھونا، استری کرنا، جوتوں پر پالش کرنا، اس کے لیے ناشتے میں پراٹھے بنانا اور چائے دینا وغیرہ وغیرہ۔ وہ سعدیہ سے بھی یہی توقع کر رہا تھا لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ اس گھر میں سب لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں۔ وہ چائے بنانے کے لیے کہتا تو سعدیہ اٹھ کر کمرے میں چلی جاتی۔ کپڑے استری کرنے کے لیے دیتے تو اسے لانڈری کا راستہ دکھا دیا۔ میں مانتی ہوں کہ سعدیہ اپنی ملازمت کی وجہ سے گھر کے کاموں کے لیے وقت نہیں نکال سکتی لیکن ارشد جس ماحول میں پلا بڑھا ہے۔ اس میں لڑکیاں گھر داری کرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔

جب اسے یہاں لفٹ نہیں ملی تو اس نے ماموں کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ روزینہ اس کی خوب آؤ بھگت کرتی۔ اس کے لیے چائے بنا کر لاتی اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتی۔ اس طرح اسے ماموں کے گھر میں اپنائیت کا احساس ہونے لگا اور وہ باقاعدگی سے وہاں جانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ اور روزینہ قریب آتے گئے اور اس نے اسے شریکِ زندگی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ سعدیہ کے لیے اس کے دل میں بہت عزت اور احترام ہے لیکن وہ اسے بیوی کے روپ میں قبول نہیں کر سکتا۔ اچھا ہوا کہ بھائی صاحب نے اس وقت مجھے ٹال دیا تھا۔ ورنہ آج میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ بہرحال میں نے ارشد کی خواہش کے پیشِ نظر اس کا رشتہ روزینہ سے طے کر دیا ہے سچ تو یہ ہے کہ وہ اس گھر کو اپنی ہونے والی سسرال ہی سمجھ کر آیا تھا لیکن اس کے نصیب میں سعدیہ نہیں بلکہ روزینہ تھی۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ عروبہ اس وقت جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے پوری اسٹوری سنائی تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”خس کم جہاں پاک۔ اچھا ہوا باجی تم ایک مشکل فیصلہ کرنے سے بچ گئیں۔“

”ہاں جو ہوتا ہے۔ اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔“ میں نے ایک انڈین فلم کا ڈائیلاگ دہراتے ہوئے کہا۔

”ویسے باجی۔ یہ ارشد بڑا ہوشیار نکلا۔ کتنی صفائی سے اس نے امی کو بے وقوف بنایا اور وہ آج تک اسے اپنا ہونے والا داماد ہی سمجھتی رہیں۔ اس طرح اسے مفت قیام و طعام کی سہولت مل گئی۔ خود غرض کہیں کا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پھیر کر لیٹ گئی میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری جب میرے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرے تو مجھے اپنا رویہ تبدیل کر لینا چاہیے تھا اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتی جو کسی عزیز ہستی کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن میں اس بات کو سمجھ نہ سکی کہ مرد بھی توجہ ملنے پر عورت کی جانب مائل ہوتا ہے یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا وہ جو توقعات لے کر آیا تھا۔ ان کے برعکس اس کے ساتھ سلوک کیا گیا جبکہ ماموں کے ہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ پانی بھی ڈھلوان کی جانب ہی بہتا ہے اگر ارشد روزینہ کی جانب مائل ہوا تو یہ ایک فطری امر تھا۔ مجھے اس وقت ہی ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا جب ارشد کی ماموں کے ہاں آمدورفت بڑھ گئی تھی اور سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ میری خاطر ہی ہمارے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا اور میں ارشد کے ساتھ وہی سلوک کرتی جو ہونے والے منگیتر سے کیا جاتا ہے لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا وہ میری دسترس سے بہت دور چلا گیا بالکل اسی طرح جیسے کسی بچے سے اس کا من پسند کھلونا چھین لیا جائے ۔ وہ خود غرض نہیں تھا غلطی میری تھی کہ میں نے اپنے کھلونے کی حفاظت نہیں کی۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔